بہنوں کا اپنا ماہنامہ
2012
شعاع

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---------- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---------- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---------- 6000 روپے

مستقل سلسلے

فروری 2012

جلد 26 شمارہ 6

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 21/3 ڈی ٹی پی، سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaamonthly@yahoo.com, info@khawateendigest.com

رضیہ جمیل

شعاع کا فروری کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

وقت کے تیز بہاؤ میں حالات کا منظر نامہ بھی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے اور اپنے ساتھ ہر شے کو بہائے لیے جا رہا ہے۔ میڈیا کی ترقی اور آزادی سے جہاں ابلاغ کے ذریعے بڑھے ہیں وہاں جو نیا رجحان سامنے آرہا ہے وہ بہت عجیب و غریب ہے۔ فکر و شعور کی ترقی کے بجائے ذہنوں کو الجھایا جا رہا ہے۔ تفریح کے نام پر جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے وہ نہ صرف ہمارے معاشرے اور مذہب سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا بلکہ تہذیب و شائستگی سے بھی کوسوں دور ہے اور ذہن اور ذوق کی سطح کو پست کر رہا ہے۔ ایسے میں خواتین کا کردار بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔

انسانی تہذیب نے آج تک جتنی ترقی کی ہے اس میں عورت کا بڑا حصہ ہے۔ وہ اپنا تہذیبی ورثہ اعلا انسانی اقدار آنے والی نسلوں کو منتقل کرتی رہی ہے۔ ایک ماں ایک خاندان کی بنیاد ہوتی ہے اور اچھے خاندانوں سے ہی اچھے معاشرے تشکیل پاتے ہیں۔ اگر ہم اپنے اندر مثبت سوچ، صالح طرز فکر، رواداری اور اعلا اخلاقیات پیدا کریں گے تو آنے والی نسلوں کو یہ ورثہ منتقل کر سکیں گے۔ جو یقیناً ایک سنہرے مستقبل کی نوید ہو گا۔

اس شمارے میں،

سائرہ رضا نے ایک طویل عرصہ بعد دوبارہ لکھنا شروع کیا ہے۔ نومبر میں آپ ان کا افسانہ پڑھ چکے ہیں۔ اس ماہ ان کا طویل ناول پیش کیا جا رہا ہے۔ شگفتہ انداز میں لکھا یہ ناول ہمارے معاشرے کی بہت سی سچائیوں کو سامنے لاتا ہے۔

- مہوش افتخار کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- سونیا نوید اور سندس جبیں کے ناولٹ،
- شاہدہ ملک، نیّر فہیم خان، انوشہ ملک، میمونۃ الکبریٰ اور مصباح خادم کے افسانے،
- عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے ناول،
- عمران رضا اور رابعہ عمران کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- بیٹھ کر سیرِ دو جہاں کرتا ۔ آمنہ زرّیں کا تبصرہ،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کے بارے میں آپ کی رائے ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ خط ضرور لکھیے گا۔

وہ ابتداؤں کی ابتدا ہے، وہ انتہاؤں کی انتہا ہے
ثنا کرے اس کی کوئی کیونکر، بشر ہے لیکن خدا نما ہے

وہ کون ہے منتظر تھا جس کا جہانِ نورِ انیاں ازل سے
گواہ ہے کہکشاں ابھی تک کہ کوئی اس راہ سے گیا ہے

وہ سرِ تخلیق ہے مجسّم کہ خود ہی آدمؑ ہے خود ہی عالم
وجود کی ساری وسعتوں پر محیط ہے جو وہ دائرہ ہے

وہی ہے اوّل وہی ہے آخر، وہی ہے باطن وہی ہے ظاہر
یہ سوچ ہے آگہی سے باہر، وہ اوّل کیا ہے، جو رہ گیا ہے

انہی کا مسکن انہی کا گھر ہیں، انہی کی نسبت سے معتبر ہیں
حرم ہو، طیبہ ہو، میرا دل ہو، یہ سب وہی ایک سلسلہ ہے

نہیں ہے کوئی مثیل اُس کا، نہیں ہے کوئی نظیر اُس کا
وہ شخص بھی ہے، وہ عکس بھی ہے، اور آپ اپنا آئینہ ہے

ہے حدِ فاصل کہ خطِ واصل کہ قوس کے قوس ہے مقابل
سلیم عاجز ہے فہمِ کامل کہاں بشر ہے کہاں خدا ہے

سلیم احمد

رسولِ مقبول

مدینے کا سفر ہے اور میں نم دیدہ نم دیدہ
جبیں افسردہ افسردہ، قدم لغزیدہ لغزیدہ

چلا ہوں ایک مجرم کی طرح میں جانبِ طیبہ
نظر شرمندہ شرمندہ، بدن لرزیدہ لرزیدہ

کسی کے ہاتھ نے مجھ کو سہارا دے دیا ورنہ
کہاں میں اور کہاں یہ راستے پیچیدہ پیچیدہ

مدینے جا کے ہم سمجھے تقدّس کس کو کہتے ہیں
ہوا پاکیزہ پاکیزہ، فضا سنجیدہ سنجیدہ

وہی اقبال جس کو ناز تھا کل خوش مزاجی پر
فراقِ طیبہ میں رہتا ہے اب رنجیدہ رنجیدہ

اقبال عظیم

پیارے نبی کی پیاری باتیں

ادارہ

دجال

4074۔ حضرت فاطمہ بنت قیسؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز ادا کرنے کے بعد منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ حالانکہ اس سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف جمعہ کے دن (خطبہ جمعہ کے لیے) منبر پر تشریف رکھتے تھے۔ لوگوں کو اس سے پریشانی ہوئی۔ کوئی کھڑا تھا' کوئی بیٹھا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ (پھر فرمایا)

"اللہ کی قسم! اس جگہ میں کوئی ایسی ترغیب و ترہیب والی بات بتانے کھڑا نہیں ہوا جس سے تمہیں فائدہ ہو لیکن میرے پاس تمیم داری آئے اور مجھے ایک خبر دی جس سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ مجھے دوپہر کو خوشی اور آنکھوں کی ٹھنڈک کی وجہ سے نیند نہیں آئی' اس لیے میں نے چاہا کہ تمہارے نبی کی خوشی سے تم سب کو آگاہ کر دوں۔

مجھے تمیم داری کے ایک چچا زاد نے بتایا کہ (سمندری سفر کے دوران میں) بادِ مخالف انہیں ایک غیر معروف جزیرے تک لے گئی۔ وہ جہاز کی کشتیوں میں بیٹھ کر جزیرے میں پہنچے۔ انہیں بڑی بڑی پلکوں والی ایک سیاہ فام چیز ملی۔ انہوں نے اس سے کہا۔

"تو کون ہے؟"

اس نے کہا۔ "میں جساسہ ہوں۔"

انہوں نے کہا۔ "ہمیں (وضاحت سے) بتا۔"

اس نے کہا۔ "میں نہ تمہیں کچھ بتاؤں گی' نہ تم سے کچھ پوچھوں گی' لیکن یہ مندر جو تمہیں نظر آرہا ہے' اس میں جاؤ' وہاں ایک آدمی ہے' جس کی شدید خواہش ہے کہ تم اسے کچھ بتاؤ اور وہ تمہیں کچھ بتائے۔"

وہ اس مندر میں گئے اور اس شخص کے پاس جا پہنچے' دیکھا تو ایک بڑی عمر کا آدمی ہے' جو خوب جکڑا ہوا ہے۔ اس سے بہت رنج و غم ظاہر ہو رہا ہے۔ بہت ہائے وائے کر رہا ہے۔ اس نے ان سے کہا۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

انہوں نے کہا۔ "شام سے۔"

اس نے کہا۔ "عربوں کا کیا حال ہے؟"

وہ بولے۔ "ہم عرب کے لوگ ہیں' تو کس چیز کے بارے میں پوچھتا ہے؟"

اس نے کہا۔ "تمہارے اندر جو آدمی (نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ظاہر ہوا ہے اس کا کیا حال ہے؟"

وہ بولے۔ "اچھا حال ہے۔ اس (نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قوم کا مقابلہ کیا تو اللہ نے اسے قوم پر غلبہ عطا فرما دیا۔ اب وہ سب (اہل عرب) متحد ہیں۔ ان کا معبود بھی ایک ہے اور دین بھی ایک ہے۔"

اس نے کہا۔ "زغر کے چشمے کا کیا حال ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "اچھا ہے' لوگ اس سے کھیتی کو پانی دیتے' اور خود پینے کے لیے پانی بھرتے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "بیسان اور عمان کے درمیان کے کھجوروں کے درختوں کا کیا حال ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "ہر سال پھل دیتے ہیں۔"

اس نے کہا۔ بحیرہ طبریہ کا کیا حال ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "اس کا پانی اتنا زیادہ ہے کہ کناروں سے اچھلتا ہے۔"

اس نے تین بار ٹھنڈی سانس لی پھر بولا۔

"اگر میں اس قید سے چھوٹ گیا تو زمین کا کوئی علاقہ نہیں رہے گا جس پر میرے یہ قدم نہ لگیں' سوائے طیبہ کے۔ اس پر میرا بس نہیں چلے گا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ سن کر میری خوشی کی انتہا ہو گئی (بے حد خوشی ہوئی۔) یہ (مدینہ منورہ ہی) طیبہ ہے۔ قسم ہے اس ذات کی' جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اس کے ہر تنگ اور کھلے راستے پر ہر میدان اور پہاڑ پر قیامت تک کے لیے فرشتے تلواریں سونتے کھڑے ہیں۔"

فوائد و مسائل : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فجر کے بعد بعض اوقات ضروری مسائل بیان فرما دیا کرتے تھے' مثلاً "خوابوں کی تعبیر وغیرہ لیکن منبر پر بیٹھ کر فجر کے بعد خطبہ دینے کا معمول نہیں تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خوش ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے بھی دجّال سے ڈرایا کرتے تھے۔ حضرت تمیم داریؓ کے واقعہ سے اس کی مزید تصدیق ہو گئی۔ صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں۔ "اس نے مجھے ایک بات سنائی جو اس کے موافق ہے' جو میں تمہیں مسیح دجال کے بارے میں بتایا کرتا تھا۔" (صحیح مسلم' الفتن' باب قصة الجساسة' حدیث:2942)

جساسہ کے بارے میں صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں۔ "اس کے جسم پر اتنے بال تھے کہ بالوں کی کثرت کی وجہ سے اس کے آگے پیچھے کا پتہ نہیں چلتا۔"

عمان اور بیسان شام کے دو شہر ہیں۔ عمان موجودہ اردن کا دار الحکومت ہے۔

زغر شام کا ایک شہر ہے۔ اس کے قریب چشمہ ہے۔ بحیرہ طبریہ شام میں ہے۔

مدینہ منورہ میں دجال داخل نہیں ہو سکے گا لیکن مدینہ میں تین بار زلزلہ آئے گا تو مدینہ میں موجود تمام کافر اور منافق مدینہ سے نکل کر دجّال سے جا ملیں گے۔ (صحیح البخاری' الفتن' باب ذکر الدّجال' حدیث:7164)

دجال مکہ مکرمہ میں بھی داخل نہیں ہو گا۔ (صحیح مسلم' الفتن' باب قصة الجساسة' حدیث:2942)

4075۔ حضرت نواس بن سمعان کلابیؓ سے روایت ہے' ایک صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دجال کا ذکر فرمایا۔ اس کی حقارت کا ذکر فرمایا اور اس کا عظیم (بڑا فتنہ) ہونا بیان فرمایا۔ (یا مطلب یہ ہے کہ تفصیل سے بیان کرتے ہوئے کبھی معمول کی آواز میں بیان فرمایا' کبھی آواز بلند فرمائی) حتیٰ کہ ہمیں محسوس ہوا کہ وہ کھجور کے درختوں کے کسی جھنڈ میں ہے (اور ابھی نکلنے والا ہے)' جب ہم (اس کے بعد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"تم لوگوں کو کیا ہوا؟"

ہم نے کہا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آج صبح آپ نے دجّال کا ذکر فرمایا۔ اس کی پستی اور بلندی کا ذکر فرمایا (یا آہستہ اور بلند آواز سے تنبیہ فرمائی) حتیٰ کہ ہمیں محسوس ہوا کہ وہ کھجوروں کے جھنڈ میں ہے۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھے تمہارے بارے میں دجّال سے زیادہ کسی اور چیز سے خطرہ ہے۔ اگر وہ اس وقت ظاہر ہوا جب کہ میں تمہارے اندر موجود ہوں تو تم سے پہلے اس کا مقابلہ کر لوں گا (دلائل کے ذریعے سے ہو یا اس کے شعبدوں کی حقیقت ظاہر کر کے ہو) اور اگر وہ اس وقت ظاہر ہوا' جب میں تمہارے اندر نہیں ہوں گا تو ہر شخص اپنا دفاع خود کرے گا اور میری عدم موجودگی میں اللہ ہر مسلمان کا مددگار ہے۔ دجال گھنگریالے بالوں والا جوان ہے۔ اس کی آنکھ ابھری ہوئی ہے۔ وہ ایسا ہے کہ میں اسے عبدالعزیٰ بن قطن سے تشبیہ دیتا ہوں۔ تم میں سے جو کوئی اسے دیکھے اس کے سامنے سورہ کہف کی ابتدائی آیات پڑھے۔ وہ شام اور عراق کے درمیان ایک راستے پر ظاہر ہو گا اور دائیں بائیں فساد پھیلائے گا۔ اللہ کے بندو! ثابت قدم رہنا۔"

ہم نے کہا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ زمین میں کتنا عرصہ رہے گا؟"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "چالیس دن (جن میں سے) ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا۔ ایک دن ایک مہینہ کے برابر' ایک دن ایک جمعہ (سات دن) کے برابر اور باقی (سینتیس) دن تمہارے (عام) دنوں کی طرح ہوں گے۔"

ہم نے کہا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! وہ دن جو سال کے برابر ہوگا کیا اس دن میں ہمیں ایک دن کی (صرف پانچ) نمازیں کافی ہوں گی؟"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "اس دن میں اس کی مقدار کے مطابق اندازہ کرلینا۔"

ہم نے کہا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! زمین میں اس (کے سفر کرنے) کی رفتار کتنی ہوگی؟"

فرمایا۔ "جیسے بادل جس کے پیچھے ہوا لگی ہوئی ہو اور اسے اڑائے لیے جارہی ہو۔"

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "وہ کچھ لوگوں کے پاس آئے گا' انہیں (اپنی بات تسلیم کرنے کی) دعوت دے گا' وہ اس کی بات مان لیں گے اور (اس کے دعوے کو سچا مان کر) اس پر ایمان لے آئیں گے۔ وہ آسمان کو حکم دے گا کہ بارش برسائے تو بارش ہوجائے گی۔ زمین کو حکم دے گا کہ فصلیں اگائے تو وہ اگادے گی۔ ان کے مویشی شام کو (چر چگ کر) واپس آئیں گے تو ان کی کوہانیں انتہائی اونچی' ان کے تھن انتہائی بڑے (دودھ سے لبریز) اور ان کی کوکھیں خوب نکلی ہوئی ہوں گی (خوب سیر ہوں گے) پھر وہ کچھ (اور) لوگوں کے پاس جائے گا' انہیں (اپنے دعوا پر ایمان لانے کی) دعوت دے گا' وہ اس کی بات ٹھکرا دیں گے' وہ ان کے پاس سے چلا جائے گا۔ صبح ہوگی تو وہ لوگ قحط کا شکار ہوجائیں گے' ان کے پاس (مال' جانور وغیرہ) کچھ نہیں رہے گا پھر وہ ایک کھنڈر پر سے گزرے گا تو اسے کہے گا۔ اپنے خزانے نکال دے۔ (فوراً) زمین میں مدفون) وہ (خزانے) شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے پیچھے چل پڑیں گے پھر وہ ایک بھرپور جوانی والے ایک آدمی کو بلائے گا اور اسے تلوار کے ایک وار سے دو ٹکڑے کردے گا۔ (ان ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے اتنی دور پھینک دے گا) جتنی دور تیر جاتا ہے پھر اسے بلائے گا تو وہ (زندہ ہوکر) ہنستا ہوا آجائے گا' اس کا چہرہ (خوشی سے) دمک رہا ہوگا۔

اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو (زمین پر) بھیج دے گا۔ وہ دمشق کے مشرق کی طرف سفید مینار کے قریب نازل ہوں گے۔ انہوں نے ورس اور زعفران سے رنگے ہوئے دو کپڑے پہن رکھے ہوں گے' دو فرشتوں کے پروں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہوں گے۔ جب سر جھکائیں گے تو (پانی کے) قطرے ٹپکیں گے' جب سر اٹھائیں گے تو موتیوں کی طرح قطرے گریں گے۔ جس کافر تک ان کے سانس کی مہک پہنچے گی' وہ ضرور مرجائے گا۔ ان کے سانس کی مہک وہاں تک پہنچے گی جہاں تک ان کی نظر پہنچے گی۔ پھر وہ (دجّال کے تعاقب میں) روانہ ہوں گے حتیٰ کہ اسے لد شہر کے دروازے پر جالیں گے اور قتل کردیں گے۔ پھر اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کے پاس آئیں گے' جنہیں اللہ نے (دجّال کے فتنے میں مبتلا ہوکر گمراہ ہونے سے) بچالیا ہوگا۔ ان کے چہروں سے غبار صاف کریں گے اور انہیں جنّت میں ان کے درجات سے آگاہ کریں گے۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ پر وحی نازل فرمائے گا۔ اے عیسیٰ! میں نے اپنے کچھ بندے ظاہر کیے ہیں' ان سے جنگ کرنے کی کسی میں طاقت نہیں' ان (مومنوں) کو حفاظت کے لیے "طور" پر لے جائیے۔"

تب اللہ تعالیٰ یاجوج اور ماجوج کو چھوڑ دے گا اور وہ جیسا کہ اللہ نے فرمایا۔ "ہر ٹیلے سے (اتر اتر کر) بھاگے آرہے ہوں گے۔" ان کے پہلے لوگوں (ہجوم کے شروع کے حصّے) کا گزر بحیرہ طبریہ سے ہوگا۔ وہ اس کا سارا پانی پی جائیں گے۔ جب ان کے پچھلے افراد

گزریں گے تو کہیں گے۔ کبھی اس مقام پر پانی بھی ہوتا تھا۔ اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی (طور ہی پر) موجود ہوں گے۔ (یاجوج ماجوج کی وجہ سے کہیں آجا نہیں سکیں گے' اس لیے خوراک کی شدید قلت ہوجائے گی) حتیٰ کہ انہیں ایک بیل کا سر اس سے بہتر معلوم ہوگا' جتنا تمہیں آج کل سو اشرفیوں کی رقم اچھی لگتی ہے۔

اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی اللہ کی طرف توجہ فرمائیں گے (اور دعائیں کریں گے) تب اللہ یاجوج ماجوج کی گردنوں میں کیڑے پیدا کردے گا' چنانچہ وہ سارے کے سارے ایک ہی بار مرجائیں گے۔

اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی (پہاڑ سے) اتریں گے تو دیکھیں گے کہ ایک بالشت جگہ بھی ایسی نہیں' جو ان کی بدبو' ان کی سڑانڈ اور ان کے خون سے آلودہ نہ ہو۔ وہ اللہ کی طرف توجہ فرمائیں گے (اور دعائیں کریں گے) تو اللہ ایسے پرندے بھیج دے گا جو بختی اونٹوں کی گردنوں کی طرح ہوں گے۔ وہ ان (کی لاشوں) کو اٹھا کر جہاں اللہ چاہے گا پھینک دیں گے۔

پھر اللہ ان پر ایسی بارش نازل فرمائے گا' جس سے نہ اینٹوں کے مکان میں بچاؤ ہوگا' نہ خیمے میں۔ وہ (بارش) زمین کو دھو کر آئینے کی طرح صاف کردے گی۔ پھر زمین کو حکم ہوگا۔ اپنے پھل اگا اور برکت دوبارہ ظاہر کردے۔ ان دنوں ایک جماعت ایک انار کھائے گی تو سب افراد سیر ہوجائیں گے اور اس کا چھلکا ان سب کو سایہ کرسکے گا۔ اللہ دودھ والے جانوروں میں اتنی برکت دے گا کہ ایک دودھ دینے والی اونٹنی سے ایک بڑی جماعت کا گزارا ہوجائے گا اور ایک دودھ دینے والی گائے ایک قبیلے کے لیے کافی ہوگی اور ایک دودھ دینے والی بکری ایک بڑے کنبے کو کافی ہوگی۔

وہ اسی انداز سے۔ خوش گوار اور بابرکت ایام گزار رہے) ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ان پر ایک خوش گوار ہوا بھیج دے گا۔ وہ ان کی بغلوں کے نیچے سے گزرے گی اور ہر مسلمان کی روح قبض کرلے گی۔

اور باقی ایسے لوگ رہ جائیں گے' جو اس طرح (سرعام) جماع کریں گے جس طرح گدھے جفتی کرتے ہیں۔ انھی پر قیامت قائم ہوگی۔" (صور پھونکنے پر یہی لوگ مریں گے۔)

فوائد و مسائل : سورہ کہف کے پہلے رکوع کی تلاوت دجال کے فتنے سے حفاظت کا باعث ہے۔

علماء کو چاہیے کہ علامات قیامت کی صحیح احادیث عوام کو سنائیں۔ خاص طور پر دجال کے بارے میں انہیں باخبر کریں تاکہ وہ اس فتنے سے بچ سکیں۔

دجال کے حکم پر بارش کا برسنا یا قحط پڑجانا اسی طرح ایک آزمائش ہے۔ جس طرح اس کی جنت اور جہنم یا اس کا مردے کو زندہ کرنا۔

دجال کے ظہور کے زمانے میں دن رات کا موجودہ نظام محدود مدت کے لیے معطل ہوجائے گا۔

ایک سال کے برابر لمبے دن میں وقت کا اندازہ کرکے پورے سال کی نمازیں ادا کرنے کا حکم ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ اس وقت انسانوں کے پاس ایسے ذرائع ہوں گے' جن سے وہ وقت کا صحیح اندازہ کرسکیں گے۔ اس میں گھڑی کی ایجاد کی پیش گوئی ہے۔

اس حدیث سے قطب شمالی اور قطب جنوبی کے ان علاقوں کے بارے میں رہنمائی ملتی ہے' جہاں دن رات کی مقدار معمول سے مختلف ہے اور ان علاقوں کے بارے میں بھی جہاں سال کے بعض حصّوں میں دن رات کا معروف نظام نہیں رہتا۔ ایسے علاقوں میں نماز اور روزے کا اندازہ گھڑی دیکھ کر کیا جائے۔ اگر کوئی مسلمان خلا میں جائے تو وہاں بھی اسی اصول کو مدِ نظر رکھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ موجود ہیں۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور یہ بھی متفق علیہ مسئلہ ہے کہ وہ دوبارہ زمین پر تشریف لائیں گے۔ اس سے صرف مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروکار

اختلاف رکھتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بہت سے معاملات معجزانہ کیفیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے یہ بھی ہے کہ پہلے کافروں نے انہیں شہید کرنے کی کوشش کی تھی اب کافر وا کا ان کی حد نظر میں زندہ رہنا ممکن نہ ہو گا۔

لد ایک شہر ہے جو فلسطین (موجودہ یہودی ریاست اسرائیل) میں واقع ہے۔ وہاں ہوائی اڈہ بھی ہے۔ ممکن ہے شہر کے دروازے سے مراد اس کا ہوائی اڈہ ہو جہاں دجّال فرار ہونے کی کوشش میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قابو میں آجائے۔

دجال بھی مسیح کہلاتا ہے مگر وہ جھوٹا مسیح ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام سچے مسیح ہیں جن کے ہاتھ سے وہ جہنم رسید ہو گا۔

یاجوج ماجوج جسمانی لحاظ سے قوی ہیکل ہوں گے اور تعداد میں بھی بہت زیادہ ہوں گے، اس لیے عام انسان ان کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔

یاجوج ماجوج اس وقت کہاں ہیں؟ یہ معلوم نہیں، تاہم وہ یقیناً موجود ہیں، اس میں شک نہیں۔

اہل چین یا اہل روس یا اس کے علاوہ کسی ملک کے باسی لوگوں کو یاجوج ماجوج قرار دینا درست نہیں۔

یاجوج ماجوج اچانک ختم ہو جائیں گے۔

یاجوج ماجوج کی ہلاکت کے بعد نباتات اور حیوانات کی پیداوار میں بہت زیادہ برکت ہو گی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات مدینہ منورہ میں ہو گی۔

ان کے بعد ان کے خلفاء ہوں گے۔ مسلمانوں کی تعداد کم ہوتی جائے گی، آخر کار ایک خاص ہوا سے بچے کھچے مسلمان فوت ہو جائیں گے۔

نیک لوگوں کے پاس بیٹھنا

حضرت ابو رزین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا میں تم کو ایسی بات نہ بتلاؤں جس پر دین کا (بڑا) مدار ہے، جس سے تم دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل کر سکتے ہو۔ ایک تو اہل ذکر کی مجالس کو مضبوط کر لو (اور دوسرے) جب تنہا ہوا کرو جہاں تک ممکن ہو ذکر اللہ کے ساتھ زبان کو متحرک رکھو (اور تیسرے) اللہ تعالیٰ ہی کے لیے محبت رکھو اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے بغض رکھو۔"

(بیہقی فی شعب الایمان)

یہ بات تجربے سے بھی معلوم ہوتی ہے صحبت نیک جڑ ہے دین کی۔ دین کی حقیقت، دین کی حلاوت، دین کی قوت کے جتنے ذریعے ہیں، سب سے بڑھ کر ذریعہ ان چیزوں کا صحبت نیک ہے۔

(حیوٰۃ المسلمین)

وسوسے ایمان کے منافی نہیں اور ان پر مواخذہ بھی نہیں ہے

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا۔

"کبھی کبھی میرے دل میں ایسے برے خیالات آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں اس کو زبان سے نکالوں۔"

آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کا شکر ہے جس نے اس کے معاملے کو وسوسے کی طرف لوٹا دیا ہے۔"

یعنی وہ خیالات جو صرف وسوسے کی حد تک ہیں۔ تشکیک اور بد عملی کا موجب نہیں ہیں۔

(ابوداؤد، معارف الحدیث)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لوگوں میں ہمیشہ فضول سوالات اور چوں و چرا کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ یہ احمقانہ سوال بھی کیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے سب مخلوق کو پیدا کیا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ پس جس کو اس سے سابقہ پڑے، وہ یہ کہہ کر بات ختم کر دے کہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر میرا ایمان ہے۔"

(معارف الحدیث۔ بخاری و مسلم)

❁

بندھن

عمران رضا ہمراہ رابعہ عمران

شاہین رشید

شادی ایک خوب صورت بندھن ہے۔ لوگوں کو ایک خوب صورت تعلق میں باندھ دیتی ہے۔ مگر یہ تعلق اس وقت اور خوب صورت ہو جاتا ہے، جب میاں بیوی میں انڈر اسٹینڈنگ ہو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو در گزر کریں اور کسی بات کو انا کا مسئلہ نہ بنائیں۔ گھر کو بنانے اور بگاڑنے کی ڈور زیادہ تر لڑکی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کیونکہ وہی سارا دن گھر میں رہتی ہے۔

"بندھن" میں اس مرتبہ نئے جوڑے عمران رضا اور رابعہ عمران سے گفتگو کی ہے، جن کی شادی کو ابھی صرف چار مہینے ہوئے ہیں۔

رابعہ عمران

"کیسی ہو رابعہ! شادی مبارک ہو، زندگی کیسی گزر رہی ہے اور کچھ اپنے بارے میں بھی بتائیں۔"

"بالکل ٹھیک ٹھاک۔ خیر مبارک، اور زندگی ماشاء اللہ بہت اچھی گزر رہی ہے۔ 10 ستمبر 2011ء کو ہماری شادی ہوئی تھی۔ میں اردو اسپیکنگ ہوں۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں اور سب سے چھوٹی ہوں۔ 14 فروری کو کراچی میں ہی پیدا ہوئی۔ والدہ ہاؤس وائف ہیں، جبکہ والد صاحب جاب کرتے تھے، اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔"

"عمران رضا سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی؟ کوئی رشتے داری ہے آپس میں؟"

"مکمل طور پر ارینج میرج ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں تھا۔ شادی کے دن ہی ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ ہماری آپس میں پہلے سے کوئی رشتے داری نہیں ہے۔ رشتے کی بات یوں

چلی کہ میں خالہ کے ساتھ کزن کی شادی میں شرکت کرنے گئی۔ وہاں ان کے رشتے دار بھی آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے مجھے دیکھا اور میرے بارے میں معلومات حاصل کیں، پھر میرے گھر والوں سے میری تصویر مانگی اور ان کے گھر والوں کو دکھائی.... کیونکہ ان کو بھی لڑکی کی تلاش تھی۔

ان کے گھر والوں نے تصویر لے کر رکھ لی اور ایک سال تک ان کے گھر میں ہی پڑی رہی۔ اصل میں ان کے گھر میں بھی بھانجیوں کی شادیاں ہو رہی تھیں، پھر یہ مصروف بھی بہت تھے۔ پھر جب ان کی شادی کا خیال آیا تو میری تصویر نکالی گئی۔ مزید لڑکیاں دیکھنے سے پہلے یہ ہمارے گھر میں آئے اور بس نصیب کی بات تھی، جوڑ لکھا ہوا تھا۔ میرا رشتہ طے پا گیا، میں ان کے گھر والوں کو پسند آگئی۔"

"ایک سال تک ان کے گھر میں تصویر رہی، آپ کے گھر والوں کو خیال نہیں آیا کہ پتا تو کریں کہ کیا ہوا؟"

"دراصل میرے لیے اور بھی رشتے آرہے تھے اور پھر میں اپنی پڑھائی میں بھی مصروف تھی تو کسی کا دھیان ہی نہیں گیا کہ انہیں تصویر دی ہوئی ہے۔ پھر خالہ کے ذریعے تصویر گئی تھی، اس لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔"

"پھر جب ان کی طرف سے رشتہ آیا تو اچھا لگا کہ ایک مشہور شخصیت کا رشتہ آیا ہے؟ تم سے تمہاری پسند پوچھی گئی تھی؟"

"سچ بتاؤں کہ میں ان کو بالکل بھی جانتی نہیں تھی۔ شہزاد رضا کو میں جانتی تھی۔ چونکہ ٹی وی دیکھنے کا اتنا شوق نہیں تھا تو ان کے بارے میں نہیں جانتی تھی.... پھر جب ان کی تصویر آئی اور فیس بک پر بھی ان کو دیکھا تو آئیڈیا ہوا کہ یہ تو مشہور شخصیت ہیں اور میں نے تو انہیں پی ٹی وی ڈراموں میں دیکھا ہوا ہے اور جہاں تک پسند کی بات ہے تو ہمارا ماحول بہت مشرقی ہے اور مشرقی ماحول میں لڑکیوں کی رائے کہاں پوچھی جاتی ہے.... لیکن میں سمجھتی ہوں کہ گھر والوں کا فیصلہ بہت اچھا تھا۔"

"منگنی کتنا عرصہ رہی اور منگنی کے دوران ملاقات ہوئی یا فون پر بات ہوئی؟"

"منگنی دس مہینے رہی، اور آپ یقین کریں کہ ملاقات تو بہت دور کی بات ہے، ہماری تو کبھی فون پر بھی بات نہیں ہوئی اور ایس ایم ایس بھی ایک دو ہی کیے۔ وہ بھی جب ان کی سالگرہ تھی یا پھر ان کا کوئی اچھا شو دیکھا اور انہوں نے بھی کبھی مجھے ایس ایم ایس نہیں کیے۔ بلکہ گھر والوں کو کرتے تھے کہ میرا شو آرہا ہے، پھر ان کی وجہ سے میں نے بھی شوق سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میں ان کو ان کی تعریف میں ایک ایس ایم ایس کر دیتی تھی اور ان کا جواب آتا تھا، تھینکس۔"

"شادی کے بعد سسرال کا ماحول کیسا پایا؟"

"سسرال کا ماحول تو اتنا اچھا ہے کہ میں لفظوں میں بیان ہی نہیں کر سکتی۔ کم سے کم آج کے دور میں، میں نے اتنا اچھا ماحول کہیں کا نہیں دیکھا اور آپ کو شاید یقین نہ آئے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم ابھی تک جوائنٹ فیملی میں رہ رہے ہیں۔ یہ سب سے چھوٹے ہیں، ان کے تین بڑے بھائی ہیں۔ تیس سالوں سے سب جوائنٹ فیملی میں رہ رہے ہیں۔"

"گھر میں سب تم سے سینئرز ہیں، کبھی سوچا کہ اپنا ایک علیحدہ گھر ہو؟"

"نہیں جی! میں تو تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اس گھر سے علیحدہ ہونے کا۔ میں خود بھی جوائنٹ فیملی کی عادی ہوں۔ اس لیے مجھے ایڈجسٹ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ شہزاد بھائی اور بھابھی بالکل میرے ماں، باپ کی طرح ہیں، کیونکہ وہ مجھے اپنی بیٹی بنا کر لائے ہیں۔ شہزاد بھائی ان کو اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے ہیں اور سچ پوچھیں تو مجھے سسرال میں کبھی اپنے ماں، باپ کی کمی محسوس نہیں ہوئی.... اور ان کی امی اتنی اچھی ہیں، اتنی محبت کرنے والی ہستی ہیں۔ وہ ہمارے گھر کی ہیڈ ہیں۔ وہ کبھی بھی اپنے بیٹوں کی سائیڈ نہیں لیتیں،

ہمیشہ بہوؤں کی سائیڈ لیتی ہیں.... اور بہوؤں کو بیٹیوں کی طرح مانتی ہیں۔ جب کبھی میری طبیعت خراب ہو تو وہ میری اس طرح خدمت کرتی ہیں اور اس طرح میرا خیال رکھتی ہیں کہ شاید میری سگی ماں نے بھی نہیں رکھا ہوگا۔"

"اچھا؟ گڈ.... پھر یہ ساس اور نندیں اتنی بدنام کیوں ہیں؟"

"ہاں جی.... پتا نہیں کیوں؟ بات یہ ہے کہ غلطیاں دونوں سائیڈ سے ہوتی ہیں، تالیاں ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہیں۔ اگر بہو، ساس کو اپنی ماں نہیں سمجھے گی تو پھر ساس بھی ماں کا پیار نہیں دے پائے گی۔ اگر آپ اچھی ہیں تو پھر وہ کیوں آپ سے بگڑیں گی.... ماشاء اللہ میری چھ نندیں ہیں اور سب شادی شدہ ہیں اور بہت اچھی ہیں۔ مزے کی بات بتاؤں کہ میری ان سے بات نہیں ہوتی تھی، مگر ان کے گھر والوں سے میری ایسی دوستی ہو گئی تھی کہ ایسا لگتا تھا کہ جیسے میں ان ہی کے پاس ہی رہتی ہوں۔ روزانہ بھابھیوں سے، ان کی امی سے اور ان کی بہنوں سے گھنٹوں گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں۔"

"شادی سے پہلے لڑکیوں کو سسرال کے لوگوں اور ان کے ماحول کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہوتا۔ بے شک تمہاری روزانہ سب سے بات ہوتی تھی، پھر بھی رخصتی کے وقت کیا احساسات تھے، کوئی ڈر خوف تھا؟"

"ہاں جی! یہ تو قدرتی بات ہے کہ ہر لڑکی کو تھوڑا سا ڈر خوف ہوتا ہے، لیکن چونکہ ان کے گھر والوں سے میری بہت اچھی بات چیت تھی، اس لیے زیادہ ٹینشن نہیں ہوئی اور جب میں رخصت ہو کر ان کے گھر آئی تو مجھے اتنا اچھا رسپانس ملا، جو کہ بہت کم لڑکیوں کو ملتا ہے۔

"گھر والوں سے تو اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی مگر عمران سے تو نہیں تھی، ان کے بارے میں کوئی خوف تھا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں.... لیکن ان کے بارے میں بھی مجھے کوئی ٹینشن نہیں تھی، بس مجھے یہ تھوڑا سا خوف تھا کہ پتا نہیں ان کا مزاج کیسا ہوگا، کیونکہ آج کل کے لڑکے لڑکیوں کی طرح ہماری کوئی ملاقاتیں نہیں تھیں۔ جب ان کے ساتھ شادی کے بعد وقت گزارا تو ان کے مزاج سے بھی آشنائی ہوئی۔ مزاج کے یہ بہت اچھے ہیں۔ بس دونوں میں درگزر ہونی چاہیے اور اپنی غلطی کو تسلیم کرنا چاہیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ شادی کے بعد ہماری کوئی لڑائی وغیرہ نہیں ہوئی۔ میں ان کو سمجھتی ہوں اور یہ مجھے، بلکہ وہ مجھے زیادہ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔"

"شادی کی رسومات انجوائے کیں؟"

"بالکل کیں، مگر بہت زیادہ رسومات نہیں کیں، کیونکہ یہ بہت سادہ اور سوبر انسان ہیں، نہ دوسروں کی زندگی مشکل کرتے ہیں نہ اپنی۔ ان کا کہنا ہے کہ خود بھی ایزی رہو اور دوسروں کو بھی ایزی رہنے دو۔ دوسروں کو خوش رہنے دیں گے اور خود بھی خوش رہیں گے تو زندگی بہت آسان گزرے گی۔ رخصتی سے ایک دن پہلے جب ہمارا نکاح ہوا تو ان کی یہی خواہش تھی کہ رخصتی بھی ہو جانی چاہیے، مگر سب کا دل تھا کہ کچھ اہتمام تو ہونا ہی چاہیے۔"

"رونا آیا تھا؟ نکاح کے وقت یا رخصتی کے وقت میک اپ خراب ہونے کا بھی تو ڈر ہوتا ہے۔"

"نکاح کے وقت رونا آیا تھا۔ رخصتی کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھا تھا۔ میک اپ کا کوئی ایشو نہیں تھا۔ انہیں تو ویسے بھی میک اپ پسند نہیں ہے۔ یہ بہت ہی سادگی پسند ہیں۔ میڈیا میں رہتے ہیں، مگر ان جیسی کوئی عادت نہیں ہے ان میں۔ انہوں نے پہلے ہی امی سے کہہ دیا تھا کہ رابعہ کو میک اپ ہلکا کروائیے گا اور زیادہ لاد کر بھی نہ بھیجئے گا۔"

"دلہن کے روپ میں تم کو اپنا آپ کیسا لگا تھا؟"

"بہت اچھا تجربہ رہا۔ جب ہم کسی کی شادی میں جاتے تھے تو ہم دولہا، دلہن کو دیکھا کرتے تھے، وہ

ہمارے لیے وی آئی پی ہوا کرتے تھے۔ اور جب ہم دونوں خود وہ وی آئی پی بنے تو بہت اچھا لگا۔ اپنی تعریف سن کر اور اپنی اہمیت دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ لگ رہا تھا کہ آج کا دن ہمارے لیے سجایا گیا ہے۔"

"ماشاء اللہ آپ کی جوائنٹ فیملی ہے تو کھانا وغیرہ پکانے کے لیے باری لگی ہوئی ہے یا کیا سسٹم ہے؟"

"ہمارے گھر کا ماحول ایسا ہے ہی نہیں کہ باری لگانا پڑے۔ جس کو جو کام سمجھ میں آجاتا ہے' وہ کر لیتا ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ مجھ سے تو ابھی تک کام شروع نہیں کروایا گیا بھابیوں کے ساتھ ان کے کاموں میں مدد کر دیتی ہوں۔ میں تو ابھی سیکھنے کے دور سے ہی گزر رہی ہوں۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون کے لیے کہاں گئی تھیں؟"

"منہ دکھائی میں انہوں نے مجھے میرے نام کا پینڈنٹ دیا تھا۔ بہت خوب صورت تھا اور ہنی مون پہ ابھی ہم کہیں گئے نہیں' کیونکہ بڑے بھائی کام کے سلسلے میں امریکہ چلے گئے' پھر عید' پھر محرم آگیا اور ویسے بھی یہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے' بس جب ٹائم ملے گا' چلے جائیں گے۔"

"ایک دوسرے کو کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟"

"یہ تو میرا نام لیتے ہیں لیکن میں ان کا نام نہیں لیتی بلکہ "سنیں" یا "سنیے" کہہ کر بلاتی ہوں۔ ہم دونوں ہیں تو نئے دور کے' مگر ہماری "روحیں" پرانی ہیں' یہ ہی دیکھ لیں کہ انہیں فیشن سے بھی کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ بہت ہی سادگی پسند ہیں۔"

"کمرے میں آکر تمہیں دیکھ کر پہلا جملہ کیا کہا تھا؟"

"کمرے میں تو اتنی افراتفری تھی کہ پتا ہی نہیں چلا کہ انہوں نے کیا کہا بلکہ ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا' گفٹ ہاتھ میں پکڑایا اور کمرے سے چلے گئے۔ وہ رات تو بس ایسے ہی گزر گئی۔ صبح چھ بجے تک سب لوگ ہمارے کمرے میں ہی بیٹھے رہے۔ یہ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی' کیونکہ بہت مزا آیا تھا۔"

عمران رضا

"کیسے ہو... انٹرویو کے لیے تیار ہو؟"

"جی بالکل ٹھیک اور انٹرویو کے لیے تیار ہوں۔ اور میں یہ بتا دوں کہ آپ وہ واحد ہستی ہیں' وہ واحد صحافی ہیں کہ جن کو ہم میاں بیوی انٹرویو دے رہے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ جب سے شادی ہوئی ہے' مارننگ شو کے لیے سب نے بلایا' مگر ہم نے انکار کر دیا' مگر آپ کو میں انکار نہیں کر سکتا۔"

"بہت شکریہ! بہت خوش رہو' اتنی عزت دی تم نے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ شادی تو گھر والوں کی پسند سے کی' پھر منگنی دس ماہ رہی۔ اس دوران نہ ملاقات نہ فون پہ بات... کیوں؟"

"جی! یہ حقیقت ہے کہ یہ میری خالصتاً" ارینج میرج ہے' لیکن میں اس کو لو میرج کہتا ہوں۔ اس لیے کہ یہ خالصتاً" میری ماں کی پسند ہے اور ماں کی پسند میری پسند ہے تو میں اس کو لو میرج کہتا ہوں۔ رابعہ کو نہ میں نے دیکھا تھا' نہ تصویر دیکھی تھی اور نہ ہی بات چیت کی تھی۔ شادی کی تو صرف اپنی ماں کے کہنے پر' ان کی پسند پر۔"

"لیکن اگر رابعہ تمہارے معیار پر پوری نہ اترتی تو...؟"

"معیار پر کوئی چیز اترتی نہیں' اتارا جاتا ہے۔ 100 فیصد تو کوئی بھی پرفیکٹ نہیں ہوتا' کچھ خامیاں ہم میں ہوتی ہیں' کچھ خامیاں دوسروں میں ہوتی ہیں۔ ہم مل بیٹھ کر انڈر اسٹینڈ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنے معیار پر اتار لیتے ہیں۔ زندگی ایسے ہی چلتی ہے۔"

"شادی کے بعد رابعہ کو کیسا پایا؟ کیا خوبیاں اور کیا خامیاں ہیں؟"

"میں نے بہت اچھا پایا اس کو۔ اور میں نے اس میں خوبیاں ہی دیکھی ہیں ابھی تک۔ اور ایسا صرف اس لیے نہیں ہے کہ ابھی ہماری نئی نئی شادی ہے' کیونکہ انسان کی پرکھ تو آدھے گھنٹے میں ہو جاتی ہے۔"

"مزاج کی کیسی ہے؟ تیز ہے یا نرم ہے؟ اور سسرال کو کیسا پایا؟"

"تیز...؟ نہیں نہیں... میں تو یہ کہوں گا کہ جس طرح میری ماں کے مجھ پر بچپن سے بہت سے احسانات ہیں' اسی طرح سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ انہوں نے میرے لیے اتنی اچھی لڑکی منتخب کی۔ اور سسرال تو بہت ہی اچھا ہے۔ میرے سالے میرے دوستوں کی طرح ہیں' شاید میری نیچر بھی ایسی ہے کہ سب میرے دوست بن جاتے ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ایسی اچھی بیوی ملی ہے ورنہ جس قدر میں مصروف رہتا ہوں' وہ میری زندگی عذاب کر سکتی تھی میں رات کو دیر سے آؤں تو اس نے کبھی منہ نہیں بنایا۔"

"سگھڑ ہیں؟ کیا اچھا پکا لیتی ہیں اور آپ کیا پکانے کی فرمائش کرتے ہیں؟"

"بہت سگھڑ ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے ابھی تک کچھ فرمائش کر کے نہیں پکوایا' کیونکہ میں کافی دیر سے گھر آتا ہوں' ہاں جب سے شادی ہوئی ہے' میں نے اس سے انڈا بنوایا تھا اور انڈا اچھا بنایا تھا۔"

"آپ چاہیں گے کہ یہ آپ کے ساتھ اس فیلڈ میں آئیں جیسے کہ بہت سے فنکاروں کی بیویاں آتی ہیں؟"

"ہرگز نہیں... کیونکہ ہم بھائیوں نے اپنی فیملی کو اپنے کام سے الگ رکھا ہے۔ بیوی کا کام گھرداری کرنا ہے اور ہم مردوں کا کام کما کر دینا اور گھر چلانا ہے۔"

"شادی کے لیے لڑکی کا خوب صورت ہونا کتنا ضروری ہے؟"

"نہیں' کوئی ضرورت نہیں ہے خوب صورت ہونے کی۔ انسان کی شخصیت خوب صورت ہونی چاہیے۔ اگر حسین ترین لڑکی بیاہ کر لائیں اور شادی کے بعد چیچک کے دانوں سے یا کسی اور وجہ سے اس کا چہرہ خراب ہو جائے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بس! لڑکی کی شخصیت۔ خوب صورت ہونی چاہیے اندر سے۔"

"فضول خرچ ہے یا کفایت شعار؟"

"فضول خرچ تو نہیں کہہ سکتے' لیکن اگر پیسے دے دوں تو جب تک سارے خرچ نہیں کر دیتی' اس کو نیند نہیں آتی اور جو خرچ کرتی ہے' وہ بھی آپ کو بتاؤں' وہ بچوں کے لیے (بھائیوں کے) گھر والوں کے لیے شاپنگ کرتی ہے' اپنے لیے کچھ خریدنے کا اس کو شوق نہیں ہے۔ ہم دونوں شاپنگ کے لیے ایک ساتھ ابھی تک نہیں گئے' کیونکہ ٹائم ہی نہیں ملا۔"

"پھر بھی کہیں جاتے ہوں گے تو لوگ آپ کو پہچان لیتے ہوں گے۔ ان کو برا لگتا ہے؟"

"ہاں اس کو اچھا نہیں لگتا' جب لڑکیاں مڑ مڑ کر دیکھ رہی ہوتی ہیں یا بات چیت کرتی ہیں تو وہ تھوڑا محسوس کرتی ہے اور پھر ہنستی ہے۔"

"اور کوئی بات جو تم رابعہ سے نہیں کہہ سکے' اس انٹرویو کے ذریعے کہنا چاہو گے؟"

"میں تو جو بات کہنا چاہتا ہوں' کہہ دیتا ہوں۔ میری عادت نہیں ہے دل میں رکھنے کی' جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر ہوتا ہے۔"

رابعہ بولیں "اور میں تو ایک بات ضرور کہنا چاہوں گی' عمران رضا بہت ہی اچھے انسان ہیں' نہ صرف میرے لیے بلکہ گھر والوں کے لیے اور میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ جو اس گھر میں بیاہ کر آئی ہوں۔ ماشاء اللہ سب ہی بہت اچھے ہیں۔"

"کھانا ایک ساتھ کھاتے ہیں یا باہر سے کھا پی کے آتے ہیں؟" ہم نے عمران سے پوچھا۔

"ضروری نہیں کہ گھر پر کھاؤں اور ضروری نہیں کہ باہر سے کھا کر آؤں۔ گھر میں ہوتا ہوں تو سب کے ساتھ کھاتا ہوں اور باہر ہوتا ہوں تو باہر سے ہی کھا لیتا ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اس جوڑے سے اجازت چاہی' اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

☆

دستک دستک دستک

شاہین رشید

فاطمہ آفندی

"ہیلو فاطمہ! کیسی ہو؟"
"جی میں ٹھیک ٹھاک۔"

"کاش میں تیری بیٹی نہ ہوتی" میں تمہاری رفارمنس بہترین ہے۔ تمہیں کیا رسپانس مل رہا ہے؟"

"بہت پسند کر رہے ہیں لوگ..... اتنا اچھا رسپانس کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ جب اس سوپ کے لیے سائن کیا تو مجھے آئیڈیا ہو گیا تھا کہ میرا کردار کلک کرے گا۔ اس لیے میں نے اس کردار کو لینے کا فیصلہ کیا اور واقعی میرا فیصلہ ٹھیک تھا۔ کیونکہ میں نے اتنے کردار کیے ہیں مگر اس کردار جیسی شہرت نہیں ملی۔"

"کردار مشکل لگا یا آسان؟"

"کردار مشکل تھا اور اس لیے میں نے لیا کہ مجھے مشکل کردار کرنے میں مزا آتا ہے۔ آسان کردار تو سب ہی کر لیتے ہیں۔"

"کیا مشکل پیش آئی؟"

"کافی مشکلات پیش آئیں..... مثلاً" جب تک اس ڈرامے میں میری شادی نہیں ہوئی تھی تو میرے ماں باپ کے گھر میں جو غربت دکھائی جا رہی تھی' اس کو سوچ کر تو میں سچ مچ لرز جاتی تھی کہ جو لوگ واقعی اس غربت کا شکار ہیں۔ وہ کس طرح اپنی گزر اوقات کرتے ہوں گے۔ غریب لڑکی کی عکاسی کرنا واقعی ایک مشکل کام تھا۔"

"شروع کے ایک سین میں جب تم مالک مکان کو لاتوں سے مارتی ہو تو وہ سین بہت حقیقی لگ رہا تھا۔"

"وہ حقیقی ہی تھا اور سارے سین میں نے حقیقی ہی کیے ہیں۔ جب دکھایا گیا کہ میں سگنل پہ کھڑی گاڑیوں کے شیشے صاف کر رہی ہوں تو وہ بھی حقیقی ہی تھا۔ کوئی میک اپ نہیں تھا۔ گرمی بھی تھی اور کیمرے کا استعمال بھی اس طرح کیا جا رہا تھا کہ کسی کو نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔"

"پھر تو مزے مزے کے واقعات بھی ہوئے ہوں گے؟"

"جی! بہت مزے مزے کے واقعات ہوئے ہیں۔ جب میں گاڑیوں کے شیشے صاف کرتی تھی تو لوگ سمجھتے تھے کہ شاید میں سچ مچ کوئی سڑک پہ رہنے والی یا جھگی میں رہنے والی لڑکی ہوں۔ تو نہ صرف وہ مجھے شیشے صاف کرنے کے پیسے دے دیتے تھے بلکہ مالی امداد کرنے کو بھی تیار ہو جاتے تھے۔ میں نے سوپ کے ابتدا میں کافی مشکل مشکل سین کیے ہیں۔ لوگوں کی بے ہودہ باتیں بھی سنی ہیں۔"

"اور جب شادی ہوئی تب؟ اچانک ہی تمہاری سوکن عزت اتار کر ہاتھ میں رکھ دیتی تھی۔"

"اس وقت جب اچانک بے عزتی کر دی جاتی تھی تو اس فیلنگ کو چہرے پر لانا' کرب کا احساس دلانا ایک مشکل کام تھا..... ابھی تو آپ آگے میرا کام دیکھیے گا آپ کو بہت پسند آئے گا۔"

"تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے اور مستقبل کے کیا ارادے ہیں؟ مطلب یہ کہ اپنی پڑھائی سے متعلق شعبہ اختیار کرو گی یا اداکاری میں ہی نام پیدا کرنا ہے؟"

"پڑھائی ٹھیک ٹھاک چل رہی ہے اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں فیشن ڈیزائنر بننا چاہتی ہوں تو ظاہر ہے کہ اپنی پڑھائی کو اپنے کام میں ضرور لاؤں گی۔ پڑھائی سے تو میں غافل ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سوپ کے دوران میرے پیپرز ہو رہے تھے اور میں نے نہ صرف بہت اچھے پیپرز دیے' بلکہ ریکارڈنگ بھی کروائی اور اب تو چونکہ اداکاری بھی پروفیشن بن گئی ہے تو شوبز کو بھی جاری رکھوں گی اور فیشن ڈیزائننگ کو بھی۔"

"کسی سے فلم میں کام کرنے کے بارے میں پوچھیں تو یہی جواب ملتا ہے کہ شعیب منصور کے لیے کام کریں گے۔ کیا تمہارا بھی یہی جواب ہے؟"

"جی بالکل..... میں بھی یہی کہوں گی۔ کیونکہ وہ بہت معیاری فلمیں بناتے ہیں اور ان کی فلم "بول" اور "خدا کے لیے" نے بزنس کے سارے ریکارڈ توڑ دیے تھے۔"

"کس سے متاثر ہو کر اس فیلڈ میں آئیں؟"

"اپنی امی سے' کیونکہ وہ بھی اس فیلڈ میں ہیں۔ میری خالہ بھی اسی فیلڈ میں ہیں تو یوں سمجھیں کہ اداکاری کے جراثیم گھر سے ہی ٹرانسفر ہوئے ہیں۔ اسکول میں تھی تو اسکول کی تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتی تھی۔ 2001ء میں فنی زندگی کا آغاز کیا۔ کچھ کمرشلز کیے' پھر پڑھائی کی وجہ سے سلسلہ توڑنا پڑا۔ اب تین چار سال سے باقاعدگی سے کام کر رہی ہوں۔"

"بے شک اس ڈرامے نے بھی تمہیں شہرت دی ہے' لیکن "ماسی اور ملکہ" نے تمہیں زیادہ شہرت دی تھی۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"جی! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ "ماسی اور ملکہ" کافی دیر تک چلا اور میں نے اس میں ایک بہت ہی الگ قسم کا رول کیا تھا۔ لیکن پھر ایک وقت آیا کہ میں نے اس کو درمیان میں چھوڑ بھی دیا' کیونکہ اس میں میرا لب و لہجہ ذرا پختگی اختیار کرتا جا رہا تھا اور پھر دوسرے ڈراموں میں بھی یہی لگتا تھا کہ جیسے میں اسی لہجے میں بات کر رہی ہوں۔ ویسے واقعی اس کردار نے مجھے بہت شہرت دی تھی۔"

"اس فیلڈ میں تو اپنی امی اور خالہ سے متاثر ہو کر آئیں' آج کل نوجوان نسل میں کون پسند ہے؟"

"جن کے ساتھ میں نے کافی کام کیا ہے اور کر رہی ہوں ان میں جویریہ اور فیصل قریشی سرفہرست ہیں۔ باقی بھی سب بہت اچھے ہیں۔"

"لگتا ہے کہ تم اداکاری میں پرفیکٹ ہو؟ اور جو کردار ملتا ہے' اس سے انصاف کرتی ہو؟"

"نہیں' ایسا نہیں لگتا' کیونکہ میں ابھی طفل مکتب ہوں۔ ابھی مجھے بہت آگے جانا ہے۔ بہت اچھے اچھے کردار کرنے ہیں۔ میں منتظر ہوں اس بات کی کہ مجھے پاور فل رول ملیں۔ ایسے رول جو منفرد ہوں اور میرے کسی رول سے میچ نہ کریں۔"

"تمہاری کوئی ایسی خامی' جو تم بہت محسوس کرتی ہو؟"

"مجھے رونا جلدی آ جاتا ہے۔ جذباتی بہت ہوں۔ کوئی میرا دل دکھائے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا شاید وقت کے ساتھ ساتھ ٹھیک ہو جاؤں۔"

"کیوں نہیں فاطمہ! ان شاء اللہ پھر بات کریں گے۔"

✿ ✿ ✿

ہمایوں سعید

"کیسے ہیں آپ؟"

"جی! اللہ کا شکر ہے۔"

"آپ کے پروڈکشن ہاؤس سے تو بہت اچھے اچھے سیریلز دیکھنے کو ملتے ہیں۔"

"بہت شکریہ..... آپ لوگ پسند کرتے ہیں تو ہم بھی کوشش کرتے ہیں کہ مزید اچھے سیریلز بنائیں۔"

"آپ نے 1995ء میں اپنے فنی سفر کا آغاز کیا تھا۔ شاید ٹیلی فلم "زہر" سے اب آپ کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے۔"

"جی! بہت لمبا سفر کیا ہے تب کہیں جا کر یہ مقام حاصل ہوا ہے۔ "زہر" میرا پہلا ڈرامہ نہیں تھا بلکہ "یہ جہاں" میرا پہلا ڈرامہ تھا۔ لوگوں نے اس میں میری پرفارمنس کو پسند کیا اور مزید آفرز آنی شروع ہو گئیں۔ البتہ "زہر" میرا بہت ہی پاپولر ڈرامہ ثابت ہوا۔ اس کے بعد تو بس جیسے راہیں ہموار ہوتی چلی گئیں۔"

"آمد کیسے ہوئی تھی؟"

"آمد تو بس اچانک ہی اور دوستوں کے کہنے پر ہوئی۔ ورنہ میرا کہاں ارادہ تھا اس فیلڈ میں آنے کا۔ میرے دوست اکثر مجھے کہا کرتے تھے کہ تمہاری شکل بہت اچھی ہے۔ تم اسمارٹ اور ہینڈسم ہو۔ ٹی وی پہ ٹرائی کیوں نہیں کرتے؟ تو میں ٹال جاتا تھا، مگر ایک دن چلا ہی گیا اور آڈیشن میں کامیاب بھی ہو گیا..... ایسا نہیں تھا کہ "فوراً" ہی کام مل گیا۔ کافی دیر بعد کام ملا۔ بس پھر پرفارمنس دکھانے کی دیر تھی اور سب کچھ سیٹ ہو گیا۔"

"گھر والے تو بہت خوش ہوئے ہوں گے؟"

"آج سے پندرہ سولہ سال پہلے کہاں اس فیلڈ کو بہت اعلا فیلڈ سمجھا جاتا تھا، کیونکہ اتنے چینلز تھے نہیں، معاوضہ بھی اچھا نہیں تھا۔ بس شہرت، بہت تھی، تو بھلا شہرت سے کب گزر بسر ہوتی ہے۔ تو جب والد صاحب کو پتا چلا کہ بیٹا جی شوبز میں آ گئے ہیں تو وہ ناراض ہوئے۔"

"دل چاہا کہ چھوڑ دوں؟ والد صاحب کی مخالفت نہ مول لوں؟"

"اگر انہیں ابتدا میں پتا چل جاتا تو شاید میں اس بارے میں کچھ سوچتا، لیکن انہیں تو اس وقت پتا چلا جب میں اچھا خاصا جانا پہچانا جانے لگا۔ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ آپ کو پتا ہے نا کہ شہرت کتنی خوب صورت چیز ہے۔ خیر! والد صاحب نے جب میرے ڈرامے اور میری شہرت دیکھی تو پھر ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔"

"بچپن میں مستقبل کے کیا خواب دیکھے تھے؟"

"بچپن کے خواب بھی بڑے ہوتے ہیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ بہت اعلا تعلیم حاصل کروں اور ملک سے باہر جاؤں، مگر میں صرف گریجویشن ہی کر سکا۔ کیونکہ مالی حالات اس قابل نہیں تھے کہ میں مزید پڑھ سکتا۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیں!"

"جی میں 27 جولائی 1971ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔ میرے والد زمین دار تھے۔ والدہ ہاؤس وائف۔ بھائیوں میں پہلے نمبر پر ہوں۔ ویسے ہم پانچ بھائی ہیں، بچپن اچھا گزرا۔ کرکٹ سے لگاؤ تھا اس لیے کرکٹ بہت کھیلا اور آج تک کرکٹ کھیلتا ہوں۔ فنکاروں کی ٹیم میں ہوں۔ 1995ء میں اس فیلڈ میں آیا اور 1996ء میں ثمینہ سے میری شادی ہوئی۔"

"کیا کیا ایوارڈز مل چکے ہیں؟"

"دو نیشنل ایوارڈز اور چھ مرتبہ لکس ایوارڈز مل چکے ہیں۔"

"بہت شکریہ..... آپ سے پھر بات کریں گے۔"

✿ ✿ ✿

نبیل

"کیسے ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"کچھ فنکاروں کا خیال ہے کہ سب کچھ بدل گیا ہے، مگر پی ٹی وی نہیں بدلا۔ کیا واقعی ایسا ہے؟"

"ہاں، جی..... ہے تو کچھ ایسا ہی ..... سب سے بڑی بات تو یہ کہ ان کے معاوضے ابھی تک پرکشش نہیں ہوئے۔ پھر اچھے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر یا تو پرائیویٹ چینلز پہ چلے گئے ہیں یا ریٹائرڈ ہو کر آرام کر رہے ہیں تو سچی بات تو یہی ہے کہ اب وہ پہلے والی بات نہیں رہی ہے۔"

"آپ کی اداکاری دیکھ کر لگتا ہے کہ جیسے آپ بنے ہی اداکاری کے لیے ہیں۔ پیدائشی فنکار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ بچپن میں آپ کے کیا خواب تھے؟"

"میرے تو خیر کیا خواب ہوں گے۔ خواب تو میری ماں نے دیکھے تھے کہ میں ڈاکٹر بنوں مگر نہ بن سکا۔ شاید اس لیے کہ بہت جلدی ٹی وی کی طرف آ گیا اور پھر میڈیکل کی تعلیم مشکل بھی بہت تھی۔"

"پھر کہاں تک تعلیم حاصل کر پائے؟"

"میں ایم بی اے کرنے کا خواہش مند تھا، مگر نہ کر سکا۔ گریجویٹ ہوں بس۔"

"آپ کو بھی کیا اپنے تمام ڈرامے اپنی اولاد کی طرح عزیز ہیں؟"

(ہنستے ہوئے) "بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔ میں نے کافی ڈراموں میں کام کیا ہے اور اللہ نے مجھے بے حد کامیابی دی ہے۔ تو بتائیے کس کس ڈرامے کا نام لوں۔"

"بلبلے" میں بہت اچھا چینج لائے ہیں۔ لوگ پسند کر رہے ہیں کیا۔"

"بلبلے" کو لوگ بہت پسند کر رہے ہیں۔ اسی لیے تو چل رہا ہے ورنہ تو یہ بند ہو چکا ہوتا۔"

"بلبلے" میں بچوں کو جوان بھی کریں گے..... ابھی تو خیر بہت چھوٹے ہیں؟"

"کامیابی سے چلتا رہا تو جوان بھی کر دیں گے۔ ابھی اس بارے میں سوچا نہیں ہے۔ ابھی تو بچے ہوئے ہیں۔ آگے آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

"آپ کے کسی ڈرامے کو ایوارڈ بھی تو مل چکا ہے؟"

"دھواں" کو بہت ایوارڈز ملے تھے ویسے ایوارڈ تو ملتے رہتے ہیں جو ہماری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ "برنس روڈ کی نیلوفر" کو تارا ایوارڈ مل چکا ہے۔ یہ ایوارڈ رائٹر فصیح باری خان کو ملا تھا۔ "وعدہ" ٹیلی فلم جو کہ میں نے ڈائریکٹ کی تھی اُسے بھی ایوارڈ مل چکا ہے۔ اس کے رائٹر بھی فصیح باری خان تھے۔"

"آپ ایک عرصے سے اس فیلڈ میں ہیں۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے آپ کی کوئی برائی کی ہو۔ یا آپ کے بارے میں کوئی غلط بات کی ہو۔ اس کی وجہ آپ کی جلدی شادی تو نہیں ہے؟"

"ہاں' یہ بھی بہت بڑی وجہ ہے..... جب مقبولیت کا دور شروع ہوا تو میں نے شادی کرلی۔ 2000ء میں میری شادی ہوئی اور اب ماشاء اللہ 2012ء ہے۔ اس دوران میری سب سے دوستی رہی مگر دوستی کو دوستی کے انداز میں رکھا۔ دیکھیں جی! بات یہ ہے کہ گھر میں اگر سکون ہو۔ بیوی اچھی ہو۔ اولاد کی نعمت بھی مل جائے تو باہر نہیں' پھر گھر میں ہی سکون ملتا ہے۔ میں جب تھک ہار کر گھر جاتا ہوں تو لگتا ہے کہ زمین پہ بنائی گئی ایک چھوٹی سی جنت میں آگیا ہوں۔ میرا گھر کسی جنت سے کم نہیں ہے۔"

"پھر بھی ایک فنکار کی حیثیت سے آپ اپنے جونیئرز کے لیے کیا کہیں گے کہ وہ کس طرح اپنے آپ کو سنبھال کر رکھیں؟"

"اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے' اگر آپ اپنی زندگی کو بیلنس کر کے گزاریں۔ انسان کو اپنا نقید نگار خود ہونا چاہیے۔ اگر انسان خود اچھا رہے گا تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ کوئی آپ کو بہکا نہیں سکے گا۔ اپنی فیلڈ کو ایک جاب کی طرح لے کر چلیں۔ یہ نہ دیکھیں کہ آپ شوبز میں ہیں۔ یہ آپ کی جاب ہے اور آپ کو ایمانداری کے ساتھ اس کو کرنا ہے۔"

"پوچھنا تو نہیں چاہیے۔ یہ سب کا اپنا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ پھر بھی آپ مذہب کے کتنے قریب ہیں؟"

"بہت قریب ہوں اور انسان کو اپنے مذہب کے قریب ہونا بھی چاہیے۔ نماز روزے کی پابندی ضرور کرتا ہوں اور حقوق العباد کا بھی بہت خیال رکھتا ہوں۔ ہمارے مذہب میں بھی کہا گیا ہے کہ اپنے کسی عمل سے کسی انسان کو تکلیف نہیں دینی چاہیے۔"

"آپ کی فٹنس کا کیا راز ہے؟"

"صرف اور صرف قدرت کا ہاتھ ہے' ورنہ یقین کریں کہ میں اپنی پسند کی ہر چیز بہت شوق سے کھاتا ہوں۔ بالکل بھی پرہیز یا ڈائٹنگ نہیں کرتا۔"

✡

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے آپ کی عافیت' سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔

پہلا خط میرپور آزاد کشمیر سے صالحہ اور اقصیٰ کا ہے' لکھتی ہیں۔

اس ماہ کا پورا شمارہ ہی زبردست تھا کہ بے ساختہ ہی ہم خط لکھنے پر مجبور ہوگئے۔ سب سے پہلے تو دوڑ لگائی اپنے پسندیدہ ناول "ستارہ شام" کی طرف یہ کیا آمنہ جی! ادھر کہانی شروع کی اور ادھر منہ بھی گیلا نہیں ہوا کہ کہانی ختم۔ تیز رفتار بڑھا دیں اور "دیوار شب" کا ذکر نہ ہو' یہ تو ہو ہی نہیں سکتا عالیہ جی! نبیل کو سخت سے سخت سزا ملنی چاہیے اور اب خیام کو بھی مزید خوار مت کریں جلدی سے اس کو اپنے باپ یوسف کمال سے ملا دیں۔ "ضبط عشق" میں عالم کا کردار ہمیں بے حد پسند آیا۔ کیا کوئی دوست اس حد تک دوستی نبھا سکتا ہے ہمیں تو یقین نہیں آیا۔ نزہت شبانہ حیدر کا ناول بھی اچھا تھا۔ فائز اور زویا کو ساتھ دیکھ کر بہت اچھا لگا' ورنہ فائز کا شینا کے لیے مان جانا ہمیں بہت افسوس ہوا تھا۔ "میری صبح کا ستارہ" کا اینڈ اچھا ہو گیا۔ ستارہ علوی کو اپنے غرور کی سزا آخر مل ہی گئی۔ نعیمہ ناز کے ناولٹ میں سویرا کا کردار ہمیں پسند آیا۔ اور آخر کار اپنے غلط فیصلے کا احساس ہو ہی گیا' سمیرا گل کا ناولٹ بھی اچھا تھا۔ علوی کا فیصلہ ہمیں بھی ٹھیک لگا۔ افسانوں میں ملیحہ صدیقی کا افسانہ "شکایت گان" بھی اچھا تھا۔

صالحہ اور اقصیٰ! تفصیلی تبصرے کے لیے تہ دل سے شکریہ' آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

اقصیٰ لاہور سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

مہنگائی کے اس دور میں بھی ہماری پاکٹ منی صرف 200 روپے ہے۔ ان میں سے 100 روپے "خواتین" اور "شعاع" کے لیے نکالنا مشکل ہے' لیکن اس سے زیادہ مشکل ہے "خواتین" اور "شعاع" پڑھے بغیر مہینہ گزارنا۔ زمانے کی اونچ نیچ اور زندگی گزارنے کے طریقے جس طرح یہ ڈائجسٹ ہمیں سمجھاتے ہیں' شاید ایک ماں بھی اپنی بیٹی کی تربیت اس طرح نہیں کر سکتی۔ مختلف کرداروں کو پڑھ کر لوگوں کے مختلف چہرے سامنے آتے ہیں' کچھ اچھے اور کچھ برے' اب آتے ہیں جنوری کے شعاع کی طرف۔ افسانوں میں سب سے اچھا افسانہ تھا "دیوار" سمیرا گل نے "زرد رُتیں" بہت اچھا لکھا۔ آغاز میں ہی مجھے "امن" کی فطرت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ مکمل ناول "جس راہ چلے" اچھا تھا۔ کبھی میں بھی شینا جیسی خود سر اور مغرور ہوا کرتی تھی' مگر شکر اللہ کا کہ میں ٹھوکر کھانے سے پہلے ہی سنبھل گئی ہوں۔ اگر ہم اپنا فوٹو سیشن آپ کو بھیجیں تو ہماری تصویر ماڈل کی جگہ آسکتی ہے؟ ایک مشورہ بھی بلکہ اسے فرمائش ہی سمجھیں۔ پلیز کوئی انعامی سلسلہ شروع کریں' مثلاً" کوئی افسانہ بلا عنوان شائع کیا کریں۔ ہم اس کا عنوان تجویز کریں گے یا پھر

بہترین شاعری (شعر یا غزل) بھیجنے پر انعام ہونا چاہیے۔

ج: پیاری افصیٰ! خامیاں اور خوبیاں ہر انسان میں پائی جاتی ہیں' ٹھوکر کھانے سے پہلے اپنی غلطیوں کا ادراک کرلیا جائے تو انسان بہت سی مصیبتوں سے بچ جاتا ہے۔ اچھی بات ہے کہ آپ کو احساس ہوگیا۔

شعاع اور خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ اپنی تصاویر بھجوادیں' دیکھ کر بتاسکتے ہیں کہ ٹائٹل پر آسکتی ہے یا نہیں۔

انعامی سلسلہ کے بارے میں آپ کی تجویز نوٹ کرلی گئی ہے۔

رابعہ نے ساہیوال سے میل کی ہے

ماڈل بہت ہی پیاری لگ رہی ہے۔ بندھن میں آغا شیراز کا اپنی بیوی کی تعریف کرنا اچھا لگا۔ "ستارہ شام" کے بارے میں کہوں گی کہ ایسا لگتا ہے آمنہ نے اسے بڑی جلدی میں لکھا ہے۔ "ضبط عشق" میں رائنہ کا شاہنواز کو نہ ملنا اچھا نہیں لگا۔ "جس راہ چلے" میں عابدہ کا اپنے بھائی کے سامنے اس قدر جھکنا اچھا نہیں لگا۔ میرے خیال میں جان بوجھ کر ظلم سہنا بھی گناہ ہے۔ "پرچھائیں" بہت اچھا لگا۔ پھر "زرد رتیں" اور اس کے بعد "فضیح کا ستارہ" سارہ کا انجام پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ اینڈ بہت جلدی میں کیا گیا' افسانے کسی بھی رسالے کی جان ہوتے ہیں۔ چھوٹی سی تحریر میں بڑی سی نصیحت تھی' پلیز افسانوں کی تعداد بڑھائیے۔ سب سے اچھا "دوسرا چہرہ" تھا۔ "دیوار" بھی اچھا تھا۔ "اف یہ شکایتگان" تو بے حد اچھا لگا۔ میرا بھی سوال نوٹ کرلیں کہ ہیروئن عام اور سادہ سے کپڑوں میں' منہ دھو کر بھی اتنی حسین کیسے لگتی ہے؟ اس پر ہر رنگ اتنا جچتا کیوں ہے؟

ج: رابعہ جی! آپ کی فرمائش پر افسانوں کی تعداد بڑھادی گئی ہے "ستارہ شام" کے بارے میں آپ کی شکایت آمنہ تک پہنچارہے ہیں۔

ہیروئن عام سے سادہ کپڑوں میں منہ دھو کر حسین اس لیے لگتی ہے کہ وہ ہیرو کی منظور نظر ہوتی ہے۔ محبت کی نگاہ سے دیکھو تو ہر چہرہ' ہر انسان خاص لگتا ہے۔

ام حبیبہ قیصر خان نے سیالکوٹ سے میل کی ہے

میں اور میرے شوہر بارہ سال سے شعاع کے قاری ہیں' کہانیوں کے علاوہ تمام سلسلے بالخصوص شاعری بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ بشریٰ رحمٰن سے کوئی ناول لکھوائیے یہ میرے شوہر کی فرمائش ہے شعاع کے سرورق نے دل لوٹ لیا' تمام مستقل سلسلے پڑھنے کے بعد جلدی جلدی دوڑ لگائی "دیوار شب" کی طرف۔ گڈ لک عالیہ! اس دفعہ عنیقہ اور حیا غالب رہیں۔ دونوں نے ہی زبردست لکھا۔ حیا نے تو گویا میری دوست کی حقیقی کہانی لکھ ڈالی۔ اب یقین آیا کہ ہماری رائٹر ہمارے اردگرد سے ہی کہانیاں چنتی ہیں' آخر میں ایک بات کہ... کیا شعاع میں مرد حضرات لکھ سکتے ہیں؟

ج: حبیبہ! آپ کے شوہر کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں۔ شعاع میں ایک سلسلہ ہے "شاعری سچ بولتی ہے" اس سلسلہ میں مرد حضرات بھی شرکت کرسکتے ہیں' آپ کے شوہر کو شاعری سے دلچسپی ہے' وہ اس سلسلہ میں لکھ کر بھجواسکتے ہیں۔ ناول' ناولٹ' اور افسانے صرف خواتین کے شائع ہوتے ہیں۔

زارا شبیر نے کھائی کوٹلی سے میل کی ہے

میری طرف سے تمام مصنفین کو سلام اور تمام پڑھنے والوں کو بھی۔ میں ہر ماہ پابندی سے شعاع پڑھتی ہوں' اس کی تمام کہانیاں بے حد اچھی ہوتی ہیں' سلسلہ وار کہانیوں میں "ستارہ شام" اس میں مجھے ماوی! کا کردار بہت پسند ہے۔ اس کے علاوہ باقی سارے سلسلے بہت اچھے ہیں۔

ج: شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ' آمنہ ریاض تک آپ کی تعریف پہنچائی جارہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

زوباریہ خالد نے لاہور سے لکھا ہے

ٹائٹل پسند آیا (لیکن مجھے سب سے زیادہ ایئررنگز اچھے لگے۔) بندھن میں آغا شیراز اور ان کی بیگم کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ان کا بیٹا تو بہت ہی پیارا ہے۔ افسانوں میں سب سے اوپر شکایت گان رہا ملیحہ صدیقی کا۔ اس افسانے کو پڑھ کر بہت مزا آیا۔ اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ "ضبط عشق" کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ کہانی ابھی پوری طرح واضح نہیں ہے۔ اس لیے تبصرہ آئندہ ماہ کے لیے محفوظ۔ ناولٹ بس ٹھیک تھے۔ "دکھلتا کسی یہ کیوں" میں اس بار نمرہ' اقرا' حمنہ جٹ اور مان کے اشعار اچھے لگے۔ بندھن میں احسن خان اور ان کی بیگم کا انٹرویو ضرور دیں۔ آپ سے FM-103 کے R.J ڈاکٹر اعجاز وارث کے انٹرویو کی فرمائش کی تھی۔ کب تک پوری کریں گے؟ آخر میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کے لیے بہت ساری دعائیں۔

ج: پیاری زوباریہ! جن حالات سے گزر رہے ہیں ان میں پاکستانی ٹیم کے لیے ہی نہیں پاکستان کے ہر ادارے اور ہر شعبہ کے لیے دعاؤں کی ضرورت ہے۔ تقریباً" ہر ادارہ ہی روبہ زوال ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے۔ (آمین) شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ' انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچارہے ہیں۔

حرا تحریم نے سرگودھا سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

شمارے کا آغاز پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور حمد و نعت سے کیا۔ اس کے بعد "ستارہ شام" کی طرف دوڑ لگائی' کہانی کی رفتار کافی سست جارہی ہے یار فتار بڑھائیں یا صفحات بڑھائیں' خیر اس کے بعد "ضبط عشق" پڑھا۔ اچھی کہانی ہے۔ مگر اگلی قسط آئندہ ماہ پڑھ کر کافی بدمزا ہوئی۔ "زرد رتیں" بہت زبردست تھا۔ اینڈ بھی بہت اچھا تھا۔ "میری صبح کا ستارہ" بس ٹھیک ہی کہانی تھی۔ افسانوں میں فی الحال دو پڑھے ہیں۔ "دیوار" بہت مزے کا تھا۔ اور دوسرا "رب کی مرضی" بھی بہت مزے کا افسانہ تھا۔ بے شک "رب کی مرضی" میں خوشیاں پوشیدہ ہیں۔ نمرہ جی کہاں غائب ہیں؟ ہم چاروں بہنیں ان کی شدید قسم کی فین ہیں۔ مائرہ خان کا انٹرویو شائع کریں پلیز۔

ج: پیاری حرا! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نمرہ جی کا مکمل ناول آئندہ ماہ پڑھ سکیں گی۔ انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی ہے' جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

ابیہا مسکان سعید قلعہ دیدار سنگھ سے لکھتی ہیں

مجھے دنیا میں تشریف لائے اکیس سال ہوچکے ہیں اور شعاع کے ساتھ زندگی جیتے ہوئے مجھے چھ سال کا عرصہ بیت گیا۔ اور ان چھ سالوں کے ہزاروں لمحوں میں یہ قدم بہ قدم میرے ساتھ رہا ہے' میری آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے' میرے ہونٹوں پر سجی مسکراہٹ کے ساتھ مسکراتے ہوئے' میری ذات سے وابستہ ہر غم کو خود کے ساتھ شیئر کرتے ہوئے' کڑی دھوپ میں میرے لیے سایہ بنتے ہوئے شعاع نے بھی اپنی زندگی کے چھ سال میرے ساتھ مکمل کیے ہیں۔ ان چھ سالوں میں آپ نے میرے صرف دو خط شائع کیے ہیں۔ پوچھتی ہوں کہ میرا بھی شعاع پر کوئی حق ہے کہ نہیں۔ ویسے اب ایک بات پوچھوں آپ کو کیا لگتا ہے میں رائٹر بنوں گی؟ کوشش کرتے پونے چار سال بیت گئے' لیکن میری ایک بھی کہانی شائع نہیں ہوسکی' اب آپ ہی بتائیں پونے چار سال کا سفر طے کرکے کیسے مان لوں کہ میں ہار گئی۔ (اف کتنا تکلیف دہ ہے نا۔) تو جی اگر آپ کو یاد ہے تو مجھے بتائیں پلیز۔ اور نئے سال کے لیے قارئین کے نام پیغام ہے کہ ان بھاگتے دوڑتے لمحوں میں سے چھوٹی چھوٹی خوشیاں چرا کر مسکرانا سیکھ لیں کیا پتا کوئی بڑی خوشی زندگی میں نصیب ہو کہ....

ج: پیاری ابیہا! شعاع پر آپ کا پورا حق ہے۔ آپ کے خط ہمیں تو موصول نہیں ہوئے ورنہ ضرور شائع کرتے آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ موضوع کا انتخاب بھی صحیح کرتی ہیں' لیکن کہانیوں میں سطحی پن ہوتا ہے۔ اس لیے شائع نہیں ہوپاتیں' آپ کی کہانی "دوسری شام" میں بہت جھول تھے۔ آپ نے پلاٹ سنبھالا نہیں۔ کہانی "صحیح فیصلہ" میں آپ نے جو موضوع لیا اس کو بھی صحیح طرح نہیں لکھا۔ مزید مطالعہ کریں' پھر بہتر لکھ سکیں گی۔ ہم کوشش کریں گے کہ آپ کی کہانی "صحیح فیصلہ" تصحیح کرکے شائع کردیں' تاکہ آپ کا حوصلہ قائم رہے۔

حرمت ردا اکرم نے ڈلوال سے لکھا ہے

بہت اچھا لگا شب آغا شیراز سے ملاقات کرکے۔ خصوصاً" ان کا بیٹا بہت پیارا ہے ماشاء اللہ "کیا ہوا ہے سال بھر میں" سب نے ہی اچھا لکھا' مگر ثمینہ اکرم کے جوابات اچھے لگے۔ ہم تو ان کو ایک نوجوان سی کنواری سی دوشیزہ سمجھے بیٹھے تھے۔ مگر وہ تو ہم سے کچھ ہی سال چھوٹی لڑکی کی ماما جانی نکلیں۔ ملیحہ صدیقی کا افسانہ بھی بہت اچھا لگا۔ واقعی چھوٹی چھوٹی شکایتیں تو خاصی ہیں ہمیں بھی شعاع سے۔ مگر ایک جگہ پہ تو ہم دھک سے ہی رہ گئے جہاں محترمہ ملیحہ صاحبہ نے ہمارے رائٹرز کو دینے والے ادب و احترام کو نشانہ بنایا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ہم کیا کریں۔ کسی کا احترام کرو تو وہ بھی ناقابل قبول ہے۔ حیا بخاری کا افسانہ بھی بہترین تھا۔ سمیرا اگل کو پڑھنا ابھی باقی ہے۔ عنیقہ محمد بیگ اپنے اچھوتے طرز خیال اور طرز

تحریر سے بہت جلد قارئین میں مقبولیت پا چکی ہیں۔ مگر یہ افسانہ کچھ خاص نہیں لگا۔ مہوش افتخار کی تحریر تھوڑی سی پڑھ کر چھوڑ دی کہ اگلے ماہ اکٹھے ہی پڑھیں گے دونوں قسطیں۔ نعیمہ ناز کا ناولٹ پرچھائیں' معذرت کے ساتھ کچھ اچھا نہیں لگا۔ ایک تو کردار اتنے زیادہ' مجھے لگا کہ شاید کافی لمبا ہوگا یہ ناول' پھوپھی میرا مطلب ہے فلک کی پھوپھی کی فیملی اتنی بڑی' مجھے تو لگا کہ محلے کے بچے بھی ان ہی کے گھر ہوتے ہیں۔ مستقل سلسلے سارے بہترین تھے۔ شاعری سچ بولتی ہے میں بانو ماہی قادری کا انتخاب اچھا لگا۔

ج: پیاری حرمت! آپ اپنے گاؤں ڈنوال کا تعارف ضرور کرائیں۔ ہمیں اپنے پیارے ملک کے شہروں' قصبوں اور گاؤں کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ خصوصاً" چھوٹے شہر اور گاؤں جہاں سے بہت سارے گوہر نایاب سامنے آئے ہیں۔ ہماری کئی مصنفین اور بیشتر قارئین کا تعلق بھی ان ہی علاقوں سے ہے' جن کے خطوط ان کی ذہانت اور صلاحیت کے آئینہ دار ہیں۔ شعاع کے بارے میں آپ کا تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ آپ کی تنقید و تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

تنزیل زہرہ نے شہدادپور سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں

سرورق پر موجودہ ماڈل گرل کو دیکھ کر میں خود بھی فریش ہوگئی اور ماڈل کے ایئر رنگز تو مجھے بہت ہی اچھے لگے۔ سب سے پہلے انٹرویوز پڑھے اور عائشہ عمر صاحبہ کا انٹرویو مجھے بہت پسند آیا۔ اور اب بات کرتی ہوں اپنی پسندیدہ رائٹر عالیہ جی کی' ان کے ناول کے بارے میں' میں اتنا کہوں گی کہ یہ وہ واحد ناول ہے جسے پڑھتے ہوئے میں کبھی بھی بوریت کا شکار نہیں ہوئی ہوں۔ باقی آمنہ ریاض کا ناول "ستارہ شام" بس ٹھیک ہی ہے' کیونکہ اس میں موجود سارے کردار کچھ اقساط سے غائب ہیں اور بس تین ہی کردار بچ گئے ہیں ثمینہ' ماوی اور جلال جن کے بارے میں رائٹر کچھ اقساط سے لکھ رہی ہیں۔ ناولٹ میں سمیرا گل کا ناولٹ "زرد رتیں" ایک ہلکی پھلکی تحریر تھی اور نعیمہ ناز کا ناولٹ "پرچھائیں" بھی ایک اچھی اور سبق آموز تحریر تھی' لیکن سائرہ عارف کے ناولٹ "میری صبح کا ستارہ" کے بارے میں یہ کہوں گی ان کی تحریر بس روایتی سی تھی اور تحریر کو بلاوجہ طول بھی دیا گیا تھا' لیکن انہوں نے کردار کو حقیقت پسندی کے ساتھ لکھا ہے۔ اب آتی ہوں مکمل ناول کی طرف نزہت شبانہ حیدر کے ناول میں شینا کا کردار پڑھ کر عجیب لگا' اتنا بڑا حادثہ بھی اس کے غرور کی عمارت کو گرا نہ سکا۔ آخر میں عابدہ کا فیصلہ اچھا لگا۔ افسانوں میں سب سے زیادہ ملیحہ صدیقی کا افسانہ "شکایت گان" اچھا لگا۔ صبا نور کا افسانہ "کوئی بتلاؤ کہ" پڑھ کر حیرانی کا شدید ترین جھٹکا لگا اور پھر مجھے بھی دادی اماں کی اس بات سے اتفاق کرنا پڑا کہ واقعی دنیا سے شرم و حیا ہی اٹھ گئی ہے۔ غزلوں میں انشاء جی کی غزل مجھے بہت اچھی لگی اور دیگر سلسلے بھی ہمیشہ کی طرح بہت آئے۔

ج: پیاری تنزیل! عالیہ بخاری ہماری بہت اچھی لکھنے والی ہیں' ان کی تحریر کی نمایاں خصوصیت وہ تہذیب و اقدار ہیں جو معاشرے سے بڑی تیزی سے غائب ہورہی ہیں۔ ان کا ناول ہمیں بھی بے حد پسند ہے۔ نزہت شبانہ حیدر کے ناول میں شینا کا کردار عجیب نہیں تھا۔ دولت اور غرور و تکبر آنکھوں پر ایسا پردہ ڈال دیتا ہے کہ بڑے سے بڑا حادثہ آنکھیں نہیں کھول پاتا۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔ آمنہ ریاض کی قسط مختصر تھی' اس لیے بہت سے کردار سامنے نہ آسکے۔ اگلی اقساط میں آپ کی شکایت دور ہوجائے گی۔

مہر گل اورنگی ٹاؤن کراچی سے تشریف لائی ہیں' لکھتی ہیں

میں آپ سے سخت ناراض ہوں' یہ اور بات کہ "ہجوم دوستاں" میں ایک نامہ بر کے نہ آنے کی آپ کو خبر ہی نہ ہوئی۔ آپ یقیناً" سوچ رہی ہوں گی ناراض ہے تو رہے ناراض' خط نہ لکھے' تبصرہ نہ کرے' ہمیں اس سے کیا' مگر پھر بھی ہمارا آپ سے دل کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ ہمیں سردی بہت لگتی ہے' مگر یخ بستہ ٹھٹھرتی راتوں میں شعاع اور خواتین کو مکمل پڑھنے کی خاطر لوڈشیڈنگ میں گیس لائٹ کی روشنی میں صحن میں بیٹھے ٹھٹھرتے' کانپتے اسے پڑھتے رہتے ہیں اور اماں کی صلواتیں سنتے رہتے ہیں کہ برتن دھوتے تو سردی کے مارے ہاتھ پاؤں ٹوٹتے ہیں اور اب کیسی جم کر بیٹھی ہے آسمان کے نیچے اور تبصیر نشاط

صاحبہ! کیا یہ نام قلمی ہے' کیونکہ آپ شوبز پر نشاطیہ تبصرے کرتی ہیں' یا آپ کے والدین کو پہلے ہی الہام ہوگیا تھا۔ اور ایک بات اور بتائیے گا شعرالہند (تذکرہ) کس کی تصنیف ہے' نہ جانے یہ خط بھی اشاعت کی منزل تک پہنچ پاتا ہے یا نہیں۔ فرحت اشتیاق اور فائزہ افتخار کو ڈھیروں سلام' عفت آپی کہاں غائب ہیں۔

ج: پیاری مہر! آپ نے بالکل غلط اندازہ لگایا۔ ہم اپنی قارئین کے لیے یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ ناراض رہیں تو رہیں۔ خط نہ لکھیں ہمیں کیا۔ پرچا آنے کے بعد ہمیں بے چینی سے قارئین کے خطوط کا انتظار ہوتا ہے' تاکہ ان کی رائے جان سکیں۔ شعاع اور خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی جو تحریریں اب تک پڑھی جاچکی ہیں' ان کے لیے معذرت۔ ناولٹ رہ نورد شوق ابھی پڑھا نہیں گیا' پڑھ کر رائے دے سکتے ہیں۔

ثانیہ مشعل خویلی لکھا ضلع اوکاڑہ سے لکھتی ہیں

ٹائٹل پر تھوڑا سا مسکراتی ہوئی ماڈل اچھی لگی۔ ٹائٹل دیکھتے ہی "ستارہ شام" کی طرف دوڑ لگا دی۔ ثمینہ بیگم نے آخر کار اپنی مرضی کر ہی چھوڑی۔ پوری قسط میں انبیا لوگوں کا ذکر ہی نہیں تھا۔ اس کے بعد "دیوار شب" پڑھا۔ عالیہ جی ناول کو بہت ہی خوب صورتی سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ عالیہ جی! نبیل کا انجام بہت برا ہونا چاہیے' نزہت شبانہ حیدر کا ناول پڑھا۔ ٹاپک پرانا تھا' مگر نزہت جی نے بہت خوب صورتی کے ساتھ لکھا۔ "ضبط عشق" کے بارے میں تبصرہ محفوظ۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ "زرد رتوں کے" میں سلوی نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔ محبت میں شدت اچھی لگتی ہے' مگر اس قدر نہیں "صبح کا ستارہ" سائرہ عارف جی اینڈ میری توقع کے عین مطابق ہوا۔ افسانوں میں عنیقہ محمد بیگ کا افسانہ نمبر لے گیا۔ خط مختصر لکھنے کی وجہ میرا ٹیسٹ ہے۔

ج: پیاری ثانیہ! پڑھائی کی مصروفیت کے باوجود آپ نے ہمیں خط لکھ کر شعاع کے بارے میں اپنی رائے سے نوازا' بہت اچھا لگا' آپ کی اس محبت کے لیے شکریہ کا لفظ بہت کم ہے۔ ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے' شکریہ۔

مہوش کنول مشی جنڈانوالہ' بھکر سے تشریف لائی ہیں

شعاع میں "ستارہ شام" بہت خوب صورتی سے بڑھ رہا ہے' اس کے علاوہ نومبر کے رسالے میں "میری زندگی ہے تو" اچھی لگی' اس کے علاوہ ناولٹ' افسانے بھی بہت مزے کے ہوتے ہیں' میں نے شعاع کے لیے "اپریل فول" پر کہانی لکھی ہے۔ میں اسے بھیجنا چاہتی ہوں۔ حقیقت میں لوگوں کو گمراہی سے بچانے کی چھوٹی سی کوشش کی ہے۔ اور ایسا کرنے میں ہم اکثر اپنا نقصان کرلیتے ہیں۔

ج: پیاری مہوش! اپریل فول کا موضوع بہت پرانا ہوچکا ہے۔ اور اس پر کافی کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اگر آپ کچھ نئے انداز میں لکھنا چاہتی ہیں تو ضرور لکھیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

فروا سجاد نے ٹیکسلا کینٹ سے لکھا ہے

اس بار میرے خط لکھنے کی وجہ کوئی ناول ؟؟ جی نہیں' کوئی ناولٹ' ارے نہیں یا پھر کوئی شاہکار افسانہ جس کے لفظوں کی بنت نے میرے دل کے تاروں کو چھو لیا ہو تو بالکل نہیں' صرف اور صرف ٹائٹل۔ جی ہاں اس ماڈل کی معصومیت اور دل ربا اسٹائل نے مجھے بار بار ٹائٹل کو دیکھنے پر مجبور کردیا۔ آغا شیراز کا انٹرویو اچھا لگا۔ ان کی بیگم اور بیٹا بہت کیوٹ ہیں ان کی طرح' حیا بخاری کا افسانہ ٹھیک تھا۔ بانو قادری کا انتخاب بے مثال تھا' تاریخ کے جھروکے زبردست تھا' کس کس سلسلے کی تعریف کروں' فہد مصطفیٰ کا بندھن میں فیملی انٹرویو کا شدت سے انتظار ہے۔ راحت جبیں کی اسٹوری ہر ماہ شامل ہونی چاہیے۔

میرا خط شامل نہ ہوا تو (ڈریے مت) میں نے شعاع پڑھنا چھوڑ نہیں دینا بلکہ اور زور و شور سے پڑھنا شروع کردوں گی۔

ج فروا جی! ہمیں یقین ہے کہ آپ شعاع سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ اسے چھوڑ نہیں سکتیں' البتہ اس بات سے ضرور ڈر لگتا ہے کہ ہماری اتنی محبت کرنے والی پیاری قارئین کا دل نہ ٹوٹ جائے۔ اسی لیے کوشش کرتے ہیں کہ سارے خط شامل ہوجائیں یہ اور بات ہے کہ صفحات کی کمی کی وجہ سے ایسا نہیں ہوپاتا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ثمرانہ شمسہ انجم نے نامعلوم شہر سے لکھا ہے

جس طرح سورج کی شعاع ہر ذی روح کے لیے مفید اور کار آمد ہے۔ بالکل اسی طرح۔ شعاع بھی ہر لڑکی کی شخصیت کے لیے بہترین ہے، بلکہ بہت موزوں ہے۔ یہ شعاع جب بھی کسی لڑکی پر پوری آب و تاب سے چمکتی ہے تو اس کی شخصیت خود بخود نکھر جاتی ہے، مکمل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا مجھے اس کی قاریہ ہونے پر ہی فخر ہے۔ جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی کے مصداق ہر طبقہ فکر کی لڑکیاں اس سے مستفیض ہو سکتی ہیں۔ شعاع کے تمام سلسلے بہت دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت کار آمد بھی ہوتے ہیں۔

ج: ثمرانہ جی! بے حد شکریہ۔ آپ نے اتنے خوب صورت الفاظ میں شعاع کو سراہا۔ آپ کے تفصیلی تبصرے کے منتظر ہیں۔

نامعلوم شہر سے نورین آصف نے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

شعائع ڈائجسٹ ملا، ٹائٹل بہت بہت پیارا لگا۔ عنیقہ جی کا "دیوار" ہلکی پھلکی تحریر تھی۔ مگر اس میں مقصد بہت گہرا تھا۔ ویل ڈن عنیقہ جی۔ نعیمہ ناز جی میری بہت پیاری رائٹر ہیں۔ ہمیشہ اچھا لکھتی ہیں اور کمال کا۔ "ضبط عشق" مہوش افتخار نے بھی اچھا لکھا۔ رب کی مرضی اور کوئی بتلائے صبا نور کا سو سو لگا۔ البتہ دوسرا چہرہ راشدہ رفعت نے بہت متاثر کیا۔ غزل انشاء جی کی کیا بات ہے، آپی میں آپ کو اپنا ایک افسانہ بھیجنا چاہتی ہوں۔ مگر ڈر جاتی ہوں۔

ج: پیاری نورین! ڈرنے کی تو بات ہی نہیں ہے۔ ہم نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ہر ماہ ایک، دو نئے نام ضرور شامل ہوتے ہیں۔ آپ اپنی تحریر بھجوائیں۔ قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

شعائع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

مسرت الطاف احمد نے کراچی سے لکھا ہے

جنوری کا شمارہ کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ البتہ دونوں سلسلے وار ناولز ٹاپ پر رہے۔ "دیوار شب" کی یہ قسط تو اتنی زبردست تھی کہ کیا بتاؤں، اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ معاذ کا جویا کی مدد کے لیے آگے بڑھنا بہت اچھا لگا۔ آمنہ ریاض کا "ستارہ شام" کی یہ قسط بھی ہر بار کی طرح سپر ہٹ تھا۔ یہ ناول بے جا طوالت سے پاک ہے۔ مہوش افتخار کا ناول "ضبط عشق" کی پہلی قسط بہت سی الجھنوں کا شکار تھی، البتہ رائنہ اور عالم کی شادی کی وجہ سے ناول میں تھوڑی بہت جان آگئی اور زرمین کے کردار کی بالکل وضاحت نہیں کی گئی، نزہت شبانہ حیدر کا ناول "جس راہ چلے" اتنی دلچسپ تحریر نہیں۔ یہ ناول مجھے خاص متاثر نہ کر سکا، اس ناول میں مجھے کچھ تشنگی سی محسوس ہوئی۔ "میری صبح کا ستارہ" آخری قسط پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ "پرچھائیں" شروع میں تو بہت دلچسپ لگا، مگر اینڈ بالکل پسند نہیں آیا اور خاص طور پر جہانگیر کا نیگیٹو کردار بالکل دل کو نہیں بھایا، موضوع میں تو جان ہی نہیں تھی۔ "زرد رتوں کا پہلا پھول" اس ناول میں مجھے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی، ایسا لگا کہ پہلے بھی پڑھ چکی ہوں، تحریر پڑھتے ہی اندازہ ہو جائے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ ناول دل کو نہیں چھو سکا۔ اس بار ناولز سے زیادہ افسانے قابل تعریف تھے اور سب سے زیادہ ملیحہ صدیقی کا افسانہ "شکایت گان" تو اتنا زبردست تھا کہ کیا بتاؤں..... پڑھ کر بالکل فریش ہو گئے۔ ملیحہ نے کردار نگاری بہت ہی اچھے انداز میں کی۔ سائیڈ ہیرو کا کردار بہت ہی زبردست تھا۔ خاص طور پر اسٹائل اور بات کرنے کا طریقہ، سو ویل ڈن راشدہ رفعت کا افسانہ "دوسرا چہرہ" بہت ہی متاثر کن تحریر تھی، پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ "دیوار" بھی قابل تعریف تحریر تھی۔ اس بار سروے تو بہت ہی دلچسپ لگا۔ قارئین کی تحریریں پڑھ کر اچھا لگا۔ سروے پڑھ کر افسوس بھی بہت ہوا کاش میں بھی شمولیت اختیار کرتی۔

ج: پیاری مسرت! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کو جنوری کا شعاع پسند نہیں آیا۔ ہم اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ تنقید کے لیے معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ شعاع آپ کا پرچا ہے۔ اگر آپ کو اس میں کمی یا خامی محسوس ہوئی تو آپ کا حق ہے کہ نشان دہی کریں۔ ہم آپ کی رائے متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ثمر عامر لاہور سے لکھتی ہیں

آپی آپ سوچ رہی ہوں گی کہ ثمر گل حویلی لکھا ہے اب ثمر عامر لاہور سے کیسے تو یہ کہ آپ کی اس لکھاری کی شادی لاہور ہو گئی ہے۔ اس لیے شعاع میں غیر حاضر رہی۔ میں نے بڑی محنت سے لکھا گیا ایک ناول مئی میں بھیجا تھا، لیکن ہر ماہ کے انتظار کے بعد وہ شعاع میں نظر نہ آیا، نہ خط اقوال زریں۔ بہت مایوسی ہوئی۔ اس ماہ کا ٹائٹل پسند نہیں آیا۔ (معذرت کے ساتھ) "صبح کا ستارہ" کی آخری قسط اچھی لگی۔ نواز نے تو کمال کر دیا۔ "پرچھائیں" نعیمہ ناز کا بس ٹھیک ہی تھا۔ "زرد رتوں کا پہلا پھول" سمیرا گل میں سلوی کا کردار بہت پاور فل تھا۔ ناول "جس راہ چلے" اس میں واقعی ایک عورت کا ضبط دکھایا گیا۔ اس نے جو کیا بالکل ٹھیک کیا۔ "ضبط عشق" مہوش افتخار اتنا زبردست ناول اف لیکن اتنا سسپنس۔ ایسا لگتا تھا کہ میرا ذہن الجھ جائے گا، لیکن ناول کا الجھاؤ ختم نہ ہوگا اور ایسا ہی ہوا۔ ایک ماہ انتظار..... افسانے "دیوار" "رب کی مرضی" اچھے لگے۔ موسم کے پکوان میری پسند کے تھے۔ اس ماہ کا شعاع اتنا شان دار نہیں تھا۔ شاید آپ کو یہ بات اچھی نہ لگے اور میری فیورٹ رائٹرز ماہا ملک اور عمیرہ احمد کہاں غائب ہیں۔

ج: ثمر! ہماری جانب سے شادی کی مبارک باد قبول کیجیے۔ زندگی کا یہ نیا موڑ آپ کے لیے ڈھیر ساری خوشیاں لے کر آئے۔ (آمین)

ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو اس ماہ کا شعاع زیادہ پسند نہیں آیا، ہم اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

آپ کا ناول ہمیں موصول نہیں ہوا۔

الفت زہرہ ہراج تلمبہ خانیوال سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

ٹائٹل بہت پسند آیا شعاع کا معیار بے شک بہت اچھا ہے، اس کی تحریریں مجھے بہت پسند ہیں، پڑھائی اور گھر کی مصروفیت کے باوجود میں اسے باقاعدگی سے خرید کر پڑھتی ہوں، میرا بھائی احمد حسن ہراج میرے لیے شعاع خرید کر لاتا ہے اور خود بھی پڑھتا ہے۔ دیوار شب ناول زبردست جا رہا ہے۔ مگر اب اس کا خوشگوار سا اینڈ ہو جانا چاہیے۔ نزہت شبانہ حیدر کا ناول اچھا تھا۔ تاریخ کے جھروکے میرا پسندیدہ سلسلہ ہے اور میں اسے بے حد شوق سے پڑھتی ہوں، پلیز آپی اس کے صفحات زیادہ دیا کریں۔ نعیمہ ناز کا ناولٹ زبردست تھا۔ اس کے علاوہ باقی تمام سلسلے اچھے تھے۔ شاعری سچ بولتی ہے میں بانو ماہی قادری کا انتخاب اچھا تھا۔ بندھن میں آغا شیراز اور شب شیراز سے مل کر اچھا لگا۔

اب میں اپنے گاؤں کا تعارف کروانا چاہوں گی، میرے گاؤں کا نام دوؤ والا ہے، اس میں ہراج کاسٹ کے لوگ رہتے ہیں اور ماشاء اللہ تقریباً" سب ہی تعلیم یافتہ ہیں اور یہاں کی تقریباً" سب لڑکیاں ہی شعاع کی دیوانی ہیں، میرے گاؤں کے شمال میں آموں کا وسیع عریض باغ ہے اور اس کے ساتھ ایک نہر بھی ہے، جو بہت خوب صورت نظارہ پیش کرتی ہے۔ گاؤں کے قریبی قصبہ میں ضرورت کی ہر چیز با آسانی مل جاتی ہے، گاؤں میں پکی سڑک اور پکے سولنگ کے ساتھ ساتھ پکے نالے بھی ہیں۔ میرے گاؤں کے لوگ سادہ اور مخلص ہیں۔ گاؤں کے چاروں طرف سرسبز کھیت ہیں۔

ج: پیاری الفت! آپ کے گاؤں کے بارے میں جان کر بے حد خوشی ہوئی۔ خاص طور پر آم کے باغ اور نہر کا تصور ہی بہت خوب صورت ہے۔

آپ نے اپنے گاؤں میں تعلیم کی سہولت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ یہاں اسکول، کالج وغیرہ ہیں یا نہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ اپنے بھائی کا بھی ہماری جانب سے شکریہ ادا کریں۔ جو آپ کے لیے شعاع خرید کر لاتے ہیں۔

✲

عالیہ بخاری

دلِ وارستہ

خیام کا تعلق اس دُنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دلدار نانی نے اس کی پرورش بے حد نازو نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو ویڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اُٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ شہر آ کر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ نگینی آرا کی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھروسا ٹوٹ جانے کا دُکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایماندار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو رفاہی کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دُعاگو ہیں۔

دوسرا گھرانہ اظہار چچا کا ہے، جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کلرک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصا کما چکے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی امارات کی دُھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ربیعہ جبکہ حویا کی بات معاذ سے طے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر خاک ڈال دی ہے۔ چچا نے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زوبیہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ربیعہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ حویا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔
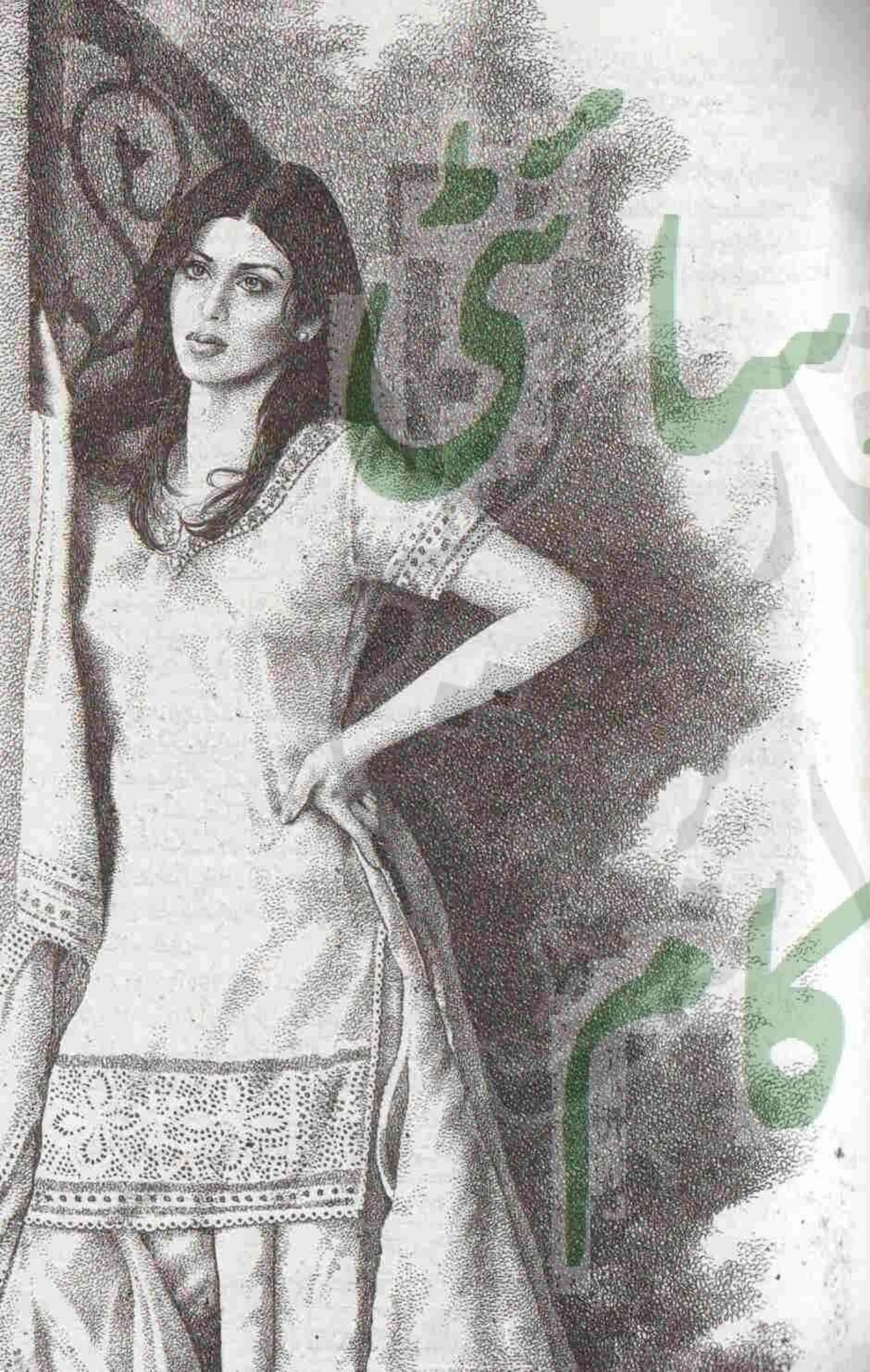
زرتاج بیگم کے بنگلے کو شہر بھر میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ مہینے کی پہلی جمعرات کو یہاں سے غریب عورتوں کو امداد دی جاتی ہے۔ خالہ افروز، سعیدہ اور بتول جیسی کتنی ہی عورتوں کے گھر اس امداد کے سہارے چل رہے ہیں۔ بوا عظمت، زرتاج بیگم کی خاص ملازمہ ہے، جو عرصۂ دراز سے اس کام کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ طبعاً سخت مزاج ہے۔

سلمان رفتہ رفتہ زوبیہ کی امارت سے متاثر ہو کر اس کے زیرِ اثر آجاتا ہے۔ زوبیہ اپنی من مانیوں سے ہر جائز و ناجائز ہر طرح کی خواہشات منوالیتی ہے۔ اظہار چچا، شاکرہ بیگم اور آپا گل سوائے تلملانے کے کچھ نہیں کر پاتے۔ ان کی تمام امیدیں زوبیہ کو ملنے والے بنگلے اور پیسے سے وابستہ ہیں۔

اسکول کے بچے ساجد کے معاملے پر معاذ پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے، جس سے وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ سلام صاحب کی پوری فیملی شدید کوفت اور پریشانی کا شکار ہوتی ہے۔ ربیعہ اس معاملے کے بعد معاذ سے اسکول کے معاملات سے علیحدگی چاہتی ہے۔ اظہار چچا خاندان مع سوائے جویا اور زوبیہ کے اس حادثے سے خوب حظ اٹھاتا ہے۔ جویا چاہتے ہوئے بھی معاذ کے لیے کچھ کر نہیں پاتی۔

دلدار نانی کے چوبارے کی رونق دن بدن بڑھتی جارہی ہے جس پر نگینہ آئے دن جلتی کڑھتی رہتی ہے۔ شاما ہر موقع پر اس کی اشک شوئی کرتی ہے۔ نگینہ کی تمام امیدیں اپنی بڑی بیٹی صندل سے وابستہ ہیں۔ گیتی زیادہ تر پڑھائی کی وجہ سے معاملات سے الگ ہی رہتی ہے۔ لیکن خیام کی یاد اس کے خیالوں کی دنیا کو آباد رکھتی ہے۔ ستارہ نانی کے یہاں سالار کی آمدورفت اسے قدرے بے چین کرنے لگتی ہے۔

خیام کچھ عرصے بعد ہی ایک لس مردس کمپنی میں معمولی نوکری کر لیتا ہے۔ دن رات اپنوں سے دوری اسے بھی ستاتی ہے۔ خاص کر گیتی کی چوڑی اسے ملال کی کیفیت سے دوچار رکھتی ہے۔ بدنامی کا خوف اسے کسی کے قریب نہیں ہونے دیتا۔ صرف بابو شوکت سے اس کی اچھی دعا سلام ہے کہ اچانک تمام تر احتیاط کے باوجود گھر سے لائے زیورات کی چوری ہو جاتی ہے۔ یہ زیورات اس کے مستقبل کی ضمانت تھے۔ اس کے بعد مستقبل پر ایک سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

زرتاج بیگم اپنے کلاس کی دیگر عورتوں کی طرح خودنمائی اور خودستائشی کا شکار ہیں۔ بیٹا عرصے سے باہر مقیم ہے۔ انہیں لباس کی طرح سکریٹریز بدلنے کی عادت ہے۔ حالیہ سیکریٹری نبیل سے ان کا "تعلق" ہر کسی کی نظر میں ہے۔ نبیل جیسے ڈرائیور الطاف کی مدد سے یہ نوکری ملی ہے۔ زرتاج بیگم کی دریا دلی سے بھرپور استفادہ کر رہا ہے۔ بوا عظمت اسے کڑے تیوروں کی زد میں رکھتی ہے، جس پر وہ خاصا جز بز ہوتا ہے۔ زرتاج بیگم کے بھائی یوسف کمال، نبیل کی عیار فطرت کو پہچان کر انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جسے زرتاج بیگم چٹکیوں میں اڑا دیتی ہے۔

زیورات کی چوری کے بعد سے خیام کے برے دن شروع ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی نوکری ختم ہونے سے وہ پیسے پیسے کو محتاج ہونے لگتا ہے۔ بابو شوکت کا بیٹا خیام کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کرتا ہے۔ ایسے وقت میں بابو شوکت اس کی ہمت بندھاتے ہیں۔ لیکن گھر کی یاد اسے بے چین رکھتی ہے۔ خاص طور پر گیتی کی چوڑیاں اسے یاد کی ڈور سے باندھے ہوئے ہیں۔

گھر میں جویا کے رشتے کی بات چل رہی ہے جس پر جویا، آپا گل سے بحث کرتی ہے۔ آپا گل کی لایعنی باتوں پر وہ براہ راست اپنے ماں باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اسے معاذ کے ارادوں کی سچائی کا پختہ یقین ہے۔ دوسری طرف آپا گل کے شوہر اکبر اپنے اثرو رسوخ سے معاذ کو ملنے والی نوکری کسی اور کو دلوا دیتے ہیں۔ معاذ اس بات کا تذکرہ اپنے والد سے کرتا ہے تو وہ اسے معاذ کا وہم سمجھتے ہیں۔ سلمان، زوبیہ کے گھر میں شفٹ ہو چکا ہے اور شاذونادر ہی ماں باپ کو شکل دکھاتا ہے۔ جس پر شاکرہ بیگم اور اظہار صاحب پریشان رہتے ہیں۔

جویا کا رشتہ آناً فاناً طے ہو جاتا ہے جس میں اظہار چچا، آپا گل اور شاکرہ بیگم کی "کوششیں" شامل ہیں۔ شاکرہ بیگم کو طلاق کی دھمکی اپنا کام دکھاتی ہے۔ اور جویا کی تمام مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔ معاذ کی نوکری اور جویا کے رشتے کی خبر ایک ساتھ ملتی ہے۔ وہ گم صم سا ہو جاتا ہے۔ جویا کے رشتے پر دادی، چچا اظہار کے خاندان سے قطع تعلق کا اعلان کر دیتی ہیں۔ زوبیہ، جویا کو اکساتی ہے کہ اگر وہ چاہے تو رشتہ ختم کروانے میں مدد کر سکتی ہے۔ زوبیہ، آپا گل اور شاکرہ بیگم کو نیچا دکھانا چاہتی ہے تاہم جویا ایسا کرنے سے منع کر دیتی ہے۔

صندل کو بالی صاحب کی فلم دنوں میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے۔ ایسے میں اسے ماں نگینہ کے طور طریقے کھٹکتے ہیں۔ وہ اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیتی ہے تو نگینہ کو دھچکا لگتا ہے تاہم وہ نانی ستارہ کو اس کا علم نہیں ہونے دیتی۔

۴۸

اڑتالیسویں قسط

سالار کمرے سے باہر نکلا، تو وہ سامنے ہی منتظر تھی۔ انیکسی کی سیڑھیوں پر اکیلی بیٹھی ہوئی۔ سالار کو آتا دیکھ کر وہ تیزی سے اٹھ کر اس کے قریب آئی۔

"کیسی طبیعت ہے اب راجو بھائی کی؟"

"بہتر ہے۔" ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے سالار نے گیتی کے فکر مند چہرے کو دیکھا۔ "ڈاکٹر دیکھ کر گئے ہیں، کہتے ہیں گہرا صدمہ ہے اور ظاہر ہے وہ تو ہے، بہت زیادہ محبت کرتا تھا راجو روزی سے۔ اس کی نیم دیوانگی کی حالت تم نے نہیں دیکھی۔ یہ تو اب کہیں جا کر کچھ نارمل ہوا تھا، تو پھر سے اتنا بڑا دکھ....."

گیتی کے کندھے پر ہاتھ رکھے وہ آہستہ آہستہ چلتا انیکسی کی سیڑھیوں پر آکر کھڑا ہوا۔

"روزی کی اس طرح بے بسی کی موت نے تو خود مجھے اندر تک ہلا کر رکھ دیا ہے گیتی! بہت چھوٹی سی ہمارے گھر آئی تھی۔ بے ماں باپ کی یتیم بچی ہماری ذمہ داری تھی وہ میں تو خود کو گناہ گار سمجھ رہا ہوں۔ اللہ مجھ کو اس غفلت پر معاف فرمائے۔"

سالار کی آواز میں بار بار نمی اتر رہی تھی۔ پچھلے تین دن سے وہ روزی کی موت کی اطلاع کے بعد بہت خاموش اور دکھی تھا۔ اس کی مہربان فطرت اور حساس دل کا اندازہ گیتی سے زیادہ بھلا کس کو تھا۔ بنا رتبہ، مرتبہ، محض انسان کو عزت دینے والا، کسی کے بھی دکھ اور تکلیف کو اپنے اندر اتارتا۔ انسانیت کی اعلا مثالیں قائم کرنے والا، سچا، مخلص اور پیارا شخص۔

"اور اگر وہ ایسا نہ ہوتا تو خود وہ کہاں ہوتی۔" گیتی کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔

"آؤ! تھوڑی دیر یہیں بیٹھتے ہیں۔"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر وہیں سرخ پتھروں کی ٹھنڈی صاف سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

"آپ خود کو سنبھالیں سالار! آپ کمزور پڑنے لگے تو راجو بھائی بالکل ہی ہمت ہار جائیں گے، کون انہیں سنبھال سکتا ہے آپ کے علاوہ، پلیز! اللہ ظالموں کو سزا ضرور....."

سالار کے ہاتھ کو تھامے وہ بڑی نرمی سے اسے تسلی دیے گئی۔ سالار نے اسے درمیان میں ایک بار بھی نہیں ٹوکا چپ چاپ سر جھکائے سب سے نیچے کے پتھروں کو تکے گیا۔ اور جب وہ خاموش ہوئی تو.....

"روزی بہت پیاری اور معصوم تھی گیتی! رنگ برنگے کپڑے پہننے، تیار ہونے کی شوقین رنگوں سے بھری لڑکی۔ عظمت بوا اسے ہر وقت ڈانٹتیں مگر وہ ہنستی ہی رہتی۔ میں بہت کم دنوں کے لیے آتا تو اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں ہوتا، سالار بھائی، سالار بھائی کرتی آگے پیچھے گھوما کرتی تھی۔ محبت والی، خدمت گزار کس درندگی کا شکار ہوئی، وہ بھی یہاں اس گھر میں....."

بڑے مضطرب انداز میں اس نے اطراف میں اشارہ کیا۔

"میرے لیے اب حقیقت کو جاننا بے حد ضروری ہے۔ ایک بے گناہ انصاف طلب ہے گیتی!"

"پولیس نے انکوائری شروع کر دی ہے نا سالار! آپ کے ذاتی دوست ہیں وہ آفیسر۔ دیکھیے گا، بہت جلد کوئی نتیجہ نکلے گا۔ اللہ پر بھروسا رکھیں۔"

"اسی پر بھروسا ہے اور اپنے لیے عمل کی توفیق کی دعا بھی اس کے حضور ہے کہ جو میرے حصے کا کام ہے، وہ میں ضرور کر لوں۔" سامنے سبزہ زار پر نگاہ دوڑاتے سالار کے لہجے میں آہستہ آہستہ وہی مضبوطی اترنے لگی، جس کی گیتی منتظر تھی۔

"میں راجو بھائی کے لیے سوپ بنا لیتی ہوں اور کچھ کھانے کے لیے بھی!"

اطمینان کا سانس لیتے ہوئے وہ اٹھنے لگی لیکن سالار نے اس کا ہاتھ ابھی بھی تھام رکھا تھا۔

"تم بہت اچھی ہو گیتی! اور میں بہت خوش قسمت کہ تم میری زندگی کا حصہ ہو' بلکہ میری زندگی ہی....." وہ بہت محبت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا گیتی کے لیے ایسے ہر لمحے میں اس کی طرف دیکھنا محال ہوا تھا۔

"جانے دیں سالار! مجھے کھانا بنانا ہے! راجو بھائی اٹھتے ہی ہوں گے۔"

سالار نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا ہاتھ چھوڑا۔

"میں بھی دیکھتا ہوں' کیا خبر اٹھ ہی گیا ہو' دواؤں کا اثر ہے ورنہ نیند کہاں آرہی ہے اسے۔" وہ اس کے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہوا۔

گیتی سیڑھیاں اترنے لگی تھی کہ کچھ یاد آیا۔

"ایک بات کرنی تھی آپ سے!"

"ہاں' بولو!"

سالار نے اس کے چہرے پر آئی کش مکش کو فوری نوٹ کیا تھا "کیا بات ہے' کوئی پریشانی؟" اس نے قریب آتے ہوئے نرمی سے گیتی کے چہرے کو چھوا۔

"مجھے پتا ہے کہ آپ بہت اپ سیٹ ہیں آج کل' میں آپ کو اور پریشان نہ کروں' لیکن....."

"اوں ہنہ۔" سالار نے مصنوعی ناراضی اختیار کی۔

"ہمیں ایک دوسرے سے کچھ شیئر کرنے کے لیے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے گیتی! یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا!"

گیتی کے چہرے پر دل فریب سی مسکراہٹ ابھری۔ وہ اسی طرح بہت سادگی سے' اسے تحفظ کے گہرے احساس سے دوچار کرتا تھا۔

اس زندگی میں اب قدم قدم پر سجدۂ شکر واجب ہونے لگا ہے یقیناً"۔

"بتاؤ نا' یا یہیں کھڑا رکھو گی شام تک!" وہ جھنجلایا۔

حالانکہ جو بات وہ اس سے کہنے جارہی تھی ذرا بھی خوشگوار نہیں تھی' مگر وہ اس کے بے ساختہ انداز پر کھل کر مسکرائی تھی۔

"جانے دیں' آپ نے تو بات ہی ختم کردی!" وہ مڑنے لگی تھی' مگر اس کا ہاتھ سالار کی گرفت میں تھا۔

"لاہور میں' کوئی پریشانی ہے کیا' نانی' نگینہ آنٹی ٹھیک تو ہیں نا۔" سالار کو فطری طور پر اس کی پریشانی کا سرا وہیں کہیں ملتا ہوا محسوس ہوا تھا بات تھی بھی کسی حد تک ٹھیک۔

صندل کی بدمزاجی اور اس کا پچھلے کئی دن سے نانی ستارہ کے ہاں کا قیام' گیتی کو پریشان رکھے ہوئے بھی تھا لیکن یہاں اتنے بڑے ایشوز موجود تھے کہ' اس نے سالار سے اس پریشانی کا تذکرہ بھی مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"بات وہاں کی نہیں ہے سالار! مجھے زرتاج آنٹی کے رویہ نے پریشان کررکھا ہے۔ بہت ڈر لگنے لگا ہے مجھے ان سے' اتنی نفرت سے دیکھتی ہیں اور مخاطب بھی کرتی ہیں تو ان کا لہجہ اتنا سرد ہوتا ہے کہ میرا تو دل ہی بیٹھنے لگتا ہے۔"

جب وہ بہت دھیمے لہجے میں بول رہی تھی تو اس کی خوب صورت آنکھوں میں پھیلا ہوا خوف اس کی بات کی تائید کررہا تھا۔

سالار نے بے ساختہ ہی اسے خود سے قریب کیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں ان سے ڈرنے کی' اصل میں وہ زندگی میں پہلی بار خائف ہوئی ہیں' اس سے پہلے برسوں سے مکمل حکمرانی کے مزے لے رہی تھیں' اب حکومت بدل رہی ہے تو واویلا تو ہوگا نا..... تم بالکل فکر مت کرو' میں ہوں نا۔"

ہلکے پھلکے سے انداز میں دی گئی تسلی کارگر ثابت ہوئی' وہ وہیں کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھے گیا۔

زرتاج جیسی زہریلی عورت سے گیتی کا خوف کھانا سمجھ میں آتا تھا۔

تو وہ بھی تو کتنے ہی سالوں ان کا سامنا تک کرنے سے گھبراتا رہا تھا۔ بچپن میں تو اس کی جان نکلتی تھی' ان کی آواز پر بھی!

ایک چھوٹے سے پل میں وہ کہیں سے کہیں پہنچا۔ بچپن سے نوعمری کا وہ دردانگیز دور' سرد تاریک راتوں میں باہر گزرنے والی راتیں' ٹرین کے بلا ٹکٹ دل دھڑکاتے سفر اور کئی کئی اوقات پر محیط ہوتے فاقے۔

سخت سردی میں' بھوک کتنی اذیت ناک ہوتی ہے۔ وہ آج تک نہیں بھول سکا تھا۔

سر کو ہلکے سے جھٹک کر اس نے خود کو اس تکلیف دہ احساس سے الگ کیا اور تیز قدم اٹھاتا راجو کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

زرتاج بیگم نے لاؤنج کی کھڑکی سے اسے اس سمت آتے ہوئے دیکھا تھا۔

"تو سالار ابھی انیکسی میں ہی ہے اور وہ بدبخت راجو بھی!" درختوں میں گھری انیکسی کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے خود کو یقین دلایا۔ اور وہ اور نبیل پرلے درجے کے بے وقوف' جو یہ فرض کیے بیٹھے تھے کہ وہ راجو کو لے کر کسی ہاسپٹل وغیرہ میں شفٹ کرگیا ہے۔ "کہاں تو پہلے سالوں شکل نہیں دکھاتا تھا اور اب اس طرح جم کر بیٹھا ہے' جیسے کبھی گیا ہی نہیں تھا۔"

زیرلب بڑبڑاتی وہ لاؤنج کے وسط میں آکھڑی ہوئیں۔

"اوپر سے یہ راجو' روزی کے ساتھ ہی مر مرا جاتا تو جان چھٹتی ساتھ ہی۔"

گیتی لاؤنج میں داخل ہورہی تھی۔ سو ان کی ساری توجہ' اس پر مبذول ہوئی۔

"تم کہاں سیریں کرتی پھر رہی ہو آخر؟"

اس کی دل کشی مرعوب کرتی تھی' سو وہ تھوڑا سا رخ بدل کر بات کرنے لگی تھیں۔

"راجو بھائی کی طبیعت پوچھنے گئی تھی آنٹی!" دھیمے سے لہجے میں کہتے ہوئے' وہ کچن کی طرف جانے لگی تھی۔

زرتاج کو اس کا یہ پرسکون انداز ہی بری طرح مضطرب کرتا تھا۔ ایسا لگتا جیسے وہ جان بوجھ کر چڑا رہی ہے۔ چیلنج کررہی ہے..... کہ یہ سب کچھ میری دسترس میں' جو چھین سکتی ہو تو چھین کر دکھادو! انہیں خوب صورت عورتوں سے ہمیشہ نفرت رہی تھی اور گیتی سے اور بھی کہیں زیادہ۔

"غیر مردوں کی تیمارداری کے لیے تمہارا جانا ضروری ہے کیا؟" زہریلا سرد لہجہ۔ گیتی کا اٹھتا ہوا قدم وہیں تھما تھا۔

"اس عورت کی ذہنی پستی کی انتہا پتا نہیں کہاں تک جاتی تھی!"

ابھی ابھی سالار کا بخشا ہوا اعتماد نہ ہوتا تو شاید وہ فوری طور پر ایسا سمجھ داری بھرا تجزیہ کر بھی نہیں پاتی۔

"اس پاگل خبطی کو کیوں سر پر چڑھا رکھا ہے تم نے' جو ہمارے گھر کی بدنامی' سارے زمانے میں کرنے پر تلا ہے۔ کیوں ہے اتنی ہمدردی تمہیں' جو دوڑ دوڑ کر وہاں اس سے اکیلے میں.....؟"

گیتی کی خاموشی ہی' زرتاج کو بے تکان بولنے پر مجبور کررہی تھی۔ چن چن کر وہ الفاظ جو کسی کو زیادہ سے زیادہ تکلیف دے سکیں۔

وہ ہسٹریکل ہورہی تھیں۔

"بولتی کیوں نہیں' مجھے پاگل سمجھا ہے' جو میں اتنی بکواس کررہی ہوں۔" وہ حلق کے بل چلائیں۔

گیتی نے بے تاثر سے انداز میں زرتاج کی طرف دیکھا اور پرسکون انداز میں کچن کی طرف مڑ گئی۔

کسی ایک بات کا جواب نہیں۔

نہ وہ جھنجلائی نہ صفائی دی اور نہ ہی کوئی ایک آنسو اس کی آنکھ میں چمکا، حد تو یہ کہ آج وہ ان سے خوف زدہ بھی نہیں تھی۔

اس کا مکمل اطمینان زرتاج کے منہ پر بھاری تھپڑ کی طرح پڑا تھا۔

بہت طیش میں آکر وہ کچن کی طرف بڑھی تھیں۔ مگر کوئی بروقت آیا تھا۔

"حماقت پر حماقت، کیا ہو گیا ہے تیری عقل کو زرتاج اتنی کمزور تو پہلے کبھی نہیں تھی، کیوں رہی سہی عزت کھونے پر تلی ہے!" سامنے لگے قد آدم شیشے میں دکھائی دیتا عکس ان سے مخاطب تھا۔

قیمتی لباس، گلابی رنگت اور کرختگی کی چھاپ والی پختۃ العمر عورت، جس کے چہرے پر بڑھتی عمر کے گریس اور نرم احساس کا سایہ تک نہیں تھا۔ اب بار بار سامنے آنے لگی تھی اور اس کے سامنے کھڑے رہنا دشوار تر ہو رہا تھا۔

زرتاج نے ایک اجنبی سی نگاہ اس عورت پر ڈالی اور دوسرے ہی لمحے ایک جھٹکے سے مڑ کر تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

نبیل کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

"ایسے کہاں جا سکتا ہے وہ، زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا ہے، تم سے ایک آدمی نہیں ڈھونڈا جا سکتا، اس لیے پال رکھا ہے میں نے تمہیں۔"

زرتاج نے اندر آتے ہوئے اسے کسی سے کہتے ہوئے سنا۔ وہ اس کی طرف سے پشت کر کے کھڑا تھا اور اتنا پریشان تھا کہ اسے زرتاج کی آمد کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔

"کہیں تو ہو گا نا، اس شہر میں نہ سہی، اس ملک میں، اس دنیا میں.... یا پھر۔"

ذرا رک کر اس نے دوسری طرف کی بات سنی تھی۔

"اور اگر وہ ملک سے باہر جا چکا ہے تو اس سے کہو کہ ابھی واپس آنے کی ضرورت نہیں ہے، بیٹھا رہے دو چار سال وہیں، جتنا پیسہ چاہیے، وہ میں اسے دے دوں گا اور اگر یہاں ہے تو اسے فوراً باہر بھیج دو، جہاں کا بھی فوری ویزا ملے۔"

بات ختم کر کے وہ فون آف کرتا ہوا مڑا تھا کہ پیچھے کھڑی زرتاج کو دیکھ کر بری طرح چونکا۔

"تم کیا کر رہی ہو یہاں؟" اس کی آواز قدرے اونچی تھی زرتاج نے اس کی گھبراہٹ کو بخوبی محسوس کیا تھا۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا، میرا کمرا، میرا گھر، میں کچھ بھی کروں نہ کروں۔" وہ بگڑ کر اس سے بھی اونچی آواز میں بولیں۔

"تم یہ کس سے بات کر رہے تھے، کون ہے کھویا ہوا جس کی تلاش اتنی ضروری ہے، سچ سچ بتاؤ نبیل! جھوٹ مت بولنا مجھ سے۔" وہ اس کے بالکل قریب آکھڑی ہوئی تھیں۔

اور جب وہ اس طرح آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھتی تھیں تو ان کی ایکسرے کرتی نگاہوں سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہتا تھا۔

نبیل کئی بار اس تجربہ سے دوچار ہوا تھا، مگر سچ کو جھوٹ کے ساتھ خلط ملط کرنا ضروری تھا۔ خود اس کی اپنی بقا کے لیے۔

"دوست ہے میرا پرانا، ضروری کام ہے کچھ اس سے۔" وہ نگاہ چراتے ہوئے مڑا تھا۔

"ایسا دوست، جس کو تم یہاں اس شہر میں دیکھنا ہی نہیں چاہتے، کیوں؟" وہ اس کے پیچھے سرد آواز میں پوچھ

نبیل کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ہمیشہ کی طرح صرف پہلا جھوٹ آسان تھا۔

"تمہارا وہ دوست، وہی ڈی ایس پی تو نہیں، جس کی تلاش آج کل پولیس ڈپارٹمنٹ کر رہا ہے، روزی کے کیس کے سلسلے میں۔" وہ اتنی پریقین تھیں کہ نبیل نے اپنے سارے الفاظ سارے بہانے کھوتے ہوئے محسوس

وہ گھوم کر پھر اس کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔

"مجھے پہلے دن سے ہی شک تھا، مگر تم ایکٹر اچھے ہو، اس لیے مجھ جیسی عورت بھی دھوکا کھا گئی۔"

نبیل پیروں تلے زمین کھسکنے کے تجربے سے دوچار ہونے لگا تھا۔ وہ برا پھنسا تھا اور آج شاید اس گھر میں اس کا آخری دن تھا۔

"میں شرمندہ ہوں زرتاج! بہت بڑی غلطی ہوئی مجھ سے۔" نبیل کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی اور اگر وہ نگاہ اٹھانے کی ہمت کر لیتا تو زرتاج کے چہرے پر پھیلے متضاد تاثرات کو دیکھ پاتا۔

"سب سے بڑی غلطی تم نے مجھ سے اصل بات چھپا کر کی ہے نبیل! ورنہ حالات اتنے نہ بگڑتے، میرے لیے اس بات کو پہلے ہی مرحلے میں دبا دینا اتنا مشکل نہیں تھا، مگر اب....."

نبیل کو ان کی فکر مندی پر حیرت ہوئی تھی۔ وہ سمجھا تھا کہ وہ اس پر چیخیں گی چلائیں گی، پولیس کے حوالے نہ سہی، گھر سے تو فوراً ہی نکال باہر کریں گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

ان کا یہ پہلا ری ایکشن خاصا تسلی بخش رہا تھا۔ ایک دبی دبی سی سانس نبیل نے اپنے اندر اتاری۔

"مشکل کی یہ گھڑی ٹلے تو وہ آئندہ زندگی بھر اتنا غیر محتاط نہ ہو۔" دل ہی دل میں اس نے وہ ارادہ باندھا، جس کے پورا کرنے میں وہ خود بھی پریقین نہیں تھا۔

"تم نے خود کو بری طرح پھنسا لیا ہے اور تم میں اتنا بھی حوصلہ نہیں ہے کہ پولیس کی انکوائری کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہی ہو سکو، جو بھی کرنا ہو گا، مجھے ہی کرنا ہو گا، اب چاہے کتنا ہی پیسہ خرچ ہو۔"

بہت دنوں سے اعصاب کو شل کرتا بوجھ نبیل کے اوپر سے ہٹا۔

"ہمارے طبقے کی عورت کے لیے مرد کی آوارگی معمول کا قصہ ہے۔" بے تاثر سے لہجے میں کہتے ہوئے، بیگم زرتاج نے کسی گزری کہانی کو یاد کیا۔

✻ ✻ ✻

گروسری شاپ سے سامان کے دو شاپر اٹھا کر گھر تک لاتے ہوئے وہ خاصی تھکی تھی۔

آج اسکول سے تنخواہ ملی تھی۔

سارا دن کی مصروفیت کے بعد چھٹی کے وقت یہ دال، چاول، چینی، گھی، مسالوں والی شاپنگ، کچھ ایسی خوش گوار تو نہ تھی، مگر کرنی پڑی، پچھلے کئی ماہ سے وہ اسکول سے ملنے والی پوری تنخواہ گھر لے جانے سے کترانے لگی تھی مگر اکٹھے ملنے والے یہ چند ہزار روپے، پہلے ہی دن، سلمان کی فضول خرچی کی نذر ہو کر اس بے دردی سے اڑتے کہ سارے اہم ترین خرچے یوں کے یوں ہی دھرے رہ جاتے تھے، آگے کوچنگ سے ملنے والے پیسوں اور محلے کی دکان کے ادھار کا آسرا ہوتا۔

سب سے زیادہ کوفت جویا کو تب ہوتی جب وہ محض چند سو یا ہزار کے ایک نوٹ کے لیے شاکرہ امی کو، آپا گل کی خوشامد کرتے دیکھتی۔

سواب وہ تنخواہ کے ملتے ہی گھر کا ضروری سامان خریدنے لگی تھی۔ یہ آئیڈیا بھی زویا کا تھا اور عمل درآمد بھی اس نے زور دے کر کروایا تھا۔

شاکرہ امی اور سلمان دونوں ہی کو سخت اعتراض تھا۔

اوپر جانے والا سیڑھیوں پر کھلتا ہوا گیٹ نیم وا تھا۔

ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے جویا نے دونوں شاپرز آخری سیڑھی پر رکھ کر اپنی ہمت کو مجتمع کیا۔

اوپر سے سلمان کے بولنے کی آواز یہاں تک آرہی تھی اور آج وہ بے حد خوش گوار موڈ میں تھا۔ اس کا اندازہ یہیں سے جویا کو بخوبی ہوا تھا۔

"شاید زوبیہ کی طرف سے اسے کلیئرنس سرٹیفکیٹ موصول ہوا ہو۔" پہلا خیال جویا کو یہی آیا۔

مگر ایسا بھی نہیں تھا۔

"واہ آپا گل! مزا آگیا' بڑی مدت بعد اتنی لذیذ بریانی کھائی' ورنہ یہاں تو گنتی کی بوٹیاں اور چاول ڈال کر بس بریانی کی رسم ہی پوری کی جاتی ہے' پر آج تو آپ نے ساری شکایتیں ہی ختم کردیں۔"

وہ سیڑھیاں چڑھ کر صحن میں آئی تھی' جب اس نے سلمان کی چہکتی ہوئی آواز سنی۔

فضا میں بریانی کی لذیذ مہک' سلمان کی خوشی کی اصل وجہ کی تصدیق کررہی تھی۔

جویا کے چہرے پر تلخ سی مسکراہٹ ابھری اور معدوم ہوئی۔

"لاؤ باقی اٹھا کر رکھ دوں' رات کو کھالینا' تمہارے لیے تو کافی ہوگی۔" اس نے آپا گل کو کہتے ہوئے سنا۔

وہ لوگ شاکرہ امی والے کمرے میں تھے' جویا کا وہاں جانے کو دل تو نہیں چاہ رہا تھا' لیکن پھر بھی.....

"السلام علیکم۔"

دروازے میں سے جھانک کر اس کے مشترکہ سلام کے جواب میں بڑی معنی خیز سی خاموشی چھائی تھی۔

آپا گل منہ موڑ کر بریانی کی ڈش پر پلیٹ ڈھکنے لگیں۔ پتا نہیں وہ اس سے کیا چھپانا چاہ رہی ہیں۔

بریانی کو یا خود کو۔

دل میں آئے بے ساختہ خیال کو جھٹک کر اس نے باقی ماندہ پیسے شاکرہ امی کے ہاتھ میں دیے اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

"پھر آگیا مہینے بھر کا دال چاول والا لنگر' معلوم نہیں کس جرم کی ہم سب سزا بھگت رہے ہیں۔" اس نے سلمان کو اپنے پیچھے کہتے سنا اور پھر آپا گل کو۔

"بہت ہی خود مختار ہوگئی ہے' لڑکیوں کا پیر گھر سے نکل جائے تو سمجھ لیں کہ وہ ہاتھ سے بھی نکل گئیں اور یہاں تو کتنے ہی ثبوت مل چکے ہیں' منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔"

سامنے چھوٹے سے کچن تک ان کی بلند آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

رشتوں کے بیچ محبت' احترام اٹھے تو مدت گزر چکی تھی۔ اب تو ایک اعلانیہ بائیکاٹ تھا' جس کے بارے میں شاکرہ امی اور سلمان کی تائید کے ساتھ آپا گل نے اسے باقاعدہ بتا بھی دیا تھا۔

"لڑکی ذات ہو' نکال بھی نہیں سکتے' ورنہ کسر تو تم نے کوئی چھوڑی نہیں ہے ہماری بدنامی میں' بہتر ہوگا اب ہمارے حال پر رحم کرو' اپنے سیر سپاٹوں میں کمی نہیں کرسکتیں تو نہ کرو' مگر ہمیں اپنی شکل نہ دکھایا کرو تو بہتر ہو۔"

جوش جذبات میں بھی انہوں نے محض شکل نہ دکھانے کی ہی سزا سنائی تھی۔ سیر سپاٹوں پر پابندی نہیں لگائی تھی۔ انہیں یاد رہا تھا کہ جویا کے سیر سپاٹے ہی گھر کی گاڑی کھینچنے کا وسیلہ بنے ہوئے ہیں۔

حالانکہ اس روز اس کا دل بڑی شدت سے خواہش مند ہوا تھا کہ وہ اسے گھر سے باہر قدم نکالنے پر ٹانگیں توڑ

دینے کی دھمکی دے کر اسے ہمیشہ کے لیے گھر میں بٹھا دیں۔

وہ کبھی باہر نہ نکلے۔ باہر کی دنیا سے اس کا ہر رابطہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جائے۔

وہ دنیا جہاں معاذ رہتا ہے۔

جہاں ہر گھڑی اس کا سامنا ہوجانے کا دھڑکا بھی لگا رہتا ہے اور امید بھی سر اٹھاتی ہے۔

اس نے اسٹیل کے سنک پر پانی کی پوری دھار کھلی چھوڑی۔

ایک بے ہنگم سا شور اندر سے آتی ساری آوازوں کو دبانے لگا۔ وہ چند لمحے یوں ہی ساکت کھڑی رہی' پھر نل بند کرکے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

زویا سو رہی تھی' ورنہ ابھی اس کی اتری ہوئی شکل دیکھ کر لیکچر شروع کردیتی۔

آج کوچنگ سینٹر میں اتفاقیہ چھٹی تھی۔ سو وہ کپڑے بدل کر زویا کے برابر آلیٹی۔ زندگی اتنے بے ڈھب انداز میں گزر رہی تھی کہ یہ چھوٹی سی آسانی بھی بڑی عافیت بھری تھی۔ جویا نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو دھیرے سے بند کیا۔

دوسرے کمرے سے آتی آوازیں یہاں تک دھیمی پڑنے لگی تھیں۔ اور خود اس نے بھی اپنا دھیان ہٹانے کی پوری کوشش کی تھی۔ دوپہر میں سونے کی عادت مدت ہوئی ختم ہوچکی تھی' پھر بھی اس نے چاہا تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے سو ہی جائے' مگر خالی پیٹ یہ چھوٹی سی آسانی بھی ہاتھ نہیں آرہی تھی۔

تب ہی کسی نے زور سے دروازے پر ہاتھ مارا۔

"چار بج گئے ہیں۔"

آپا گل نے ناحق ہی اپنے ہاتھ کو تکلیف دی تھی' ورنہ ان کی پاٹ دار آواز کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں تھی' جویا خاموش لیٹی رہی۔

انہوں نے جھنجلا کر دوسری بار پہلے سے بھی زیادہ زور سے دروازہ بجایا' مگر وہ پھر بھی خاموش رہی۔

اسے پتا تھا کہ وہ اندر تک آنے اور اسے مخاطب کرنے کی غلطی کبھی نہیں کریں گی کہ اپنی انا کے بارے میں ان سے زیادہ حساس کم ہی لوگ ہوں گے۔

اتنی تکلیف بھی انہوں نے محض اسے کوچنگ سینٹر جانا یاد دلانے کے لیے ہی اٹھائی تھی۔

باہر کوئی چیز زور سے پٹخی گئی تھی..... غصہ میں۔

"آگئیں تم!" سر پر مچا ہنگامہ زویا کو نیند سے اٹھا چکا تھا۔ "ابھی آئی ہو۔" وہ اپنے بال سمیٹتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

"اور یہ شور کیسا مچا تھا؟"

"کچھ نہیں' آپا گل تھیں۔"

زویا کی نگاہوں سے بچنے کے لیے اس نے دوسری طرف کروٹ لی تھی۔

"کھانا کھالیا تم نے' آپا گل کے ہاں کہیں سے ڈھیر ساری بریانی آگئی تھی' سو وہ یہاں لے آئیں' ان کی ضرورت سے زیادہ ہوگی' ورنہ وہ اتنی فیاضی دکھانے والی کہاں ہیں۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے' اسکول میں کچھ کھالیا تھا۔"

"جھوٹ۔"

وہ چپ چاپ دوسری طرف منہ کیے دیوار کو دیکھے گئی۔ زویا کی چھٹیاں تھیں' آج کل وہ گھر پر ہی ہوتی تھی اور اس کے پاس سارے دن کی مفصل رپورٹ' جسے جویا کو نہ چاہتے ہوئے بھی سننا پڑتا۔ مگر آج شاید کچھ زیادہ نہیں تھا۔ تب ہی وہ کچھ خاموش تھی خلاف معمول' اس نے جویا سے کھانا کھانے یا نہ کھانے پر بھی اصرار نہیں کیا تھا۔

"جویا!" درمیان میں آئے خاموشی کے وقفے کے بعد وہ پھر سے مخاطب تھی۔ "تمہارے پاس معاذ بھائی کا نمبر ہے؟"

دیوار پر جمی جویا کی نگاہ اور بھی ساکت ہوئی۔ زویا کو لگا کہ جیسے وہ سو چکی ہے۔

"جویا!" اس نے دوبارہ پکارا۔

"تمہیں بھی لگتا ہے کہ میرا معاذ سے مستقل کوئی کانٹیکٹ رہتا ہے، جو اس کا نمبر میرے پاس ضرور ہی ہو گا۔"

"نہیں، لیکن میں نے سوچا شاید اس روز کورٹ میں اس نے تمہیں دیا ہو۔" زویا نے اس کے الفاظ کی تلخی کا ذرا بھی نوٹس نہیں لیا تھا۔ "اصل میں.... " کچھ تھا جو وہ کہتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

جویا نے دھیرے سے اس کی طرف کروٹ لی۔

زویا کے چہرے پر اداسی تھی۔

"کیا آپا گل کے وکیل نے کوئی شکایت کی ہے اس کی؟" جو ڈر اسے معاذ کی طرف سے تھا، وہی زبان پر بے ساختہ آیا۔

"نہیں" زویا نے نفی میں سر ہلایا۔ "اصل میں آج اسلام چچا آئے تھے، امی سے ملنے کے لیے۔"

"کیا۔" وہ بری طرح چونکی تھی۔ "وہ یہاں آئے ہمارے گھر، اور کون تھا ساتھ۔"

"کوئی نہیں، اکیلے ہی آئے تھے، ابو کے کیس کو وہ اپنے وکیل کے سپرد کرنا چاہ رہے ہیں، اسی لیے امی کی اجازت لینے کے لیے۔"

"پھر کیا کہا امی نے؟" وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھی۔ "اسلام چچا کے وکیل بہت قابل ہیں زویا! اور چچا خود دیکھیں گے تو ان شاء اللہ بہت جلد پروگریس ہو گی، دیکھ لینا، وہ تو کہہ رہے تھے کہ اس ہفتے میں کم از کم ضمانت تو ہو ہی جائے گی۔"

خوش امیدی نے اس کے ذہن سے فوری طور پر تو بہت کچھ محو کیا۔ زویا چپ چاپ اس کی شکل دیکھے گئی۔

"کیا طے ہوا پھر بتاؤ تو سہی؟"

"تمہیں آپا گل کی خوشی اور سلمان بھائی کی بے حسی نے کوئی اشارہ نہیں دیا۔" زویا کے لہجے میں تلخی اترنے لگی۔

"مطلب؟"

"سلمان بھائی نے اسلام چچا کو باہر سے ہی رخصت کر دیا، اوپر آنے تک نہیں دیا، خاصی بے عزتی بھی کی ان کی، آواز اوپر تک آ رہی تھی، میں نہا رہی تھی، جب تک بھاگم بھاگ نیچے گئی، وہ گاڑی میں بیٹھ چکے تھے، بس ایک لمحے رک کر میرے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر چلے گئے، ان کی آنکھوں میں آنسو تھے جویا! میں نے خود دیکھا۔"

زویا کی آواز درد میں ڈوبی تھی اور ایک ایک لفظ کسی نشتر کی طرح جویا نے روح میں اترتا ہوا محسوس کیا تھا۔ ایسی تکلیف جواب تک اٹھائی گئی ہر تکلیف سے زیادہ درد انگیز تھی۔

وہ ایک انتہائی شریف النفس شخص جس کا سارا فخر اس کی حلال آمدنی اور زمانے کے مروجہ معیار عزت سے کہیں بلند ترین اخلاقیات تھیں، کیا وہ اس سلوک کا مستحق تھا کہ انتہائی نچلے درجے کی ذہنیت والے خود غرض، بے حس اور بے شرم لوگوں کے ہاتھوں بنا کسی قصور کے بار بار ذلیل ہو۔

ایک چھوٹے سے پل میں اس نے گلی میں کھڑے اسلام چچا کو سر جھکائے، سلمان کی بدزبانی کی نذر ہوتے دیکھا۔ پتا نہیں کس کس نے ان کی بے عزتی کا تماشا دیکھا ہو گا۔

"اسلام چچا کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، انہیں پتا بھی تھا کہ یہاں کوئی ان کی نیک نیتی پر نہ کل بھروسا کرتا تھا

اور نہ آج، کتنی گھٹیا باتیں اور لب و لہجہ ہمارے والدین کا ہمیشہ ہوا کرتا تھا جویا! یاد ہے نا۔" زویا بے حد اداس تھی۔

"یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے زویا! آج بھی وہ سب اس سے زیادہ دہرایا جا رہا ہے۔" وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بیٹھ چکی تھی۔

زویا نے اس کے زرد پڑتے چہرے کو فکر مندی سے دیکھا۔

"تم ٹھیک تو ہو نا۔"

"ہوں۔"

"میں معاذ بھائی کو فون کر کے ان سے معذرت کرنا چاہ رہی تھی، سلمان بھائی کے رویے پر۔ مگر [illegible] ہمت نہیں پڑتی ہے۔"

وہ بہت حساس ہو رہی تھی، اتنی دیر میں پہلی بار جویا نے اس کی سوجی ہوئی آنکھوں کو نوٹ کیا تھا۔

"اسلام چچا نے معاذ سے سلمان بھائی کے بارے میں ایسا کچھ بھی نہیں کہا ہو گا، وہ بہت بڑے آدمی ہیں زویا! یہاں اچھالی گئی کیچڑ نے ان کے قدموں کو چھونے کی بھی جرات نہیں کی ہو گی، گھر تک تو وہ کیا لے کر گئے ہوں گے۔"

جویا کا لہجہ بہت ٹھہرا ہوا تھا۔

"تمہیں معاذ سے کوئی معذرت کرنے کی ضرورت نہیں، اسلام چچا کو اچھا نہیں لگے گا۔" اس کا ہاتھ نرمی سے زویا کے ہاتھ پر آ کر ٹھہرا۔

☼ ☼ ☼

پچھلے احاطے کی طرف کھلتی کھڑکی میں سے آتے ہوا کے جھونکے چمپا کے پھولوں کی خوشبو سے بوجھل تھے اور کمرے کے اندر سہ پہر کا پرسکون سوتا جاگتا سا احساس ٹھہرا تھا، مگر اندر موجود وہ دونوں بے حد پیارے لوگ اپنی اپنی جگہ مضطرب تھے۔

"آپ کو سلمان کو سمجھانا چاہیے تھا ابا! اس وقت اظہار چچا کی ضمانت ہونا سب سے زیادہ اہم ہے اور علوی صاحب بہت ہی جانے ہوئے وکیل ہیں، انہیں یہ کیس ریفر کرنے میں کیا اعتراض ہے کسی کو۔"

سلمان کی طرف سے معذرت کا قصہ سن کر بھی وہ بار بار اپنی بات پر اصرار کیے جا رہا تھا۔

شاید اس لیے کہ وہ اس سارے قصے کا چشم دید گواہ تھا اور نہ ہی وہ سلمان کے لب و لہجے اور الفاظ کی تفصیل میں گئے تھے۔

"آپ کو اوپر جانا چاہیے تھا، شاکرہ چچی سے بات کرنی چاہیے تھی، سلمان تو اس قابل بھی نہیں ہے ابا! کہ اس سے بات بھی کی جائے۔ اس نے تو بے حسی کی ہر انتہا کو پار کر لیا ہے، اگر اس میں ذرا بھی شرم ہوتی تو جویا کو یوں اس طرح....."

اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اس نے دانستہ اپنا رخ موڑا تھا۔

اسلام صاحب نے افسردگی سے اس کی طرف دیکھا۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ جمائے باہر درختوں کے جھنڈ کی سمت دیکھتے ہوئے وہ کس کشمکش میں گرفتار تھا۔

وہ ایک دکھ بھرا کھلا راز تھا۔

میز پر اپنی ترتیب سے رکھی کتابوں کو یوں ہی الٹ پلٹ کرتے ہوئے اسلام صاحب نے ایسے ظاہر کیا جیسے انہوں نے کبھی جویا کا نام سنا ہی نہ ہو۔

"ابا!" وہ واپس ان کے قریب آکھڑا ہوا۔ "ایک بات بتائیں۔"
"ہوں۔" وہ پہلے ہی اس کی طرف متوجہ تھے۔
"اظہار چچا کے بچوں میں آپس میں یہ سوتیلا پن سا کیوں ہے، سگے بہن، بھائی ہیں یہ لوگ، مگر کس کمال کی خود غرضی ہے، انہیں تو اپنے باپ سے بھی کوئی ہمدردی نہیں، حالانکہ انہوں نے جو بھی کیا، وہ ان سب کے لیے ہی کیا تھا۔" جویا کی خستہ حالی پر دل میں بار بار اٹھتے سوال کو وہ آج زبان پر آنے سے نہیں روک سکا۔
ایک گہری ٹھنڈی سانس اسلام صاحب کے لبوں سے آزاد ہوئی۔
"اظہار نے ساری عمر جو کیا، وہ کسی سے چھپا نہیں ہے، بلکہ انہوں نے خود بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی، اپنے روپے پیسے کی اعلانیہ نمائش ——— ساری زندگی ایک لوئر ڈویژن کلرک کی پوسٹ پر رہ کر اپر مڈل کلاس کا لائف اسٹائل اپنانے میں انہوں نے ہمیشہ جو فخر کیا، یہ سب اس کا شاخسانہ ہے۔"
وہ کچھ سمجھا تھا اور کچھ نہیں بھی، ایک لمحے کے لیے افسردہ سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر آئی۔
"حرام کی آمدنی اپنے ساتھ جو نحوست لاتی ہے معاذ! اس سے دلوں پر ایسی ہی مہر لگتی ہے، قرآن سنت بار بار ہمیں حرام کے پیسے کی ہولناکی سے خبردار کرتے ہیں، مگر کتنے ہیں جو اس پر کان دھرتے ہیں، انجام سے بے خبر، ایک نہ ختم ہونے والی سرپٹ دوڑ ہے۔ بس۔ یہ بھول کر کہ فخرو غرور صرف اس کی ذات کو زیبا ہے اور اس کی زمین پر اکڑ کر چلنا کسی کو بھی راس نہ آسکا، بڑے بڑے منہ کے بل گرتے ہیں۔"
ان کا پر اثر اور دھیما لہجہ، معاذ ساکت کھڑا تھا۔
"حلال کے لقمے پر پرورش ہونے والی اولاد کا خمیر، محبت اور انسانیت سے اٹھتا ہے معاذ! اولاد کو حلال رزق پر پالنے والے والدین بڑی بھاری سوداگری کرتے ہیں۔ اپنا بڑھاپا اور آخرت دونوں کو پوری طرح محفوظ کر لیتے ہیں۔ کسی ایک لمحے میں وہ اولاد انہیں مایوس نہیں کرتی، میں تو اپنی زندگی میں یہ تجربہ کر چکا ہوں، کل کو جب تم اپنی اولاد کو پالو گے تو ان شاء اللہ تمہیں بھی ثبوت مل جائے گا۔"
روشنی کا جو ہالہ معاذ کو ہمیشہ ان کے گرد محسوس ہوتا تھا آج اس کی روشنی پہلے سے بھی کہیں بڑھی ہوئی تھی۔ ان کے چہرے پر جمی معاذ کی نگاہ احتراماً" جھکی اور گلے میں اٹکتے نمکین پانی نے اسے کچھ بھی کہنے سے قاصر کیا۔
اسلام صاحب نے خود بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا۔
"مجھے تم پر فخر ہے معاذ!" اور بہت دن بعد اس کے ضبط کی حد بھی ختم ہوئی، ان کے کندھے سے لگ کر بے آواز کتنے ہی آنسو اس کی آنکھوں سے گرے تھے۔
کچھ ان کے فخر پر اور زیادہ اپنی خوش قسمتی پر، وہ اسے لیے ریگزین کے اس پرانے صوفے پر آبیٹھے جو شاید اتنا آرام دہ نہیں تھا، مگر اس پر بیٹھنا معاذ کو ہمیشہ بہت سکون بخش احساس سے دوچار کرتا تھا اور یہ صوفہ کیا اس کمرے، اس گھر کی ایک ایک شے پر یہاں کے ماحول میں نرمی اور محبت کا ایسا ہی دل چھوتا احساس تھا کہ کبھی کبھی وہ خود بھی حیران ہوتا تھا۔
سو آج یہ بھید بھی کھلا۔
آنکھ میں آئے آخری آنسو کو اس نے انگلی کے کنارے سے رگڑا اور پھر سے موضوع پر واپس آیا۔
"تو پھر اب کیا کیا جائے ابا! سلمان اور آپا گل ہی اب اس گھر کے کرتا دھرتا ہیں اور دونوں ہی کسی ایک مسئلہ کو حل کرنے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔"
"دیکھتے ہیں۔ وہ وکیل جو اب آیا ہے، وہ بھی بالکل یوں ہی سا ہے، عارف صاحب سے بھی گیا گزرا۔ لیکن سنا ہے، اس بار مقدمے والے دن سلمان کورٹ آیا تھا، جویا نہیں۔"

"اسے تو انہیں اب روکنا ہی تھا ابا۔" ایک پھیکی سی مسکراہٹ لیے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "لیکن سلمان یا آپا گل کو کافی برا لگے۔ اس بار انہیں ہماری دخل اندازی برداشت کرنی پڑے گی، میرا خیال ہے کہ کل میں خود جا کر بات کرتا ہوں ان کے گھر پر۔"
"پاگل ہوئے ہو، پتا بھی ہے، سارا غصہ انہیں تم پر ہی ہے۔" وہ ہڑبڑا کر اٹھے تھے۔
"جس بات پر انہیں غصہ ہے، وہ کب کی ختم ہو چکی ہے ابا!" کندھوں کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے اس نے خود کو لاپروا ظاہر کرنے کی پوری کوشش کی۔
"کیا واقعی!" ان کی نگاہ اس کے چہرے پر جمی۔
"تو اور کیا، آپ کو اب بھی شک ہے مجھ پر۔" معاذ نے مسکرانا چاہا، مگر وہ بے حد سنجیدہ تھے۔
"شک تو بے بنیاد باتوں پر ہوتا ہے بیٹا! جویا کی تمہاری زندگی میں اہمیت تو ایک کھلی حقیقت ہے، بے وقوف اور ظالم ہیں وہ سب جو اسے نفی کرنے پر تلے ہیں۔"
"ابا پلیز! میں وعدہ کر چکا ہوں امی سے اور آپ جانتے ہیں کہ میں اتنا کمزور بھی نہیں۔"
اس کا چہرہ سرخی مائل ہو رہا تھا، اور گہری براؤن آنکھوں کی وہ شوخ سی چمک اب ماضی کا حصہ بنی تھی۔
"میں تم میں سے کسی سے یہ نہیں کہہ رہا کہ فیصلے پر نظرثانی کرو، اس لیے کہ میں نے اپنی اپیل اس کے حضور دائر کی جو سب سے بڑھ کر انصاف کرنے والا ہے اور میرا یقین ہے کہ وہ اپنے بندے کو کبھی مایوس نہیں کرتا، بس کبھی کبھی ہمیں سمجھ میں دیر سے آتا ہے۔"
اپنی بات کے اختتام پر وہ ہلکے سے مسکرائے۔
"جاؤ تمہیں دیر ہو رہی ہے۔"
"جی۔" اس نے کچھ چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ "مجھے خیام کو لے کر ساجد کو دیکھنے جانا ہے ابا!" آج اس کی رپورٹس بھی ملی ہوں گی، وہ ٹھیک نہیں ہے۔"
"علاج تو ٹھیک ہو رہا ہے نا اس بچے کا۔" وہ تشویش سے پوچھنے لگے تو معاذ نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔
"اب تک تو کوئی خاص علاج نہیں تھا ابا! ابھی دس دن پہلے ہی ہم نے اسے چیسٹ اسپیشلسٹ کو دکھایا ہے، ایکسرے وغیرہ کی رپورٹس اچھی نہیں ہیں، کچھ ٹیسٹ کے بارے میں آج پتا چلے گا۔" دروازے کی طرف مڑتے ہوئے وہ رک کر انہیں بتانے لگا۔
"اللہ رحم کرے، جاؤ تم پھر دیر نہ کرو، میں بھی دعا کروں گا۔" وہ ابا کے کمرے سے نکلا تو حیرت انگیز حد تک پرسکون تھا۔
حالات و واقعات میں کوئی ہلکی سی بھی مثبت تبدیلی نہ ہونے کے باوجود بھی دل پر آیا ہوا ٹھہراؤ بڑا ہی عافیت بھرا تھا۔
"زری!" وہ اسے برآمدے کی سیڑھیوں پر دوسری طرف سے آتی ہوئی ملی۔
"جی!" محض ایک نگاہ اٹھا کر اس نے معاذ کو دیکھا اور سر جھکا کر زمین کو تکنے لگی۔
آج کل وہ زیادہ تر اسی موڈ میں رہنے لگی تھی۔
خاموش، مودب، نہ بات بات پر اونچی آوازیں، ہنسنا، ایک قطعی مختلف روپ۔
شائستہ کہتی تھیں کہ بہت ہی ڈرامایاز لڑکی ہے، اپنی طرف توجہ مبذول کروانے کے لیے خود کو مختلف ثابت کرتی ہے۔
معاذ کو ان کی بات یاد کر کے ہنسی آنے لگی تھی، مگر صفائی سے دبا گیا۔

"سنو، میں آج ساجد کو دیکھنے جا رہا ہوں، اگر تمہیں چلنا ہو اپنے پرانے محلے میں کسی سے ملنے تو چلو، یا پھر اپنی بھابھی سے ہی....."

"مجھے کہیں نہیں جانا۔" ایک جھٹکے سے اس نے تیزی سے معاذ کی بات کاٹی۔ "بھابھی سکھر میں ہیں اور خوش ہیں، کبھی انہوں نے میری خیریت تک دریافت نہیں کی، آپ بس خالہ بتول کو سلام کہہ دیجئے گا اور ساجد کو میری طرف سے پوچھ لیجئے گا۔"

بات ختم کر کے وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

معاذ نے کچھ عجیب سا محسوس کیا تھا، اس کے رویہ میں..... کوئی معنی خیز بات تک نہیں۔ سو مقام شکر تھا، اگر وہ واقعی بدل رہی تھی تو کمال کی تبدیلی تھی اور اگر کوئی نیا ڈرامہ.....

دل میں کسی واہمہ کو جھٹک کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

اس چھوٹے سے گھر میں غضب کا تضاد تھا۔ تنگ پتلی گلی سے گھر میں داخل ہو کر، ایک کونے میں چھپر کے نیچے بنے برائے نام باورچی خانے سے لے کر نیچی چھت والے اس کمرے میں رکھے کلر ٹی وی اور فریج اور ساجد کے پرانے لوہے کے پلنگ پر بچھی چمکتی ہوئی نئی بیڈ شیٹ تک، ہر شے ہی خود کو نمایاں کر رہی تھی۔

نہ یہ پوری طرح کی غریبی تھی اور نہ ہی آسودہ حالی، بیچ بیچ کی حالت میں جیے جانے والی زندگی، ایک کی انتہا کو چھو لینے کے بعد، دوسرے آغاز کی طرف بڑھتا ہوا دورانیہ۔

"پتا نہیں انسانوں کی ذہنی حالت میں کتنی توڑ پھوڑ ہوتی ہو گی، اس بیچ کے دورسے گزرتے ہوئے۔"

بتول کی سوکھی کلائیاں، آرٹیفشل گولڈ کی چوڑیوں سے پوری طرح بھری ہوئی تھیں۔ گلے میں اس طرح کی دو تین یا چار مختلف طرح کی چین، انگوٹھیاں اور اس چمکتے دمکتے حلیے میں وہ، اپنے بیٹے کے لیے رو رو کر ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔

معاذ کے لیے اسے تسلی دینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

"دیکھیں، ساجد ٹھیک ہو جائے گا، آپ حوصلہ رکھیں اور دعا کریں، اس طرح رونے سے تو آپ اپنی طبیعت خراب کریں گی۔" مگر وہ پھر بھی روئے گئی۔

"خیام بھائی نہیں آئے!" بستر پر لیٹے ساجد کی آواز دھیمی تھی۔ وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ معاذ کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

"نہیں، خیام کو اسکول پر رکنا تھا، میں آیا ہوں تو کسی کو تو وہاں بھی ٹھہرنا تھا نا!"

اس کے بالوں پر نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بمشکل ہی مسکرایا تھا۔

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں معاذ بھائی!" ساجد کی شکایتی نگاہ معاذ کے چہرے پر جمی۔ "خیام بھائی، جان کر یہاں نہیں آئے ہیں، وہ آئیں گے بھی نہیں، ابا نے ان پر الزام ہی اتنا گندا لگایا تھا نا۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے، اور تم اپنے ذہن پر بے کار کے بوجھ مت ڈالو، دیکھو میں تمہارے لیے کیا کیا لایا ہوں۔"

وہ اس چھوٹے سے بچے کی اذیت کو کم کرنا چاہتا تھا، سو اس کی توجہ ہٹانے کے لیے اپنے ساتھ لائی گئی چیزیں نکال کر دکھانے لگا۔

ساجد شاید اس کا دل رکھنے کے لیے ہی ان میں دلچسپی ظاہر کر رہا تھا۔

"تمہاری رپورٹس کہاں ہیں۔" معاذ نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔

"یہ ادھر!" ساجد نے اشارہ کیا۔

معاذ نے بڑھ کر وہ بڑا سا لفافہ اٹھایا ہی تھا کہ ساجد کو کچھ اور یاد آیا، جو رپورٹس سے زیادہ اہم تھا۔

"وہ زری باجی اور ان کی بھابھی کا پتا کرنے آئے تھے، میں نے بتا دیا کہ سعیدہ خالہ تو سکھر جا چکی ہیں، لیکن زری باجی معاذ بھائی کے گھر ہیں۔"

معاذ کے ماتھے پر ہلکی سی شکن ابھری۔

"کون آئے تھے؟"

"سالار نام ہے ان کا، زری باجی کی ساری فیملی کے بارے میں محلے والوں سے سنا ہے۔ معلومات کر کے گئے ہیں، میں تو اٹھ کر باہر نہیں جا سکتا تھا، لیکن جب محلے والوں نے انہیں بتایا کہ زری باجی کو میں نے آپ کے گھر رکھوایا ہے تو وہ خاص طور پر مجھ سے ملنے اندر آئے تھے۔"

اتنی سی تفصیل بتانے میں ہی ساجد کا سانس پھول گیا تھا۔

"ہو سکتا ہے، کوئی رشتے دار ہوں، اچھا ہے زری کو لے جائیں اپنے ساتھ، میں تو خود فکر مند ہوں اس کے لیے۔"

وہ سچ مچ تھوڑا سا مطمئن ہوا تھا یہ سن کر۔

"وہ خود آپ سے ملیں گے۔" کچھ کہنے سے پہلے ذرا رک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

"وہ نبیل کے بارے میں بھی بات کر رہے تھے معاذ بھائی! محلے والوں سے ساری رپورٹ لے کر گئے ہیں مگر میں نے ان کے بارے میں زیادہ بات نہیں کی، آپ نے شروع میں ہی منع کر دیا تھا نا، جب وہ اسکول کا افتتاح کرنے اپنی امیر بیوی کے ساتھ آئے تھے۔"

"وہ!" معاذ کی پیشانی پر آیا بل اور بھی گہرا ہوا۔

آس پاس زندگی میں اتنے سارے کنفیوژن اکٹھے ہو رہے تھے کہ اسے نبیل کو یاد کرنے کے لیے ذہن پر زور ڈالنا پڑا، بیگم زرتاج کا ینگ اسمارٹ شوہر!

کہیں پیچھے گم ہوئی وہ شام

جب اس نے بوکھلاتے ہوئے نبیل کے آگے بحث کرتے ہوئے ساجد کو کھینچ کر پیچھے کیا تھا۔

"آپ نے کہا تھا کہ یہ بڑے لوگ ہیں، ان کی حقیقت کے پیچھے پڑنا ہمارا کام نہیں ہے۔ کوئی ضرورت نہیں کسی سے کچھ بھی کہنے کی۔"

"ہاں تو ٹھیک ہی تو کہا تھا نا، مگر یہ قصہ اب اتنے عرصے بعد پھر سے، اور یہ زری۔"

کوئی گم گشتہ کڑی جوڑنے میں وہ اب بھی ناکام تھا۔

"نبیل بھائی، زری باجی کے بھائی ہیں، بہت سال پہلے گھر سے بھاگ گئے تھے، پہلے بتا چکا ہوں آپ کو۔"

بہت اطمینان سے اطلاع دے کر وہ اپنے لیے لائے تحائف کھول کر دیکھنے لگا۔

معاذ کے ہونٹ حیرت سے کھلے اور بند ہوئے۔

"زری کا بھائی اس شہر میں تھا تو تم نے اس روز کیوں نہیں کہا جب اسے دارالامان بھیجا جا رہا تھا۔ مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنے گھر لے کر جانا پڑا۔"

وہ ساجد پر ناراض نہیں ہونا چاہتا تھا سو خود کو کنٹرول کر گیا تھا۔

"بتایا تو، آپ نے منع کیا تھا کہ بڑے لوگوں کے بارے میں ہمیں زیادہ بات نہیں کرنی چاہیے، ورنہ ہمارا ہی نقصان ہوتا ہے ویسے بھی یہ جو سالار بھائی آئے تھے، زری باجی کو ہی ڈھونڈ رہے ہیں۔ آجائیں گے ایک آدھ دن

میں آپ کی طرف۔ زری باجی کو ان کے ہی حوالے کر دیجئے گا' کر دیں ان کے بھائی کے حوالے۔"
اسے کھانسی اٹھنے لگی تھی۔
معاذ نے بڑھ کر جلدی سے اسے پانی پلایا۔
"تم بھی زیادہ مت بولو' جو بھی ہوگا دیکھ لیں گے۔" دل و دماغ میں شور مچاتے کئی سوال' جواب طلب تھے' مگر ایک خیال سب پر حاوی تھا۔
زری اور نبیل آپس میں سگے بہن بھائی ! !
بیگم زر تاج کے ہائی کلاس لائف اسٹائل میں زری سے رشتے داری کی گنجائش قطعی نہیں تھی۔
ساجد نے اس کا لایا ہوا جگ سا پزل کھول کر ٹکڑے جوڑنے شروع کر دیے تھے۔
ایک نامکمل تصویر' تکمیل کی منتظر تھی۔
اسے کچھ اور بھی یاد آیا۔
ان ہی کرداروں سے متعلق ایک اور منظر!
جب وہ ابا کے اصرار پر سلمان اور زوبیہ کی شادی میں گیا تھا' وہاں ریسپشن پر آئے ہوئے بیگم زر تاج اور ان کے ساتھ وہ خوش شکل لڑکا جسے ان کے شوہر کی حیثیت میں دیکھ کر وہ پہلی بار چونکا تھا۔ بعد میں پتا چلا تھا کہ وہ زوبیہ کی پھوپھی ہیں۔ شہر کی ممتاز شخصیت' ایک مثالی سوشل ورکر۔
غریبوں اور محتاجوں کا سہارا۔ بعد میں وہ ان سے' ان کی دوسری حیثیت میں ہی ملا اسکول کا افتتاح' ڈونیشن۔
زر تاج کے بارے میں اڑتی ہوئی باتوں پر اس نے کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔
"کسی کی بھی ذاتی زندگی خالص اس کا اپنا معاملہ ہے۔" سو نو کمنٹس! اس کے چند اصولوں میں سے ایک۔
"دیکھیں' تصویر بنتی جا رہی ہے نا!" ساجد پوری طرح کھیل میں گم تھا معاذ اس کا دل رکھنے کے لیے ہلکے سے مسکرا دیا۔
بتول کب کی آنسو صاف کرتے ہوئے باہر برآمدے میں جا چکی تھی اور اس کا وہ جلاد شوہر اتفاق سے آج کل شہر سے باہر تھا۔
معاذ کو سائیڈ میں رکھا ہوا رپورٹس کا لفافہ یاد آیا جو کھولے جانے کا منتظر تھا۔
باہر سے چائے پکنے کی دلفریب سی مہک آنے لگی تھی۔ معاذ کی نگاہ ہاتھ میں تھمے کاغذ پر جمی تھی۔
آج کا دن انکشافات کا ہی تھا۔
وہ بدترین خدشہ جسے اس نے اپنا واہمہ سمجھ کر کئی بار ٹالا تھا' خود کو ثبوت کے ساتھ ثابت کر رہا تھا۔
ایک خاموش سی نگاہ معاذ نے سر جھکائے ٹکڑے جماتے ہوئے ساجد پر ڈالی۔
حالات کی سفاکی سے بے نیاز' اپنے کام میں محو۔
"شاید خود اس کے اپنے سمجھنے میں ہی غلطی ہو' بہرحال وہ کوئی ڈاکٹر تو نہیں ہے۔"
ساجد نے تب ہی نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا جب وہ خود اپنے آپ کو تسلی دے رہا تھا۔
"کیا ہوا آپ کو۔ اتنے پریشان کیوں ہیں؟"
معاذ کا اڑا ہوا رنگ' اس کے ہاتھوں میں تھمی رپورٹ اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک ذہین لڑکا تھا۔
"کچھ نہیں!" معاذ نے خود کو سنبھالنا چاہا "میرا خیال ہے کہ اب میں آیا ہوں تو چل کر یہ رپورٹس اور تمہیں' دونوں ہی کو ڈاکٹر کو دکھا دیں۔"
"مگر انہوں نے تو اب ہفتے کو بلایا ہے۔" ساجد کا لہجہ دھیما تھا اور نظر اسی رپورٹ پر۔

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہم آج ہی چلے چلتے....."

"معاذ بھائی!" ساجد نے اس کی بات پوری ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا۔

"کیا میری رپورٹس سے آپ کو پتا چل گیا ہے کہ میں نشہ کرتا ہوں، وہ بھی بہت زیادہ۔"

اعتراف جرم کرتے ہوئے ساجد کی نگاہ جھکی تھی۔ ایک تھکی تھکی سی سانس معاذ کے لبوں سے آزاد ہوئی زندگیوں سے جڑا ایک اور المیہ۔

"کب سے ہے یہ عادت؟"

"جب سے ابا نے اس سگریٹ، پان مسالوں کے کام پر لگایا تھا، اس میں نشے کی پڑیاں بھی بیچ میں رکھی ہوتی تھیں، تب ہی سے....."

معاذ نے پیروں تلے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس کی۔

"تم زہر بیچ رہے تھے ساجد! اور مجھے خبر تک نہیں تھی، خدایا..... میری سمجھ میں کیوں نہیں آیا کہ اتنے سارے پیسے تمہیں ایسے ہی تو نہیں مل رہے ہوں گے۔ وہ زہر بھرا خوانچہ لے کر سارے شہر میں پھرتے تھے اور کتنے ہی لوگ، کتنے ہی بچے شکار بنے ہوں گے۔ تھوڑے سے پیسوں کے لیے تم نے اتنا بڑا عذاب تقسیم کیا شہر میں۔"

معاذ کی آواز قدرے اونچی ہوئی۔ "اور تمہارے ابا۔ انہیں پتا ہے کہ تم.....!" بات ادھوری چھوڑ کر وہ ساجد کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔" لیکن شروع میں انہوں نے بہت سختی سے سمجھایا تھا کہ صرف بیچنا ہے، خود کبھی بھول کر بھی نہیں چکھنا، مگر میں خود ہی....."

اسے اب بے تحاشا کھانسی اٹھ رہی تھی۔ بتول چائے کے کپ لیے اندر آئی تھی اور بہت تشویش سے اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔

معاذ کو اس بار اس سے ذرا سی بھی ہمدردی نہیں محسوس ہوئی۔

حالات کو بدلنے کے لیے ہر جائز اور ناجائز راہ کو اپنانے میں ذرا سی بھی شرم محسوس نہ کرنے کا وہی عمومی رویہ اور حرام رزق کی ہولناکی کی ایک اور مثال..... اور نہ جانے کتنی ان گنت مثالیں۔ نہ ہم دیکھ کر دیکھتے ہیں اور نہ سمجھ کر سمجھتے ہیں۔ اندھے، بہرے، فاطر العقل لوگ۔

معاذ نے ساری کڑواہٹ اپنے ہی اندر اتاری۔

"چلو، دیر ہو رہی ہے۔" وہ ساجد کو سہارا دینے کے لیے آگے بڑھا۔

☼ ☼ ☼

خیام کا ہاتھ تیزی سے بلیک بورڈ پر چل رہا تھا۔

اور اس کی ساری کلاس پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھی۔

گیٹ سے اندر آتے ہوئے معاذ نے پوری دلچسپی سے یہ منظر دیکھا۔

خیام کے پڑھانے کی صلاحیت حیرت انگیز تھی۔

بہت جلد اس نے بچوں کے ساتھ ایک دوستانہ رشتہ قائم کر لیا تھا، اور جس نرمی اور ٹھہراؤ کے ساتھ وہ انہیں پڑھا رہا تھا۔ یہ اس کی اکھڑ اور ضدی طبیعت کے بالکل برخلاف رویہ تھا۔

"شاید انسان کبھی بھی، کسی کو بھی پوری طرح جاننے کا دعوا نہیں کر سکتا۔"

اسے پہلی بار خیام کا ساجد کے ساتھ اپنے ہاں آنا یاد آیا، جب وہ اسے اپنے ساتھ نہ رکھنے کا پورا پکا ارادہ کر چکا تھا۔

اور آج وہ اس پر فخر کر سکتا تھا، اور کر رہا تھا۔

مداخلت کے خدشے کے تحت وہ آخری لائن کی سب سے آخری کرسی پر بیٹھا رہا۔

کلاس ختم ہو رہی تھی اور بچے خیام سے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکراتے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔

کئی بچے معاذ کو دیکھ کر اس کے پاس بھی ہاتھ ملانے آئے، تب ہی خیام نے بھی اسے دیکھ لیا۔

"آپ کب آئے؟" وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب چلا آیا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے۔" معاذ نے خوش دلی سے ہاتھ ملایا "اور تم تو اتنا اچھا پڑھا رہے ہو کہ دل چاہ رہا ہے، نوکری چھوڑ کر میں بھی، تمہاری کلاس میں داخلہ لے لوں۔"

خیام ہنس پڑا۔ معاذ نے محبت سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے واقعی بہت اچھا سنبھالا ہے اسکول۔ مجھے بے فکری ہو گئی ہے اس طرف سے۔"

"آپ بتائیں، ساجد کیسا ہے؟" وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"ٹریٹمنٹ شروع ہو گئی ہے۔ مگر خاصی بگڑی ہوئی حالت ہے اس کی، بس اللہ پر ہی بھروسا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ!"

خیام کے چہرے پر ہلکی سی افسردگی آئی۔

"میں تو شکر کرتا ہوں کہ اس نے مجھے صرف سادہ سگریٹ اور ٹافیاں بیچنے پر لگایا، ورنہ میں تو خود کو ساری عمر معاف نہیں کر پاتا معاذ بھائی۔" معاذ نے دیکھا اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔

"میں نے ساری زندگی صرف ایک ہی تمنا، ایک ہی جستجو پالے رکھی، حصول رزق حلال۔ میں تو کچرا چننے والے کو بھی عزت سے دیکھتا ہوں، وہ کم از کم چوری تو نہیں کر رہا، پھینکا ہوا مال ہی اٹھا رہا ہے۔" اس کے لہجے کی سچائی خود کو منوا رہی تھی۔

"اب مجھے تم پر فخر کے ساتھ رشک بھی آ رہا ہے خیام! اتنی چھوٹی عمر میں تم نے وہ سبق پڑھ لیا، جو لوگوں کو ساری زندگی گزار لینے کے بعد بھی یاد نہیں ہوتا۔"

"انہیں میرے جیسے حالات سے واسطہ نہیں پڑا ہو گا۔" وہ پھر تلخ ہونے لگا۔

معاذ نے ہلکے سے نفی میں سر ہلایا۔

"میرے نزدیک تو وہ حالات مبارک ہے، جس میں انسان صحیح اور غلط کو پہچاننے کے قابل بنتا ہے، تاریک راہ میں ایک روشن راہ کی طرف ہاتھ تو بڑھاتا ہے، ورنہ چاروں طرف چکا چوند پھیلانے والوں کو تو اس راہ کا سراغ بھی نہیں مل پاتا کئی بار۔ تم خوش قسمت ہو، یقین کرو میرا۔"

وہ بالکل خاموش معاذ کی شکل دیکھے گیا۔

"کتنی عجیب بات تھی اور کتنے اجنبی لفظ۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے سوچا۔

"اچھا بات سنو! ایک صاحب آئیں گے ملنے مجھ سے، وہ جب بھی آئیں انہیں پوری عزت سے روکنا اور مجھے فوراً خبر کرنا۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

انوشہ ملک

بے مہراساں بے بخت اساں توکرم ڈیکھا متاں
وس ونجوں
تو رحم دی ایہہ جئی بارش کر، روح پیاسی اے متاں
پس ونجوں
اس جندڑی تے نئیں لگدا اے، اساں اتے کوئی
پھٹ رکھسی
اساں زخم ناسور اچ ڈھل گئے ہاں، توہتھ چالا متاں
رس ونجوں
اس شہر اچ جی ہنڑ نئیں لگدا۔ اساں کہیں دے
ناکوئی ساڈا اے
ونجڑاں نا ملک ضرور ہنسے، اینج ہتھ ملا کھل ہس
ونجوں

(میں بے مہر نصیب تو ایسا کرم کر کہ زندگی سنور، رحم کی ایسی بارش کر کہ پیاسی روح سیراب ہو جائے۔ میرے زخم ناسور بن گئے ہیں، اِن پر کون مرہم رکھے گا تو ایسا ہاتھ پھیر کہ یہ ٹھیک ہو جائیں۔ اس دنیا میں جہاں ہم کسی کے ہیں نہ کوئی ہمارا ہے۔ ہمارا دل نہیں لگتا۔ مرنا تو ہے تو اس طرح مل کہ ہنسی خوشی دنیا سے گزر جائیں)

مہر علی شاہ کی نظر عبایا میں سے نظر آتے پاؤں پر تھی۔ ان پیروں کو تو وہ لاکھوں میں بھی پہچانتا تھا کہ پچھلے دو سالوں سے وہ انہی پیروں میں ہی تو پڑا تھا اور پھر بے اختیار ہی اس کی نظروں نے پیروں سے ان آنکھوں تک کا سفر کیا کہ شاید ان آنکھوں میں رحم کی تھوڑی سی رمق ہو مگر ہمیشہ کی طرح مایوسی.... مہر علی شاہ نے اپنی نظریں جھکا دیں۔

بے بسی کا احساس۔ لگتا تھا کہ ابھی امتحاں باقی ہے۔ ابھی انتظار کی سولی پر مزید لٹکنا ہے اس کو....

"تم سے کہا تھا نا میں نے کہ مت آیا کرو...."

غصے سے بھری آواز نے اس کو سوچوں کے بھنور سے نکالا تھا۔ نظریں یونہی جھکی رہ گئیں۔

"یہاں سے کچھ نہیں ملنے والا۔ تم جانتے ہو مہر علی شاہ! کہ بے مراد لوٹو گے، پھر کیوں آتے ہو؟"

مہر علی شاہ کی ذہین آنکھوں میں سیلاب امڈ آیا۔ وہ بزدل نہیں تھا اور نہ ہی عورت کے طعنوں نے اس کو چھلنی کیا تھا۔ آنسو تو خوف خدا سے.... پھر جب وہی پیر واپسی کو اٹھے تو مہر علی شاہ کا دل جکڑ ا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں نے دور تک ان پیروں کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ وہ اوجھل ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

"بی بی! اک بات بولوں؟" خانقاہ سے واپسی پر میراں نے اس کو مخاطب کیا، جو اس کی ذاتی ملازمہ تھی اور اس کی ہی ہم عمر تھی۔

"تمہیں میری اجازت کی ضرورت کب سے پڑ گئی میراں!"

"بی بی! آپ وہ.... چھوٹے سائیں کو معاف کیوں نہیں کر دیتیں.... دیکھیں نا بی بی! دو سال سے آپ کے پیروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ گھر کی شکل وی نئیں دیکھی۔ اماں کے دل پہ کیا گزرتی ہو گی۔"

"دیکھ میراں! میں نے تجھ کو پہلے بھی روکا ہے نا کہ مجھ سے یہ بات مت کیا کر"

"پر بی بی....."

"بس میراں!" اور میراں کا چہرہ مایوسی کی چادر اوڑھ گیا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ بے کار ہے۔ بے سود ہے، پر ہر بار کی طرح پھر سے پر امید ہو جاتی تھی کہ شاید اب کی بار بی بی کو رحم آجائے مگر.....

سوچتے سوچتے وہ گاڑی میں سوار ہو گئی اور اس کو پتا بھی نہ چلا.....

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم بابا سائیں!"

میر مخدوم علی شاہ نے اپنی جھکی پلکیں اٹھائی تھیں اور اسے سر پر پیار دیا۔

"آگیا میرا بچہ خانقاہ سے.....؟"

"جی بابا..... بابا! آپ ڈیرے پر جا رہے ہیں کیا؟"

"جی پتر! مرید آئے بیٹھے ہوں گے اور انتظار بھی تو نہیں کروا سکتے نا۔"

"جی بابا سائیں۔"

وہ چلے گئے پر وہ ابھی تک ان کی آواز کے سحر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کتنی شفقت تھی ان کی آواز میں۔ کیا پیار تھا، کتنا احترام تھا اپنے بچوں کے لیے۔ اپنے بڑوں کے لیے وہ ہمیشہ سر کو جھکائے رکھتے تھے، پھر بھی نہ جانے کیسا رعب تھا ان کی شخصیت میں اور یہی رعب، یہی نرم لہجہ اور گھنے درخت جیسی شخصیت اس کا آئیڈیل رہی تھی۔

رات وہ بستر پر لیٹی تو نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، وہ اس کو دیکھنے ضرور جاتی تھی۔ پتا نہیں وہ مہر علی شاہ کی امید نہیں توڑنا چاہتی تھی یا پھر وہ اس کا صبر آزما رہی تھی۔ اس بات کی خبر تو خود حجاب علی شاہ کو بھی نہیں تھی۔ یہی سب سوچتے ہوئے اس نے چار سال پیچھے کا سفر کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ان کا یونیورسٹی میں پہلا دن تھا۔ سارا شاہ اور وہ ساتھ تھیں ہمیشہ کی طرح۔

"تجھے پتا ہے، جوجو؟" (حجاب شاہ کا یہ نام بھی صرف اور صرف سارا شاہ کے لبوں سے ہی نکلا تھا اور پکارتی بھی وہی تھی)

"اور جب تو بتائے گی نہیں تو مجھے بھلا کیا پتا۔" حجاب چلتے چلتے ٹھہری تھی اس کی طرف۔

"وہی تو بتا رہی ہوں یار! تو جانتی ہے نا کہ میں ادھر صرف اور صرف مہر علی شاہ کی وجہ سے آتی ہوں اور تو یہ بھی جانتی ہے نا کہ اگر وہ یونیورسٹی نہ ہوتا تو میں بھی اب تک گھر بیٹھی نئی نئی ڈشز تیار کر رہی ہوتی۔ پر تم دونوں کتابی کیڑے تعلیم کے دشمن۔ مجھے بھی خوار ہونا پڑ رہا ہے۔"

"ہوں! تو مس سارا شاہ! آپ مجھے کیوں دوش دے رہی ہیں۔ اگر آپ یہاں میری وجہ سے تشریف لاتیں تب تو حق بنتا تھا پر اب....."

حجاب شاہ نے بھی آنکھیں دکھائیں تو وہ جلدی سے بولی۔

"چلو! کلاس میں چلیں۔" اور پھر خود ہی بڑبڑائی۔

"گزر تو سب اوپر سے ہی جانا ہے پر۔"

پیر مخدوم علی شاہ نے اپنی چھوٹی بہن کی شادی اپنے کزن رئیس شاہ سے کی تھی اور سارا شاہ مہر النساء اور رئیس شاہ کی بیٹی اور حجاب شاہ کی پھوپھی زاد تھی۔ پیر غلام علی شاہ بڑے سائیں کے دو بیٹے خادم علی شاہ بڑے بیٹے اور مخدوم علی شاہ چھوٹے بیٹے اور بیٹی مہر النساء تھی۔

خادم علی شاہ کا بیٹا مہر علی شاہ تھا اور مخدوم علی شاہ کی ایک ہی بیٹی حجاب شاہ تھی۔ سارا شاہ کا سارا وقت اپنے ننھیال میں گزرتا تھا کیونکہ وہ حجاب شاہ کے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

ویک اینڈ پر وہ تینوں اکٹھے ہی آتے تھے۔

"تم اپنے گھر جاؤ گی یا حویلی چلو گی؟" مہر علی شاہ نے سارا شاہ کو مخاطب کیا تھا۔ آواز میں واضح سی سرد مہری تھی۔

"جہاں بھی چھوڑ دو گے، مجھے کون سا اعتراض کرنا ہے۔"

"ہاں! تم اعتراض کب کرتی ہو۔ تم تو سیدھا سیدھا شکایت کرتی ہو۔ بہت ہی معصوم ہو نا تم۔"

"ہاں! ہوں تو۔" اور اس کی ڈھٹائی پر حجاب شاہ نے مسکراہٹ دبائی تھی۔ وہ دونوں ہمیشہ ایسے ہی لڑتے تھے۔ مہر علی شاہ نے سارا شاہ کی آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھ لی تھی اور تب سے رویے میں سرد مہری واضح تھی پر سارا شاہ کو پروا کب تھی۔

پتا نہیں کتنی دیر حجاب شاہ ماضی کی گلیوں میں پھرتی رہی تھی۔ ہوش تو تب آیا، جب تائی کے چیخنے کی آواز آئی تھی۔

"ہائے ہائے! آگ لگی ہوئی ہے۔" تائی نے اس کا دوپٹہ کھینچا تھا۔

"تم کتنے لوگ بچے ہو باقی۔ ایک حرام موت مر گئی اور وہ..... وہ ترک دنیا کیے پڑا تھا۔ ایک تم نظر آتی ہو اور اب تم بھی..... یوں بے دھیان مت رہا کرو حجاب شاہ! پر ہمارے کلیجے بہت ہی سخت ہیں پتر! ایسے ان باتوں سے تھوڑی مریں گے ہم۔"

اور حجاب کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ زمین میں دھنس جائے۔ بے شک تائی اس کو کچھ کہتی نہیں تھیں، مگر ان کے جگر کا ٹکڑا در بدر تھا اور ماں کا دل تو پھر ماں کا دل ہے نا.....

"جاؤ پتر! دوپٹہ اوڑھ کر آؤ۔ یہ تو جل گیا۔"

اور وہ خود کو گھسیٹنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"ویسے جوجو ایک بات سوچنے والی ہے۔"

حجاب شاہ نوٹس بنا رہی تھی اور سارا ہمیشہ کی طرح اس کا سر کھا رہی تھی۔

"واہ سارا بی بی! آپ سوچتی بھی ہیں؟ یہ مجھے ابھی ابھی پتا چلا ہے۔"

"یہ تم..... تم میرا مذاق اڑا رہی ہو؟ جاؤ! نہیں بتاتی میں۔" وہ ناراض ہی ہو گئی۔

"یار! معاف کر دو نا۔ اچھا بتاؤ کیا بات ہے؟" حجاب شاہ نے ہاتھ جوڑے تو وہ پھر شروع ہو گئی۔

"یار! یہ بابا سائیں نے (ان کی دیکھا دیکھی وہ بھی ننھیال کے رشتوں کو ویسے ہی ناموں سے پکارتی تھی جیسے حجاب اور مہر علی شاہ بلاتے تھے) مہر علی کو تو گھر لے کر دیا ہوا ہے اور ہم یہاں ہوسٹل میں..... تو کیا ہم اس گھر میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتے؟ اس طرح میری بھی کچھ..... آئی مین جب میں ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے..... تم سمجھ رہی ہو نا، جوجو!"

حجاب کی ہنسی نکل گئی، سارا شاہ کے انداز پر۔

"پہلی بات تو یہ سارا شاہ! کہ بچپن سے تم اس کے سامنے ہی ہو تو جب تم پہلے اس کو نظر نہیں آئیں تو اب؟" اس نے جان بوجھ کے زبان دانتوں تلے دبائی تھی۔

"اور دوسری بات بابا کو مہر علی شاہ کی ایکٹیویٹیز کا علم ہے اس کے سب دوست وہاں آتے جاتے ہیں اور وہ ان دوستوں کے ساتھ کیا کیا کرتا پھرتا ہے، یہ کوئی چھپا ہوا تو نہیں ہے نا تم سے۔" حجاب نے ہنسی روک کر واضح کیا۔

"اب ایسے تو مت بولو جوجو! اس کے بارے میں"

"ہاں! تمہاری آنکھوں پر تو محبت کی پٹی بندھی ہے مس سارا رئیس شاہ! مگر میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ وہ کس طرح گرل فرینڈز بدلتا ہے؟ لڑکیاں نہ ہوئیں جوتے ہو گئے۔"

وہ جانتی تھی کہ اس نے سارا شاہ کو دکھی کر دیا ہے مگر وہ ایسا اس لیے کرتی تھی تاکہ سارا شاہ اس حقیقت کو تسلیم کر لے کہ وہ سراسر نقصان میں جا رہی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ سارا اس کا خیال چھوڑ دے کیونکہ مہر علی شاہ سارا جیسی اچھی لڑکی کے قابل ہرگز نہیں تھا۔

اس کے دروازے پر دستک کے ساتھ ہی ماضی کی جھلکیاں بھی بھاگ گئی تھیں۔

"کون ہے؟"

"میراں۔" جواب آیا تھا۔

"آجاؤ بھئی! تم کو کب سے اجازت کی ضرورت پڑ

گئی ہے؟"

☼ ☼ ☼

"آج اسے آنا تھا چار بجے سے ہی اس کا انتظار شروع ہو چکا تھا۔ مسلسل دو گھنٹے سے آنکھیں ایک ہی نقطے پہ ٹکی تھیں۔ ان آنکھوں کو تو پچھلے چار سال سے عادت سی ہو چلی تھی انتظار کی اور اب تو وہ مہر علی شاہ کی بھی نہیں مانتی تھیں۔ وہ سو جتن کرتا ان کو سمجھانے کے مگر وہ بھی مہر علی شاہ کے دل کی طرح بے اختیار ہو چلی تھیں۔ اس کی مانتی ہی نہیں تھیں۔ وہ لاکھ سمجھاتا، منتیں کرتا مگر وہ پھر بھی کسی ننھے بچے کی طرح اسے دیکھنے کی ضد پر اڑی رہتی تھیں اور جب زیادہ تکرار چلتی تو وہ چھلکنے لگتیں اور مہر علی شاہ دل کی طرح آنکھوں سے بھی ہار جاتا۔

آج بھی سارا منظر دھندلایا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں فریادی تھیں اور پھر شاید اس پہ ترس کھالیا گیا تھا۔ دھندلائے ہوئے منظر میں کالے رنگ کا عبایا اور اس میں لپٹا وجود نمودار ہوا تو آنکھوں میں دیپ سے جلنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ آنکھیں ان قدموں کی خاک ہونے کو ہیں۔ تب ہی... تب ہی وہ قریب رکی تھی، اپنے وجود کی خوشبو لیے اور مہر علی شاہ نے ہمیشہ کی طرح امید لگالی تھی پھر سے... ہاں ایک بار پھر سے...

"ترس آتا ہے مجھے تم پہ مہر علی شاہ! ایک عورت کو تم نے خود برباد کر ڈالا اور دوسری تم کو برباد کر رہی ہے۔ کیا فائدہ ہوا؟ بتاؤ مجھے، اے کاش... اے کاش یہ بربادی تم کو کچھ دیتی مہر علی شاہ!"

وہ بول رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح کڑوے لفظ مگر وہ اس کی ان کڑوی باتوں سے زیادہ تو اس کی آواز کو اپنے دل میں اتارتا تھا۔ اس کی آواز اتنی میٹھی تھی کہ مہر علی شاہ کو لگتا تھا جیسے اس کی میٹھی آواز میں زندگی کی ساری کڑواہٹ ضم ہو گئی ہے۔ وہ بہت ہی میٹھا سا لہجہ لیے ہوتی۔ چاہے الفاظ کتنے ہی سخت تھے۔ مگر مہر علی شاہ کے جینے کا سامان بھی وہ خود کر گئی تھی۔ ہاں! خود حجاب علی شاہ کی آواز نے زندگی کے اس زہر کا تریاق کیا تھا جو مہر علی شاہ کو شاید زیادہ عرصہ جینے نہ دیتا۔

بے عیب نئیں کوئی دنیا وچ بے عیب لبھی سیں کہہ تائیں
لڑ پر دے ہتھ وچوں چھٹ ویسی ڈس خاک چٹیسیں کہہ تائیں
اساں ملک فقیراں بھیس ودے وچ خاک رولی سیں کہہ تائیں
ہک کھوٹا سکہ نئے کے توں گھانٹریں حسن دے پیسیں کہہ تائیں

(اس دنیا میں کوئی بے عیب نہیں ہے تم کب تک ڈھونڈتے رہو گے
سب تمہیں چھوڑ جائیں گے اور تم خاک چھانتے رہ جاؤ گے
ہم بادشاہ سے فقیر بن بیٹھے اور کتنا خاک میں رولو گے
کینہ ساز دل کے ساتھ اپنے حسن سے کب تک پاگل بناؤ گے۔)

☼ ☼ ☼

"سارا! یار کچھ پڑھ لو۔ پیپرز میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں اور تم موویز کے چکروں میں پڑی ہو۔ بعد میں کر لینا یہ سب۔ ساری زندگی تو ہے ابھی۔"

حجاب اس کی آرام طلبی اور کتابوں سے بھاگنے والی عادت سے تنگ آگئی تھی۔

"یار جو جو! زندگی ہی تو نہیں پڑی۔" وہ کچھ دنوں سے ایسی ہی عجیب عجیب ہانک رہی تھی۔

حجاب شاہ نے بہت حیرانی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا مطلب سارا شاہ؟" وہ کتاب بند کر کے اس کی طرف آئی۔ "کیا بات ہے کوئی الجھن ہے؟"

وہ نرمی سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ بہت عقیدت تھی اس کو اپنی پھوپھی زاد سے۔ سارا شاہ نے اپنا سر مزید جھکایا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ ضرور کچھ چھپا رہی ہے۔

"سارا شاہ! میری طرف دیکھو اور بتاؤ ہم ایک دوسرے کو کب سے جانتے ہیں؟"

"کیا مطلب؟" سارا شاہ کو کچھ عجیب سا لگا تھا یہ سوال۔

"مطلب یہ کہ ہم نے کبھی پہلے جب ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپایا تو اب کیوں ضرورت پڑ گئی تم کو؟"

حجاب شاہ نے اس کا چہرہ اونچا کیا۔

"اصل میں جو جو میں... وہ میں۔ مہر علی شاہ سے صاف صاف بات کرنا چاہتی ہوں۔"

سارا نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کے بمشکل تمام کہا۔

"مطلب اظہار...؟"

"ہاں..."

"اور اگر اس نے انکار کیا تو آئی مین ریجیکٹ کا مارجن بھی تو ہے نا۔"

"تو کیا؟ جو قسمت میں لکھا، وہی ہو گا یار! میں... میں اسی وجہ سے آج تک کہہ نہیں پائی ہوں مگر جو جو! مجھے لگتا ہے، مجھے کہہ دینا چاہیے ورنہ میں اس کو کھو دوں گی۔"

سارا شاہ کی آنکھیں عجیب سی لو دیتی ہوئی لگیں اس کو۔ اس کے برعکس سارا کا چہرہ عجیب بے بسی کا شکار تھا اس لیے حجاب اس کو روک نہ سکی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر سارا کی امید ٹوٹ گئی تو کتنا دکھ ہو گا اس کو مگر اس کی بے بسی اور چمکتی آنکھیں حجاب کو روک سکیں۔

"ٹھیک ہے، کر کے دیکھ لو۔ میں دعا کروں گی سارا شاہ تمہارے لیے۔"

اس نے سارا شاہ کے ہاتھ پہ دباؤ بڑھایا تھا۔

"تھینکس!" اور حجاب علی شاہ کو اس وقت دنیا کا مشکل ترین کام سارا شاہ کے چہرے کے تاثرات پڑھنا لگا تھا چمکتی آنکھیں مگر بے بس چہرہ۔

اور پھر ٹھیک دو دن بعد سارا شاہ، مہر علی شاہ کے گھر پہ تھی۔ اس کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ اگر بابا سائیں کو پتا چلا تو وہ کتنا ناراض ہوں گے، مگر دل کا کیا کرتی۔ اس نے اندر قدم رکھ تو لیے تھے۔ مگر اب عجیب سی ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ڈرائنگ کے دروازے تک آئی۔ مگر پھر اندر لوگوں کا ہجوم دیکھ کر وہ گھبرائی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ واپس مڑتی، مہر علی شاہ کی آواز اس کے کانوں میں سرسرائی تھی۔

"ٹھہرو!" وہ آہستہ آہستہ لڑکھڑاتا ہوا اس تک آیا۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا اور گلاس میں کیا تھا۔ سارا شاہ کو اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے اندازہ لگانے میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی۔ عجیب سی گھبراہٹ میں پلو اس کے چہرے سے سرک گیا۔

"تم... سارا شاہ... یہاں؟"

عجیب سی سرد مہری تھی اس کی آواز میں، جسے سارا شاہ نے بخوبی محسوس کیا، مگر وہ فیصلہ کر کے آئی تھی کہ وہ اپنی بات کر کے ہی جائے گی۔

"وہ... مجھے تم سے کچھ کہنا تھا مہر علی!" اس نے اپنے ہونٹوں پہ زبان پھیر کے ان کو تر کیا تھا۔ کاش وہ جان جاتی کہ اس وقت مہر علی شاہ کے ہوش و حواس بوتل میں غرق تھے۔

"ہاں بولو... بلکہ آؤ! بیٹھ کے بات کرو۔" وہ لاؤنج میں پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔

سارا شاہ کو ایک دم گھبراہٹ محسوس ہونے لگی اس کی نظروں سے۔

"نہیں... میں چلتی ہوں۔ اب۔" وہ جانے کے لیے مڑی۔

"نہیں مس سارا شاہ! آپ ایسے نہیں جا سکتیں۔" اب سرد مہری کی جگہ اس کے لہجے میں کچھ اور تھا۔ کیا تھا سارا شاہ سمجھ ہی نہیں پائی۔

"زندگی میں اب تک خریدا ہے۔ چھینا ہے۔ تھالی میں رکھ کر تو پہلی بار مل رہا ہے تو کون کم بخت چھوڑے گا کیا خیال ہے مس سارا شاہ؟"

مہر علی شاہ نے حد کر دی تھی۔ سارا شاہ کی آنکھیں

ہی نہیں دل بھی رونے لگا۔
"بہت لوگوں پر عنایت ہے' وہاں آپ بھی شامل ہو جائیں کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ سنگ دلی سے ہنسا۔
اور سارا شاہ تو مہر علی شاہ کی عنایت پر کچھ دیر پہلے ہی مرگئی تھی اور اب دھندلی آنکھوں سے بس اپنی موت کا خالی منظر دیکھ رہی تھی اور جب..... جب موت ہوتی ہے تو اندر بہت شور ہوتا ہے۔ بہت درد اٹھتا ہے۔ تب باہر کی خبر کہاں رہتی ہے۔ سارا شاہ بھی اپنا لاشہ اپنے ہی کندھوں پہ اٹھا کے لائی تھی وہاں سے ہی کیسے..... ؟ کیا معلوم..... ؟
سارا شاہ کے لرزتے ہاتھوں نے نمبر ڈائل کیا تھا۔
"بابا سائیں! مجھے حویلی آنا ہے ابھی اور اسی وقت"حجاب اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔
"سارا تم..... تم..... کیا بات ہوئی تمہاری مہر علی سے؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟"
حجاب شاہ میں اس سے زیادہ ہمت ہی نہیں ہو پائی کیونکہ سارا شاہ کا چہرہ عجیب پتھر ہو چلا تھا۔
"سارا پلیز! ہمارے پیپرز اور....."حجاب شاہ رونے والی ہوئی تھی۔ اسے ترس آرہا تھا سارا شاہ پہ۔
"بتاؤ نا کیا کہا مہر علی نے؟"بہت کوشش کے باوجود بھی وہ سارا شاہ کی چپ نہیں توڑ پائی تھی۔
سارا شاہ چلی گئی اور اگلے ہی دن حویلی سے اس کی موت کی خبر آئی۔ حجاب شاہ کو یقین نہیں ہوا کہ وہ اتنی آگے نکل چکی تھی مہر علی کی محبت میں۔
اور مہر علی شاہ' سارا شاہ کی موت سے ہی مر گیا۔ ایسا گرہن لگایا تھا سارا شاہ نے اس کو کہ وہ پہروں خود کو ہی تلاشتا رہتا۔ اپنا ہی چہرہ' اپنا ہی وجود ڈھونڈتا رہتا تھا۔
حویلی میں کسی کو کچھ پتا نہیں تھا سوائے حجاب شاہ اور مہر علی شاہ کے کہ کیا ہوا تھا اور کیوں؟ حجاب شاہ سے نظر ملانا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی لاکھ منتیں نہ تو سارا شاہ کو واپس لاسکیں اور نہ حجاب شاہ کے دل میں موجود اپنے لیے نفرت کو مٹا پائی تھیں۔

☼ ☼ ☼

پچھلے چار سالوں سے مہر علی شاہ سکون کے لیے معافی کے لیے اور اپنے وجود کو پانے کے لیے کتنی بار نجانے کتنی ہی بار حجاب شاہ کے پاؤں تک آیا' مگر حجاب شاہ اپنے اور سارا شاہ کے تعلق سے اور شاید اسی ایک وقت سے ہی آگے نہ نکل پائی۔ نہ جانے کیوں..... ؟
سارا شاہ کی موت سے تقریباً" سال بعد ہی جب بابا سائیں نے مہر علی شاہ کی حالت کو دیکھ کر شاید یا پھر پھر شاید حجاب شاہ کی چپ کو دیکھ کر حجاب شاہ کے سر پہ ہاتھ رکھا اور اپنے دل کی سنائی تو حجاب شاہ ان کے سینے پہ سر رکھ کر رو پڑی تھی۔
"بابا سائیں! اس کا دکھ مجھے مہر علی شاہ سے نفرت پہ اکساتا رہتا ہے۔ اس کی روح' اس کی مہر علی شاہ سے محبت اور پھر اس کی محبت میں اس کا مر جانا مجھے سکون نہیں لینے دیتے بابا سائیں۔"
اور وہ کیا؟ کیوں؟ اور کیسے' سب کچھ ان کو بتاتی چلی گئی۔
"دیکھو پتر! میں یہ نہیں کہتا کہ مہر علی شاہ بے قصور ہے' مگر سب کچھ اسی کے کھاتے میں ڈالنا بھی انصاف نہیں۔ ہاں! اس وقت مہر علی شاہ جس جگہ پہ تھا' اپنے رویے اپنے کردار کے حوالے سے تو سارا شاہ نے غلطی کر ڈالی۔ میں نے تم میں..... اور سارا شاہ میں کبھی بھی فرق نہیں جانا پتر!" وہی ٹھہرا ہوا شفیق لہجہ۔
"اور اب تو مہر علی شاہ نے بہت تاوان بھرا ہے اپنی نادانی کا۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں..... ؟"
وہ ٹھہرے تھے اور پھر سے گویا ہوئے۔
"حجاب شاہ! اگر سارا شاہ' مہر علی شاہ کے بجائے ہم پہ بھروسا کرتی تو شاید ایسا نہ ہوتا۔ آپ جانتی ہیں کہ مہر ہماری کوئی بات رد نہیں کرتا اور ہمارے اور آپ لوگوں کے درمیان ایسا بھی کچھ نہیں رہا کہ سارا شاہ ہم سے بات نہ کر سکتی تھی۔ ٹھیک ہے پتر! آپ کا اعتراض اور انکار' ہو سکتا ہے بلاوجہ نہ ہو' مگر آپ پچھلے ایک سال سے دیکھ تو رہی ہیں کہ مہر علی شاہ' وہ مہر علی شاہ نہیں رہا۔ اس کی نظریں ندامت سے اٹی رہتی ہیں۔ میں نے خود اس کو سارا شاہ کی قبر پہ گھنٹوں روتے دیکھا ہے۔"
وہ چپ ہوئے تو حجاب شاہ نے ان کے سینے سے سر اٹھایا۔ اور جب وہ بولی تو ہمیشہ کی طرح لہجہ بہت ٹھہرا ہوا تھا۔
"بابا سائیں! سارا شاہ نے جس دن مہر علی شاہ کو معاف کر دیا' میں..... میں اسی دن اپنا انکار واپس لے لوں گی آپ سے..... اور مجھے معلوم ہے' تب تک آپ بھی میرا ساتھ دیں گے۔"
وہ یہ کہہ کر رکی نہیں تھی کیونکہ وہ اپنی بے بسی سے دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی ان کو۔

☼ ☼ ☼

ٹھیک دو دن بعد وہ حویلی میں موجود تھا۔ نجانے وہ کون سی ایسی ضرورت تھی' جس نے اتنے عرصے میں پہلی بار اسے حویلی آنے پہ مجبور کیا اور پھر آخر کار یہ راز بھی کھل گیا۔
وہ حجاب شاہ سے انکار کی وجہ دریافت کرنے آیا تھا اور اسی وجہ سے وہ اب اس کے سامنے موجود تھا۔
"انکار کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"
"نہ سلام نہ دعا' سیدھا ہی مطلب..... شاہ جی! پہلے ہمیں کچھ آداب میزبانی نبھانے دیتے۔"
حجاب شاہ کے لہجے میں چھپا طنز وہ بہت اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔
"آپ پہلے مجھے میرے سوال کا جواب دیجیے' یہ آداب میزبانی بعد میں....."
"ہا..... تو پھر پہلے آپ کو میرے سوال کا جواب دینا ہوگا....."
"کیسا جواب؟"
"آپ یہ شادی کیوں چاہتے ہیں؟"
"کیونکہ....." وہ کہتے کہتے حجاب شاہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔ آخر وہ یہ سوال کیوں کر رہی تھی۔ بات کی تہہ تک تو نہیں' مگر وہ کہیں نہ کہیں پہنچا تھا کہ اس کی نظریں زمین میں گڑ گئی تھیں اور پھر نہایت مدھم آواز آئی تھی۔
"کیونکہ..... کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" بہت ٹھہر ٹھہر کر لفظ ادا ہوئے تھے اس کے ہونٹوں سے۔
"مجھے لگتا ہے حجاب شاہ کہ میں..... میں تمہارے بغیر کبھی خوش نہیں رہ پاؤں گا۔ حجاب شاہ! میرا دم گھٹنے لگتا ہے' سانس مشکل لگنے لگتی ہے مجھے تمہارے وجود کے بغیر۔"
"اوہ! تو مہر علی شاہ محبت کی بھیک مانگنے آئے ہیں۔ آپ..... آپ کو یاد تو ہوگا شاہ جی! کہ کچھ ہی عرصہ پہلے ایک زندہ سلامت انسان نے ایسے ہی..... ہاں! بالکل ایسے ہی محبت کی بھیک مانگی تھی۔ تب..... تب اس غلاظت بھرے لفظوں سے آپ کا دم کیوں نہیں گھٹا تھا شاہ جی! اس توہین سے بھری بھیک کی پٹاری نے اسے اپنا ہی گلا گھونٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔" وہ بہت چبا چبا کے بول رہی تھی۔
"یاد ہے نا شاہ جی! تو کیوں..... آخر کیوں کروں میں رحم آپ پہ؟ اور تب بھی شاہ جی..... تب بھی آپ کو لگتا ہے کہ تم آپ قابل رحم ہیں.....؟ تب بھی آپ کو لگتا ہے کہ آپ کی جھولی خالی نہیں لوٹائی جانی چاہیے نا تو ٹھیک ہے جائیے جا کر معافی مانگیے' اس وقت تک میرے پاس مت آئیے گا' جب تک سارا شاہ اور اس کا رب آپ کو معاف نہ کر دیں اور ہاں شاہ جی....."
وہ کہتے کہتے رکی تھی۔ مہر علی شاہ نے پلکیں جھپکا کے اس درد کو اندر اتارا تھا۔ "میں آپ کی اس ندامت کا تماشا دیکھنے ضرور آؤں گی۔"
مہر علی شاہ کی زندگی میں یہ پہلی دفعہ تھا کہ اس کی ذات میں چھپی درندگی اور غلاظت کو اس پر اس طرح آشکار کیا گیا تھا' جس نے اس کی رگوں میں لہو منجمد کر ڈالا تھا۔ بے شک حجاب شاہ نے لفظوں کے تیر برسا کر اسے آئینہ دکھایا تھا۔ اس سے پہلے کہ اسے اپنی ہی شکل کی اصلیت کا خوف مار ڈالتا' وہ باہر نکل گئی تھی۔
تب سے آج تک کوئی نہیں جانتا تھا کہ مہر علی شاہ حویلی کیوں نہیں جاپاتا ہے' سوائے تین لوگوں کے۔ ان

تین لوگوں میں میراں بھی شامل تھی۔

☼ ☼ ☼

آج اس کا دل نہیں کر رہا تھا کہ وہ جائے مگر وہ جانتی تھی کہ ان دو آنکھوں کو شدت سے اس کا انتظار رہتا ہے۔ وہ جانتی تھی' وہ اس کی ایک جھلک پانے کو بے تاب ہوں گی' مگر آج اس کے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ ان آنکھوں کی یہ بے تابی ختم کر دینا چاہتی تھی۔ حجاب شاہ کو لگ رہا تھا کہ اس کی نفرت کا یہ سفر بے معنی تھا۔ اصل میں تو وہ کسی اور ہی راستے پہ نکل آئی تھی اور پھر اچانک ہی فیصلہ بھی ہو گیا تھا۔

"میراں... میراں۔"

"جی بی بی!" میراں بھاگی ہوئی آئی تھی۔

"چادر لاؤ اور ڈرائیور سے بولو گاڑی نکالے۔"

وہ جب بھی مہر علی شاہ کی ندامت کا تماشا دیکھنے کے لیے جاتی تھی اس کی گردن نفرت سے تنی رہتی تھی مگر آج حجاب شاہ کو لگ رہا تھا جیسے گردن ڈھلک کر کندھوں پہ آ گئی ہو۔ اسے تائی اماں کا دکھ اپنے سینے میں درد ابھارتا محسوس ہو رہا تھا اسے اپنا آپ بہت بونا سا لگنے لگا تھا۔ مہر علی شاہ کے سامنے۔

وہ بھاری قدموں سے آئی تھی۔ سامنے ہی تو وہ دشمن جاں موجود تھا' اور حجاب شاہ کو مہر علی شاہ پہ آج غصہ نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی اس سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے تو خود پر رحم آ رہا تھا۔

حجاب شاہ نے اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تھے اور آج مہر علی شاہ سے آنکھ نہیں اٹھائی گئی۔ کیوں آج سکون تھا۔ کیوں مہر علی شاہ کو گمان سا گزرا تھا کہ جیسے سارا شاہ اور اس کے خدا نے آج اس کو معاف کر دیا ہے۔ اسی احساس میں وہ حجاب شاہ کے وجود کو فراموش کر بیٹھا تھا' پھر اس نے سنا' جیسے کوئی اس کو پکار رہا تھا۔

"شاہ جی!" مہر علی شاہ نے نظریں اٹھائی تھیں اور حجاب شاہ کی آنکھوں میں اپنے گمان کو سچ ہوتے دیکھا۔ مسکراہٹ نے بہت عرصے بعد اس کے لبوں کو چھوا تھا۔ اس کے چہرے پہ کرب کے جو سائے رہتے تھے۔

آج ان کی جگہ سکون بخش نرماہٹ تھی۔ بہت تفصیلی جائزہ لیا تھا حجاب شاہ نے اس کا۔ اور جب' جب خوف کی جگہ پھر آنکھوں میں انتظار نے پر پھیلانے چاہے تھے تو حجاب شاہ کو نجانے کیوں الجھن ہوئی تھی۔

نجانے یہ عشق کا کون سا رنگ تھا جو حجاب شاہ کے چہرے پہ آیا تھا۔

"گھر چلیں شاہ جی!"

نجانے پوچھا گیا یا باخبر کیا گیا تھا کیونکہ جواب انتظار کیے بغیر ہی وہ اس کا ہاتھ تھامے لے جا رہی تھی۔

روایت ہے کہ ہمیشہ مرید ہی پیر کا اسیر ہوتا ہے! لیکن آج لگ رہا تھا کہ پیر اسیر ہو گیا تھا۔ تب مہر علی کے لبوں پہ التجا تھی جو بہت خاموشی سے حجاب شاہ تک پہنچائی گئی۔ وہ اب بھی اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی اور مہر علی شاہ کا وجود اس کے ساتھ بندھا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے لبوں نے ہولے سے جنبش کی تو حجاب شاہ کو رکنا پڑا!.....

ساکوں دل نئیں پار محبتاں دا اساں بھولے کھلے لوک ہے
تو سامنے اکے اکھ ملا انج ورق ورق ساکوں عشق پڑھا
اساں بھٹکی روح دے وانگ ودے' نہ جی سکدے نہ مر سکدے
ہک واری عرش تو ہو آوں ساکوں عشق دا ایہہ جئی زہر پلا
ساری عمر آوارہ گزر گئی نہ اے ڈٹھی نہ اوڈٹھی
بن ملک تو یار فقیروں نوں کوئی ایہہ جئی کر تجویز سزا

(مجھے محبت کرنا نہیں آتی' میں اتنے بکھیڑے نہیں پال سکتا' میں بھٹکی روح کی طرح ہوں نہ جی سکتا ہوں نہ مر سکتا ہوں۔ مجھے ایسا زہر عشق پلا کہ عرش تک ہو آؤں۔ ساری عمر آوارہ گردی میں گنوا دی نہ دنیا کو برتا نہ آخرت کو' کوئی ایسی سزا دے کہ بادشاہ سے فقیر بن جاؤں)

☼

میمونہ اکبری

آزمائشوں کا دور خاصا طویل ہوتا جا رہا تھا۔ اسے نئی مایوسیاں گھیرے رکھتیں۔ کبھی نوکری کا نہ ملنا' کبھی مل کے چھوٹ جانا اور پھر وہی لعن طعن اور تنگ دستی... اس کے چمکتے کالے جوتوں کے تلے گھسٹے

گھسٹ کے ختم ہونے کو تھے اور جواں سال مرد ایسا نحیف و نزار دکھتا تھا، جیسے کبھی جواں رہا ہی نہ ہو۔ وہ جو ثمر ڈھونڈتا تھا، وہ خود بھی پوری طرح سے نہ جانتا تھا۔ کیونکہ وہ بھول چکا تھا کہ اس نے کیا بو رکھا ہے۔ فصل تو پک کے کٹنے کو تیار کھڑی تھی، پر اس کے پاس کوئی اوزار نہ تھے، بس آزار تھے، جنہیں وہ اپنی پونجی بنائے صبح سے شام تلک اداس رہتا تھا۔ اور اس کی راتیں سپنے بننے میں کٹ جاتی تھیں۔

سیر و سیاحت کا بہت شائق تھا۔ دیامر کی وادیوں اور بلتت کے قلعے سے لے کر بنوں اور ڈیرہ کی ریتیلی دھرتیوں تک پورا پختونخوا اس نے سر کر رکھا تھا۔ مگر۔۔۔ اس کی تلاش، اس کی پیاس جانے کیا ڈھونڈتی پھرتی تھی اور جو اس کے گھر میں تھا، جانے اس کی منزل تھی یا مسافتوں کا بوجھ۔۔۔ لیکن اگر ریت یا پھر برف کے ہی کسی طوفان میں مظفر سے کھو گئی ہوتی تو شاید اس کی زندگی بہت پہلے سنور جاتی۔

وہ اس کی دلہن تھی۔ دکھنے میں نار پھل سے بھرا بھرپور جسم، پر چکھنے پر بالکل بنجر۔ بانجھ تو نہ تھی پر سواد میں بہت بے گانی تھی۔ نہ کسی ریت کی، نہ رواج کی، نہ کسی کام کی، نہ کاج کی۔ شادی کے دس سال ہونے کو آئے تھے، پر مظفر اس کے ہاتھ کی چائے سے ابھی تک محروم تھا۔ ہر صبح جب وہ اپنی بوڑھی ماں کا ہاتھ کا بنا ناشتا کرتا، تو دل مسوس کے رہ جاتا۔ اب تو نارسائی اس کی ذات کا حصہ بن گئی تھی۔ وہ کسی ناکردہ جرم کی سزا کاٹ رہا تھا۔ ابھی تک وہ سمجھ نہ پایا تھا کہ وہ عورت اسے اولاد کی نعمت سے محروم کیوں رکھنا چاہتی ہے۔ آخر وہ کس کی منتظر ہے؟ اس کی راتیں بہت بے کیف گزرتی تھیں۔

وہ اپنی ان بے کیف راتوں کا مجرم ٹھہراتا بھی تو کسے اور کیونکر۔۔۔ اس کی پیدائش سے بھی پہلے وہ اس کے سر لگا دی گئی تھی۔ شعور کی آنکھ کھولتے ہی وہ جان گیا تھا کہ اس کے کانچ سے نازک خوابوں کی ریشمی ڈوروں سے وہ بھاری بھرکم وجود الجھ رہا ہے اور اسے ان ہی بن مانگی، بن چاہی الجھنوں سے مزید الجھنا ہے۔ سلجھنے سلجھانے کا کوئی رستہ نہیں ہے۔

اسے اپنی پھوپھی کی آٹھویں صاحب زادی کو لازمی بیاہ کر لانا تھا۔ تاکہ اس کی بوڑھی پھوپھی کے سر سے ذمہ داریوں کا ایک پہاڑ آسانی سے سرک جائے۔ ہمدردی کی اس مدھم آنچ سے پگھل کر پگلے نے ریتیلا پتھریلا پہاڑ اپنے نازک کندھوں پہ دھر لیا تھا، جو اس کے سر آنے کو ہر لحظہ تیار رہتا تھا۔ جس نے اس کے دہن کے ذائقے ہی خراب کر دیے تھے۔ آنکھوں میں ریت چبھے تو آنسو بہا کے آنکھیں صاف ہو جاتی ہیں، پر وہ چبھن تو اس کے لہو میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔

عمر میں خود سے بہت بڑی لڑکی کو بیاہ کے لانا تھا اس نے۔ نوجوانی میں قدم رکھتے ہی جبکہ ابھی پختہ عمر کے خواب بھی نہ بنے تھے، نہ ہی کوئی محبت کرنے کا موقع ہی پایا تھا کہ اس پہ دلہن لاد دی گئی۔ عمر میں بھی بھاری، وزن میں بھی اور ضد میں بھی۔۔۔ اور ضد بھی وہ کہ جس میں صرف خود غرضی جھلکے۔

اک معصوم بندے کے نام کا سہارا پا کر اسے بہت سے معاملوں میں آزادیاں مل گئیں۔ پہلے وہ لڑکی ہونے کی وجہ سے بہت سی جگہوں پہ بے بس تھی، اب وہ شادی شدہ عورت تھی۔ بہت سے معاملوں میں خود مختار، اور اپنے کنوارپن کو بھی بچائے ہوئے، پختہ جو تھی اتنی آسانی سے مظفر کے ہاتھ کیسے آتی۔ حالانکہ اس ارمانوں سے بھرے بھولے شہزادے نے اپنی پہلی شب وصل کے لیے چاندی میں نہائی، سحر انگیز، پرنور سفید رات کا انتخاب کیا تھا۔

لوگ مظفر سے کہتے کہ دیوانی ہے، سمجھ جائے گی اور وہ صرف سوچ کر رہ جاتا کہ کاش دیوانی ہوتی۔ اور وہ تھی بھی نہیں۔ اسے تو ہر بات کی سمجھ تھی، بس وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

مظفر نے بہت سی جگہوں پہ چھوٹی چھوٹی نوکریاں شروع کر رکھی تھیں۔ اب وہ سارا دن محنت کر کے اتنا کما لیتا کہ اس کے گھر کی ضرورت کے ساتھ ساتھ عشرت بھی پوری ہوتی رہے۔ پر جب شام ڈھلے تھکا ہارا لوٹتا تو کوئی اس کا خیر مقدم نہ کرتا۔ وہ خود ہی خود کو

اگلے دن کی مشقت کے لیے تیار کرتا اور اپنی اس بے بسی کو سگریٹ کے دھوئیں میں اڑانے کی تگ و دو کرتا۔ دھوئیں کے مرغولے نہ جانے اسے کہاں سے کہاں لے جاتے تھے۔ اس سبب جب تک وہ گھر میں ہوتا، دھواں سلگائے رکھتا۔ سگریٹ بجھاتا تو اپلے تاپنے بیٹھ جاتا۔ وہاں سے اٹھتا تو کمرے میں مچھر بتی سلگا کے اسی دھوئیں میں سو رہتا۔ صبح اٹھتا تو آنکھیں پوری کھولنے سے پہلے ہی موٹر سائیکل کے دھوئیں میں دفتر چلا جاتا اور پھر اگلے اندھیرے میں لوٹتا۔

چھٹی کا دن اس کی عیاشی کی انتہا ہوتا۔ اس دن وہ صبح دیر سے جاگتا۔ ناشتے سے پہلے ایک سگریٹ سلگاتا، پھر اپنی ماں کے ہاتھ کا بنا پراٹھا انڈے کے ساتھ کھاتا۔ ایک پیالا چائے کا پیتا اور اپنے ماموں کے ہاں چلا جاتا۔

ماموں کا گھر اس کے لیے بہت اہم تھا۔ وہاں اس کا بچپن رقصاں تھا۔ اس کے کھلکھلا کے ہنسنے کی گونج ان دیواروں میں اب بھی باقی تھی اور اس کے معصوم وجود کی غمازی کرتی تھی۔ وہ بہت بے ضرر انسان تھا۔ گھنٹوں ایک جگہ بیٹھ کے گزار دیتا۔ پڑھی ہوئی کہانیاں بار بار پڑھ لیتا۔ چپ کر کے بہت سی باتیں سن لیتا۔ نہ جانے سنتا بھی تھا یا صرف چپ کیے بیٹھا رہتا تھا۔ پر کچھ تو کرتا تھا۔

وہ گھر اس کے لیے سپنوں کا شہر تھا۔ اس کی واحد امان گاہ۔ وہ جب خوف زدہ ہوتا تو زمانے سے چھپ کے وہیں چلا جاتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس گھر میں بھی بہت تبدیلیاں آئیں۔ بچے بڑے ہو گئے، بڑے بوڑھے ہو گئے۔ کچھ نئے چہرے بھی آ بسے۔ پر ان سب کا آپس میں اور اس کے ساتھ، جو خاموش بندھن تھا، وہ اک مقدس سا تعلق تھا۔ وہ جوں کا توں قائم رہا۔ اس میں کہیں کوئی دراڑ نہ آئی۔ وہ کبھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سپنوں کا وہ رنگ محل اس سے چھوٹ جائے۔ پر دنیا کو اور بہت اہتمام سے اس کی اپنی دنیا کو اس کا وہاں جانا بہت کھٹکنے لگا۔

وہ اس کے قریب کبھی نہیں آئی تھی۔ مگر اس کے نام پہ ایک عرصے سے رہ تو رہی تھی، سو باقی دنیا کے نزدیک تو اس کی اہمیت صفر ہو چکی تھی۔ وہ دسویں سال ہی سہی، پر جان گئی تھی کہ اب اسے وہیں رہنا ہے۔ چاہے جو بھی کر لے۔ تب اسے اجنبی وسوسوں نے گھیر لیا۔ اسے اپنے مظفر میں بہت کچھ مشکوک دکھنے لگا۔ اور سب سے پہلے اس نے مظفر سے اس کا رنگ محل چھین لینا چاہا۔ اس کے وہاں جانے کو اتنا اچھالا کہ دنیا اعتراض کرنے پہ مجبور ہو گئی۔ اسے مظفر کی شخصیت میں اپنا عکس دکھنے لگا اور اسی عکس کی دھند نے مظفر کے پاکیزہ رشتے اس کی نظر میں مشکوک کر دیے۔

مظفر کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس احسان کے بدلے یہ عورت اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لینا چاہتی ہے۔ پھر اسے ان سب نے سمجھایا، جو اس کی کائنات تھے، اس کے رنگ محل کے ساحر ساتھی۔ اسے عزت کے واسطے دیے۔ مثالیں دیں اور مجبور کر دیا کہ جو بھولا واپس آنا چاہے اسے گلے لگاتے ہیں، بھولا نہیں کہتے۔

آخر کار آہوں کی سرزمین پہ تیار ہونے والے مکان کی زینت بننا اس نے گوارا کر ہی لیا۔ اور اس کے بدلے اسے ایک بچہ بھی دے دیا گیا، جو اس کی کائنات نہ سہی، پر دنیا ضرور تھا۔ لیکن بہت جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس مکان میں اس کی حیثیت گل دان کی سی ہے۔ جس کونے میں چاہو اٹھا کے سجا دو۔ اب اس کے پاس کوئی امان گاہ بھی نہ تھی۔

وہ اس سے کوئی بدلہ لینا چاہتا تو اس کے قدم زمین پکڑ لیتی اور کہتی کہ تم تو اسے معاف کر چکے ہو، پھر کیوں؟ اور اس کیوں نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ لیکن اب اسے جینا تھا۔ اپنے بچے کے لیے، اپنے گھر کے گلدان کے لیے، تاکہ کچھ تو زینت باقی رہے۔

اور اس کی عمر تو یوں بھی ڈھلنے لگی تھی۔ بیٹا بھی بڑا ہو گیا تھا اور اس نے باپ کو بہت جلد جان بھی لیا اور پا بھی لیا۔ اب دونوں باپ، بیٹا تانے بانے بنتے تھے اور خوش رہتے تھے اور وہ عورت ان کے تانے بانوں میں الجھ الجھ جاتی تھی۔ مگر اب سلجھنے کی عمریں گزر چکی تھیں۔

سنبل جبیں

شبِ آرزو کا عالم

ناولٹ

پام اور مولسری کے درختوں سے گھری ہوئی دورویہ پگڈنڈی پر وہ گھڑسوار پوری رفتار سے بھاگتا چلا آرہا تھا۔ کچی زمین سے اٹھتی دھول اس کی شناخت چھپالیتی اگر اس کے لگاموں کو تھامے ہوئے مخروطی ہاتھ اور ہوا کے دوش پہ اڑتے خوب صورت سنہرے بال اس کی دوشیزگی کا رازنہ کھول دیتے۔

فارم ہاؤس کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے اس نے لگامیں کس کر رفتار آہستہ کردی تھی۔ باڑ کے قریب جاکر گھوڑا روکا۔ چھلانگ لگاکر نیچے اتری۔ لگامیں سائیس کو تھمائیں اور خود لانگ شوز پہنے ٹھک ٹھک کرتی اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گئی۔ سیٹنگ روم میں ہی اس کا ٹکراؤ زین سے ہوگیا۔

"کہاں تھیں تم؟" اس کے ماتھے پہ شکن تھی اور لہجے میں سرد مہری۔

اس نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا اور آگے بڑھنے لگی تھی' جب اس کا ہاتھ زین کی گرفت میں آگیا۔ وہ جھٹکے سے اس کی طرف مڑی۔

"جسٹ اسٹاپ اٹ۔ آئم ناٹ یور بیٹ میرزین خان!" وہ دہاڑ اٹھی تھی۔

"ان فیکٹ یو آر۔" وہ طنزیہ مسکرایا۔ ہمیشہ کی طرح اس کی مسکراہٹ اور لب و لہجے نے اسے مزید مشتعل کردیا تھا۔ کوئی بھی جواب دینے کی بجائے وہ جھٹکے سے ہاتھ چھڑاتی آگے بڑھ گئی۔

"کل کے فنکشن کی تیاری کیسی ہے؟" وہ دروازے تک پہنچی تھی' جب پیچھے سے اس کی آواز آئی۔

"میں آپ کو صبح مطلع کرچکی ہوں' سو اب اس پہ بات کرنا فضول ہے۔" وہ سرد مہری سے کہتی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

زین دانت بھینچے وہیں کھڑا رہ گیا تھا' مگر یہ صرف لمحاتی کیفیت تھی۔ اگلے ہی پل وہ دندناتا ہوا اندر کی
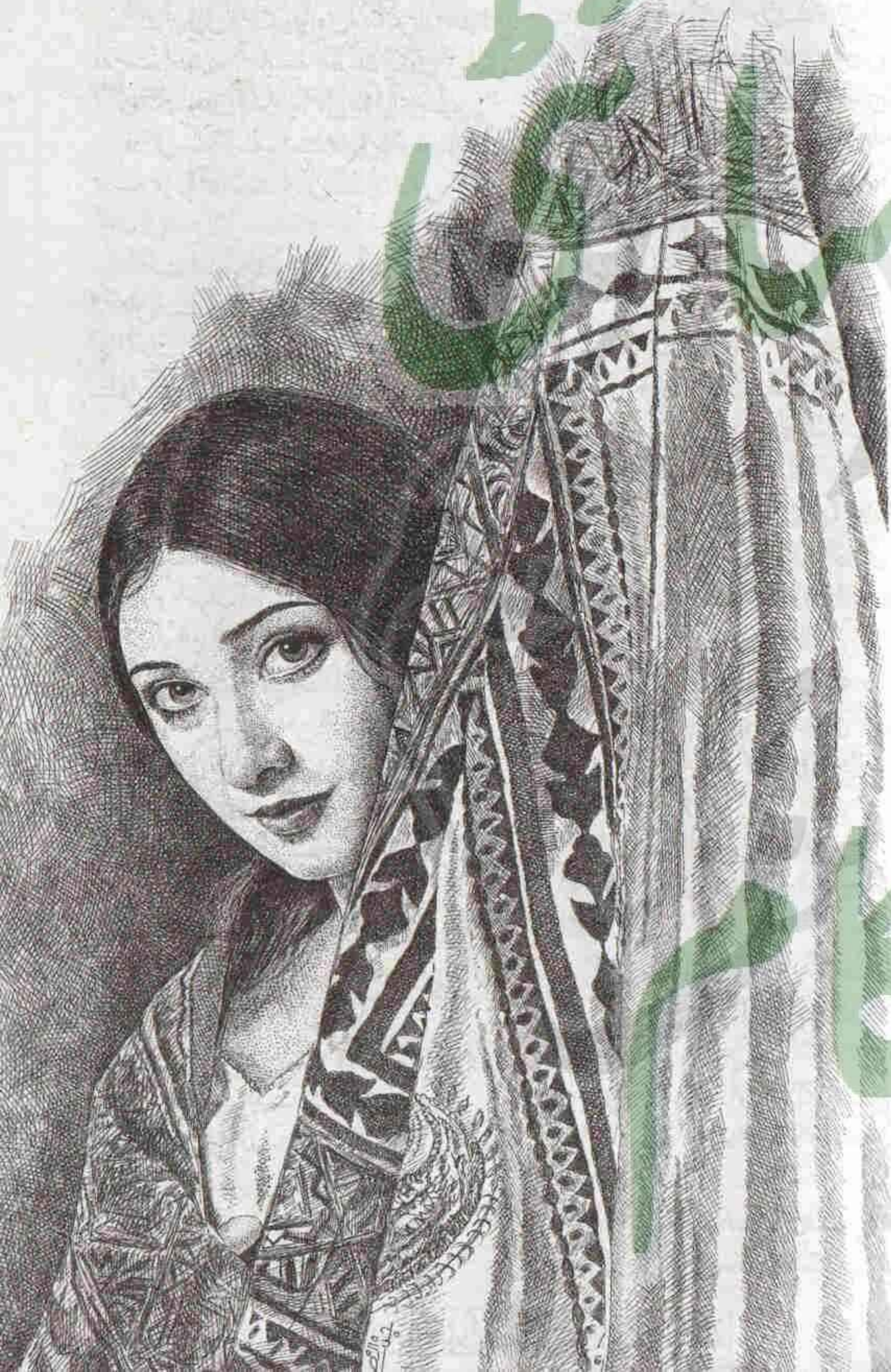
طرف بڑھا تھا۔ دھاڑ سے دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تو وہ اسے وارڈروب سے کپڑے نکالتی نظر آئی۔ وہ جھپٹنے والے انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

"ابرش بی بی! اگر میں چاہوں تو تمہیں دو منٹ میں درست کردوں۔ تمہارے سارے پرزوں کی ایسی اصلی ترتیب دوں گا کہ بولنا بھول جاؤ گی اس لیے....."

وہ اس کے شانے پہ اپنے بھاری ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے غرا رہا تھا ـــــ ابرش نے چلا کر اس کی بات کاٹ دی۔

"شٹ اپ، اپنا یہ بازاری لہجہ میرے ساتھ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ ہی مجھ پر اپنا افسرانہ رعب جھاڑنے کی کوشش کیجیے گا۔" اس نے وارننگ دی۔

اس سے پہلے کہ وہ بھی اسے کوئی سخت سا جواب دے پاتا، ابرش کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے جیکٹ کی اندرونی جیب سے سیل نکالا تو زین کا غصہ مزید بڑھ گیا۔ وہ کچھ دیر پہلے اسے کتنی ہی دیر کال کرتا رہا تھا۔ مگر بیل جاتی اور نو آنسرنگ آجاتا۔ اب اس سے پہلے کہ وہ فون آن کرکے کان سے لگاتی، زین نے اس سے فون چھینا اور ایک جھٹکے سے دیوار پہ دے مارا۔ وہ ہکابکا سی رہ گئی، یقیناً" اسے زین سے یہ امید قطعاً" نہیں تھی۔ اس نے پتھرائی ہوئی نگاہ فون کے پرزوں پہ ڈالی۔ یہ فون چار دن پہلے ہی تو اسے بابا نے گفٹ کیا تھا۔ اسی "منحوس حادثے" کی خوشی میں جس کے بعد اس کی زندگی میں یہ شخص آگیا تھا۔

"جب اس فون پہ میری کال ریسیو نہیں ہوسکتی تو اسے یقیناً" تمہارے پاس نہیں ہونا چاہیے۔" وہ اطمینان سے بولا تھا۔

وہ اس قدر حیران و پریشان تھی کہ کچھ کہنے یا کوئی ردِ عمل دینے کے بجائے بے جان انداز میں زمین پہ بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رونے لگی جبکہ وہ پلٹا اور کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

ویمن ہاسٹل سے دو لڑکیوں کا اغوا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ نچلی سطح سے لے کر اعلا سطح تک ایک بار تھرتھلی مچ گئی تھی اور کیوں نہ مچتی جبکہ اس کے پیچھے میر الٰہی بخش خان تھے۔ انہوں نے فوری طور پر اعلا پر تحقیقات کا مطالبہ کردیا تھا کہ آخر ان کی نازوں پلی اکلوتی لختِ جگر "ابرش الٰہی خان" بھی تو اسی ہاسٹل میں مقیم تھی۔ کتنا کہا تھا انہوں نے اسے کہ وہ ان کے شہر والے بنگلے میں رہائش اختیار کرلے، مگر وہ بھی ضد پکی، بالکل ان پہ گئی تھی، مان کر نہ دی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کیوں اکیلی اس بنگلے میں سر پھوڑے جبکہ وہ بنیادی طور پر بھی "بیرون بیں" شخصیت۔

خیر! اس وقت پولیس کی مشینری پوری طرح حرکت میں آچکی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ تفتیش کرنے کے لیے ہاسٹل کے آفس میں موجود تھا۔ جب وندنا تی ہوئی ابرش اندر داخل ہوئی۔

"بی بی! آپ یہ بتائیں ان لڑکیوں کا کردار کیسا تھا؟" بڑے سکون سے کرسی پر براجمان ہاتھ میں مخصوص پولیس فسروں کی اسٹک تھامے وہ وارڈن سے پوچھ رہا تھا۔

"دیکھیے ایس پی صاحب! یہاں سے دو لڑکیاں اغوا ہوچکی ہیں اور آپ کو ان کے کردار کی جانچ پڑتال کی پڑی ہوئی ہے۔" بے حد جھلائی ہوئی آواز میں اس نے دخل اندازی کی تھی۔

وہ کرسی سے اٹھا اور پورے کا پورا اس کی طرف گھوم گیا۔ وہ قدرے چونکی، وہ قدم بڑھاتا اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔

"اپنے بیان کی درستی کریں محترمہ! لڑکیاں اغوا نہیں غائب ہوئی ہیں۔" اس کا لہجہ بڑا کھردرا تھا۔

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق پڑتا ہے۔ اغوا "کیا" جاتا ہے اور غائب "ہوا" جاتا ہے، آیا سمجھ میں؟" اس نے اس بار طنزیہ کہا۔

"تو آپ کا کہنا ہے کہ وہ یہاں سے اپنی مرضی سے غائب ہوئی ہیں؟" اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔

اس کی آنکھوں میں حیرت چمکی تھی، کس حق سے وہ اس سے سوالات پہ سوالات کر رہی تھی۔ اس نے اسٹک کو اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھتے ہوئے اس کے چہرے کو ذرا سا اوپر اٹھا دیا۔

"میں اپنا کام کرنا جانتا ہوں ابرش بی بی! اور میں کیسا افسر ہوں، تم بھی جانتی ہو اور تمہارا باپ بھی۔ اس لیے میرے راستے میں آنے کی کوشش مت کرنا، ورنہ برا حشر کردوں گا۔" دھیمے مگر آگ اگلتے لہجے میں کہہ کر وہ جھٹکے سے مڑا اور باہر نکل گیا۔

وہ وہیں ساکت تھی۔ چند ثانیے بعد وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد وہ روتے ہوئے اپنے بابا "میر الٰہی بخش خان" سے مخاطب تھی۔ ساری بات من وعن انہیں بتادی تھی، البتہ آخر میں اس نے قدرے مبالغہ آرائی سے بھی کام لے لیا تھا۔ وہ ابا" اسے ڈھیروں تسلیاں دے رہے تھے، بہلا رہے تھے اور یقین دہانی کروا رہے تھے کہ وہ ابھی کے ابھی آئے گا اور اس سے اپنے بدصورت رویے کی معافی مانگے گا۔ فون بند کرنے کے بعد اس نے آنسو صاف کیے اور محظوظ ہونے والے انداز میں مسکرائی تھی۔

"ایسی کی تیسی تمہاری افسری کی۔ ابھی تم نے مجھے جانا ہی کہاں ہے میر زین خان!" بڑبڑائی تھی۔

تقریباً" آدھا گھنٹہ گزرا ہوگا جب اسے گیٹ پر زین کے آنے کی اطلاع ملی۔ بڑی مطمئن مسکراہٹ کے ساتھ وہ باتھ لینے کے لیے بڑھ گئی۔ وہ اسے خوب انتظار کروانے اور اس کا ضبط آزمانے کے موڈ میں تھی۔ نہانے کے بعد وہ بالوں میں برش کر رہی تھی، جب ردا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ردا اس کی ہم جماعت اور روم میٹ تھی۔

"ابرش! تمہارا کزن گیٹ پر آدھے گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ کیا تم کہیں جا رہی ہو؟"

"نہیں۔ ابھی لوٹ آؤں گی۔" وہ فتح مندی سے مسکراتی باہر نکل گئی۔ ہاسٹل کے گیٹ پر وہ اسے اپنی جیپ سے ٹیک لگائے سگریٹ پھونکتا نظر آیا تھا۔ وہ

چادر کو ٹھیک کرتی اس کی سمت بڑھی تھی۔ زین نے سگریٹ پھینک کر بوٹ سے مسلا تھا۔

"کہیے! کیسے اس ناچیز کو کیسے یاد فرمایا ایس پی صاحب!" اس کی کھنکتی ہوئی آواز میں بڑی طنزیہ مسکراہٹ گھلی ہوئی تھی۔

زین نے بڑی سرد نگاہ اس پہ ڈالی اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"گاڑی میں بیٹھو۔" اس نے دوسرا دروازہ کھول کر کہا۔ لہجہ بڑا سپاٹ تھا۔ وہ چند لمحے کھڑی رہی، پھر اس کی ہدایت پہ عمل کرتے ہوئے بیٹھ گئی اور دروازہ بڑی زوردار آواز میں بند کیا تھا، گویا سارا غصہ نکال دیا تھا۔

"کیا بات ہوئی تمہاری چچا سائیں سے؟" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ابرش نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"انہوں نے آپ کو بتا دیا ہوگا، آئم شیور۔" اس نے اعتماد سے کہا۔

"ہوں.....تو پھر.....؟"

"پھر کیا؟"

"پھر یہ کہ اب مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"آپ مجھ سے ایکسکیوز کریں؟" اس نے اطمینان سے کہا۔

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔

"کیا؟ کیا کہا تم نے؟ ایکسکیوز کروں تم سے؟ بٹ وائے؟" وہ حیرت سے چلا پڑا تھا۔

ابرش نے بھنویں اچکا کر اسے گھورا۔

"آپ نے میرے ساتھ مس بی ہیو کیا تھا۔" اس نے جتایا۔

"اور جو تم نے کیا اس کا کیا؟" وہ تلملا اٹھا تھا۔

"اوکے فائن، آپ بابا کو بتادیں۔" اس نے تسلی سے شانے اچکائے۔

"تم مجھے بلیک میل نہیں کرسکتیں ابرش بی بی!" اس نے طنز کیا۔

"میں ایسا کچھ نہیں کر رہی۔"

"اوکے۔" وہ چند لمحے اسے پرسوچ انداز میں دیکھتا

رہا۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ وہ بے تحاشا کنفیوز ہو گئی۔

" ODear!I wanna apalogy "

وہ مدھم لہجے میں گنگنایا تھا۔ آنکھوں سے پھوٹتی تپش بڑی جان دار تھی۔ ابرش نے جھٹکے سے ہاتھ کھینچ لیے۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" اس کی رنگت تمتمائی ہوئی تھی۔ اس کی حالت پہ زین نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔

"میں ایکسکیوز کیا ہے۔" اب وہ اسے جلا رہا تھا۔

"مجھے ہاسٹل چھوڑ دیں۔" اس نے رخ پھیر کر کھڑکی کی طرف کر لیا۔

"اتنی جلدی کیا ہے؟ چلو میرے بنگلے پہ چلیں۔ اچھا سا ڈنر کریں گے۔" وہ بڑے دوستانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"میں نے آپ سے کہا نا، مجھے ہاسٹل چھوڑ دیں۔" وہ اس کی طرف رخ کر کے بلند آواز میں بولی تھی۔

زین کے لبوں پہ جلا دینے والی مسکراہٹ آ گئی۔

"لگتا ہے ایکسکیوز پسند نہیں آیا؟" اس کا لہجہ بڑا ٹھنڈا تھا۔

ابرش کو اس کی بات چابک کی طرح لگی تھی۔ اس نے بے بسی سے لب کچلے، اس کے ساتھ تو "الٹی ہو گئیں سب تدبیریں" والا معاملہ ہوا تھا۔ کیسا زیرک تھا وہ شخص؟ وہ تو اسے جلانا چاہتی تھی، مگر الٹی آنتیں گلے کو پڑ گئی تھیں۔

"چلو جیسے تم کہو۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

☼ ☼ ☼

میر قربان علی خان اور میر الٰہی بخش خان دونوں بھائی تھے۔ میر قربان وکیل تھے، بے حد پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے اور تہذیب یافتہ۔ ان کا اکلوتا بیٹا زین خان تھا، وہ بھی ان کا پرتو تھا۔ اس نے اپنی مرضی سے پولیس سروس جوائن کی تھی، جس کی وجہ سے اس کے مزاج میں سختی اور تندی آتی چلی گئی، پیشہ ہی ایسا تھا کہ سخت دل بنے بنا چارہ ہی نہ تھا۔

دوسری طرف میر الٰہی بخش خان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ان کا بڑا بیٹا ایک مشہور و معروف صنعت کار تھا۔ شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ تھا اور کراچی میں اپنی اسٹیل مل چلا رہا تھا۔ دوسرا بیٹا نیوز اینکر تھا اور اسلام آباد میں ہوتا تھا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا جبکہ تیسرا بیٹا امریکہ میں انجینئرنگ پڑھ رہا تھا۔ ان کے بعد ابرش تھی۔ بے حد لاڈلی، ضدی اور اپنی منوانے والی۔

گاؤں کے پس منظر کے باوجود وہ ہاسٹل میں رہائش اختیار کرتے ہوئے آگے پڑھ رہی تھی اور پولیٹکل سائنس پارٹ ٹو کی طالبہ تھی۔

لاہور میں صرف وہ اور زین ہوتے تھے۔ زین اپنے سرکاری بنگلے میں رہائش پذیر تھا۔ اس کا اکلوتا تایا زاد کزن، جسے غصہ دلانے میں اسے خوب میں مزا آتا تھا۔ بابا ہمیشہ اسی کو بھیج دیتے، کبھی سامان دے کر، کبھی پیسے دے کر، کبھی کتابیں اور اکثر شاپنگ پہ لے جانے کی ذمہ داری بھی زین خان ہی کی تھی۔

وہ اکثر چڑ جاتی اور جلتی کڑھتی بے سوچے سمجھے جو ہاتھ آتا، خریدتی جاتی۔ ایسے میں وہ اپنے ساتھ چلتے اس باڈی گارڈ کو قطعاً" بھول جاتی، جو منہ میں گھنگھنیاں ڈالے ہر دس منٹ بعد گھڑی پہ نگاہ ڈال کر اسے اپنے قیمتی وقت کا احساس دلاتا تھا۔

جب کبھی بابا لاہور آتے تو زین کے گھر میں اکثر ڈنر ہوتا جس میں اس کی شرکت لازمی ہوتی تھی۔ بھلا ایسے ممکن تھا کہ بابا آتے اور اسے گھماتے نہ۔ سرفہرست پکنک پوائنٹ تو ان کے نزدیک زین کا سرکاری بنگلہ ہی تھا۔

ابرش کے شوق بھی بڑے عجیب تھے۔ گھڑ سواری اور نشانہ بازی، دونوں میں اس نے باقاعدہ ٹریننگ لی تھی۔ اگر وہ گھوڑے کی پشت پر بے خوف و خطر سواری کر سکتی تھی تو دوسری طرف اس کا نشانہ بھی باکمال اور بے خطا تھا۔ بابا نے اس کے عجیب و غریب شوق ہونے کے باوجود اس پہ کوئی پابندی نہ لگائی تھی۔ وہ اس کی ہر خواہش و ضد ہمیشہ پوری کرتے تھے، مگر جواباً" انہوں نے اس سے اس کے بدلے صرف ایک ہی چیز کا اختیار مانگا تھا اور وہ تھا شادی۔

اسے ہاسٹل بھیجنے سے پہلے انہوں نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ شادی ان کی پسند سے کرے گی۔ ابرش نے بلا چون وچرا ان کے فیصلے کو مان لیا تھا، اس کا تعلق بظاہر ایک ماڈرن مگر کسی حد تک روایت پسند فیملی سے تھا، جہاں بہرحال آج بھی باپ کی مرضی کو اولیت دی جاتی تھی۔

سب سے زیادہ اس کی دوستی ردا سے تھی جو کہ اس کی روم میٹ بھی تھی۔ وہ اس کی اور زین کی نوک جھونک سے بے حد محظوظ ہوتی تھی۔

اور یوں "ابرش الٰہی بخش خان" اپنی زندگی اور ذات میں بڑی مطمئن و مسرور تھی اور زندگی گزرتی جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

ردا نے اس سے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شاپنگ چلے۔ پہلے تو وہ پس و پیش کرتی رہی کیونکہ اسے پتا تھا، بابا کبھی نہیں مانیں گے۔ وہ قطعاً" اس حق میں نہ تھے کہ وہ اکیلی گھومتی پھرے، اسی لیے وہ ہمیشہ زین کو اس سے نتھی کر دیتے، مگر آج ردا نے اس سے اتنے درخواست گزار انداز میں کہا کہ اسے مانتے ہی بنی تھی۔

اس نے اجازت لینے کے لیے بابا کو فون کیا تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ زین شہر سے باہر ہے، اس لیے وہ اسے ایک لڑکی کے ساتھ تنہا جانے کی اجازت قطعاً" نہیں دے سکتے۔ لاکھ بہانے بنانے کی کوشش کی کہ اس نے بہت ضروری چیزیں خریدنی ہیں مگر وہ نہ مانے۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی تھی۔

یہ غالباً" دوپہر تین بجے کا واقعہ ہو گا۔ شام سات بجے بتایا گیا کہ اس سے ملنے کوئی آیا ہے۔ وہ حیران سی ہوئی۔ زین یہاں تھا نہیں، پھر بھلا کون آ گیا؟ وہ ردا کو بھی ساتھ گھسیٹ لائی۔ ویٹنگ روم میں پہنچ کر اس کے حلق سے ایک طویل سانس نکل گیا۔

یونیفارم میں ملبوس زین تھکا سا صوفہ پہ بیٹھا تھا۔

لازمی بات تھی کہ بابا نے اسے آتے ہی دوڑا دیا تھا۔

"السلام علیکم!" وہ آگے بڑھ آئی۔

"وعلیکم السلام!" وہ کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر گویا ہوا۔ "چلیں؟"

"کہاں؟" وہ حیران ہوئی۔

"شاپنگ پہ۔"

"مگر مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔" اس نے جھلا کے کہا۔ کوئی تک تھی بھلا؟ یعنی اس کی اپنی مرضی تھی ہی نہیں۔ اسے بابا پہ غصہ آنے لگا۔ دل میں ان سے لڑائی کی بھی ٹھان لی تھی۔ اس دوران ردا خاموشی سی ایک طرف کھڑی رہی، مگر اس کی نظریں مستقل زین پہ جمی ہوئی تھیں۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ پھر کس کے ساتھ جانا ہے؟" وہ غصے سے بولا۔ یعنی اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ چچا کی ایک کال پہ وہ دوڑا چلا آیا تھا، بنا اپنی تھکن کی پروا کیے۔ آخر اتنے پریشان جو تھے کہ خدا معلوم ان کی لاڈلی بیٹی کو کتنی ضروری اشیا خریدنی ہیں، جو وہ انہیں یوں فون پہ فون کر رہی تھی۔ وہ اسلام آباد سے ابھی اور سیدھا ادھر ہی آ گیا مگر وہ اس کا احسان ماننے کے بجائے الٹا اکڑ رہی تھی۔

"مجھے ردا کے ساتھ جانا تھا۔" اس نے کہا۔

"ایم سوری محترمہ! آپ کو اس کی اجازت نہیں ہے۔" وہ طنزاً" بولا۔

"کائنڈلی آپ اپنا افسرانہ لہجہ میرے ساتھ مت استعمال کیا کریں۔" اس نے بھی طنز کیا۔

"اچھا اب چلو ابرش! مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اس نے گھڑی کی طرف دیکھ کر جتایا۔

"مجھے نہیں جانا۔" وہ واپس مڑ گئی۔ زین کا خون کھول اٹھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں اتنا فارغ ہوں کہ تمہارا یہ جواب سننے کے لیے شہر کے دوسرے کونے سے پون گھنٹے کی ڈرائیو کر کے آیا ہوں۔" اس نے تلخی

سے کہا۔

ابرش کو فوراً اپنے بدصورت رویے کا احساس ہوا تھا۔ وہ پلٹی۔

"آئم سوری۔" اس نے دلی شرمندگی سی کہا۔ واقعی بھلا اس میں زین کا کیا قصور تھا۔

"نہیں جانا تمہیں؟" وہ اسے گھور رہا تھا۔

"جی' جانا ہے۔" وہ کہہ کر ردا کی طرف پلٹی جو خاموش تماشائی بنی کھڑی تھی۔

"سوری ردا! تم مجھے لسٹ دے دو۔ میں تمہاری شاپنگ بھی کرلوں گی۔"

"ارے نہیں۔" ردا نے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں۔"

"ابرش! بس کرو اب چل پڑو۔" وہ بے زاری سے بولا۔

ابرش اس کی طرف پلٹ آئی۔ وہ دونوں ساتھ چلتے باہر نکل گئے۔ ردا کی نظریں خالی ہوجانے والے منظر پہ جمی تھیں۔

☼ ☼ ☼

یہ ایک خوش گوار دن تھا۔ کھلا کھلا سا۔ کالج کی حدود میں ایک گرم جوش ہلچل تھی۔ لڑکیوں کے مختلف جگہ بنے ہجوم صرف ایک ہی بات ڈسکس کررہے تھے اور وہ تھا حالیہ جاری کیا جانے والا ایگزامز کا شیڈول۔

ان کے پارٹ ٹو کے فائنل ایگزامز ڈیڑھ ماہ بعد شروع ہورہے تھے۔ وہ بھی ردا کے ساتھ لائبریری میں بیٹھی یہی ڈسکس کررہی تھی۔

"بس ایگزامز ہوجائیں تو اماں نے میری شادی کردینی ہے۔" ردا نے کہا۔

"واقعی؟" وہ خوشی سے بولی۔ "تم کہیں انگیجڈ ہو ردا؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔ جواباً ردا کی شرمیلی سی مسکراہٹ نے اسے حیران کردیا۔

"مگر تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" اس نے شکوہ کیا۔

"بس ویسے ہی۔" اس نے سرسری سا جواب دیا۔

"اچھا! پوچھوں گی تم سے۔" اس نے کتابیں سمیٹتے ہوئے دھمکی دی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج وہ پہلی مرتبہ بابا کی اجازت کے بغیر ردا کے ساتھ شاپنگ پر آئی تھی۔ وہ ردا کو اپنے منگیتر سے بات کرنے کے لیے موبائل گفٹ کرنا چاہ رہی تھی۔ ... نے سوچا' تھوڑی دیر کی تو بات ہے' اس کے لیے ... کو کیا تنگ کرنا۔

موبائل خرید کر وہ دونوں اب سم خرید رہی تھیں۔ سم آن کرانے کے لیے دکان دار نے شناختی کارڈ طلب کیا' ردا نے پورا پرس کھنگال ڈالا' مگر کارڈ نہ ملا' اس نے بے بسی سے ابرش کو دیکھا' اسے ... آگئی۔

"اب ایسی شکل تو نہ بناؤ۔ مجھے کچھ ہوجائے گا۔" اس نے مسکرا کر ردا کو دیکھا اور پھر اپنا شناختی کارڈ دکان دار کے ہاتھ میں تھمادیا۔

"مگر اس طرح تو سم تمہارے نام پر ہوجائے گی۔" ردا پریشان ہوگئی۔

"سو واٹ؟ میں یوز کروں یا تم۔ ایک ہی بات ہے۔" اس کے لہجے میں بے پناہ پیار تھا۔ ردا نے ... سے اسے دیکھا۔

سم لے کر دونوں ہاسٹل واپس آگئیں۔

☼ ☼ ☼

وہ پیٹرولنگ پہ تھا۔ جب اس کا سیل بجنے لگا۔ ... عجلت میں تھا' سو اس نے نمبر دیکھے بغیر فون اٹھالیا۔

"دلیں۔"

"کیسے ہیں زین؟" بڑی اپنائیت سے پوچھا گیا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔ آپ؟"

"کیا کررہے ہیں؟"

"آپ کون ہیں؟" زین تھوڑا جھنجلایا۔

"یہ جاننا ضروری ہے کیا؟" مدھم لہجہ' بڑی مٹھاس لیے ہوئے تھا۔ زین کے ماتھے پہ بل پڑنے لگے۔

"بہت ضروری ہے۔ بتائیں؟" اس نے سرد مہری ... کہا۔

"ناموں میں کیا رکھا ہے؟"

"دیکھیے بی بی! میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں ان فضولیات میں پڑوں' اس لیے صاف بات کیجیے۔" وہ ... لک تھا۔

"اف اپنا یہ افسرانہ انداز چھوڑ دیجیے ایس پی صاحب!" کھنکتی ہنسی کے ساتھ کہا گیا۔

زین کے سر پہ کسی نے ... سا کیا تھا۔ یہ انداز' یہ ... تو صرف اس کے ساتھ ابرش ہی بولتی تھی۔ وہ ... دیر خاموش رہ گیا۔

"میں اسی لہجے میں بات کرنے کا عادی ہوں۔ آپ ... اور وقت برباد کریں محترمہ!" اس کا انداز مزید ... ہوا تھا۔

"جب وقت ہی برباد کرنا ہے تو آپ پر کیوں ... ؟" وہ آنچ دیتے لہجے میں بولی تھی۔

زین کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے کھٹاک سے فون بند ... دیا تھا۔ اسے یقین نہیں ہورہا تھا کہ یہ "ابرش" تھی۔ ... وہ ایسا کیوں کرے گی؟ کیسی اتفاق کی بات تھی کہ ... کی ابرش سے کبھی فون پہ بات نہیں ہوئی تھی ... وہ فوراً اس کی آواز شناخت کرلیتا۔ اس نے ... سکرین پہ نظر دوڑائی مگر وہ ابرش کا نمبر نہیں تھا' کوئی ... نمبر تھا۔

... اس کے ذہن میں آیا کہ وہ اس نمبر پہ کال بیک ... اور اس کا دماغ درست کردے مگر پھر وہ ہچکچا ... کیونکہ اسے یہ بھی لگ رہا تھا کہ یہ ابرش کی ہی ... ت ہوسکتی تھی ورنہ رانگ کالز اسے کبھی نہیں ... ہیں۔

... کچھ دیر اسی طرح بیٹھے گزر گئی۔ پھر اس نے ... سے سر جھٹکا اور اس اچانک اٹھنے والے ... کو پس پشت ڈال دیا۔

... مسئلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ ہر وقت اسے ... کرنے لگی۔ شروع میں وہ صرف یہ اندازہ لگاتا ... تھا کہ وہ کون ہے؟ مگر اس کے لیے اسے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ اسے بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ وہ ابرش ہی تھی۔ اس کی باتیں اتنی زیادہ ملتی جلتی تھیں کہ وہ ماننے پہ مجبور ہوگیا تھا۔ اور یہ یقین ہوجانے کے بعد کہ وہ ابرش ہی تھی' دکھ اور افسوس کا گہرا احساس تھا' جس نے زین کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

کبھی وہ اسے مختصر کال بھی کرتی۔ وہ اتنے خوب صورت لہجے میں بولتی کہ وہ حیران رہ جاتا۔ اس کی بے تابی اور دل کو کھینچ لینے والی کشش زین کو مسحور کردیتی' مگر اس سب کے باوجود وہ بہت کم بولتا تھا اور اس نے اپنا ریکارڈ صاف رکھنے کے لیے کبھی اس نمبر پہ کال یا میسج نہ کیا تھا۔ کل کو کوئی بات کھلتی تو کم از کم اس کے ہاتھ تو صاف ہوتے۔ وہ اس سے کہتی تھی۔

"آپ پر یونیفارم بہت سجتا ہے زین!" توصیفی لہجہ زین کو عجیب سی کیفیت سے دوچار کرجاتا۔ کبھی وہ مصروف ہوتا تو فون ہی نہ اٹھاتا' تب وہ اسے بہت افسردہ میسج بھیجا کرتی۔

"آپ بہت سخت دل ہیں زین!"

وہ خراب موڈ کے ساتھ میسج پڑھتا اور ڈیلیٹ کردیتا' مگر ایک اور خیال اسے اکثر ستاتا... وہ یہ کہ ابرش کے لہجے میں بڑی منہ زور سرکشی ہوتی ہے۔ ضد ہوتی ہے اور کسی قدر اس کا رویہ بے لچک بھی... زین کو یہ سب یاد آتا تو اسے یہ لڑکی "ابرش" نہیں لگتی۔

اسی کشمکش میں دس دن گزر گئے۔

ایک شام وہ کراچی میں تھا۔ ضروری میٹنگ چل رہی تھی' جب اس کا سیل فون بج اٹھا اس نے فون نکالا اور سائلنٹ پہ لگادیا' مگر اسکرین پہ چمکتے ہوئے نمبر نے اس کو بے حد تیش دلایا تھا۔ موقع تھا نہ وقت کہ وہ اپنی بھڑاس نکال پاتا' جب ہی ضبط آزما کر رہ گیا' مگر رات اس کا فون آیا تو زین نے اس کی خوب بے عزتی کر ڈالی۔

"دیکھیے بی بی! کہیں اور کوشش کیجیے۔ ان تلوں میں تیل نہیں۔ سمجھ میں آیا؟ میرے لیے کچھ مشکل نہیں۔ مجھے صرف ایک فون کرنا پڑے گا اور آپ کی ساری ہسٹری میری ٹیبل پہ ہوگی۔"

زین کا لہجہ مروت سے عاری تھا مگر وہ لڑکی بھی کمال تھی۔ اس نے بڑی بے خوفی سے زین کی بات کاٹ دی۔

"آپ مجھے ڈرا رہے ہیں' تو جان لیجئے میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

اس کی بات نے زین کو آگ لگا دی تھی۔

"تو پھر کیا چاہتی ہو تم؟ اٹھوا لوں تمہیں؟" اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔

دوسری طرف فون بند کر دیا گیا۔ زین نے فون ایک طرف پھینک دیا۔

"اگر یہ تم ہو نا ابرش الٰہی بخش خان! تو پھر یاد رکھنا میں تمہارا حشر کر دوں گا۔" اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے سوچا۔

اگلے دن اس نے پھر فون کیا تھا' اور آج تو وہ ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس نے ذہنی مکمل تیاری کر رکھی تھی۔

"میں اس نمبر پر بات کروں گا۔ تب تک تم اس کی لوکیشن معلوم کرو۔" اس نے اپنے پی اے کو ہدایات دی تھیں۔ وہ سر ہلاتا باہر نکل گیا۔

"یس۔" اس نے فون آن کیا۔

"کیسے ہیں آپ؟"

"جیسا پچھلے اکتیس سال سے ہوں۔" اس نے کہا' جواباً وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"بڑا پریکٹیکل جوک ہے بھئی۔"

"کیونکہ میں خود بہت پریکٹیکل ہوں۔" اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" اس کا لہجہ مدھم تھا۔

"کتنا کچھ جانتی ہو میرے بارے میں؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"سب کچھ۔" وہ بولی۔ زین کی پیشانی پر ایک شکن آگئی۔

"تو پھر بتاؤ مجھے؟ تمہیں کیا لگتا ہے' میں تمہیں اتنے دنوں سے کیوں برداشت کر رہا ہوں؟" اس نے گیند اس کے کورٹ میں پھینکی۔ جواباً "ایک گہری خاموشی چھا گئی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے' اس بے فائدہ فون کالز سے تمہیں کچھ مل جائے گا؟" وہ اسی طرح بولتا گیا۔ وہ خاموش ہو رہی۔

"دیکھو! خاموش مت رہو۔ خاموشیاں غلط فہمیاں بڑھا دیتی ہیں۔"

"ٹھیک کہا آپ نے زین! مجھے واقعی حیرانی ہے۔ آپ مجھے کیوں برداشت کر رہے ہیں اتنے دنوں سے اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ ان فون کالز سے مجھے کچھ ملے گا' لیکن میں کیا کروں؟ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔" اس کے انداز میں بے بسی کو چھوتی ہوئی تھی۔ وہ سن سا رہ گیا۔

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" اس نے پھر تلخی بھرے لہجے میں کہا۔

"دیکھیں! میں آپ کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا رہی نا! بس کچھ دیر بات ہی کرتی ہوں اور چند دنوں تک یہ بھی چھوڑ دوں گی۔"

"پھر تمہیں عقل آجائے گی؟" اس نے طنز کیا۔

"جب میں یہاں رہوں گی ہی نہیں تو کال کیسے کروں گی؟" وہ یاسیت سے بولی تھی۔

"کیوں؟ پھر کہاں رہو گی؟" وہ حیران ہوا۔ یہ لڑکی زیرو زیرو سیون سے بھی زیادہ پراسرار نکل رہی تھی۔

"ایگزامز کے بعد میں واپس چلی جاؤں گی۔"

وہ مدھم آواز میں بولتی گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا' اسے اپنے پی اے کی طرف سے اوکے کا اشارہ ملا۔ زین نے مزید بات کیے بغیر فون بند کر دیا۔

"سر! یہ نمبر ویمن ہاسٹل کی لوکیشن میں ہے۔ یہ کسی لڑکی کے نام ہے۔ کچھ عجیب سا نام ہے "ابرش الٰہی بخش خان۔"

اس کا پی اے کچھ اور بھی کہہ رہا تھا مگر زین کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اس کا بدترین خدشہ سچ نکلا تھا۔ وہ آفس سے باہر آگیا۔

"تم اتنا گر سکتی ہو ابرش! میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اپنے جذبات کے اظہار کا اتنا گھٹیا طریقہ چنا تم نے۔" وہ سلگتے ذہن سے سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے کتنی بے وقوفی کا ثبوت دیا ہے وہ جانتی بھی ہے کہ "میر زین خان" کوئی عام آدمی نہیں' ایس پی ہے' جس کے ہاتھ بہت لمبے اور اختیارات وسیع ہوتے ہیں۔ پھر اس کو یہ کیا سوجھی تھی؟ وہ کیسے یہ سوچ سکتی تھی کہ اسے اس کا پتا نہ چلے گا۔

اس کے بعد بہت دنوں تک کوئی کال نہیں آئی۔ شاید اس کے پیپرز شروع ہو گئے۔ زین بھی اپنے معاملات میں الجھ گیا تھا سو اس کا دھیان بھی وقتی طور پر ہٹ گیا۔

اس دن ابرش کا آخری پیپر تھا۔ چچا میر الٰہی بخش اسے ہاسٹل سے لینے خود آرہے تھے اور اسی دن پھر سے زین کے پاس اسی کا فون آیا تھا۔

اس نے فون نہیں اٹھایا۔ فون بجتا رہا بجتا رہا اور پھر میسجز آنے لگے۔ اس نے پڑھنے کی زحمت کیے بغیر ڈیلیٹ کر دیے۔ کچھ دیر بعد پھر فون بجنے لگا۔ اس نے اس بار فون اٹھا لیا۔

"کیا ہے؟" وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا تھا۔

"میں دوبارہ آپ کو کبھی فون نہیں کروں گی زین!" دوسری طرف وہ رو رہی تھی۔ زین ساکت رہ گیا تھا۔

"آپ کا کردار بے داغ ہے زین! میں پہلے صرف آپ کی پرسنالٹی سے متاثر تھی' اب آپ کے کردار نے بھی اپنا اسیر کر لیا ہے۔ آج کے دور میں جبکہ ٹیلیفونک فرینڈشپ ایک عام بات بن چکی ہے' پھر بھی آپ نے میری گستاخی اور بے وقوفی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا' میں آپ کی مشکور ہوں۔" وہ بہت رنجیدہ تھی۔ وہ بھی خاموش تھا۔

"میرا مقصد آپ کو تنگ کرنا کبھی بھی نہیں تھا۔ میں تو صرف آپ سے بات کرنا چاہتی تھی خواہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی۔ میں کوئی فضول بات نہیں کروں گی کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں وغیرہ وغیرہ' لیکن یہ سچ ضرور ہے کہ میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔ اتنے بہت سارے دن میں نے آپ کو بہت تنگ کیا! مجھے معاف کر دیجیے گا۔ اب میں آپ کو کبھی تنگ نہیں کروں گی۔ اور ایک آخری التجا ہے آپ سے پلیز! اس نمبر پہ کبھی کونٹیکٹ مت کیجیے گا' پلیز۔۔۔" وہ پھر سے رونے لگی۔

"اوکے۔" زین نے فون بند کر کے طویل سانس لیا۔ وہ عجیب سی کیفیات کا شکار ہو رہا تھا۔ تو ابرش اس سے متاثر تھی۔ اسے پسند کرنے لگی تھی۔ اس کے لبوں پہ ایک مسکراہٹ آگئی جو دم بدم گہری ہوتی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ابرش اندر آئی تو ردا بیڈ پہ اوندھی لیٹی رو رہی تھی۔ آج وہ سب تتلیاں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہی تھیں' وہ دکھ کے گہرے احساس کے ساتھ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"بس کرو ردا! مجھے بھی تم سے بچھڑنے کا اتنا ہی دکھ ہے' لیکن تم فکر مت کرو۔ ہم ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے۔" وہ اس کو تسلی دے رہی تھی۔

"ہاں میں جانتی ہوں۔" وہ آنکھیں پونچھتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

"کر لیا فون؟" ابرش نے پوچھا۔

"ہوں۔ ابا آئیں گے مجھے لینے۔" ردا نے بتایا۔

"اور اسد نہیں آئے گا؟" وہ اسے چھیڑنے کو بولی۔ ردا نے صرف نفی میں سر ہلانے پہ اکتفا کیا تھا۔

"اور تم بتاؤ تمہیں کون لینے آئے گا؟ یقیناً "زین"۔" ردا نے پوچھا۔

"نہیں۔ بابا آئیں گے مجھے لینے۔" ابرش نے خوش دلی سے کہا۔

ردا کے چہرے پہ مایوسی چھا گئی۔ ابرش اب پیکنگ میں مصروف تھی۔ اس نے بھی اٹھ جانا ہی مناسب

سمجھا۔

اور اسی رات وہ سب ایک دوسرے سے بچھڑ گئیں۔ ایک دوسرے سے ڈھیروں وعدے لیے گئے۔ فون نمبرز کے تبادلے ہوئے اور سب رخصت ہو گئیں۔ واپسی کا سفر کرتی ردا نہیں جانتی تھی کہ اس نے ابرش کے لیے کتنی مشکلات کھڑی کردی تھیں اس کے راستے میں کیسے کانٹے بودیے تھے۔

☼ ☼ ☼

اسے گاؤں آئے بہت دن بیتے تھے۔ جب ایک دن تایا جان اور تائی جان کے ساتھ زین آیا تھا۔ وہ اس سے شکوہ کررہی تھی اور جواباً" وہ ہلکا سا مسکرا کر خاموش ہو گیا تھا۔

"ایگزامز کیسے ہوئے تمہارے؟"

"بہت اچھے۔ بس اب مجھے رزلٹ کا انتظار ہے۔" وہ بچوں جیسے جوش سے بولی تھی۔

وہ بغور اسے دیکھتا رہا۔ اسی شام تائی جان نے اسے مانگ لیا۔ وہ ششدر سی رہ گئی تھی۔ بھلا ایسا کب سوچا تھا اس نے؟ مگر وہ تو پہلے ہی بابا کو یہ حق دے چکی تھی' سو اب بولنا بے کار تھا۔ بابا نے اسی وقت ہاں کردی۔ مبارک سلامت کا ایک شور اٹھا اور تائی جان نے اس کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن پہنادیے' شگن کے طور پر۔ وہ اتنی زیادہ حیران تھی کہ اسے شرمانا یاد ہی نہ رہا تھا۔ وہ ٹکر ٹکر سب کے چہرے دیکھ رہی تھی یہ جانے بغیر کہ زین کی نظریں صرف اسی چہرے پہ مرتکز تھیں۔

وہ لوگوں کے اندر اترنے کا فن جانتا تھا اور اس وقت ابرش کے تاثرات نے اسے ٹھٹکا دیا تھا۔ زین کے خیال میں اسے خوش ہونا چاہیے تھا' آخر یہی تو چاہا تھا اس نے۔ پھر وہ اس طرح کیوں کررہی تھی؟

زین نے ماں سے بات کرنے سے پہلے بہت سوچا تھا مگر اسے یہی لگا کہ اگر وہ ابرش کی اس غلطی کو نظر انداز کردے تو وہ ایک اچھی لڑکی تھی۔ وہ اسے پسند کرتا تھا اور اس کے ساتھ گزارنے کے بارے میں اس کے ذہن میں کوئی سوالیہ نشان نہ تھا' مگر اس وقت متذبذب ہو رہا تھا۔

بیگم قربان نے اس سے کہا کہ وہ ابرش سے بات کرنا چاہتا ہے تو کرلے۔ چچا سائیں کو بھی اعتراض نہ تھا۔ کون سا وہ پہلی بار مل رہے تھے۔ وہ تو ہمیشہ سے ہی ابرش کی ہر ذمہ داری زین پہ ڈال دیا کرتے تھے' سو اب تو وہ بے حد خوش تھے۔ انہیں اپنا یہ ذہین اور بااصول بھتیجا بے حد پسند تھا۔

وہ دونوں لوہے کے سنہرے کام سے سجے جھولے کے گرد کھڑے تھے۔

"تم خوش ہو ناں ابرش؟" زین کے انداز میں سچائی جاننے کی جستجو تھی۔

"نہیں۔" اس نے سر اٹھا کر پوری سچائی سے کہا۔

"کیوں؟" زین کو دھچکا لگا۔ یہ لڑکی کیا چاہتی تھی بھلا اس سے؟

"میں نے کبھی ایسا سوچا نہیں تھا۔" ابرش نے جھولے میں بیٹھتے ہوئے کہا' کھلی کھلی چاندنی میں جھولا آہستہ آہستہ ہلنے لگا۔

"تو اب سوچ لو۔" زین نے دوٹوک انداز میں کہا' ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا دو تھپڑ لگا کر اس ڈرامے باز لڑکی کا دماغ درست کردے۔ کیسا انجان بننے کا ناٹک کررہی تھی وہ؟

"مشکل ہے۔"

"کیوں؟"

"آپ کے اور میرے مزاج میں بہت مماثلت ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"ہم دونوں ہی غصہ ور ہیں۔"

"ٹھیک؟"

"ہم دونوں ہی ضدی ہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک۔۔۔ اور؟"

"ہم اپنی منوانا چاہتے ہیں۔"

"ہوں۔"

"اور آپ بہت سخت دل ہیں زین۔"

"یہ میری فیلڈ کا تقاضا ہے۔"

"پتا ہے بابا کہتے ہیں کہ شوہر اور بیوی کا مزاج ایک جیسا نہیں ہونا چاہیے۔"

"کیوں؟"

"یکساں مزاج ہونے کی وجہ سے ہم دونوں ایک دوسرے کو برداشت نہیں کرسکیں گے۔"

"تمہیں ایسا لگتا ہے؟"

"جی۔"

"تو اس کا حل ہے ناں؟"

"کیا؟"

"تم بدل جانا۔"

"آپ کو لگتا ہے کہ میں بدل سکتی ہوں؟"

"مجھے یقین ہے۔"

"کس پہ؟"

"خود پہ۔ میں تمہیں بدل دوں گا۔"

"یہ دعوا ہے؟"

"نہیں۔ یہ ارادہ ہے۔"

"چلیں؟" وہ کھڑی ہو گئی۔

"ہوں۔ چلو۔" وہ چلنے لگا اور اس کے پیچھے چلتی ابرش سوچ رہی تھی کہ زندگی اتنی بھی آسان نہ ہو گی۔

☼ ☼ ☼

بہار کا موسم تھا۔ پہلے تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ صرف منگنی باقاعدہ طور پر کی جائے گی مگر پھر شادی کی تیاریاں شروع کردی گئیں اسلام آباد سے اس کا بھائی میر عادل خان اور کراچی سے اس کا بڑا بھائی میر بادل خان آچکے تھے۔ شادی کی تیاریاں بڑے وسیع پیمانے پہ کی گئی تھیں۔ شادی کی تیاریاں خالصتاً" مقامی رواج کے مطابق کی جارہی تھیں۔

شادی سے سات دن پہلے اسے مایوں بٹھا دیا گیا۔ زرد لباس میں اس کا مومی سانچے میں ڈھلا حسن بہت سوگوار تھا۔

اس شور وہنگامے کے دنوں میں جبکہ اس کی دور دیرے کی ساری کزنز اور دیگر رشتہ دار خواتین موجود تھیں' وہ ردا کو یکسر بھول گئی حالانکہ اس کی ماں کی وفات اس کے بچپن میں ہی ہو گئی تھی' مگر سب اپنوں نے مل کر اس خوشی کے موقع پر اسے قطعاً" کسی کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔

مہندی کا فنکشن بڑا شان دار اور دھوم دھام سے کیا گیا تھا۔ اگلے دن بارات تھی۔ ہر کوئی مصروف تھا' کسی کو کسی [illegible] کو نبھانے میں مگن۔ باراتیوں کے لیے شایان شان تیاری کی جارہی تھی۔

وہ بہت مضطرب تھی۔ ہونٹ کچلتے ہوئے خالی الذہنی کے عالم میں وہ اپنے گرد ہوتی ہلچل کو دیکھتی رہی۔ دماغ اس قدر منتشر تھا کہ کسی نقطے پہ جم ہی نہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے تیار کرنے کے لیے بیوٹیشنز آگئیں۔ جنہیں خصوصی طور پر لاہور سے بلوایا گیا تھا۔ بابا نے کہیں کمی نہ چھوڑی تھی۔ وہ تیار ہو رہی تھی۔

خوب صورت ودیدہ زیب عروسی لباس میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ موم کی گڑیا جس کی سج دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی' مگر یہ گڑیا اندر ہی اندر پگھل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ مکمل طور پر دلہن بن چکی تھی۔ اسی اثنا میں بارات کے آنے کا غلغلہ اٹھا۔ بڑی دھوم دھام سے بارات آئی تھی۔ دلہا راجا اس وقت ایک شان دار مرسڈیز میں تھا۔

نکاح کے بعد جب ان دونوں کو ساتھ بٹھایا گیا تو ہر زبان نے اس شان دار اور مکمل جوڑی کو سراہا تھا۔ کھانے کے بعد کچھ مقامی رسمیں ہوئیں' جن سے نبٹنے کے بعد دلہا نے جانے کی اجازت چاہی تھی' جسے بابا نے نم آنکھوں سے قبول کرلیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے رخصت ہو کر سیدھا لاہور میں موجود زین کی رہائش گاہ میں لایا گیا تھا۔ یہ بھی زین کی ہی فرمائش تھی ورنہ تائی جان نے لاکھ سر پٹخا تھا کہ وہ ان کے آبائی گھر چلے' مگر زین نے انکار کردیا تھا۔

یہ اس کا حجلہ عروسی تھا۔ سفید للی اور سرخ گلابوں

سے سجا کمرا بے حد خوب صورت اور شان دار تھا۔ وہ تھکی اور نڈھال سی جہازی سائز بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اسی وقت عجلت میں زین اندر آیا' فون اس کے کان سے لگا ہوا تھا اور وہ دوسرے ہاتھ سے کوٹ کے بٹن کھول رہا تھا۔ وہ اتنی جلدی میں آیا تھا کہ ابرش کے سنبھل کے بیٹھنے سے پہلے ہی وہ ڈریسنگ روم میں گھس گیا' دس منٹ بعد وہ یونیفارم میں برآمد ہوا۔

"ابرش! ایک ایمرجنسی ہوگئی ہے' پلیز! تم چینج کرلو۔"

وہ سپاٹ انداز میں کہتا باہر نکل گیا۔

اپنی نئی زندگی کے اس بدصورت آغاز پر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

"تمہیں تو میں دیکھ لوں گی مسٹر زین خان!" وہ بڑبڑاتی ہوئی بیڈ سے اٹھی تھی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد اس نے زیورات سنبھالے اور سونے کے لیے بیڈ پہ آگئی۔ تھکن کی وجہ سے اسے جلد ہی نیند آگئی مگر اس کے باوجود اس کے اندر اذیت بھری ایک کیل گڑ گئی تھی۔

اگلی صبح وہ جاگی تو اس کے پہلو میں بے شکن بستر اس بات کا گواہ تھا کہ وہ رات بھر نہیں لوٹا تھا۔ وہ دل میں اٹھتے درد کے احساس کو دباتی فریش ہونے چلی گئی۔ مہمانوں سے بھرا ہوا گھر تھا اور وہ کوئی تماشا نہیں چاہتی تھی' اور یہ تو اسے پہلے ہی معلوم تھا کہ زین خان کے سنگ زندگی بڑی پیچیدگیوں اور مشکلوں سے دوچار رہے گی۔ اس کا غصہ تند مزاجی اور کرخت طبیعت کو بڑے حوصلے سے سہنا تھا اسے۔ دل ہی دل میں وہ خود کو مضبوط بنا رہی تھی۔

ناشتے کی میز پر اس کی ملاقات زین سے ہوئی تھی۔ وہ سلام کرکے اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

"ناشتا کرنے کے بعد تیار ہوجانا۔ ہم فارم ہاؤس چل رہے ہیں۔" زین نے کہا۔

"فارم ہاؤس؟" اس نے پوچھا' دل ہی دل میں وہ جھوم اٹھی تھی۔ فارم ہاؤس جانے کا مطلب تھا۔ گھڑ سواری اور نشانہ بازی کی مشقیں کرنے کا سنہری موقع۔

"ہوں۔ کل ولیمہ کا فنکشن وہیں ہے۔" اس نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

"جی ٹھیک ہے۔" ابرش نے سرہلادیا۔

ناشتا کرنے کے بعد وہ واپس کمرے میں آگئی۔ تائی جان بھی اس کی مدد کروانے کے خیال سے اندر آگئیں۔ کچھ شان دار سے کامدار جوڑے رکھنے کے ساتھ ساتھ اس نے ولیمہ کا لباس اور جینز شرٹ بھی رکھی تھی۔ آخر گھڑسواری لانگ شرٹ ٹراؤزر پہن کر تو نہیں ہوسکتی تھی نا۔

ابھی فارم ہاؤس صرف وہ دونوں ہی جارہے تھے' باقی سب مہمانوں کو کل دوپہر کے بعد وہاں پہنچنا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ فارم ہاؤس پہنچے تو آدھا دن ڈھل چکا تھا۔

زین بے حد تھکا ہوا ہونے کی بنا پر آتے ہی سونے کے لیے چلا گیا تھا جبکہ اس نے ڈھیر ساری خوشی کو اندر دباتے ہوئے جینز پہنی اور گھوڑا لے کر نکل گئی۔ مولسری اور پام سے بھری ہوئی راہ گزر پر فرحت بخش ہوا اسے آسمانوں میں اڑائے دے رہی تھی۔ اس کا سیل فون مسلسل بج رہا تھا مگر وہ نظرانداز کرتی رہی۔

وہ لوٹی تو زین سے ٹکراؤ ہوگیا جو کہ اتنا خوش گوار قطعاً نہ تھا۔ وہ غصہ ور تھا تو ابرش بھی کم نہیں تھی۔ وہ بھلا کیسے بات کرسکتا تھا اس سے اس طرح سخت اور سردمہر لہجے میں' ابرش نے خود کو دی گئی ساری ہدایات بھلا ڈالی تھیں اور اس سے الجھ پڑی۔ جس کا نتیجہ فون ٹوٹنے پر ختم ہوا تھا۔

وہ کتنی ہی دیر پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ پھر اٹھی اور فریش ہونے چلی گئی۔ سیاہ لباس میں وہ سوجی آنکھیں لیے بالوں میں برش کررہی تھی۔ باہر شام ٹھہر رہی تھی اور اس کا ملگجا اندھیرا ابرش کے دل کو تاریکیوں میں دھکیل رہا تھا۔ زین نے ثابت کردیا تھا کہ وہ آخر مرد تھا جو سراپا حکم ہوتا ہے۔ اور وہ ابرش کو اپنا محکوم بنانا چاہتا تھا۔ کیا ایسا ممکن تھا؟ اس کا ذہن

تکلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

اسی وقت ملازم نے اسے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ وہ خود کو سنبھالتی اٹھ کر باہر آگئی جہاں ٹیبل پر زین بھی موجود تھا۔ اس نے صرف چند لقمے لیے اور اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی کمرے میں آگیا۔ وہ خود کو پرسکون کرتی اٹھی اور خوامخواہ وارڈ روب میں لباسوں کی ترتیب درست کرنے لگی۔ زین کی گہری اور اندر تک اترنے والی نگاہ اس پر جمی تھی۔ اسے بے چینی ہونے لگی۔

"یہ سیاہ لباس کس سوگ میں پہن لیا تم نے؟" اس کی گمبھیر آواز میں سوال تھا۔

"جاؤ! لباس تبدیل کرکے آؤ۔" اس کے لہجے میں تحکم کی آمیزش صاف نظر آتی تھی۔ ابرش نے خود پر بے پناہ ضبط کیا تھا۔ وہ اس وقت اگر معمولی سی بھی بدتمیزی کرتی تو معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ اس نے بڑی فراست سے معاملے کی نازکی کو دیکھا اور لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ لوٹی تو ایک سرخ رنگ کے کامدار جوڑے میں جھلملا رہی تھی۔ زین کی نگاہیں اس پر جم سی گئیں۔

"ابرش!" اس نے پکارا۔

اس پکار میں کچھ ایسا تھا جس نے ابرش کو بے تحاشا نروس کردیا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر زین کو دیکھا جس کی آنکھوں میں واضح طلب تھی۔ اس کے اندر ہلچل مچ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔

اور وہ عجیب رات تھی' جو اس کی جھولی میں کوئی خوشی نہیں ڈال کے گئی تھی' یہ روحوں کا ملاپ نہیں تھا۔ اس کی روح اس کے وجود سے نکل گئی۔ وہ دور کھڑی خود کو اس کی بانہوں میں دیکھتی رہی۔ کسی کٹھ پتلی کی مانند' کسی کی کرخت مزاجی اور سختی نے اس کے اندر زہریلا دھواں بھر دیا تھا۔ اسے گھٹن ہو رہی تھی۔ جس راستے پر وہ اسے چلا رہا تھا وہ بڑا ناہموار سخت اور ٹیڑھا راستہ تھا جس نے اسے تھکا دیا تھا اور وہ ہار گئی۔ اور پھر صبح ہوگئی۔ ایک بے یقین اور تکلیف دہ رات کی صبح جس نے اس کے ہر مسام میں تھکن کو بھر دیا تھا۔

پھٹی ہوئی آنکھیں
فالج زدہ زبان
اور مفلوج بازوؤں کا یہ سفر
جو نہ جانے کتنی صدیوں سے مجھے طے کررہا ہے
آخر یہ میری انتہا تک پہنچ کیوں نہیں جاتا
اور یہ آنسو.....
یہ سارے کے سارے آنسو
ایک ہی بار ایک ساتھ بہہ کیوں نہیں جاتے؟

وہ واش بیسن کے آگے کھڑی میکانکی انداز میں چہرے پہ پانی کے چھپاکے مارتی چلی گئی۔ اس کی حالت اس سرزمین کی سی تھی جس کو فاتح فوج کے گھوڑوں نے روند کر رکھ دیا۔ اس نے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھا۔ یہ عکس اس کا نہیں تھا' یہ "مسز زین خان" کا تھا۔ وہ بدل دی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ولیمہ کا فنکشن بڑی دھوم دھام سے ہوا اور پھر ایک معمول کی زندگی شروع ہوگئی۔ کچھ دن وہ بابا کے ہاں رہی تھی مگر بہرحال اسے واپس لاہور اپنے شوہر کے گھر آنا پڑا تھا۔ یہ اس کی شادی کے گیارہویں روز کی بات تھی جب ایک شب خواب گاہ میں اس نے زین کو دیکھا جو کسی فائل میں گھسا ہوا تھا۔ ان گیارہ دنوں میں وہ پہلے دو دن فارم ہاؤس میں ٹھہرے تھے جہاں سے ولیمہ کی تقریب کے بعد وہ بابا کے گھر چلی گئی۔ پانچ دن بعد وہاں سے واپس لوٹی تو زین سے سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔ اور اس دن کے بعد وہ آج اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنا زیادہ کام میں مصروف رہتا تھا کہ گھر آنے کا وقت ہی کم ملتا تھا۔

"آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" اس نے ہمت کرکے زین کو مخاطب کیا۔ یہ بات کئی دنوں سے اس کے اندر کھٹک رہی تھی۔ زین نے اس سے بابا کے گھر بھی کوئی رابطہ نہ کیا تھا۔

"کس بات پر؟" زین نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کی چمکدار بھوری آنکھوں میں حیرت تھی۔

"فارم ہاؤس پر میں نے آپ سے بدتمیزی کی تھی نا۔ اس بات پر۔" وہ ہچکچاتے ہوئے مدھم لہجے میں بولی تھی۔

"نہیں" اس واقعے کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔"

"یعنی کچھ نہ کچھ اہمیت ہے؟" وہ ٹھٹکی تھی۔

"مجھے فلسفہ مت سمجھاؤ ابرش! تمہیں نظر نہیں آرہا میں مصروف ہوں۔"

اس نے جتاتے ہوئے انداز میں کہا۔ اہانت کے احساس سے ابرش کا چہرہ گلابی ہوگیا تھا۔ اس نے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔

اگلے دن تائی جان آگئیں۔ ان سے مل کر ابرش کو دلی سکون ملا تھا۔ وہ ان کے ساتھ مل کر گھر کی نئے سرے سے آرائش و زیبائش میں مصروف ہوگئی تھی۔ پتا نہیں گھر والے کو گھر میں دلچسپی تھی یا نہیں مگر اسے بہرحال تھی۔ گھر میں بھی اور گھر والے میں بھی۔

پورے گھر کی آرائش تبدیل کرنے کے بعد اس نے توجہ بیڈ روم کی طرف مرکوز کردی تھی۔ تائی جان نے اسے بتایا تھا کہ یہ روم زین نے اپنی مرضی سے سیٹ کیا تھا' جب ہی ابرش نے چند معمولی تبدیلیوں کے سوا اور کچھ نہ کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ زین کو برا لگے۔

اس کی ازدواجی زندگی نے پہلے دن سے جو ڈگر اختیار کی تھی' ہنوز اسی پہ چلی آرہی تھی۔ اس کی بے نیازی اور لاپروائی بھی اسی طرح قائم تھی۔ وہ اب بھی ہفتے میں دو تین دن ہی رات کو گھر آیا تا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر اس کا ابرش کے ساتھ رویہ بھی اسی طرح کا تھا عجیب سا۔

پتا نہیں کیوں مگر ابرش کو لگتا کہ اس کی بھول بھلیوں سے بھری ازدواجی زندگی کے پیچھے کوئی اور بات بھی تھی۔ کوئی ایسی بات جو یقیناً" زین کے اندر دلی تھی۔ اس کی جانچتی نظریں ابرش کو عجیب سے کرب کا شکار کرجاتی تھیں۔ کوئی ایسی کہانی تھی جس کے عنوان اور متن سے ناواقف ہونے کے باوجود اس کے زیر اثر تھی۔

وہ بدل رہی تھی۔ کسی کی بے نیازی اور سختی نے اسے توڑ دیا تھا۔ جب وہ گھر آتا تو ابرش کی حتی الامکان کوشش ہوتی کہ اسے ابرش سے کوئی شکایت نہ ہو' مگر خدا معلوم وہ اس میں ناکام کیوں ہوجاتی تھی۔ اسے ہمیشہ کوئی نہ کوئی بات مل جاتی جو قابل گرفت ٹھہرتی اور وہ بے بسی کے احساس سے لب کچل کر خود کو برداشت کا درس دیتی رہتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ زین سے بدتمیزی کرنے کی صورت میں اس کے باپ کی تربیت کو غلط ٹھہرایا جائے۔ جب ہی اس نے اپنی منہ زور طبیعت کو اندر دبالیا تھا۔

زندگی گزرتی جاتی تھی اور مشکل کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔

☼ ☼ ☼

گلابی جاڑوں کا موسم تھا۔ ایک دھندلی صبح جبکہ وہ آفس جانے کے لیے تیار ہورہا تھا۔ ابرش اس کی مدد کر رہی تھی۔ وہ یونیفارم پہن کر لوٹا تو فون کان سے لگا ہوا تھا اور شرٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ یقیناً" اسے بند کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ وہ آہستگی سے آگے بڑھی اور بڑی دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ اس کی شرٹ کے بٹن بند کرنے لگی۔ اس کے سنہرے بال اس کے چہرے پر جھک آئے تھے۔ زین کے ہاتھ نے نرمی سے بال پیچھے ہٹا دیے۔ ابرش نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ فون بند کرچکا تھا۔ پھر اس نے نرمی سے ابرش کو بازوؤں میں لے لیا۔

"ایک بات بتاؤ؟" اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

"پوچھیں۔" اس نے نظر جھکالی۔

"مجھ سے محبت کرتی ہو ناں؟" اس کا لہجہ پریقین تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے؟" اس نے نظریں اٹھا کر اعتماد سے پوچھا۔

"تم سوئی کسوٹی کھیلنا چاہتی ہو؟"

"نہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔

"تو پھر میری بات کا جواب دو۔"

"اور اگر میں نہ دینا چاہوں تو؟" اس نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔ زین کے ماتھے پر شکن آگئی۔ اس نے ابرش کو ایکدم جھٹکا دیا۔ وہ اس سے ٹکرائی تھی۔

"تم جواب دوگی اور ضرور دوگی۔" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

"زبردستی ہے کیا؟" ابرش ضد سے بولی۔

"ہاں۔" اس نے اپنی گرفت سخت کردی۔

"آپ مجھے ہرٹ کررہے ہیں۔" اس نے مزاحمت کی تھی۔

"اور تم مجھے۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"زین! پلیز۔۔۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"میں آنسوؤں میں بہنے والا مرد نہیں ہوں ابرش خان! تم اچھی طرح جانتی ہو۔" اس کا لہجہ بے لچک تھا۔

"کیا مجھے آزادی رائے کا حق ہے؟" اس نے ایک گہری سانس لے کر پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں۔ تم کسی عام' جاہل اور گنوار شخص کی بیوی نہیں ہو۔ تم میر زین خان کی بیوی ہو۔" اس نے غرور سے کہا۔

"تو پھر میری بات مان لیجیے۔ میں آپ کو اس بات کا جواب ضرور دوں گی مگر ابھی نہیں۔ کچھ دنوں بعد پلیز۔۔۔" اس نے التجا کی تھی۔

وہ پیچھے ہٹ گیا تھا۔

وہ لب کچلتی باہر نکل گئی۔ اسے ابھی ناشتا کا انتظام دیکھنا تھا۔ اسے آج بابا بہت یاد آرہے تھے اور ردا بھی۔ وہ ردا کا نمبر گم کر بیٹھی تھی جب ہی وہ اسے شادی پہ بھی نہ بلا سکی تھی جس کا اسے دلی افسوس تھا۔ اس کی یہ یاد رنگ لائی تھی اور اسی دن بابا اس سے ملنے آگئے۔ وہ بے تحاشا خوش تھی۔ وہ ان کے پاس بیٹھی ڈھیروں باتیں کرتی رہی۔ وہ اس کے لیے یہ خوشخبری بھی لائے تھے کہ ردا نے انہیں گھر کے نمبر پر فون کیا تھا اور جب انہوں نے اسے بتایا کہ ابرش کی شادی ہوچکی ہے تو وہ بے حد خوش ہوئی تھی۔ فوراً" ابرش کا نمبر مانگنے لگی تو انہوں نے اسے ابرش کا نیا نمبر دے دیا تھا۔ ابرش ان کی بات پر پریشان ہوگئی تھی' جانے وہ بے چاری کب تک کال کرتی رہی ہوگی مگر اس کا تو نمبر ہی بند ملا ہوگا۔

الٰہی بخش' زین سے مل کر جانا چاہتے تھے مگر وہ پتا نہیں کہاں تھا کہ فون بھی نہیں اٹھا رہا تھا۔ وہ بہت مایوس ہوکر لوٹے تھے۔ دکھ تو ابرش کو بھی بے حد تھا۔ کم از کم وہ فون پہ بات تو کرسکتا تھا۔

اس رات وہ گھر لوٹا تو ابرش کا موڈ سخت خراب تھا۔

"بابا آئے تھے۔" اس نے ڈنر ٹیبل پر زین کو بتایا۔

"ہوں۔" اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"آپ کو کال کرتے رہے۔ آپ نے فون ہی نہیں اٹھایا۔" وہ بہت سنبھل کے بول رہی تھی مگر کہیں اندر شدید غصہ دبا ہوا تھا۔

"میں پیٹرولنگ پہ تھا اور فون سائلنٹ پہ۔" سپاٹ لہجہ تھا۔

"تو جب آپ نے فون چیک کیا تھا تو کال بیک کرکے ایٹ لیسٹ انہیں بتا تو دیتے کہ آپ نہیں آسکیں گے۔" اس نے شکوہ کیا۔

وہ کرسی دھکیل کر کھڑا ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

وہ ساکت بیٹھی رہ گئی۔ اس کی نظر اپنے ہاتھوں پہ پڑی جو لرز رہے تھے اور بے آواز کتنے ہی آنسو رخساروں پہ بہہ رہے تھے۔ بہت دیر تک وہ ایسے ہی بیٹھی رہی۔ پھر خود کو سنبھال کر اٹھی اور اندر کی طرف بڑھ گئی۔ زین بیڈ پہ نیم دراز کوئی مووی دیکھنے میں مگن تھا۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہنا اور اپنے مقام پر لیٹ گئی۔

سر لحاف میں دیے وہ کتنی دقتوں سے خود پر قابو پانے کی کوشش کررہی تھی ورنہ دل چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ وہ تھکی ہوئی تھی اور سونا

چاہتی تھی مگر ٹی وی کی آواز اس کی راہ میں مزاحم تھی۔
کچھ دیر بعد ٹی وی کی آواز بند ہو گئی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ اسے خواہش تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ نرمی سے اس کا کندھا تھپتھپائے اور اپنے رویے پر معذرت کرے مگر وہ جانتی تھی یہ ناممکن تھا۔ وہ بے خبر سو چکا تھا۔ رات قطرہ قطرہ بھیگ رہی تھی اور زندگی میں تاریکی بڑھتی جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کی ازدواجی زندگی اسی اتار چڑھاؤ کا شکار تھی۔ زین کا رویہ بھی اسی طرح کا تھا۔ ویسا ہی سرد مہر، لاپروا اور بے حس۔ اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی مگر اس نے اپنا کہا سچ ثابت کیا تھا۔ اس نے ابرش کو بدل دیا تھا۔ غصہ کرنا تو در کنار وہ اونچی آواز میں بولنا بھی بھول گئی تھی۔ شادی کو چار ماہ بیت گئے تھے۔ اس بار تائی جان آئیں تو اسے شاپنگ پر لے جانے پہ بضد ہو گئیں۔ زین سے بات ہوئی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

"میں ماں ہوں اس کی۔ تمہیں کس بات پر اعتراض ہے؟" وہ بگڑ گئیں۔

"میں اسے خود لے جاؤں گا۔"

"مجھے یقین نہیں تمہاری بات پر۔"

"تو مت کریں۔" اس کی بے نیازی عروج پہ تھی۔

"مجھے تمہاری اجازت درکار نہیں زین۔" وہ اسے جتا رہی تھیں۔

"ٹھیک کہا آپ نے مگر اسے میری اجازت درکار ہے، جو میں نہیں دوں گا۔" اس نے ابرش کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

"یہ کہیں نہیں جا رہی۔ سنا آپ نے؟" اس کی آواز بلند تھی۔ وہ چونکی تھیں۔

"دن کی روشنی میں تو کبھی نظر آئے نہیں تم اس گھر میں۔ شاپنگ پہ کیا خاک لے کر جاؤ گے اسے۔" وہ جل کر بولی تھیں۔

"اس کی آپ فکر مت کریں۔" وہ بات ختم کرتا باہر نکل گیا۔

تائی جان اتنی خفا ہوئیں کہ اسی دن واپس لوٹ گئیں، جس کا زین نے کوئی نوٹس نہ لیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد ابرش رات گئے تک جاگتی رہی تھی، اس کا ذہن بس ایک ہی نقطے پر ٹھہر گیا تھا۔

"کیا میں زین کے نزدیک اس قابل نہیں ہوں کہ اس کے بغیر باہر جا سکوں...

کیا اسے میرا کردار مشکوک لگتا ہے...

کیا اس کے لیے میں قابل اعتبار نہیں ہوں؟"

یہ سوالات بڑے نوکیلے تھے اور ابرش کے خون کی گردش مدھم کرتے جاتے تھے۔ اس نے یہ تو سوچا تھا کہ زین کے ساتھ زندگی مشکل ہوگی، مگر اتنی کٹھن ہوگی، یہ اس کے گمان میں نہیں تھا۔ وہ خود پہ ضبط کرتی نڈھال سی ہوئی جا رہی تھی۔ مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ زین سے ان سارے سوالوں کا جواب مانگ سکے۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن اسے ایک اچھی خبر ملی تھی اور وہ تھا لینڈ لائن پر آنے والا ردا کا فون۔ وہ بے حد خوش تھی۔
ردا اس سے ساری باتیں جان لینا چاہتی تھی۔ زین کی اور اس کی شادی، زین کا رویہ، یہ شکوہ کہ اسے نہیں بلایا اور سب سے بڑھ کر اس کا موجودہ پتا۔
وہ مسکرا کر اس کی ساری باتوں کے جواب دیتی گئی۔ ردا بھی آج کل لاہور آئی ہوئی تھی۔ اس نے اگلے دن آنے کا وعدہ کر لیا۔ ابرش نے فوراً ہامی بھر لی تھی، مگر یہی بات جب اس نے زین کو بتائی تو اس کے تاثرات عجیب سے ہو گئے۔

"میں نے اسے بلا کر غلط تو نہیں کیا ناں؟" وہ انجانے خدشوں کے پیش نظر پوچھ رہی تھی۔

"ہاں۔" وہ کھردرے لہجے میں بولا۔

"کیوں؟"

"کیوں کہ دوستیاں کالج تک ہی محدود ہونی چاہئیں۔ گھر تک آنے والی دوستیاں مجھے پسند نہیں ہیں۔" وہ ہنوز اسی لہجہ میں بات کر رہا تھا۔ ابرش کو دھچکا لگا۔

"مگر وہ میری اکلوتی دوست ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"سو واٹ؟" وہ کتاب بند کرتے ہوئے بولا۔

"مگر اب میں اسے بلا چکی ہوں۔"

"تو منع کر دو۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" اس نے احتجاج کیا۔

"کیوں؟" اس کے ماتھے پہ شکن آ گئی۔

"آخر میں کیوں مانوں آپ کی بات؟" وہ جھلا گئی تھی۔

"کیوں کہ یہ مجھے پسند نہیں ہے۔" اس نے کتاب سائیڈ ٹیبل پر پٹخی اور فون ابرش کی طرف بڑھایا تھا۔

"اپنی فرینڈ کو فون کرو اور اسے بتا دو کہ وہ مت آئے۔" بے لچک اور تحکم سے بھرا لہجہ ابرش کے اندر سناٹے بھر گیا۔

"میں یہ نہیں کروں گی۔" وہ سرکشی سے بولی۔

"تمہیں یہ کرنا ہوگا۔" اس نے زور دیا۔

"آخر میں ہی آپ کی ہر بات کیوں مانوں؟ آپ کو مجھ میں کچھ بھی پسند نہیں ہے۔ میرا بابا کے گھر جانا، انہیں فون کرنا، شاپنگ پہ جانا، اونچی آواز میں بولنا اور اب میری دوست کا آنا... آپ کو تو کچھ بھی پسند نہیں۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں میر زین خان! کہ آخر آپ اتنے شکی مزاج کیوں ہیں؟ ایسی کون سی خرابی دیکھ لی آپ نے میرے کردار میں؟؟ کیا کیا ہے میں نے؟ کچھ بتائیں گے آپ مجھے؟" وہ پھٹ پڑی تھی۔ زہر خند لہجے میں وہ بلند آواز سے بول رہی تھی۔

"شٹ اپ۔" وہ چلایا تھا۔

"یو شٹ اپ۔ خریدا نہیں ہے آپ نے مجھے..." وہ اس سے بھی بلند آواز میں بولی مگر زین کا دایاں ہاتھ اٹھا اور پوری قوت سے اس کے دائیں گال پہ پڑا۔ مضبوط ہاتھ کی ضرب اتنی بھاری تھی کہ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گری۔

"ہاں۔ اعتراض ہے مجھے تمہاری ہر بات پر۔ شک کرتا ہوں میں تم پر۔ اس کی وجہ بھی تم ہی ہو... یہ دیکھو... اس نمبر کو پہچانتی ہو ناں؟ تمہارا خفیہ نمبر۔ جس سے تم مجھے فون کالز کرتی رہیں۔ تمہیں کیا لگا تھا، میں جان نہیں پاؤں گا؟ تمہارے ہاتھوں بے وقوف بنتا رہوں گا؟ تم نے ایس پی میر زین خان کو اتنا کم عقل سمجھا تھا؟ میں تو بہت پہلے ہی جان گیا تھا کہ یہ تم تھیں جو مجھے رانگ کالر بن کر تنگ کر رہی تھیں۔ اپنی پسندیدگی کے دعوے بھول گئے تمہیں؟ یاد ہے آخری فون پہ کیا کہا تھا تم نے... "آپ کا کردار بے داغ ہے زین!"...
میں چاہتا تو کال بیک کر کے تمہارا بھانڈا پھوڑ سکتا تھا، مگر میں اتنا گرا ہوا نہیں ہوں، جب ہی جائز طریقے سے سوچا کہ تم سے شادی کر لوں۔ کوشش بھی کی کہ تمہاری غلطی کو بھلا دوں مگر میں بھی انسان ہوں۔ تمہاری اس مستقل ڈرامے بازی نے مجھے تھکا دیا ہے... سو اب ابرش بی بی! سمجھ میں آیا آپ کی کہ کیوں مجھے اتنے اعتراضات ہیں تم پر۔"

زین کے منہ سے الفاظ کی جگہ آگ کے گولے نکل رہے تھے۔ تیزاب میں جھلسے ہوئے جو اس کا تن من خاک کر گئے۔ وہ خالی آنکھیں لیے اس کی باتوں کا متن سمجھنے کی کوشش کرتی رہی اور وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ اسی طرح ساکت و جامد بیٹھی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہا تھا زین؟ میں اسے کالز کرتی رہی... نہیں... اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسا بھلا کیسے ممکن ہے؟ لیکن وہ نمبر تو میں نے ردا کے لیے لیا تھا۔ وہ کیوں کرے گی زین کو فون؟ تو پھر؟ کیا زین نے میرے ساتھ جھوٹ بولا ہے؟؟ نہیں... وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ لیکن پھر وہ ایسا کیوں کہہ رہا تھا؟" وہ بڑبڑا رہی تھی۔ اس کے سارے جسم پر لرزہ سا طاری تھا۔

وہ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر بیٹھ گئی۔

"وہ شک کرتا ہے مجھ پر۔" اس کے سینے میں تیر سا گڑ گیا تھا۔ پتا نہیں اسے کتنی دیر اسی طرح بیٹھے گزر گئی جب باہر سے کسی کی آواز آئی، پھر دروازہ کھلا اور

ردا اندر آگئی' اس کے ہاتھوں میں کئی شاپنگ بیگز تھے۔

"ہائے ابرش!" وہ چہکتی ہوئی آواز میں بولی مگر آگے بڑھ کر جب اسے اس طرح دیکھا تو حیران سی اس کی طرف آگئی۔

"کیا ہوا؟ ایسے کیوں بیٹھی ہوں؟"

ابرش خالی الذہنی کے عالم میں' ویران آنکھیں لیے اسے یک ٹک دیکھے گئی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

"وہ... وہ کہتا ہے میں اسے فون کالز اور میسجز کرتی رہی۔" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی تھی۔ اس کا سکتہ ٹوٹ گیا تھا۔

ردا کے سر پر کسی نے بم پھوڑا تھا۔ وہ دھک سے رہ گئی۔

"کیا مطلب؟"

"یہ جھوٹ ہے ردا۔ میں نے کبھی اسے فون یا میسج نہیں کیا۔ ایک بار بھی نہیں۔ وہ ایسا کیسے کہہ سکتا ہے؟ وہ اتنا بڑا الزام کیسے لگا سکتا ہے ردا؟"

وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اس بار سُن ہونے کی باری ردا کمال کی تھی۔

"وہ مجھ پہ شک کرتا ہے۔ مجھے کہیں آنے جانے بھی نہیں دیتا۔" اس کی آواز کرب سے پھٹ رہی تھی۔

"وہ کہتا ہے اسے میری ہر بات پر اعتراض ہے۔ میں اس کے نزدیک قابل اعتبار نہیں ہوں۔ اسے میری ہر بات جھوٹ لگتی ہے... میں نے کچھ نہیں کیا ردا! اسے میرا یقین نہیں ہے... آہ اللہ جی! میری مدد کریں... اللہ..." وہ تڑپ رہی تھی۔

مجسمہ بنی ردا میں حرکت ہوئی اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ابرش گھٹنوں میں سر دیے سسکیاں لے رہی تھی۔ اس کی زبان پہ نوحے تھے۔

ردا باہر نکل آئی۔ اس کا رخ زین کے آفس کی طرف تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کچھ ضروری ڈکٹیشن دینے میں مصروف تھا' جب اسے اطلاع ملی کہ کوئی خاتون اس سے ایمرجنسی میں ملنا چاہتی ہیں۔ اس نے اندر آنے کا کہہ دیا۔ کچھ دیر بعد ایک لڑکی اندر داخل ہوئی' اس کی عمر بمشکل تیئیس چوبیس سال رہی ہوگی' وہ واجبی شکل و صورت کی لڑکی تھی۔

"جی فرمایئے بی بی۔" زین خان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس کے سامنے کرسی پہ بیٹھ گئی۔

"میرا نام ردا کمال ہے۔" اس نے اپنا نام بتایا۔

زین بری طرح چونکا۔ اس کی آواز نے زین کو اندر سے کلک کیا تھا۔

"میں دو سال ابرش کی کلاس فیلو اور روم میٹ رہی ہوں۔" اس نے کہا اس کی آواز بڑی مدھم تھی اور چہرے کے تاثرات بڑے عجیب سے تھے۔ زین سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"آپ سچ تک پہنچ تو گئے زین! مگر ابھی آدھا سچ آپ کی نظروں سے اوجھل ہے۔"

"کیسا سچ؟" زین نے اس سے پوچھا۔

"میرا تعلق لوئر مڈل کلاس سے ہے۔ میں شروع سے ہی ابرش سے بہت متاثر تھی۔ میں اکثر اس سے آپ کا ذکر سنتی رہتی تھی۔ مجھے ہمیشہ آپ کی پرسنالٹی بڑی اٹریکٹو لگی' مگر اصل خرابی تو تب ہوئی جب میں نے آپ کو فرسٹ ٹائم دیکھا... میں بتا نہیں سکتی کہ مجھ پر کیا گزری۔ آپ کا اٹھنا' بیٹھنا' بات کرنے کا انداز اور یونیفارم... میں شاید پاگل ہو گئی تھی۔ میرے نفس نے مجھے بے قابو کر دیا۔ میں جانتی تھی کہ میں آپ کو پا نہیں سکتی تھی۔ یہ ممکن ہی نہ تھا۔ ہم دونوں دو مختلف دنیاؤں کے لوگ تھے' مگر میں نے وقتی تسکین کے لیے بہت پستی میں گر جانے میں بھی کوئی قباحت نہ سمجھی۔

تھوڑی دیر فون پہ بات یا میسج کرنے سے نہ تو آپ میرا کچھ بگاڑ سکتے تھے اور نہ ہی میں آپ سے کچھ لے سکتی تھی۔ جب ہی میں ابر آپ کو کالز کرتی رہی۔ مگر خدا گواہ ہے کہ ابرش کو اس کا علم نہیں ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ آپ یہ

بات جان لیں گے۔ میں اپنی طرف سے مطمئن تھی' مگر نہیں جانتی تھی کہ میں نے اپنی معصوم بے گناہ دوست کے راستے کھوٹے کر دیے ہیں... میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میری وقتی جذباتیت اور بے وقوفی مجھے یہ دن دکھائے گی۔"

وہ بے آواز رو رہی تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ شاید اس میں زین سے نظر ملانے کی ہمت ہی نہ تھی۔

"میں نے تب جو کیا' مجھے اس میں کچھ غلط نہ لگا تھا... میں مطمئن تھی کہ میری چوری پر پردہ پڑ گیا' مگر یوں آج اپنی دوست کو اپنے رب سے التجا کرتے دیکھا تو مجھے اس آہ سے ڈر لگا۔ مجھے اس پاکیزہ لڑکی کی بددعا سے خوف آیا... اپنی آخرت بچانے کے لیے سوچا کہ میں آپ کو سب سچ بتا دوں... اور آج میں یہاں ہوں۔" وہ ہونٹ بھینچ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ابرش کے سامنے یہ راز کھول سکوں۔ جب ہی آپ کے پاس آگئی۔ آپ مجھے جو بھی سزا دیں گے... میں... میں قبول کر لوں گی۔" وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

زین جواب تک خاموش تھا۔ اسے یکدم احساس ہوا کہ اسے بولنے میں کتنی دقت ہو رہی تھی۔

"تمہاری سزا یہی ہے ردا کمال! کہ تم اپنے منہ سے سب کچھ ابرش کو بتاؤ گی۔" وہ سفاکی سے بولا۔

"نہیں۔ پلیز نہیں... میری غلطی کی مجھے اتنی بڑی سزا مت دیں۔" وہ خوفزدہ ہو گئی۔ اس کی آواز میں التجا تھی۔

"غلطی؟؟ یہ غلطی تھی؟ تمہیں پتا ہے تمہاری اس غلطی کا کیا خمیازہ بھگتا اس نے؟ احساس ہے تمہیں؟" وہ غرایا تھا۔ وہ سسک اٹھی۔

"یہ تماشا بند کرو اور چلو میرے ساتھ۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"زین! مجھ پر رحم کھائیں... مجھے میری دوست کی نظروں سے مت گرائیں۔" وہ تڑپ کر بولی تھی۔

"اور تم نے جو اسے میری نظروں میں پست کر دیا تھا' اس کا کیا؟" اس نے کھا جانے والے انداز میں اسے گھورا۔

"خدا کے لیے..."

"خدا کو بیچ میں مت لاؤ۔ کیا یہ کرتے ہوئے تمہیں خدا یاد آیا تھا؟" اس نے جھپٹ کر اس کا بازو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا لے کر باہر نکل گیا۔

طوفانی انداز میں گاڑی دوڑاتے جب واپس گھر پہنچا تو وہ بے چاری ابھی تک زمین پہ بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کے دائیں گال پر زین کی انگلیوں کا نشان بھی ہنوز تھا۔ زین نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور ردا کے سامنے کھڑا کر دیا۔

"ابرش! تم بے گناہ ہو۔ تم نے کچھ نہیں کیا۔ جو کیا' اس نے کیا۔ پوچھو اس سے۔" زین نے بلند آواز میں کہا تھا۔

ابرش نے تڑپ کر زین کو دیکھا۔ یہ زندگی بخشنے والے الفاظ اس کے لبوں سے ہی ادا ہوئے تھے؟ مگر وہ کیا کہہ رہا تھا کہ یہ سب ردا نے کیا؟ وہ نا سمجھی کی کیفیت میں ردا کو دیکھنے لگی۔

"مجھے معاف کر دو ابرش! میں تمہاری مجرم ہوں۔" اس نے ابرش کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ابرش چکرا کر رہ گئی۔

"کیا مطلب؟ کیا کیا ہے تم نے؟"

"یہ مجھے تمہارے نام پر لیے ہوئے نمبر سے کال کرتی رہی۔ رانگ کالر بن کر۔ میں تنگ آچکا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر یہ اتنی جرات مند لڑکی کون تھی جب میں نے نمبر ٹریس کروایا تو پتا چلا کہ یہ تمہارے نام پر لیا گیا ہے۔ نیچرلی میرے دماغ میں یہی آیا کہ یہ تم ہی ہو سکتی تھیں' مگر یہ ساری کارستانی اس لڑکی کی تھی۔ پوچھو اپنی اس نام نہاد دوست سے جو آستین کا سانپ نکلی۔"

وہ زہریلے لہجے میں بولتا گیا۔

"نہیں... آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ جھوٹ بول رہے ہیں۔" وہ چلائی تھی۔

"یہی سچ ہے ابرش!" ردا کی آواز گونجی۔ ابرش نے پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم ایسا کیسے کر سکتی ہو؟ کیسے؟" اس کی آواز میں حیرت آمیز سرسراہٹ تھی۔

"میں پاگل ہو گئی تھی۔ مجھے معاف کر دو..." وہ رونے لگی۔

"معاف کر دوں؟" وہ بڑبڑائی اور نہ سمجھنے والے انداز میں زین کو دیکھا۔ زین نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔

"ابرش! یہی سچ ہے۔ میں مس گائیڈ ہو گیا تھا۔ بات ہی اس طرح کی تھی کہ میری ساری ذہانت دھری کی دھری رہ گئی۔" اس کے لہجے میں افسوس تھا۔ ابرش نے بے یقینی سے ایک نظر زین کو اور پھر ردا کو دیکھا۔

"تم تو میری دوست تھیں ردا... میری اکلوتی دوست! ایسا کیوں کیا تم نے؟" اس کی آواز میں ٹوٹے ہوئے مان کی کرچیاں تھیں۔

"میرا دماغ خراب ہو گیا تھا ابرش۔" اس نے جیسے خود کو کوسا تھا۔

"ابرش! دفع کرو اس گھٹیا لڑکی..." زین نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ابرش بلند آواز سے رو رہی تھی۔

"یہ تو میری دوست تھی زین!" وہ زین کا بازو تھامے فریاد کناں تھی۔

"اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں مجھے آپ کی نظروں سے گرا دیا؟ کیوں میرے ساتھ ایسا گھناؤنا کھیل کھیلا... کیوں؟ کیوں؟ میں نے کسی کے ساتھ کبھی برا نہیں کیا زین! پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟" وہ زین سے پوچھ رہی تھی۔

زین نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور خوں آشام نظروں سے ردا کو گھورا تھا۔

"ردا کمال! اس گھر سے دفع ہو جاؤ اور دوبارہ مجھے نظر مت آنا ورنہ تمہارا انجام اچھا نہیں ہو گا۔" اس نے وارننگ دی تھی۔

اور ردا کمال تو اب تاعمر اپنے ضمیر کی قیدی بن چکی تھی۔ روتے ہوئے وہاں سے نکل گئی۔

"ابرش! حوصلہ کرو..." زین نے اس کا سر سہلایا۔

"وہ میری... دوست..." وہ بے ربطی سے بولتی اس کے بازوؤں میں لہرا گئی۔

☼ ☼ ☼

رات گہری اور تاریک تھی۔ وہ بیڈ پر چت لیٹی تھی جب دو بازو نرمی سے اس کے گرد حمائل ہو گئے۔

"ابرش۔" اس کی آواز میں بے تابی اور پیاس تھی۔

"مجھے چھوڑ دیں... میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔" اس کا وجود لرز رہا تھا۔

"ایسا مت کہو۔" وہ تڑپا۔

"یہی سچ ہے میر زین خان! میں تو خود سے نظر ملانے کے بھی قابل نہیں ہوں۔ کیا ہو سکتی ہے میری حیثیت خود اپنی نظر میں؟ ایک ایسی لڑکی جس کے بارے میں ہر حد تک غلط سوچا گیا ہو۔ جس کو بدکرداری کا سرٹیفکیٹ تھما کر ہر لمحہ اسے بے اعتباری کی مار ماری گئی ہو... میں ایک ہاری ہوئی ذات ہوں... میں تو بالکل بھی اچھی نہیں ہوں..." اس کے آنسو بہنے لگے۔

"ایسا کچھ نہیں ہے ابرش! خدارا اتنی انتہا پر مت جاؤ۔" وہ اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

"تو پھر سچ کیا ہے؟ آپ بتائیں آپ تو بہت پڑھے لکھے ہیں نا! عام لوگوں سے بہت مختلف مگر آپ نے مجھ سے پوچھنا تک گوارا نہ کیا۔ بس لاعلمی میں ہی مجھے سزا دیتے رہے۔" وہ شکوہ کناں تھی۔

"اس بات کو بھول جاؤ۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہے۔" وہ مستحکم لہجے میں بولا تھا۔

"نہیں، بھول سکتی میں۔" وہ ہسٹریائی ہو گئی۔

"تو پھر کیا چاہتی ہو تم؟" وہ بے بس ہوا تھا۔

"مجھے بابا کے گھر بھجوا دیں۔" اس نے التجا کی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ صبح تیار رہنا۔" اس نے فوراً ہامی بھر لی تھی۔

وہ ساکت سی اس کے بازوؤں میں پڑی رہی اور

رات قطرہ قطرہ بھیگتی رہی۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح وہ بابا کے ہاں چلی آئی۔ وہ اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے تھے۔ دونوں باپ بیٹی نے مل کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ وہ ان کے بازو دباتی رہی اور بابا اس سے پوچھتے رہے کہ زین کے ساتھ وہ خوش تو ہے۔ وہ ان کی تسلی کے لیے مسکرا مسکرا کر جواب دیتی رہی۔ اس کے بابا نے اسے ایک شاندار زندگی دی تھی، اس کی ہر خواہش پوری کی تھی، اس کے لیے اپنے تئیں ایک بہترین جیون ساتھی تلاش کیا تھا اور سب سے بڑھ کر اس کے لیے بے شمار دعائیں کی تھیں تو وہ کیسے انہیں اپنی ازدواجی زندگی کی جھلک دکھلا کر دکھی کرتی۔

وہ دو دن وہاں رکی تھی اور اس دوران اسے سنبھلنے کا خاصا موقع مل گیا تھا۔ تیسرے دن اسے لینے کے لیے زین خود آیا تھا۔ وہ قدرے حیران ہوئی مگر بابا بے حد خوش تھے۔ وہ کافی دنوں بعد اس سے ملے تھے، جب ہی دیر تک باہم گفتگو میں مگن رہے۔

وہ چار پانچ گھنٹوں تک رکا تھا۔ ایک شاندار ضیافت کے بعد وہ دونوں واپسی کے لیے نکل آئے۔ شام ہو چکی تھی۔ فضا میں ایک دھندلی زردی چھائی ہوئی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟" زین نے پوچھا۔ وہ چونک کر متوجہ ہوئی۔

"بہتر ہوں۔" آہستگی سے اس نے کہا۔

"میں اس گلٹ سے نکلنا چاہتا ہوں ابرش!"

"تو پھر کیا سوچا آپ نے؟" وہ بولی۔

"یہی کہ تم سے ایکسکیوز کروں۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"تو کریں۔" وہ زیر لب مسکائی۔ اسے ایک پرانا منظر یاد آنے لگا تھا۔

زین نے جھٹکے سے بریک لگائی اور پورا کا پورا اس کی طرف گھوم گیا شاید اسے بھی وہ پرانا منظر یاد آ گیا تھا۔

"ابرش! میں تم سے اپنے غلط رویے اور سخت الفاظ کی معافی مانگتا ہوں۔" وہ اس کے ہاتھ تھامے بولا تھا۔ وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔

"میں نے بہت غلط کیا نا؟" وہ بے حد بے چین تھا۔

"میں نے تمہیں انجانے میں دکھ دیا، ورنہ سچ تو یہ ہے میں تم سے بے پناہ پیار کرتا ہوں۔" اس کی آنکھوں میں سچی چاہت کے دیے روشن تھے۔

ابرش نے بے ساختہ زین کے شانے پہ سر دھر دیا۔ زین کے اندر سکون اترتا گیا۔ اس نے جھک کر ابرش کی پیشانی کو چوما اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☼ ☼ ☼

ابرش کا دل پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ زین کی والہانہ چاہت اسے ایک خوب صورت زندگی کے آغاز کی نوید دے رہی تھی۔

محبت تو بادشاہ ہوتی ہے
جو رعایا نہیں رکھتی
لیکن غلام ضرور بنا لیتی ہے۔

☼

نیر فہیم خان

عدنان نے اچھی طرح جھاڑو دینے کے بعد پوچا لگایا پھر پوچے کو اچھی طرح رگڑ رگڑ کر دھویا۔ نچوڑ کر ایک طرف کھونٹی پر لٹکایا۔ واش بیسن کے شیشے پر پانی کے قطرے خشک کپڑے سے صاف کیے اور پنکھا چلا کر تخت پر آ بیٹھا۔ جہاں امی مٹر چھیل رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مٹر اٹھائے۔

"بس رہنے دو۔" انہوں نے ٹوکری کو اپنی طرف گھسیٹا۔ "ابھی تو ساری صفائی کر کے آئے ہو۔ تھوڑا سانس لے لو۔ میں چھیل لوں گی۔"

"امی! فالتو ہی تو بیٹھا ہوں ناں۔ اچھا ہے جلدی کھانا بن جائے گا، پھر میرا فیکٹری جانے کا وقت بھی ہونے والا ہے۔"

"ہاں یہی تو کہہ رہی ہوں، ابھی دو بجے جاؤ گے تو آدھی رات ڈھلے واپس آؤ گے۔ تھوڑا آرام کرو۔" امی نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں ٹھیک ہوں اماں! بس یہ ڈبل ڈیوٹی کی عادت نہیں ہو پا رہی۔ کبھی صبح کبھی رات، اسی چکر میں نیند پوری نہیں ہو پا رہی۔" وہ نہایت نفاست سے مٹر چھیل رہا تھا۔

"ہاں بیٹا! یہ تو ہے۔ وہی ڈیوٹی صحیح تھی صبح والی۔ شام ڈھلے گھر آ کر آرام سے کھا پی کر سو جاؤ۔ صبح اٹھ کر تازہ دم ہو کر کام پر نکل جاؤ مگر تمہارے مالکوں کی تو مت ہی الٹی ہے۔ خیر! اللہ نے چاہا تو یہ دن بھی نکل جائیں گے۔" ان کے انداز میں تسلی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے ماں بیٹے میں!" بیگم خالہ نے خوشگوار انداز میں پوچھا۔

"آئیں بیگم خالہ! ہم تو بس یونہی باتیں کر رہے تھے۔"

امی نے سامان سمیٹ کر جگہ بنائی۔ بیگم خالہ نے طائرانہ انداز میں نگاہ دوڑائی۔ بڑے نصیب ہیں تمہارے ؟ ابھی صبح کے دس بجے ہیں اور تمہارے گھر میں سارا کام نمٹا کر دوپہر کے کھانے کی تیاری بھی ہو رہی ہے اور ایک ہمارے گھر کا حال ہے۔ ابھی بہو رانی جمائیاں لیتی اٹھی ہیں۔ میں تو اس کی منحوس ماری صورت دیکھ کر باہر نکل آئی۔ اختلاج قلب ہونے لگا تھا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ان لوگوں کی کمر کیوں نہیں دکھتی بستر پر اینڈتے ہوئے۔ میں تو آنکھ کھلتے ہی اٹھ جاتی ہوں۔ فالتو لیٹا نہیں جاتا اور ہماری بہو صاحبہ..... ان کا بس چلے تو پیٹ میں ہی ڈھکن بنا لیں تاکہ کھانا چبانا بھی نہ پڑے اور پیٹ بھر جائے۔ پکانے کو تو دور جانو۔"

عدنان مسکراتے ہوئے اٹھ گیا۔

"حد کرتی ہیں خالہ آپ بھی، ہر وقت بہو کے شکوے۔"

ابھی تم اس بلا سے محفوظ ہو ناں اس لیے، جب بہو لاؤ گی تو تمہارے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔" عدنان نے پاپے اور چائے کا بھاپ اڑاتا کپ سامنے رکھا۔

"ماشاء اللہ! اللہ خوش رکھے۔ تمہارے بھاگ جگائے۔ تمہیں چاند سی دلہن عطا کرے۔"

چائے کے کپ نے خالہ کی دعاؤں کی بیٹری چارج کر دی۔

"بھئی رئیسہ! خوش نصیب ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں نیک اولاد عطا کی ہے۔ تمہارے دونوں بیٹے ہیرا ہیں ہیرا۔"

"یہ بات تو ہے۔ میرے بچوں کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بیٹی نہیں دی مگر بیٹوں کا سا سکھ بیٹوں کے ذریعے نصیب میں لکھ دیا۔ میرے بیٹے لڑکے ہونے کے باوجود گھر کے کام کاج سے نہ گھبراتے ہیں اور نہ ہی شرماتے ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ سے دعا ہے ان کے جوڑ بھی سگھڑ ہی ملیں۔" انہوں نے دل سے دعا دی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو مگر اس کے لیے بہت خجل خواری کرنی ہو گی۔ تم خود زمانے کی سگھڑ ہو، کون سا ایسا کام ہے جو تم کو نہیں آیا۔ کشیدہ کاری ایسی کہ مشین کا گمان ہو۔ کھانا بنانے میں کمال حاصل ہے، جو ایک بار تمہارے ہاتھ کا کھانا کھا لے ہمیشہ ذائقہ یاد رکھتا ہے۔ گھر دیکھو تو شیشے کی مانند جگمگا تا رہتا ہے۔ پھول پودے اپنی جگہ بہار دکھاتے ہیں۔ ان کا خیال رکھنا بھی کوئی

آسان بات نہیں مگر تم کو شاباش ہے، اکیلی جان اور سب طرف کا دھیان اور کہیں بھی کوئی کمی نہیں۔" بیگم خالہ نے دل کھول کر تعریف کی۔

"عدنان کے ابو سے پوچھیں، وہ بتائیں گے۔" رئیسہ بیگم ہنس کر بولیں۔

"ارے چھوڑو تمہارے میاں کو۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کو گنجے سر میں بھی جوئیں نظر آتی ہیں۔ ہم آنکھیں رکھتے ہیں۔ ہم سے جھوٹ نہیں بولا جاتا۔"

"خالہ! میری امی کو نظر نہ لگا دینا۔" عدنان نے شرارت سے کہا۔

"دیکھو! یہاں ایک لڑکے نے کپڑے دھوئے ہیں سب صاف ستھرا ہے۔ برش صابن اپنی جگہ ہے، بالٹی دھو کر الٹی رکھی ہے اور جگہ کو بھی خشک کر دیا۔ ابھی یہ کام میری پوتی سے کراؤ۔ ایک کپڑا دھونے میں ایسا فتور ڈالے گی کہ حد نہیں۔ پورا آنگن گیلا کر دے گی اور مجال ہے کہ کوئی چیز ٹھکانے پر ملے۔ سب ماں کی ڈھیل ہے۔ ماں ہی بدسلیقہ ہے۔ وہی عادت بچوں میں آتی جا رہی ہے۔"

"بچی ہے، خالہ! سیکھ جائے گی۔"

"کب سیکھے گی، جب سسرال کی چوکھٹ پر کھڑی ہو گی؟ ارے سسرال تو ایسی بلا ہے کہ سگھڑ سے سگھڑ لڑکی کو بھی پھوہڑ کا تمغہ مل جاتا ہے۔ نئے گھر کے نئے ریت رواج ہوتے ہیں، جن کو سمجھنا آسان کام نہیں۔ جو لڑکی اپنے گھر کے کام آسانی سے نہیں نمٹا سکتی، کسی اور گھر کو کیا اپنائے گی۔" بیگم خالہ سخت نالاں تھیں۔

"اللہ پر بھروسا رکھیں خالہ! وہ سب بہتر کر دے گا۔ آپ چائے پی لیں، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"بس اللہ ہی مالک ہے۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کپ لبوں سے لگا لیا۔

☼ ☼ ☼

"یا اللہ! مجھے معاف کرنا، میری توبہ۔" انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"ہاں بھئی بہت برا لگتا ہے۔ کسی کے گھر جانا کھانا پینا پھر امید بھری نگاہوں میں مایوسی کا اندھیرا دے کر چلے جانا۔"

"مگر میں بھی کیا کروں، میرے دو ہی بچے ہیں۔ آپ جانتی ہیں میں نے بڑی مشکل سے انہیں پال پوس کر جوان کیا ہے۔ میرے بچوں میں پیار ہے اور میں چاہتی ہوں کہ مجھے ایسی لڑکی ملے جو ہمارے گھرانے کو جوڑ کر رکھے۔ میرے بچے بھی میری طرح کی سوچ کے مالک ہیں۔ وہ بھی سلجھی، شریف اور ہنرمند لڑکی کو ہی اپنا شریک سفر بنا سکتے ہیں، کسی فیشن کی دلدادہ کو نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ لڑکی کم عمر اور خوب صورت تھی مگر فیشن توبہ! دو رنگے بال، تنگ کپڑے زیورات کی دکان بنی ہوئی تھی۔ بات بات پر ہنس پڑنا جیسے ہم کوئی لطیفہ سنا رہے ہوں۔ ایسی لاابالی لڑکی خاک گھر سنبھالے گی۔ مجبوراً واپس آنا پڑا۔"

وہ تھکی تھکی سی بیٹھی تھیں۔

"ہمت کرو، مایوسی اچھی نہیں، تمہارے مطلب کی لڑکی بھی مل جائے گی۔"

"لوگوں کے اوٹ پٹانگ لڑکوں کو اتنی اچھی لڑکیاں مل جاتی ہیں اور میرے اتنے قابل بیٹے کے لیے کوئی ڈھنگ کی لڑکی نہیں مل رہی۔" وہ سخت روکھی ہو رہی تھیں۔

"امی! آپ بھی تو سات لڑکیوں کی خوبیاں ایک لڑکی میں ڈھونڈنا چاہتی ہیں۔ اب ایسا تو ہو گا ہی۔

ایک ہی لڑکی خوب صورت بھی ہو، سلیقہ شعار سگھڑ بھی ہو، اسی کو با اخلاق بھی ہونا ہے اور تعلیم یافتہ بھی، ساتھ میں مہذب اور دین دار بھی ہو تاکہ آنے والی نسل کی پرورش اچھی ہو سکے۔ اب ایک اکیلی لڑکی بے چاری کتنا بوجھ اٹھائے گی۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ چار......"

امی کا جوتی کی طرف بڑھتا ہاتھ دیکھ کر سمیر بقیہ جملہ منہ میں ہی دبا گیا۔

"شکل گم کرو تم اپنی ورنہ آج پٹ جاؤ گے۔" ان کا غصے سے برا حال تھا۔ وہ کان دبا کر نکل گیا۔ وہ خاصی دیر تک بڑبڑاتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

"کس نے کہا ہے آپ سے گرمی میں باہر جانے کے لیے۔ دیکھیے، کتنا برا حال کر لیا ہے آپ نے اپنا۔" عدنان کے لہجے میں خفگی تھی۔

"ارے کچھ حال نہیں بیٹا! بس تھوڑا سا بی پی لو ہو گیا ہے اور تھکاوٹ کی وجہ سے چکر آگئے تھے۔" ان کے لہجے میں نقاہت تھی۔

"تو کیا ضروری ہے جانا۔ نہیں کرنی مجھے شادی، لڑکی ملنا ہو گی تو خود ہی مل جائے گی۔"

"ارے تو کیا آسمان سے ٹپکے گی۔ دیکھنا بھالنا تو پڑتا ہے ناں۔ آخر ساری زندگی کا معاملہ ہے، یوں آنکھ بند کر کے تو رشتہ نہیں جوڑ سکتے۔"

"ابھی آپ یہ سب کچھ چھوڑیں اور آرام کریں۔ میں کھانا بنا لوں گا آپ جوس پی لیں۔"

"میں ٹھیک ہوں بیٹا! اپنی ماں کو اتنا آرام پسند نہ بناؤ۔"

"امی..." وہ ان کے قریب بیٹھ گیا۔

"آپ کی زندگی میں آرام پسندی کہاں رہی ہے۔ ابو اتنے سخت مزاج ہیں کہ ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہیں۔ آپ ان کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش میں ہلکان رہتی ہیں لیکن پھر بھی ان کے غصے کا گراف نیچے نہیں اترتا۔ امی! ہم بچپن سے دیکھ رہے ہیں، ابو شروع سے گرم مزاج ہیں اور ہر کام میں نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اسی لیے میں آپ کی مدد کرتا ہوں تاکہ گھر کے کاموں کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔"

"اور اسی لیے بیٹا! میں چاہتی ہوں کہ اب تم کو بھی آرام ملے۔ آج کے دور میں کمانا ہی سخت محنت کا کام ہے پھر گھر میں میرا ہاتھ بھی بٹانا۔ یہ ڈبل مشقت تم کو کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے میں کوئی ایسی لڑکی چاہتی ہوں جسے دیکھ کر تمہاری تھکن اتر جائے۔ جس کا سلیقہ اور میٹھے بول تمہاری زندگی میں رنگ بھر دیں۔"

"امی! آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔" عدنان نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا بولو، میں بھلا کیوں تمہاری بات کا برا مانوں گی۔" انہوں نے ہمت بندھائی۔

"آپ غلط مت سمجھیے گا آپ کا فیصلہ اور پسند میرے لیے سب سے اہم ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میرے جیون ساتھی کی وجہ سے میری ماں کو کوئی دکھ پہنچے۔" اس نے تمہید باندھی۔

"مجھے پتا ہے بیٹا کہ تم مجھے دکھ پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔" وہ اعتماد سے مسکرائیں۔

"اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ آپ سعد کی بہن اجالا کو دیکھ لیں۔ ان کے گھر کا ماحول بھی اچھا ہے اور شریف فیملی ہے۔"

"ارے! تو اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے۔" وہ ہنس دیں "اگر لڑکی کا گھرانا تمہارا دیکھا بھالا ہے تو اس سے اچھی کیا بات ہے۔ میں کل ہی جا کر دیکھ آؤں گی۔"

"اتنی جلدی کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب آپ کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے تو سوچیے گا۔"

"اچھا بابا! جو تمہاری مرضی۔" وہ ہار مان کر بولیں۔ عدنان کے لبوں پر بھی پرسکون مسکراہٹ پھیل گئی۔

☼ ☼ ☼

اجالا کو دیکھ کر ان کے دل کو جیسے قرار سا آگیا۔ خوب صورت نازک سے نقوش، سلجھا ہوا انداز، سادہ مگر باوقار لباس، اس کی شخصیت واقعی نام کا آئینہ دار تھی۔ بے حد نفاست اور خوب صورتی سے سجا ہوا گھر لگتا ہے جیسے بے حد سلیقہ مند ہاتھوں اور تخلیقی دماغ نے اپنی ساری صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے عام سی چیزوں کو بھی نہایت مہارت سے استعمال کر کے گھر کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ ایک پرسکون خوشگواریت کا احساس ہر سو پھیلا ہوا تھا۔

ناشتے میں پیش کی جانے والی ساری اشیا گھر کی بنی ہوئی تھیں۔ کباب، فروٹ چاٹ، کٹلس بڑے سلیقے اور نفاست سے پیش کیے گئے تھے۔

"امی! یہ لڑکی تو فوران ون ہے یعنی چار بہوؤں کی خوبیاں ایک ہی لڑکی میں۔ واہ کمال ہے۔" سمیر بھی ساتھ آیا تھا۔ وہ یہ سب دیکھ کر چپ نہ رہ سکا۔ اجالا کی امی فون سننے باہر گئیں تو اس نے ہلکی سی سرگوشی کی۔

"تم ہی بتاؤ اب کیا کہو گے۔ اس دن تو بڑا ماں کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اب مل گئی ناں میری پسند کی لڑکی۔" وہ بے حد مسرور تھیں جیسے اجالا ان کی ہی دریافت ہو۔

"مجھے امید تھی کہ میرا عدنان کسی ایسی ویسی جگہ کا نام تو لے نہیں سکتا مگر لڑکی اتنی اچھی ہوگی میں نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔" وہ خوشی سے سرشار لہجے میں بولیں۔

"میری مانیں آپا! رشتہ دے دیں۔ ایسی پیاری لڑکی کون چھوڑتا ہے۔" چھوٹی خالہ ساتھ آئی تھیں، بے صبری سے بولیں۔

"مگر ابھی...... ابھی تو ہم چائے پر آئے ہیں۔" وہ تذبذب کا شکار ہوئیں۔

"تو کیا ہوا۔ لڑکی پسند نہ آتی تو خاموشی سے چلے جاتے مگر لڑکی تو ہیرا ہے۔ میری مان لیں اور کان میں بات ڈال دیں۔" چھوٹی خالہ کو تو بے حد جلدی تھی۔ امی سوچ میں پڑ گئیں۔ اجالا کی امی کو آتا دیکھ کر وہ سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"معاف کیجیے گا۔ میری بھابھی کا فون تھا، ان کی طبیعت خراب تھی۔ آپ لوگوں کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی، میں معذرت چاہتی ہوں۔" نہایت نرم اور صاف لہجہ، دھیمی آواز، شائستہ سا انداز تھا۔ "ہمیں برا نہیں لگا۔ ہم تو آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتے ہیں اگر آپ کو برا نہ لگے تو......"

"کہیے ایسی کیا بات ہے۔" وہ کچھ پریشان ہوئیں۔

"یوں تو پہلی بار کسی کے گھر آنے کے بعد فوراً ہی اپنی خواہش کا اظہار زیب نہیں دیتا مگر ہم نے سوچا آپ سے ابھی بات کرلی جائے۔"

"جی فرمائیے۔" وہ کچھ الجھ سی گئیں۔

"بات دراصل یہ ہے کہ عدنان کو تو آپ جانتی ہی ہیں۔ سعد کا دوست ہے۔ ہمیں آپ کی بیٹی اجالا بہت پسند آئی ہے اگر آپ..... ہم اجالا کے لیے عدنان کا رشتہ دینا چاہتے ہیں۔"

"اوہ!" انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ چہرے پر نرم سی مسکراہٹ پھیلی۔

"عدنان بہت سلجھا ہوا اور سمجھ دار بچہ ہے لیکن اجالے کے دو تین رشتے اور آئے ہوئے ہیں۔ میں اجالے کے ابو سے مشورہ کرکے آپ کو جواب دوں گی۔"

"ضرور، آپ کا حق ہے۔ آپ قریبی لوگوں سے بھی مشورہ کریں لیکن میرے عدنان کا خیال رکھیے گا۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ عدنان مجھے بھی ذاتی طور پر پسند ہے۔ وہ ایک اچھا لڑکا ہے اسی لیے میرے بیٹے کا دوست ہے۔ بس جو نصیب میں ہوگا۔ وہی فیصلہ ہوگا۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔ امی خوش ہو گئیں۔

✻ ✻ ✻

پھر تو جیسے چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا اور اجالا اپنے ساتھ تمام تر رنگینیاں سمیٹے اس کے گھر چلی آئی۔ عدنان اسے پا کر بے حد خوش تھا اور سمیر تو جیسے بھابھی کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ امی بھی من پسند بہو پا کر بہت خوش تھیں۔ خوشگوار انداز سے دن گزر رہے تھے۔

"ارے امی! یہ کیا کر رہی ہیں آپ، چھوڑیں میں لوں گی۔"

اجالا نے انہیں بنیان دھوتے دیکھا تو فوراً کچن سے باہر نکل آئی۔

"بیٹا! یہ تمہارے ابو کی ہے۔ انہیں میلی بنیان بالکل پسند نہیں بہت غصے ہوتے ہیں۔"

وہ ٹب میں واشنگ پاؤڈر ڈال کر رگڑ رہی تھیں۔

"امی! میں کھانا پکانے کے بعد کپڑے دھونے والی تھی۔ آپ آرام کریں۔" اس نے رسان سے کہا۔

"آرام کرنے کی عادت ہی نہیں ہے۔ ساری عمر اکیلے گھر سنبھالا ہے، اب تم آگئی ہو۔ میں یہ چھوٹے موٹے کام بھی نہ کروں تو جسم اکڑ جائے گا بیمار ہو جاؤں گی۔"

"سارا دن آپ کچھ نہ کچھ تو کرتی ہی رہتی ہیں۔ کون سا ایسا کام ہے جس میں آپ میرا ہاتھ نہیں بٹاتیں، بچی، ایسی ساس تو قسمت والوں کو ملتی ہے۔" اس نے پیار سے رئیسہ بیگم کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"اور تم جیسی بہو بھی قسمت والوں کو ملتی ہے۔" انہوں نے بھی پیار سے کہا۔

"اوہو! یہاں تو ساس میری "سہیلی" چل رہی ہے۔" سمیر ہاتھ میں شاپر پکڑے گھر میں داخل ہوا تو صحن کا منظر اس کی نگاہوں سے چھپا نہ رہ سکا۔

"تم کیوں جل رہے ہو؟" اجالا نے آرام سے کہا۔ اس کی سمیر سے بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

"میں نہیں میری بھابھی ماں! میرے ہاتھ جل رہے ہیں۔ آپ کے فرمائشی گرم گرم پکوڑوں اور سموسوں کی وجہ سے۔" اس نے شاپر تخت پر رکھا۔

"اوہ ریئلی! یہ کام کیا ناں تم نے اچھے بچوں والا۔" وہ خوش ہو گئی۔

"اور یہ کیچپ بھی، آپ اس کے بغیر نہیں کھاتیں ناں، آپ جلدی سے پلیٹیں لے آئیں۔"

"ارے بیٹا! گھر میں ہی بن جاتیں یہ چیزیں۔" امی نے کہا۔

"چھوڑیں ناں امی! ہر وقت کچن میں مصروف رہتی ہیں۔ کبھی پکا پکایا بھی کھائیں ناں!" وہ سموسے نکالتے ہوئے بولا۔

"دہی لائے؟" انہوں نے پوچھا۔

"اوہ سوری امی! میں بالکل بھول گیا، مجھے پتا بھی ہے آپ سموسے زیرہ رائتہ کے ساتھ کھاتی ہیں۔ دہی والے کی دکان کے سامنے سے گزرا بھی تھا مگر۔ رکیں ایک منٹ میں ابھی لاتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں رہنے دو۔" وہ کچھ چپ سی ہو گئیں۔

"بس میں یوں گیا اور یوں آیا۔" سمیر کو حقیقتاً شرمندگی ہو رہی تھی۔

"تم لوگ کھاؤ۔ اس آنے جانے میں تمہارے سموسے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ کوئی بات نہیں میں نے ابھی چائے پی ہے اس لیے میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ اٹھ گئیں۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ سمیر ان کی پسند کا خیال رکھنا بھول گیا تھا۔ ان کی پسند پر اجالا کی پسند نے فوقیت حاصل کرلی تھی۔ اک عجیب سے احساس نے دل کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ سمیر اجالا کے ساتھ بیٹھا مزے سے سموسے کھا رہا تھا۔ دل پر انجانا بوجھ پڑ گیا۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئیں۔

✻ ✻ ✻

"یہ کیا پکایا ہے؟" ڈھکن اٹھاتے ہی ابو نے غصیلی نظروں سے امی کو گھورا۔

"بیگم خالہ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ میں ان کے ساتھ اسپتال چلی گئی تھی۔ ابھی آئی ہوں۔ اجالا کو معلوم نہیں تھا کہ آپ شملہ مرچ نہیں کھاتے، اس لیے جل فریزی بنالی۔ آپ یہ کباب لے لیں۔" انہوں نے دوسری ڈش سامنے کی۔

"میرا موڈ نہیں ہے۔" "تمہیں بتا کر جانا چاہیے تھا کہ کیا پکانا ہے۔ تم اتنی لاپروا کیوں ہو۔ بس ایک ٹائم کا کھانا میں کھاتا ہوں گھر میں اور وہ بھی سکون سے نہیں ملتا۔" وہ گرج رہے تھے۔

"امی کا قصور نہیں ہے ابو! اچانک ہی ان کا پوتا آیا تھا اور امی افراتفری میں نکل گئیں۔ غلطی میری ہے، مجھے پکانے سے پہلے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ ابھی مجھے سب گھر والوں کی پسند کا مکمل طور پر علم نہیں ہوا ہے۔ اس لیے پلیز معاف کردیں۔"

اجالا نے نرم لہجے میں تفصیلی وضاحت دی۔ اس کا دل اندر ہی اندر کانپ رہا تھا۔ ابو کا غصہ پورے خاندان میں مشہور تھا۔ جس نے بھی کہا یہی ڈراوا دیا کہ تمہارے سسر کا غصہ بہت خراب ہے۔ آج اس کا عملی نمونہ پیش ہونے ہی والا تھا۔

"دنیا میں حادثات ہوتے رہتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ گھر کا گھر بدحواس ہو جائے، عقل ہی

کام کرنا چھوڑ دے۔ کوئی زلزلہ تو نہیں آیا تھا کہ سب کے دماغ اپنی جگہ سے ہل گئے۔ تم عورتیں ہوتی ہی فاترالعقل ہو۔" ان کا پارہ اونچا ہو رہا تھا۔

"سوری ابو! آپ کہیں تو انڈے فرائی کر دوں کباب کے ساتھ؟"

"اب انڈے صبح شام تو کھانے سے رہا۔" انہوں نے سخت لہجے میں کہتے بہو کی طرف تیز نگاہ ڈالی مگر اس کا شرمندہ چہرہ دیکھ کر ٹھنڈے پڑ گئے۔

"چلو لے آؤ مگر جلدی لے آنا۔"

اجالا شکر کا کلمہ پڑھتی تیزی سے کچن کی طرف لپکی۔

"آئندہ جاؤ تو بچی کو اچھی طرح سمجھا کر جانا کہ کیا کرنا ہے۔ میں رات کے کھانے میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو اور میں بات دہرانے کا قائل نہیں ہوں' وہ بچی بے قصور ہوتے ہوئے بھی تمہاری غلطی اپنے سر لے رہی ہے۔ مخلص لوگوں کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو اپنی ذات سے کوئی دکھ نہیں دینا چاہتے۔"

اجالا کباب کو انڈے کے ساتھ مکس کر کے گرما گرم فرائی کر کے لے آئی۔ انہیں آرام سے کھانا کھاتے دیکھ کر سمیر اور امی دونوں نے سکون کا سانس لیا۔ ابو کے جانے کے بعد سمیر شروع ہو گیا۔

"واہ بھابھی! آپ نے کمال کر دیا۔ اس گھر میں غصے کا سونامی آنے ہی والا تھا کہ آپ نے رخ پھیر دیا۔ یہ کام تو آج تک امی بھی نہیں کر پائیں۔ اگر آپ ابو سے بات نہ کرتیں تو وہ ابھی تک گرج برس رہے ہوتے۔"

"شکر ادا کرو کہ ابو کا غصہ جلد ٹھنڈا ہو گیا ورنہ بیگم صاحبہ آپ کی عزت افزائی ہو جاتی۔" عدنان نے کہا۔

"کوئی بات نہیں' میرے ابو ہیں ڈانٹ سکتے ہیں۔" اس نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"واہ بھئی واہ! یعنی کہ کھانے کی میز پر آپ ابو کی ڈانٹ کھانے کے لیے بھی تیار ہیں۔" سمیر نے آنکھیں پھاڑیں۔

"آف کورس! منہ کا ذائقہ بھی تو بدلنا چاہیے ناں۔"

وہ ہنسی۔

"بھئی میری بیگم کا جواب نہیں ہے' کیوں امی!" عدنان کی نگاہوں میں پیار تھا۔

"ہاں بیٹا!" وہ دھیمے سے مسکرائیں مگر چہرے کے تاثرات کچھ الگ سے تھے۔ اجالا کو عجیب سا لگا۔ وہ سمجھ نہیں پائی۔

"میری اور اپنے ابو کی چائے کمرے میں لے آنا۔ اپنے ابو کی چائے احتیاط سے دم کرنا' کچی رہ گئی تو ناراض ہوں گے۔" وہ خاص تاکید کرتے ہوئے بولیں۔

"جی اچھا!" اجالا نے آہستہ سے کہا۔ اسے تاکید کچھ عجیب سی لگی کیونکہ ابو نے چائے میں کبھی کوئی نقص نہیں نکالا تھا۔ وہ کچھ الجھتی ہوئی کچن میں چلی آئی۔

* * *

رئیسہ بیگم کے مزاج میں ان دیکھا کھنچاؤ آ گیا تھا۔ وہ بات بات پر اجالا کو ٹوکنے لگیں۔ اس کی بنائی ہوئی ڈشز کی تعریف کرنا چھوڑ دی۔ اگر کوئی محلے دار اجالا کی تعریف کرتا تو وہ خاموشی اختیار کر لیتیں یا موضوع ہی بدل لیتیں۔ اجالا ان کے رویے سے پریشان ہونے لگی تھی۔ رات اس نے عدنان سے بات کرنے کی ٹھانی۔

"عدنان! ایک بات کہوں۔" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں کہو' کچھ پریشان ہو؟" اس نے بغور دیکھا۔

"میں آپ سے شکایت نہیں کر رہی' بس ایک بات مجھے الجھن میں مبتلا کر رہی ہے۔" اس نے تمہید باندھی۔

"ایسی کیا بات ہے بھئی' جو ہماری نازک سی بیوی کے مزاج پر بار گراں گزر رہی ہے۔" وہ شوخ ہوا۔

"آپ ناراض مت ہوئیے گا۔" وہ ساس کے بارے میں بات کرتے ڈر رہی تھی۔

"بھئی تم بے خوف و خطر کہو۔ عالی جاہ اچھے موڈ میں

ہیں' آپ کی جان کو اماں بخشتے ہیں۔" عدنان کا انداز حوصلہ افزا تھا۔

"عدنان! کئی دنوں سے میں محسوس کر رہی ہوں امی کا رویہ آہستہ آہستہ بدلتا جا رہا ہے۔ وہ مجھ سے پہلے کی طرح بات نہیں کرتیں۔ وہ میرے کام میں نقص نہیں [نکالتیں] لیکن جب میں کھانا پکانے لگتی ہوں تو ترکیب دہرانے لگتی ہیں جیسے مجھے کھانا پکانا ہی نہ آتا ہو۔ صفائی بھی ان [کو] پسند نہیں آتی' کہتی کچھ نہیں ہیں' بس دوبارہ اسی جگہ کو صاف کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ مجھے خود سے کسی کام کا نہیں کہتیں۔ میں خود کرنے لگوں تو منع کر دیتی ہیں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔" اس نے دل پر چھایا بوجھ اتار دیا۔

"ہوں' تمہارا مطلب ہے کہ امی روایتی ساس بنتی جا رہی ہیں۔" عدنان نے ساری بات سن کر کہا۔

"روایتی ساس بنیں تو کچھ کہیں ناں' وہ تو خاموشی کی چادر اوڑھے اپنے خول میں سمٹ گئی ہیں۔ ناراض ہیں تو ناراضی کا اظہار کریں ناں یوں نظر انداز کر کے مجھے پرایا تو نہ کریں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"ارے یار!" عدنان نے اسے قریب کیا۔ "ذرا سی بات پر اتنا فکر مند ہونا غیر ضروری ہے۔ اس دن کھانے کی وجہ سے ابو کا مزاج برہم ہو گیا تھا' سو وہ محتاط ہو گئی ہیں۔ ابو کی عادت سے ہم لوگ سب بہت ڈرتے ہیں۔ وہ کبھی بھی کسی کے بھی سامنے شور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی لیے ہم سب بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں کہ ان کا موڈ بگڑنے نہ پائے۔ امی اس معاملے میں سب سے زیادہ حساس ہیں۔ وہ ابو کے عتاب کا خاص نشانہ بنتی ہیں۔ کسی کی غلطی ہو ذمہ دار امی کو ہی ٹھہرایا جاتا ہے۔ تم اس گھر میں نئی آئی ہو' ابھی سارے معاملات کا ٹھیک طریقے سے پتا نہیں ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ تم فکر نہ کرو' اپنی روٹین پر عمل کرتی رہو۔ ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" عدنان کے سمجھانے پر وہ مطمئن ہو گئی۔

* * *

کچن میں پانی پڑا تھا شاید اچانک ہی اس کا پیر پھسلا اور وہ زمین بوس ہو گئی۔ دماغ چکرانے لگا تھا۔

"الٰہی خیر!" رئیسہ بیگم گھبرا کر کچن میں آئیں۔

"کیا ہوا اجالا! خیریت تو ہے۔ اف! تمہاری پیشانی پر تو خاصی چوٹ لگ گئی ہے۔" وہ پریشانی سے بولیں۔

"بس ٹھیک ہوں امی!" اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ٹانگوں نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

رئیسہ بیگم بمشکل اٹھا کر باہر لائیں۔ وہ سر پر لگنے والی چوٹ کی وجہ سے ادھ موئی ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا تھا۔

"تم آرام کرو۔ میں تمہارے لیے جوس لاتی ہوں۔ احتیاط سے کام کیا کرو بیٹا!" وہ حقیقتاً فکر مند تھیں۔

اجالا کو بہت اچھا لگا۔ وہ جوس لائیں۔ پی کر اسے سکون ملا۔ شام کو عدنان کے آتے ہی وہ اسے اسپتال لے کر گئیں۔

"امی! کیا ہوا' کچھ پریشانی کی بات تو نہیں؟" عدنان کے چہرے سے تشویش عیاں تھی۔

"ارے کچھ نہیں ہوا۔ سب ٹھیک ہے۔ تم گھر چلو پھر بتاتی ہوں۔" خوشی ان کے انگ انگ سے عیاں تھی۔ "مٹھائی کا بندوبست کر لینا۔"

"امی! بھابھی ٹھیک تو ہیں۔" گھر میں سمیر بھی پریشان صورت بنائے انتظار کر رہا تھا۔

"بھابھی بالکل ٹھیک ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ تم چاچو بننے والے ہو۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

سمیر نے حیرت سے اجالا کی شرمیلی صورت دیکھی پھر عدنان سے لپٹ گیا۔

"ہراہ! میں خوامخواہ ڈر رہا تھا کہ میری پیاری بھابھی کو کچھ ہو نہ گیا ہو مگر آپ نے تو میرا ڈھیر سارا خون بڑھا دیا۔" عدنان کے چہرے پر مسرت ابھر آئی۔

"اب بھابھی کا خیال رکھنا' یہ جو تمہارا چٹورپن اس کو کچن میں کھڑا رکھتا ہے' اس کو کنٹرول کرنا اچھا اور اجالا! تم کمرے میں جا کر آرام کرو' میں صدقے کے لیے رقم نکالتی ہوں۔ اللہ سب خیر کرے۔"

عدنان کمرے میں لے گیا۔ "اجالا! دل چاہ رہا ہے

کہ تمہیں زور زور سے گھما ڈالوں۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ میں کتنا خوش ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ جیسے ساری دنیا کی دولت مجھے مل گئی ہو۔" وہ بہت خوش تھا۔

اجالا کے چہرے پر شرمگیں مسکراہٹ پھیل گئی۔

✲ ✲ ✲

"بہت بہت مبارک ہو! بھئی مجھے تو مانو بہت خوشی ہوئی۔ بڑی بھاگوان ہے تمہاری بہو اللہ نے جلدی پاؤں بھاری کردیا۔" بیگم خالہ بے حد خوش تھیں۔

"اس رب کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ہر خواہش کو بنا ترسائے پورا کیا ہے۔" رئیسہ بیگم شکر گزار تھیں۔

"پہلے پہل کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے پھر تو عورت خود ہی ہوشیار ہو جاتی ہے۔ پہلی بار میں ڈر ہوتا ہے۔ انجان صورت حال ہوتی ہے اجالا بیٹا! جتنا احتیاط کرو گی اتنا ہی اچھا ہو گا۔ ہماری اماں کہا کرتی ہیں کہ ان دنوں عورت خربوزے کی طرح مہکتی ہے۔ مغرب کے وقت باہر مت جانا اور خوشبو پھول سے پرہیز کرنا تاکہ بلائیں دور رہیں اور ہاں ہینگ باندھ لینا۔ یہ ٹوٹکا ہے اوپری چیزیں اثر نہیں کرتیں۔"

وہ اپنی سمجھ اور تجربے کی بنیاد پر پر خلوص مشوروں سے نوازتی رہیں۔

اجالا سر جھکا کر سنتی رہی۔

✲ ✲ ✲

"تم خوامخواہ فکر کر رہی تھیں، امی کو دیکھو کتنا خیال رکھ رہی ہیں۔ مجھے بھی ہر روز تاکید کرتی ہیں کہ تمہارا خیال رکھوں۔ وہ سب وقتی تھا۔ ابو کے غصے کی وجہ سے امی بہت کانشس ہو جاتی ہیں۔" عدنان اسے جوس کا گلاس دیتے ہوئے بولا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں تو بہت ڈر گئی تھی۔ امی کا رویہ اگر خراب رہا تو گھر کا ماحول تباہ ہو جائے گا۔ آپ جانتے ہیں ہمارے گھر میں سب ایک دوسرے کی رائے کا احترام کرتے ہیں، اگر رائے مخالف بھی ہو تو اس پر بحث کرنے کے بجائے مفاہمت کی راہ اپنائی جاتی ہے۔ میرا تو چند دنوں میں ہی دم گھٹنے لگا تھا۔ اب سب ٹھیک ہو گیا۔" اس نے گلاس لبوں سے لگایا۔

"اب تم فکر نہ کرو، اللہ تعالیٰ سب ٹھیک کردے گا۔ تم آرام کرو، میں صبح کے لیے کپڑے پریس کرالوں۔"

"میں کردیتی ہوں۔" اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"نہیں تم آرام کرو۔ تم ہی کرتی ہو، آج میں کرلوں گا۔ مجھے کام کرنے کی عادت ہے لیکن تم نے آکر بالکل ہی نکما کردیا ہے۔" پھر وہ شوخ ہوا۔

"آپ اپنی انرجی ہمارے نئے مہمان کے لیے سنبھال کر رکھیں۔ انہوں نے آپ سے ڈھیروں کام کرانے ہیں۔" عدنان اس کے گال کو چھو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مسکرادی۔

✲ ✲ ✲

توس سینک کر چائے مگ میں ڈالی، پیاز اور ہری مرچوں کا آملیٹ بھی تیار تھا۔ وہ ٹرے لے کر نکل ہی رہا تھا کہ امی داخل ہوئیں۔

"ارے یہ کیا کر رہے ہو؟" رئیسہ بیگم نے چونک کر دیکھا۔

"امی! اجالا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے دیر ہو رہی تھی تو ناشتا بنا لیا۔"

"تو بیٹا! مجھ سے کہہ دیتے ... میں بنادیتی۔"

"کوئی بات نہیں امی! اتنے سے کام کے لیے آپ کو کیا تکلیف دیتا۔"

"پھر بھی، میں اٹھی ہوئی تھی۔" انہیں نہ جانے کیوں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"امی! کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ چھوٹا سا تو کام اور کون سا پہلی بار بنایا ہے۔ آپ بھی آجائیں ناشتا کرلیں۔" وہ تخت پر آبیٹھا۔

"نہیں، تم کرو، میں نے نماز کے بعد چائے پی لی ابھی دل نہیں چاہ رہا۔ اجالا کی زیادہ طبیعت خراب ہے؟"

"نہیں، چکر آرہے ہیں۔ صبح سے الٹیاں ہو رہی ہیں۔ آپ ذرا دیکھ لیجیے گا۔ رات بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔"

"تم بے فکر رہو۔ میں دیکھ لوں گی، ویسے بھی شروع کے دو تین ماہ ایسا ہوتا ہے، یہ نارمل بات ہے۔ جب تم پیدا ہونے والے تھے تو میرا بھی ایسا ہی حال تھا اور تمہارے ابو کو اس وقت بھی ہر کام پرفیکٹ چاہیے ہوتا تھا۔" ان کا لہجہ اداس ہو گیا۔

"وہ دور گزر گیا امی! میں ابو کی طرح سخت نہیں ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ یہ دور بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر میں اجالا کی تھوڑی مدد کردوں تو یہ میرے لیے ہی اچھا ہو گا۔ اس کی صحت اچھی رہے گی تو میں بھی ذہنی طور پر فریش رہوں گا۔"

"کاش ایسی سوچ تمہارے ابو کی بھی ہوتی تو ہمیں بھی سکون ملتا۔ ہم تو تمام وقت تکلیفوں سے ہی دوچار رہے۔"

ان کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔ عدنان کو کچھ محسوس تو ہوا مگر وہ سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔

✲ ✲ ✲

"کچھ چلا پھرا کرو، کام کاج نارمل انداز میں کیا کرو، بھول جاؤ کہ تم کسی خاص عمل سے گزر رہی ہو۔ آج کل لڑکیاں بہت نازک ہوتی ہیں۔ ذرا سا کچھ ہوا نہیں اور خود کو کانچ کی گڑیا سمجھ لیا، میاں بھی کاٹھ کے الو ہونے لگے ہیں۔ بیویوں کو پلنگ سے پاؤں اتارنے ہی نہیں دیتے اسی لیے ہر دوسری لڑکی آپریشن کرا کے پیدا کر رہی ہے۔ ہمارے زمانے میں سل پر روزانہ مسالا پیس کر سالن پکا کرتا تھا، اب تو ہر طرف آسانیاں ہیں۔"

ان کا لہجہ تلخ سا تھا۔ اجالا نے حیرانی سے دیکھا۔ وہ ان کے ساتھ ڈاکٹر سے مل کر آئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے احتیاط اور آرام کا کہا تھا۔ وہ کمرے میں آکر لیٹی تھی کہ امی آگئیں اور بولنا شروع کردیا۔

"امی! ڈاکٹر نے تو....." اس نے کہنا چاہا۔

"ارے چھوڑو ڈاکٹر کو۔ ان کا بس چلے تو ہر شخص کو مریض بنا دیں تاکہ ان کی روزی روٹی کا بندوبست ہوتا رہے۔" انہوں نے ہاتھ ہلا کر جیسے اس کی بات کو ٹالا۔

"تم تھوڑی دیر آرام کرلو پھر گوبھی گوشت کا سالن بنا لینا۔ میری کمر میں ذرا درد ہے۔ میں آرام کرنے جا رہی ہوں۔" وہ آرام سے کہہ کر نکل گئیں۔

"گوبھی گوشت!" اجالا کو متلی ہونے لگی تھی۔ گوبھی اور گوشت کی خوشبو سے اس کا جی الٹنے لگتا تھا۔

"کیا کروں!" وہ سوچ میں پڑ گئی۔ چکر کی وجہ سے حشر برا ہو رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر لیٹ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں آنکھ لگ گئی۔ اندھیرا سا پھیلنے لگا تو وہ گھبرا کر اٹھی۔ ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔

"اف! سات بجے تو عدنان آجائیں گے۔ کھانا بھی بنانا ہے۔"

وہ فوراً کچن میں آئی۔ فریج سے گوشت کا پیکٹ نکال کر پانی میں رکھا اور گوبھی نکال کر کاٹنے لگی۔ پیاز وغیرہ کاٹ کر مسالا بھون کر گوشت ڈالا۔ مسالا بھوننے کی خوشبو سے اس کا جی متلانے لگا تھا مگر دل پر جبر کر کے خود کو سنبھال کر اس نے جیسے تیسے سادہ سالن بنایا اور کچن سے باہر نکل آئی۔ کمرے میں جاتے ہی اس نے باتھ روم کی طرف دوڑ لگائی۔ الٹیاں کر کر کے اس کا حشر خراب ہونے لگا تھا۔ عدنان کمرے میں آیا تو وہ بالکل نڈھال ہو رہی تھی۔ وہ گھبرا سا گیا۔ "اجالا کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے اشارے سے کہا۔

"تم اپنا خیال کیوں نہیں رکھتی ہو؟ دیکھو تو کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔"

"وہ کچن میں کھانا بنایا تھا تو خوشبو سے متلی ہو گئی۔" جب حالت سنبھلی تو اس نے کہا۔

"کھانا بنانا ضروری تھا کیا؟ امی سے کہہ دیا ہوتا۔" وہ غصہ ہونے لگا۔

"امی نے ہی کہا تھا کہ سالن بنالو۔ ان کی بھی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

"تو مجھے فون کردیتیں، میں کچھ لے آتا۔"

"ابو ناراض ہوتے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔
"ابو بھی ناں!" وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔
"آپ فکر نہ کریں' اس طرح ہو جاتا ہے ان دنوں۔ یہ نارمل سی بات ہے۔" اجالا نے تسلی دی۔
"میرے لیے تمہاری صحت بڑی اہم بات ہے۔ تمہیں کچھ ہوتا ہے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔" اجالا ہنس دی۔

✲ ✲ ✲

ننھے حذیفہ کی آمد کے بعد اس کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ امی بھی بے حد خوش تھیں۔ عدنان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ فیکٹری سے آنے کے بعد سارا وقت حذیفہ کو اٹھائے رکھتا۔ اس سے کھیلتا رہتا۔ ابو بھی اس کو گود میں اٹھانے لگے تھے۔ جب بھی وہ حذیفہ سے پیار کرتے' امی بغور دیکھا کرتیں۔ وہ ان کے چہرے کے تاثرات جانچتی رہتیں۔
اجالا کو خاصا عجیب سا لگتا۔ وہ نہ جانے کیوں ایسا کرتی تھیں۔ وہ سمجھ نہ پاتی۔ اس کے ساتھ تلخ رویہ تو عام سی بات ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ ایسی چبھتی ہوئی بات کہہ جاتی تھیں کہ اجالا دنوں اس کی تکلیف محسوس کرتی۔ عدنان سے کچھ کہتی تو وہ الٹا اسے ہی سمجھانے بیٹھ جاتا۔ اس نے کہنا ہی چھوڑ دیا۔
حذیفہ گھٹنوں چلنا شروع کر دیا تھا۔ ہر جگہ رینگتا ہوا پہنچ جاتا۔ کچن میں اجالا کے پاس پہنچ جاتا۔ کبھی صحن میں ٹہلتا اس وقت بھی وہ صحن میں بچھے تخت پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک دم گر پڑا۔ امی صحن میں ہی تھیں اس کے رونے کی آواز سن کر اجالا بھاگ کر صحن میں آئی تو امی اسے اٹھا چکی تھیں۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ ابو کو دیکھتے ہی غصہ آ گیا۔
"کیا کر رہی تھیں تم بچہ بھی نہیں سنبھالا جاتا۔" وہ امی پر برس پڑے۔
"میں نے دیکھا ہی نہیں وہ کب تخت کی طرف گیا۔"
"لاپروا تو تم سدا کی ہو' بچہ ہے' کہیں بھی جا سکتا ہے۔ اس کی ماں کام میں مصروف ہے تو تم تو دھیان رکھ سکتی ہو ناں!"
ابو کا جلال کسی صورت کم ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ امی کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ انہوں نے آہستہ سے حذیفہ کے گرد گرفت ڈھیلی کی' اجالا نے فوراً گود میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکلے تھے۔ پہلی بار حذیفہ کو چوٹ لگی تھی۔ اجالا کا دل جیسے پھٹ سا گیا تھا۔
"چلو بہو! چادر پہنو ہم ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔" وہ اجالا سے بولے۔ وہ حذیفہ کو گود میں اٹھائے اندر جانے لگی۔
"بہو کو چادر تو لا دو۔ کیا سکتہ ہو گیا ہے۔" وہ امی پر برسے۔
امی نے خاموشی سے چادر لا دی۔ وہ دونوں باہر نکل گئے۔
حذیفہ کو دوا دلا کر واپس لائے تو وہ سو رہا تھا۔ چہرے پر سوجن تھی۔ ڈاکٹر نے دوا دی تھی جس کے زیر اثر سو رہا تھا۔ امی کے چہرے پر تاسف تھا۔
"کیسا ہے میرا بچہ!" رئیسہ بیگم روہانسی ہو کر بولیں۔
"امی! اب ٹھیک ہے۔ دوا دے دی ہے۔"
"میرے بچے کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ ہے بھی تو اتنا پیارا اور شاید سارا قصور میرا ہے۔ مجھے دھیان رکھنا چاہیے تھا۔"
"نہیں امی! بچہ شرارتی ہے۔ اس میں آپ کا کیا قصور۔ آپ بھی حذیفہ سے بہت پیار کرتی ہیں۔"
"ہاں مگر تمہارے ابو سمجھتے ہیں کہ ہر ایک بات میں قصور میرا ہوتا ہے۔ اب بھلا میں لاپروائی برت کر حذیفہ کو گرا سکتی تھی۔ نہیں ناں! لیکن وہ ہمیشہ مجھے کٹہرے میں کھڑا کر دیتے ہیں۔"
"ان کی عادت ہو گئی ہے اور آپ فکر نہ کریں سب بہتر ہو گا۔"

"اجالا۔۔۔ اجالا! حذیفہ کو کیا ہوا۔" عدنان گھبرایا ہوا داخل ہوا۔
"ابو کا فون آیا تھا۔ حذیفہ کو چوٹ لگ گئی۔ کیسے لگی؟"
"پلیز ریلیکس! حذیفہ اب ٹھیک ہے۔ صحن میں گر گیا تھا۔ چوٹ لگ گئی۔" اجالا نے نرمی سے کہا تاکہ اس کی پریشانی دور ہو۔
"صحن میں۔۔۔ تو تم کہاں تھیں' امی کیا کر رہی تھیں؟"
"میں کچن میں کھانا بنا رہی تھی اور حذیفہ صحن میں کھیل رہا تھا۔" اس نے آہستگی سے کہا۔
"اور امی؟" اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔
"میں صحن میں ہی تھی بیٹا! مگر مجھے پتا ہی نہیں چلا کب ہوا؟"
"کمال کرتی ہیں امی آپ بھی۔ آپ صحن میں تھیں۔ حذیفہ وہاں کھیل رہا تھا۔ آپ کو دھیان رکھنا چاہیے تھا۔ اتنی لاپروا کیسے ہو سکتی ہیں آپ؟"
"کیا؟" ان کو جھٹکا سا لگا۔
وہی لفظ وہی انداز ویسے ہی تیور۔۔۔ انہیں لگا کہ جیسے عدنان نے احمد صاحب کا روپ دھار لیا ہو اور ان پر برس رہا ہو۔ ان کا نرم خو' فرماں بردار بیٹا ان کی ہر تکلیف پر تڑپ اٹھنے والا' ان کا ہاتھ بٹانے والا' ان کے دل کی بات بنا کہے سمجھنے والا بیٹا آج ماتھے پر شکنیں رکھے کھڑا تھا۔ صرف اس لیے کہ اس کی اپنی اولاد کو چوٹ لگی تھی جس کے لیے بیوی بے قصور اور وہ قصوروار تھیں۔ طیش کی ایک شدید لہر ان کے اندر اٹھی اور دماغ کو کھولا گئی۔
"کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں دشمن ہوں تمہارے بیٹے کی؟ جان بوجھ کر گرایا ہے؟ اگر مجھے علم ہوتا تو کیا میں گرنے دیتی؟ اپنے باپ کی طرح تم بھی مجھے قصوروار سمجھتے رہو۔ میں نے تمہیں پال پوس کر بڑا کر دیا۔ اب تمہاری اولاد کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔ جب تم چھوٹے تھے تو سارے گھر کے کام کے ساتھ ساتھ تم دونوں پر بھی نظر رکھی اور دھیان رکھا۔ یہ نہیں کہ ایک کام میں لگے تو دوسری ذمے داری کو بالائے طاق رکھ دیا۔" وہ تلخ لہجے میں بولیں۔
"امی!" عدنان ان کے ایک دم گرم ہونے پر حیران ہوا۔ "میرا مطلب۔۔۔"
"بس رہنے دو!" انہوں نے بات کاٹ دی۔ "میں تمہارا مطلب اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ باپ کی طرح تمہاری نظریں بھی میری غلطیوں پر زیادہ ہوتی ہیں' اچھائیوں پر کم۔ اب بس تم جانو تمہاری اولاد جانے۔" وہ غصے سے کہتی نکل گئیں۔
"یہ امی کو کیا ہوا؟" اس نے اجالا کی طرف دیکھا۔
"آپ بھی تو ان پر شروع ہو گئے۔ ابو نے بھی انہی کو کھری کھری سنا ڈالی تھیں۔ ظاہر ہے وہ بھی پریشان ہیں۔ حذیفہ سے پیار کرتی ہیں۔ اب انہیں ہی قصوروار ٹھہرایا جائے گا تو وہ غصہ تو کریں گی ناں!"

اجالا نے ان کی سائیڈ لی تو عدنان کے چہرے پر بھی شرمندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔
لیکن وہ دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ عدنان کے چند جملوں نے اس کی ماں کے دل کی دنیا زیر و زبر کر دی تھی۔ ان کے خیالات میں شدید طوفان آچکا تھا۔

☼ ☼ ☼

بیگم خالہ گھر میں داخل ہوئیں تو انہیں جھٹکا سا لگا۔ رئیسہ بیگم کی سخت و کرخت آواز پورے صحن میں گونج رہی تھی۔
"سارے زمانے کے نخرے ہمارے ہی گھر میں دکھائے اور اٹھائے جاتے ہیں۔ ہم نے بھی یہ وقت گزارا ہے' ہمارا تو کوئی حال پوچھنے والا نہ ہوتا تھا۔ اور یہاں میاں کو بیوی صاحبہ کے نخرے اٹھانے سے ہی فرصت نہیں ہے ذرا سی طبیعت خراب کیا ہوئی۔ شوہر صاحب کمر کس کر میدان میں آ گئے۔ ایسے زن مرید ہمارے نصیب میں تو نہ لکھے گئے۔ ہمارے لیے تو ساری عمر کڑوی کسیلی باتیں اور نوکیلے طنز ہوا کرتے تھے۔ بہو بیگم! عورت ہو اپنے فرائض سنبھالو ساری عورتیں گھر کے کام کرتی ہیں۔ تم نرالی نہیں اور تم عدنان! مرد بنو دم ہلاتے ہر وقت بیوی کے پیچھے نہ پھرا کرو۔"
ان کا انداز بے حد زہریلا تھا۔ بیگم خالہ نے دیکھا۔ اجالا کپڑے دھو رہی تھی۔ عدنان کے سامنے بالٹی تھی وہ کپڑے الگنی پر ڈال رہا تھا اور رئیسہ بیگم صحن میں کھڑی شعلہ بار تھیں۔
"کیا ہوا بیٹا! کیوں غصہ کر رہی ہو؟"
آیئے خالہ! آیئے دیکھیے! صحیح کہتی تھیں آپ بہو آئے گی تو پتا چلے گا۔ مجھے اب پتا چلا ہے۔ ہمارے بیٹے کو دیکھیں۔ ان کا بس چلے تو بیوی کی جگہ بچہ بھی یہی پیدا کر لیتے۔ ہم نے سارے کام ساری عمر اکیلے کیے اور یہاں صاحب زادے ہر گھڑی تیار کامران رہتے ہیں۔"

وہ زہر میں بجھی تھیں۔ بیگم خالہ کی سمجھ میں یک لخت سب کچھ آ گیا۔ انسانی نفسیات ہزاروں گتھیوں میں الجھی ہے۔ جن کا کوئی سرا نہیں ملتا۔ ساری عمر شوہر کی پھٹکار خاموشی سے سہنے والی رئیسہ بیگم کے اندر ابلتے جوار بھاٹے کو بہاؤ کا راستہ مل گیا تھا۔
رئیسہ بیگم کی شوہر کی طرف سے ملی احساس محرومی عود کر آئی تھی۔ وہ عدنان کو اجالا کا خیال رکھتے دیکھتیں تو ذہن کے کسی گوشے میں چھپا احساس کمتری ان کے دل میں چبھنے لگتا۔ حذیفہ کی چوٹ پر عدنان کے رویے نے ان کے ضبط کے سارے بندھن توڑ دیے تھے۔
وہ شوہر کے رویے کو تو برداشت کر لیتی تھیں مگر بیٹے کی جانبداری برداشت نہ کر سکیں۔ اب ان کی نظر میں عدنان ایک زن مرید شوہر تھا جو بیوی کی چاپلوسی کرتا تھا۔
"ارے چھوڑو بیٹا! بچے ہیں۔ آرام سے سمجھاؤ۔"
"یہ بچے ہم سے کیا سیکھیں گے یہ تو ہمیں عقل سکھاتے ہیں۔ ہم بدھو اور بے وقوف ہیں۔ یہ عقل مند ہیں' سمجھ دار و ذمہ دار ہیں۔" ان کا غصہ کچھ کم نہ ہوا تھا۔
اجالا اور عدنان خاموشی سے ان کی پھٹکار سن رہے تھے۔ ان کے گھر میں بھی ناچاقی کے قدم اتر گئے تھے۔ پر سکون ماحول میں کینہ پروری نے اپنے پر پھیلا دیے تھے۔ بیگم خالہ کا دل گھبرانے لگا۔
"اچھا میں چلتی ہوں بعد میں آؤں گی۔"
"ارے بیٹھیے ناں! یہ تو روز کی کہانی ہے۔ میرا دل ہر پل جلتا ہے' کہاں تک برداشت کروں۔" وہ اونچا بول رہی تھیں۔
بیگم خالہ نے ایک نظر ماحول پر ڈالی اور تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل آئیں۔

☼

سائرہ رضا

سرخ تاب پھول

"ہیں آمنہ! کیا واقعی اینڈ میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے؟" آمنہ کے ہاتھ میں دھلے کپڑوں کی بالٹی تھی۔ اس نے تھکان سے بوجھل سانس بھرتے ہوئے

بالٹی زمین پر رکھی اور اس کا چہرہ دیکھا جہاں الجھن بھری لکیریں اور خوش امیدی جھلک دکھلا رہی تھی۔ ... میں شعاع تھا اور سینے سے لگے خواتین میں ...

مکمل ناول
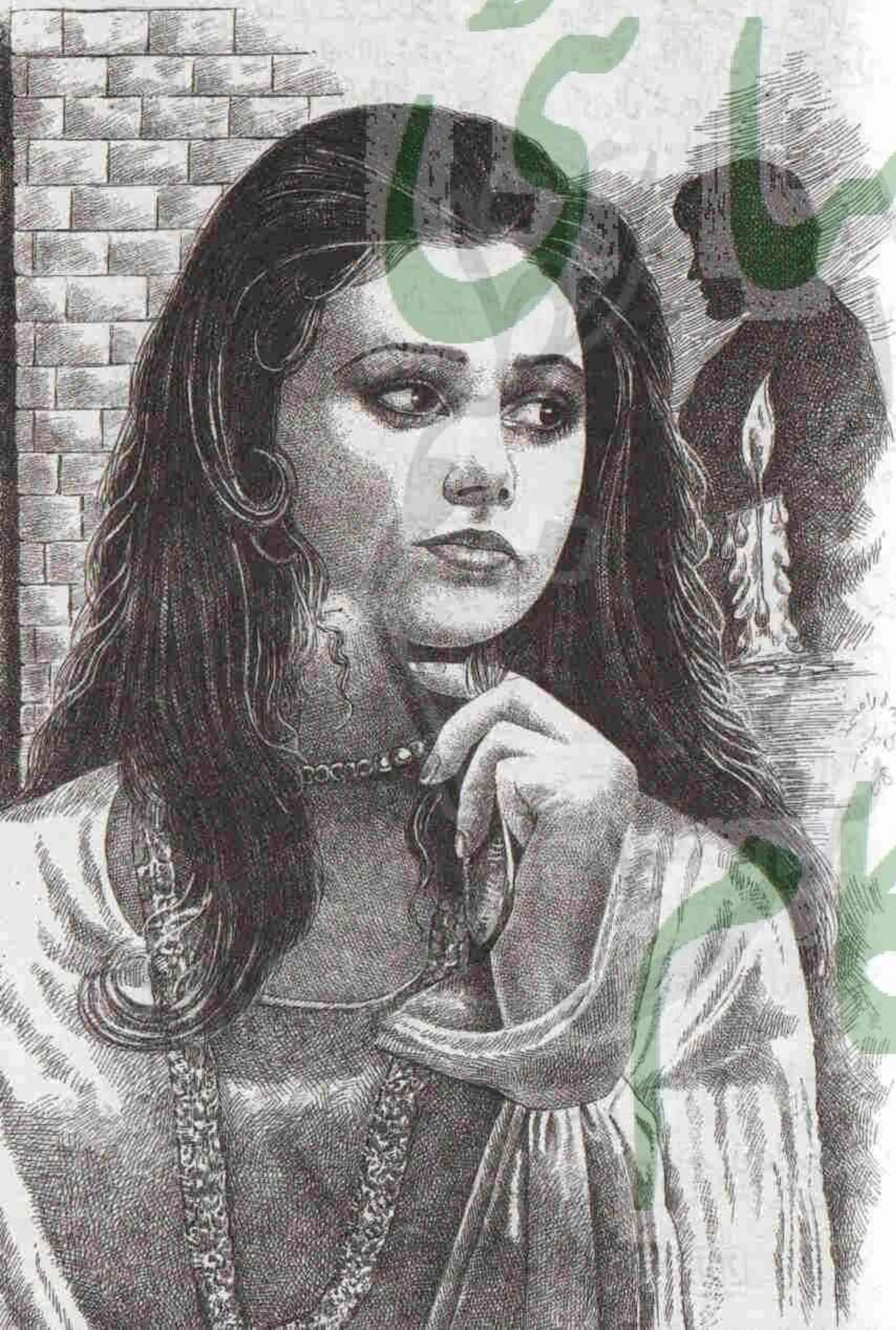
پھنسائے وہ جواب کی منتظر تھی۔ آمنہ خاموشی سے کپڑے جھٹکنے لگی۔ وہ بہت زیادہ تھکی ہوئی تھی۔ پہلے سارا دن شہر جانے کی خواری، پھر بازار، پھر کالج میں فارم جمع کروانے کی پریشانی۔ گرمی نے جیسے سارے جسم سے نمک نکال دیا تھا۔ وہ آتے کے ساتھ ہی غسل خانے میں گھس گئی۔ پہنا ہوا جوڑا اور تر بتر برقعہ ساتھ ہی دھو ڈالا اور اب صرف سونے کی خواہش تھی۔

"بولو ناں آمنہ! کیا واقعی اینڈ میں سب صحیح ہو جاتا ہے؟" اس کے لہجے میں بے صبری تھی۔

"شڑنگ ....." آمنہ نے پوری طاقت سے کپڑا نچوڑ کر جھٹکا۔

"اینڈ میں "جو صحیح ہوتا ہے" وہ ہو جاتا ہے۔" اس نے اگلا کپڑا زور سے جھٹک کر رسی پر پھیلایا۔

"یہ کیسا جواب ہے۔ ہمیں کیسے خبر کہ جو ہوا، وہ صحیح ہے۔" اس نے برا منہ بنایا۔

"اس کے لیے تھوڑے توکل، تھوڑی قناعت اور یقین کا سیرپ پینا پڑتا ہے۔ اچھی بری ہر بات ماں لینا پڑتی ہے۔"

اس نے پیروں پر لگنے والی مٹی پر پانی بہایا اور اندر بڑھ گئی، وہ پیچھے پیچھے۔ شہروں کی نسبت ان چھوٹے گاؤں میں لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ یوں بھی بہت زیادہ تھا اور اب بھی جب لائٹ تھی تو وولٹیج بے حد کم۔ آمنہ نے چارپائی گھسیٹ کر بالکل پنکھے کے نیچے کی اور دھم سے لیٹ گئی۔ اس نے بھی تقلید کی۔

"بہت تھک گئی ہو؟"

"ہاں بہت۔" وہ اپنے گیلے بالوں میں انگلیاں چلا رہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر بغل میں دبا "شعاع" مانگا۔

"اس کی حالت کتنی خراب ہو رہی ہے۔ اخبار چڑھا لیتیں۔"

"مجھے قسط پڑھنے کی جلدی تھی۔ شام کو چڑھاؤں گی۔ اور تم بھی تو ذرا اچھی حالت کا لاتیں۔"

"اچھی حالت کا کہاں سے لاتی۔ اتنی مشکل سے ملا۔ چار دکانیں چھانٹیں، پھر یہ گلا سڑا ملا۔" آمنہ نے خفگی سے اپنی جدوجہد بتائی۔

"ساری دنیا پڑھ لیتی ہے، پھر ہمیں ملتا ہے پڑھنے کو۔ اسی لیے ہم دنیا سے ہمیشہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔" اس کے لہجے میں ملال گھل گیا۔

"تو کیا ہوا؟ کہانیاں ہی تو پڑھنی ہوتی ہیں اور کہانی کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ سمجھیں؟"

"قسط وار کی بے چینی تو ہوتی ہے ناں۔ [illegible] سمجھیں؟" اس نے منہ [illegible] بناتے ہوئے [illegible] اتاری۔ آمنہ نے ان سنی کردی۔ اسے [illegible] مطالبہ [illegible] گئی تھی۔

"دراصل آمنہ! ہم سب انجام جاننا چاہتے ہیں۔ دنیا کو کوئی خوف اس سے بڑا نہیں کہ آگے کیا ہوگا۔ ہم آنے والے وقت سے اتنے ڈرتے کیوں ہیں۔ زندگی آگے کیسے رنگ دکھائے گی۔ کیا وہ پا سکیں گے، جو ہمیں چاہیے اور کیا وہ کھو جائے گا، جس کے بغیر ہم رہ نہیں سکتے۔"

"ایسی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں، جو اللہ پر یقین نہیں رکھتے ______ جبکہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔" ______ نرمی سے سمجھاتے ہوئے آخر میں آمنہ کے لہجے میں سختی آگئی۔

"پتا نہیں کیسی بے چینی ہے میرے اندر۔ پتا ہے میں ہمیشہ ایک ہنستی مسکراتی تحریر پڑھنا پسند کرتی ہوں۔ سب اچھا اچھا اور جیسے ہی کردار مشکل میں پڑتے ہیں۔ میرے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگتی ہیں، حلق خشک ہو جاتا ہے اور پھر میں جلدی جلدی پلٹ کر اینڈ پڑھ ڈالتی ہوں۔ اگر سب ٹھیک ہو جاتا ہے پھر الٹی کہانی پڑھتی ہوں، تسلی ہو جانے پر دوبارہ شروع سے....."

وہ عجیب بے بسی سے بولی۔ آمنہ چارپائی پر اٹھ بیٹھی۔

"تم اپنے اندر اتنی برداشت، صبر و تحمل پیدا کرو۔ کرداروں کے ساتھ سفر کرو، ان کے دکھ سکھ محسوس کرو [illegible] تم میں برداشت اور صبر پیدا ہوگا۔ میرا دعوا [illegible]"

[illegible] یقین سے بولی اور وہ بے یقینی سے اس کا چہرہ [illegible] لگی۔ اب پتا نہیں آمنہ کے بتائے ہوئے اتنے [illegible] علاج کو اس کا کرنے کا ارادہ تھا کہ نہیں۔ آمنہ [illegible] بدل کر لیٹ گئی۔ وہ بھی چت لیٹ کر پنکھے کو [illegible] رہی۔ نجانے کب آنکھ لگی۔

٭ ٭ ٭

"[illegible] منوں..... منوں کڑیے! کبھی میری ایک آواز بھی [illegible] کر۔" دادی جی غصے سے بھری لاٹھی ٹیکتی ان کے سر پر پہنچیں۔

آمنہ نے زبان دانتوں تلے دبائی۔ اسے وہم سا [illegible] تھا کہ دادی کی آواز ہے، مگر وہ زور و شور سے ہانڈی [illegible] میں لگی رہی۔

"[illegible] چیخ کے شور میں پتا نہیں لگا دادی جی! آپ [illegible] کیا بات ہے؟"

"ہاں..... بات تو میں بھول گئی۔"

"تو تو ہانڈی نہیں بھون رہی تھی ناں۔ یہاں ویلی [illegible] تو ڑ رہی تھی ناں۔ تجھے میری آواز نہ آئی؟"

"آئی تھی دادی جی! مگر میں نے سوچا، آپ آمنہ کو [illegible] رہی ہیں۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

"ہاں منوں! تجھے ہی بلاؤں گی۔ یہ تو ہانڈی بھون [illegible] رہی تھی۔ دو ہی تو کڑیاں ہیں گھر میں۔ منوں وڈی تے [illegible] منوں۔"

"میرا نام لیا کریں ناں "ثمینی" مگر بس آپ کے [illegible] انیس سال سے چڑھا ہی نہیں۔ دو لڑکیاں اور [illegible] ثمینہ یہ بھی منوں وڈی تے میں چھوٹی اگر آپ [illegible] نہیں کہہ سکتیں تو مانی کہہ دیں، مینا کہہ دیں، ہمی [illegible] مگر مجھے منوں نہ کہا کریں پلیز دادی جی!" اس [illegible] تیز کہتے ہوئے آخر میں ہاتھ جوڑے اور لہجہ [illegible] میٹھا کر لیا۔

[illegible] نے بھنے گوشت کی ہانڈی نیچے اتاری۔ بڑی والی جلتی لکڑی نکال کر پانی کا چھینٹا دیا، راکھ اور سفید کوئلوں پر دودھ کی پتیلی رکھ دی۔ دادی کی دوائی کا وقت ہونے کو تھا۔ دودھ تھوڑی دیر بعد نیم گرم ہو جاتا۔

"یہ بھی تو آئس کریم ہوتی ہے۔ میں نے کھائی ہے میٹھی اور ٹھنڈی۔ واہ! مگر آپا تم تو الٹ ہو۔ کڑوی اور گرم..... جلتا کوئلہ۔" اس کے چھوٹے بھائی شہباز نے جلتی پر تیل چھڑکا۔

"کڑوی اور گرم..... ٹھہر شہباز!" اس نے ارد گرد نگاہ کی۔ پاس سبزی کی ٹوکری رکھی تھی۔ ٹماٹر، پیاز، لہسن اور بڑی بڑی ہری مرچیں..... "ہوں۔" اس نے اگلے پل بارہ سال کے بھائی کو قابو میں کیا اور اس کی بچاؤ کی ساری کوششوں کو ناکام بناتے ہوئے اس کے ہونٹوں اور دانتوں پر مرچ رگڑ دی۔ آمنہ کے بیچ بچاؤ اور دادی کی لاٹھی کے حرکت میں آنے سے پہلے وہ شہباز کا کام تمام کر چکی تھی۔

"ہائے! میں مر گیا۔ ہائے میں گیا۔ ہائے میری اماں! ہائے منوں باجی! میں گیا۔" وہ تڑپ رہا تھا۔ کچھ سچ کچھ جھوٹ۔

"وے تیرا ککھ نہ جاوے منوں! ویر دی دشمن۔ ہائے کیسے میرا پوترا تڑپ رہا ہے۔"

"مکر کر رہا ہے! دادی مکر....." اس پر خاک اثر نہ ہوا۔ آمنہ آگے بڑھی۔ پتیلی کا کچا دودھ شہباز کے ہونٹوں سے لگایا۔ اس نے بھی صحرائی پیاسے کی طرح گٹ گٹ چڑھا لیا۔ آستین سے منہ صاف کیا۔ اب وہ آمنہ کی دی ہوئی شکر منہ میں بھر رہا تھا۔

"ویر سر دا دوپٹہ، عزت، مان اور تو اس کی دشمن ہو گئی، کڑیے!"

دادی جی ازحد حیرت سے اس کی لاپروائی کو تک رہی تھیں۔ "نی تجھے ایک بار بھی بھائی کا خیال نہ آیا؟ کیسے مرچ مل دی؟" دادی کو غصے سے زیادہ حیرت تھی۔

"ہاں! مل دی اور آئندہ اس کے منہ میں بھر دوں گی، جو مجھے تنگ کیا تو..... میں نہیں ہوں کسی کی بہن

دین۔۔۔" وہ تنتناتے ہوئے اندر بڑھ گئی۔ شہباز نے مزید شکر مٹھی میں بھری اور باہر کو لپکا۔ دادی نے پلو سے بندھا پانچ کا سکہ بھی دیا تھا۔

آمنہ نے دادی کو پانی کا گلاس دیا۔

"آپ کہنے کیا آئی تھیں دادی جی؟" اس نے ان کی طبیعت کے پیش نظر دھیان ہٹانا چاہا۔

"نی کڑیے! کہنا کیا' سب بھول بھال گئی اس کڑی کے سیاپے میں۔ لیکن تو تو بتا' یہ اتنی غصے میں کیوں ہے؟" دادی نے آمنہ کو رازدارانہ انداز میں گھورا۔

"وہ دادی جی!" آمنہ ہکلا گئی۔

"وہ۔۔۔ وہ ابا جی کے ساتھ وہاں جانا چاہتی ہے۔"

"وہاں کہاں؟" دادی نے ناسمجھی سے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہاڑی۔" اس نے رخ پھیرتے ہوئے اٹک کر بتایا۔

"ہاں! تو میں بھی تو یہی کہنے آئی تھی۔ سب بھلا دیا۔ بلا ذرا اسے۔۔۔ اے منوں! اے گل سن کڑیے۔" پھر اس کی تنبیہہ یاد آئی۔ "یمی بیٹی! دھی رانی! چلی جانا اپنے تائے کے ساتھ۔ ادھر آ میرے پاس۔" آمنہ بھی موڑھا گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ یمنی کا منہ سوجا ہوا تھا۔

"تو چلی جا اپنے تائے کے ساتھ۔ پہلے زمانوں میں تو ایسی گل بات پسند نہیں کرتے تھے مگر اب یہ نیا زمانہ۔۔۔ جا تو بھی دیکھ آ۔ اب تجھے کچھ غصہ کر کے سمجھاؤں تو تیری ماں اللہ بخشے یاد آتی ہے کہ سوچے میرے پیچھے میری بچی کا خیال نہیں کیا۔"

"دیکھ پتر! میں ایک واری دیکھ آئی۔ اپنی تسلی کرلی۔۔۔ مجھے تو سب اچھے لگے ہمارے جیسے ہی لوگ ہیں سفید پوش عزت دار۔ منڈا بھی چنگا ہے۔ اونچا لمبا' چوڑی کاٹھی۔۔۔ گھربار سب چنگا' جا تو بھی دیکھ لے۔ اگلے شہر میں رہتے ہیں۔ ہاں! مگر یہ نہ پتا لگے تو خاص انہیں دیکھنے آئی ہے۔ کہہ دینا' پھپھی سے ملنے آئی تھی اور ادب لحاظ سے رہنا۔ چنی سر پہ بکل مار کے رکھنا' منڈا بھی دیکھ لینا' مگر بس سلام دعا۔ بھلے سے تیرا پنویا (بہنوئی) بننے جارہا ہے پر بیٹے! جس کا خصم اس کے رشتے دار۔ سلام دعا کرنا نظر سے نظر ملا کر بات نہ کرنا نہ ہی ہنسی مذاقاں۔۔۔"

"اتنی ہدایتیں' میں جاتی ہی نہیں۔"

"نہیں تے فیر نہ سہی۔" دادی نے زیادہ زور سے لاٹھی ماری۔ آمنہ بے بسی سے دونوں کو دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"آمنہ! بہت خوش قسمت ہو۔" اس نے وہاڑی سے آنے کے بعد کوئی دسویں بار آمنہ کو بتایا۔ آمنہ اپنی فطری متانت سے مسکراتی رہی۔ "اب تمہاری جان چھوٹ جائے گی اس کچے چولہے سے۔ پاتھیوں اور بالن سے' وہاں یہ بڑے بڑے اسٹیل کے چولہے لگے ہیں۔ سنگ مرمر کا سلیب صاف ستھرا۔۔۔ پھر ام ہوں گے اور یہ کالک۔۔۔"

"تمہیں بھی یہ سب مل جائے گا۔" آمنہ ہمیشہ سے خوش امید تھی۔

"کیا خبر؟" اس نے راکھ میں چھپا دہکتا کوئلہ تنکے کی مدد سے ڈھونڈ نکالا تھا۔ اب پھونکیں مار مار کر اس کے گہرے ہلکے ہوتے رنگ کو دیکھ رہی تھی۔ رنگ بدلتی روشنی اس کے چہرے پر دہک رہی تھی۔

"اوں ہوں! پھر وہی بے یقینی کی باتیں۔ اللہ ناراض ہوتا ہے۔" آمنہ نے تنبیہہ کی۔

"اب وعظ مت شروع کرنا۔ تم بھی گھنی ہو' آ[illegible] کب سے پوچھو گی کہ وہ کیسے تھے؟"

"مجھے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم نے بتا جو[illegible] ہے خود سے۔"

"لو! میں اب بالکل نہیں بتاتی۔" یمنی نے بھی عہد کیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد سب بھول بھال کر شروع ہو گئی۔

"مجھ سے اچھی طرح ملے' پھر کہنے لگے ہم نے [illegible] سنا تھا' لڑکی اکلوتی ہے۔ سالی کے بغیر ہی زندگی گزر[illegible] گی' مگر۔۔۔ مجیداں تائی پاس بیٹھی تھیں' اب انہیں ار[illegible]

کہاں بولنی آتی ہے۔ بڑی مشکل سے منہ بگاڑ کر دانت جما جما کر بولیں۔ ”وے پتر! یہ سالی والی کا نام نہ لینا۔ یہ تو خیر سے چاچے کی دھی ہے۔ تیری اپنی چار بہنیں ہیں اور انہوں نے بھی سالیاں بننا ہے۔ غلط رواج ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ میں نہ سنوں ’وہ کیا کہتے ہیں سالی‘ تے آدھے گھر والی۔ ناں سالی پنویا دے ادھے کار کو سنبھالے گی تو اس کا گھر سنبھالنے اس کی ماں جائے گی؟ خبردار!“

اتنے بڑے اونچے لمبے عظیم بھائی ایسے چپ ہوئے کہ پھر خدا حافظ بھی اماں کی بغل میں منہ دے کر کہا۔ اس پر وہ بولیں۔ ”اب کدھر منہ چھپا کر کھڑا ہے۔ بہن پہلی واری کار آئی ہے۔ سر پر ہاتھ رکھ۔ رخصت دے۔ اور انہوں نے ایسے ہاتھ رکھا جیسے میرے سر میں کرنٹ چلتا ہو، پھر مجیداں تائی نے مجھے سو روپیہ دیا اور پتا ہے میں نے کیا کیا؟“

”مجھے کیا پتا تم نے کیا کیا۔“

”تم کو پتا ہو بھی نہیں سکتا کنجوس بی بی آمنہ عرف وڈی منوں۔ اس نے بیگ کھولا جس میں نئے نکور تازہ اسی مہینے کے شمارے تھے۔

”ارے واہ۔“ آمنہ کی بھی چیخ نکل گئی۔ ”لاؤ ایک میرا۔“

”اوں ہوں۔ پہلے تم چائے بناؤ گی۔ پھر ہم مزے سے چھت پر جا کر پڑھیں گے۔“

”یمنی! میں نے ابھی چولہا ٹھنڈا کیا ہے۔“ اس نے مجبوری بتائی۔

”دوبارہ گرم کرو۔ سلنڈر پہ بنالو۔“ اس نے آسان حل پیش کیا۔

”گیس ختم ہو گئی ہے۔“

”ہائیں!“ یمنی کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔ ”تو تم نے منگوائی کیوں نہیں؟“

”ابھی مہینہ ختم ہونے میں چار دن ہیں میں نے سوچا گزارا کرلوں۔ ابو پر بوجھ پڑے گا۔“

”اب یہ چار دن کیسے گزریں گے۔“ اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ وہ اسی دیہاتی کلچر کی پیدائش تھی مگر اس سب سے بری طرح متنفر۔ اس نے ڈائجسٹ ڈھیلے ہاتھ سے چھوڑ دیے۔ چائے پینے کی بہت زیادہ عادت تھی اور سلنڈر کا استعمال وہ اسی مقصد کے لیے کرتی تھی۔ جب دل چاہا اٹھ کر بنالی۔

”اچھا! موڈ خراب نہ کرو بنا رہی ہوں چائے میں۔“ آمنہ نے لپک کر جگ سے پتیلی میں پانی ڈالا۔ ماچس سے کاغذ کے ڈھیر (جو اس مقصد کے لیے قریب رکھا رہتا تھا) میں سے کاغذ کو آگ لگائی پھر پاتھی اندر رکھ دی۔ چوتھی پانچویں پھونک میں چولہے میں آگ لگ چکی تھی۔ اس نے بہت لگن سے چائے تیار کی۔

”مجھے اس چائے کا ذائقہ اچھا نہیں لگتا۔“ یمنی نے بے چارگی سے کہا۔

”پورے وہاڑی میں تو گیس نہیں آئی مگر تمہارے سسرال والے محلے میں ہے۔“ یمنی نے اپنے تئیں خوش خبری دی۔ آمنہ پھیکی مسکراہٹ سے ہلکے دھوئیں کو ہواؤں میں تحلیل ہوتا دیکھتی رہی۔

”تمہارے جانے کے بعد میں خود بھی بھوکی مروں گی اور سب کو بھی ماروں گی۔“ اس نے چائے کا کپ ختم کرنے کے بعد اعلان کیا۔

”سر پر پڑے تو سب آجاتا ہے۔“ آمنہ نے یونہی کہا۔ یمنی ورق پلٹ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے گہری نگاہ سے آمنہ کا چہرہ دیکھا، پھر گمبھیر لہجے میں بولی۔

”اور میں یہی نہیں چاہتی کہ میرے سر پر ان چاہی چیزوں کا بوجھ پڑے۔“

☼ ☼ ☼

”آمنہ... آمنہ...!“ وہ اسے پکارتی چھت پر آگئی جہاں آمنہ کپاس کی چھٹیوں (سوکھی شاخیں) کو توڑ توڑ کر چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل کر رہی تھی۔ ابا جی سال چھ ماہ کا حساب رکھ کے اکٹھی خرید لیتے پھر چھت پر جمع کر دیتے۔ رہائشی علاقے میں گھستے ہی گھر کی چھت پر ڈھیروں ڈھیر نظر آتیں۔ مضبوط شاخیں ابا جی کلہاڑے سے توڑ دیتے۔ بوقت ضرورت آمنہ بلکہ

یمنی بھی ہزار باتیں سناتے ہوئے کلہاڑا چلا لیتی تھی۔ گیس نہ ہونے کے باعث بازار سے سوکھا بالن خریدا جاتا۔ مٹی کا تیل بہت مہنگا پڑتا تھا، گوبر کی پاتھیاں بھی خریدی جاتیں اور سلنڈر بھی رکھے ہوئے تھے۔ اب جس کو جس طرح سہولت محسوس ہو۔

☼ ☼ ☼

دادی جی نے دو پیٹیاں بھر کے رکھی تھیں آمنہ کے جہیز کے لیے۔ نجانے کتنے زمانوں پرانی چیزیں تھیں ان میں... کوئی سات نسلوں پرانا سامان بھرا ہے ان میں۔ دادی کی دادی کے ہاتھوں کے کڑھے گول تکیے، سفید تکیے پر مور اور مور کے نیچے پنجابی کا شعر... آمنہ کے جہیز کی اہم چیز، پھر دادی جی کی اپنی شادی کا بغیر استعمال شدہ سامان پھر آمنہ کی امی کی بے شمار چیزیں۔ یمنی انہیں آثار قدیمہ کہتی۔

”میں تو کہتی ہوں ہم اپنا ذاتی میوزیم کھول لیتے ہیں۔ نسل در نسل سے محفوظ و برقرار جہیز کا سامان ’دیکھنے کی چیز اور ایسا منحوس سامان جو بس سفر ہی کرتا رہا‘ استعمال ہونا جس کے نصیب ہی میں نہیں۔ بدبو آتی ہے ٹرنک سے۔ اور تم پاگل! اس بڈھا کی باقیات کو لے کر سسرال جاؤ گی؟ تمہیں خود بھی تمیز نہیں۔ وہ اتنے موٹے کپڑے کی بیڈ شیٹ جس پر سوؤ تو کروٹ بدلنے ہی سے جسم کا رواں اتر جائے۔“

آمنہ ہنستی رہی۔ وہ دادی جی کی ہاں میں ہاں ملانا فرض سمجھتی تھی۔

اس کے نزدیک یہ سب چیزیں بے کار اور ناقابل استعمال تھیں۔ اس لیے وہ اپنے ہاتھوں کے ہنر کو بروئے کار لاتے ہوئے اجرت پر کام کرتی، پھر جو پیسے ملتے اس سے آمنہ کے جہیز کے لیے چیزیں خرید کر رکھتی جاتی۔ اس نے خود سے اونی پھندنوں والا مسٹرڈ اور سرخ بے حد خوب صورت بیڈ روم سیٹ بنا رکھا تھا، اور دادی جی تو کیا، آمنہ تک کو خبر نہ ہو پاتی کہ وہ اپنی ذاتی پیٹی میں کیا کیا بھرتی رہتی ہے۔

آمنہ، دادی جی کے ساتھ مل کر گھر چلاتی تھی وہ فطرتاً“ کنجوس واقع ہوئی تھی۔ بہت ناپ تول کر پیسہ خرچ کرتی اور کچھ پیسہ بھی کم تھا، ضرورتوں کے لیے ناکافی، پھر آسائش اور تعیش تو بہت دور کی سوچ تھی۔ گھر اور باہر کے سو بکھیڑے تھے۔ پیسہ آنے کے راستے کم اور جانے کے بہت زیادہ تھے۔ دادی جی عمر کے اس دور میں تھیں جہاں خوراک سے زیادہ دوائیاں کھائی جاتی ہیں۔ کھانے سے پہلے دوائی، کھانے کے بعد دوائی... اور گزشتہ دو سال میں یمنی کی امی کا گردوں کی بیماری میں مبتلا رہنا، ان کا جگر بھی جواب دے گیا۔ ان کے علاج پر پہلے جمع جتھا لگا، پھر ادھار اور آخر میں خود بھی نہ رہیں۔

وہاڑی، میلسی، بورے والا، لودھراں، جنوبی پنجاب کے اس حصے میں گردے اور جگر کے امراض بہت زیادہ تھے۔ پانی ابال کر پینا فلٹر کرنے کا سب سے آسان اور سستا ذریعہ کہا جاتا ہے، مگر گیس نہ ہونے کے باعث عورتیں اپنا ”بالن“ کبھی بھی اس عیاشی کے لیے بال (جلا) نہیں سکتی تھیں۔ بس آخری پل گردے واش کرواتے ہوئے جان دے دیتیں۔ اس خطے میں ذرائع روزگار بھی بے حد محدود اور کم تھے۔ نئی فیکٹریاں اگر کہیں تھیں بھی تو وہاں چند افراد ہی کھپ سکتے ہیں پھر یہاں کے لڑکے کافی عرصہ آوارہ پھرنے کے بعد بڑے شہروں کا رخ کر لیتے، جہاں مواقع میسر آجاتے تھے اور پڑھ لینے والے پھر بہت زیادہ پڑھ لیتے کہ بڑے شہروں سے واپسی کا راستہ ہی بھول جاتے۔ ہر گھر میں بوڑھوں بچوں اور عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے جو ہر ماہ آنے والے منی آرڈر کے انتظار میں سو ضرورتوں سے دامن بچاتے ہیں۔ پردیس کا دکھ بھی اور بدلے میں مایوسی اور ناامیدی۔ ان کے گھر کی داستان بھی سب کے جیسے تھی۔ یہ میلسی کا کھیتوں کے کنارے بنا محلہ تھا۔ جو شہری دیہاتی کلچر کا امتزاج تھا۔ کم آمدنی والوں کے گھر پسماندہ تھے۔ اور ذرا جو چار پیسے آگئے تو کھیتوں کے درمیان کوٹھی کھڑی کرلی۔ شہر ترقی کر رہے تھے مگر غربت گاؤں کو مزید پسماندگی کی طرف لے گئی۔

نئی آبادیاں بن گئی تھیں۔ خوب صورت بڑے بڑے گھر، چوڑی کھلی سڑکیں، بازار... اور شہر کو مزید پھیلنا ہی تھا۔ کھیت ختم کرکے نئی ہاؤسنگ اسکیمیں بن رہی تھیں اور دھڑا دھڑ بک رہی تھیں۔ نئی کالونیاں مسجد، اسپتال، اسکول، پارک اور دیگر ایسی للچادینے والی پیشکشوں کے ساتھ۔

آمنہ، یمنی کا گھر پرانے علاقے میں تھا۔ مین روڈ کے اطراف میں کھیت تھے جن کے درمیان میں چلتی سڑک درختوں سے ڈھکی تھی اور جس پر موٹر سائیکل اور رکشے چلتے تھے۔ کبھی کبھار لوڈنگ گاڑیاں کہ کولڈ اسٹور اور منرل واٹر کی فیکٹریاں بھی تھیں، قرین قیاس یہی تھا کہ شہر آگے کی جانب پھیلتے پھیلتے جب پیچھے دیکھے گا تو ان کا چک بھی شہر میں شامل ہوجائے گا، مگر ابھی تو یہ چک ہی تھا اور یمنی کو یہ سب بہت برا معلوم ہوتا تھا۔

وہ چاہتی تھی، اس اتنے بڑے اصطبل کو بیچ کر شہر کے بیچ، بازار سے نزدیک کوئی چھوٹا مگر اچھا گھر خرید لیا جائے۔ لیکن اس میں سب سے پہلے جذباتی طور پر دادی رکاوٹ تھیں کہ پرکھوں کا گھر دادا جی کے ہاتھ کے بنائے ہوئے کمرے، رشتے داروں سے بڑھ کر پڑوسی۔

"ارے کڑیے صبر کر۔ تیرے بھائی جواں ہوں گے بنائیں گے اسے حویلی جیسا تو صبر کرلے۔" دادی جی اس کے کوسنوں اور مطالبات کے جواب میں خواب دکھاتیں۔

"ہونہہ! حویلی چھوڑ، محل بنالیں۔ میرے کس کام کا۔ اس میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہیں گے۔" اور اپنے منہ سے اپنے مستقبل کا ایسا کھلا تذکرہ دادی جی کے تلووں تک کو آگ لگا جاتا۔

"بے شرم بے ہدایتی۔"

"اس میں بے شرمی کس بات کی۔ میری شادی نہیں کریں گی کیا؟ وہ مجھ سے اتنے چھوٹے ہیں۔ مجھے تو آپ نے سال دو سال میں باہر کردینا ہے۔"

"ہائے! میں مرگئی شرم دا گھاٹا (شرم کی کمی) اگر جو کسی کے کانوں میں پڑے، توبہ توبہ..." دادی جی گال پیٹتیں۔ یمنی بڑی بے فکری سے خلاؤں میں تکتی۔

"دادی جی! اسے کہیں ہم اچھا گھر بھی بنالیں گے بالکل اس کی پسند کا۔ اور اسے کہیں جانے بھی نہیں دیں گے۔ تسلی رکھے۔" آمنہ نے موقع شناسی کا مظاہرہ کیا۔ دادی جی کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

"تے ہور کی، بالکل ٹھیک۔"

"کیا مطلب میری شادی نہیں کرنی؟" وہ خوف سے اچھل پڑی۔

"کرنی ہے کیوں نہیں کرنی۔ میں کوئی زمین دار ہوں جو تجھے گھر بٹھا کر تیری "پتی" قبضے میں کرنی ہو۔ اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے، سب کی کروں گی۔ پر تجھے اسی حویلی میں رکھوں گی، میرے سب سے پیارے پوترے کی ووہٹی بنا کر۔ تو ہی مالکن ہوگی۔ گھر کی دھی بھی تو نالے نوں بھی۔" دادی جی کے لہجے میں شکر گھل گئی۔ وہ تصور کی آنکھ سے جو دیکھ رہی تھیں۔

یمنی جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی "خبردار... خبردار جو ایسا سوچا بھی تو... میں نے پہلے ہی کہہ دیا اور یہ... تم نے..." وہ آمنہ کی طرف مڑ کر غرائی۔

"تم نے دادی جی کے کان بھرے ہیں ناں آمنہ! تم میرے ہاتھوں..." اس نے دھلے کپڑوں کا ڈھیر آمنہ پر الٹ دیا۔ وہ چارپائی پہ منہ کے بل گری۔ آمنہ کی ہنسی دادی کی پوپلی ہنسی سے مل جاتی۔ یمنی پیر پٹختے رستے میں پڑی چیزوں کو ٹھوکر مارتے ہوئے آگے بڑھ جاتی۔

دادا جی کے بنوائے ہوئے تین کمرے، ایک دادی جی کا، دوسرا اسٹور، تیسرا لڑکیوں کا۔ بعد میں تایا جی نے بھی دو کمرے بنوائے تھے۔ جب تک تائی جی اور یمنی کی امی زندہ تھیں، وہ ان کے لیے تھے اور اب خالی ویران... کبھی یمنی کا لاہور پڑھنے والا بھائی اعجاز آتا تو، رہتا اور جب چھ چھ ماہ بعد اعزاز چھٹی پر آتا تو ایک کمرا اسے مل جاتا، مگر وہ زیادہ تر دادی جی کے ساتھ ان کی چارپائی پر وقت گزارتا یا پھر آمنہ کے ساتھ اس اونچے چبوترے پر بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا رہتا جو کچن کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہ آمنہ اور اعزاز کی پسندیدہ جگہ تھی اور یمنی کو شدید ترین چڑ بلکہ اپنے اس اوپن کچن سے نفرت تھی۔

"یہ ہمارا کلچر ہے یمنی!" آمنہ نرمی سے سمجھاتی۔

"ہونہہ! اچھی چیز ہے نہیں تو اس بری کو کلچر کہہ کر گلے میں باندھ لو۔" وہ ہٹ دھرمی سے کہتی۔

"ارد گرد سب کے گھر ایسے ہی ہیں۔" آمنہ بولتی۔

"سب خوش ہیں، کوئی ایسے ناک بھوں نہیں چڑھاتا۔ کچن بنا بھی لیں تو سلنڈر والا چولہا ہی رکھا جاسکتا ہے، وہاں لکڑی یا پاتھی تو جل نہیں سکتی۔ دھوئیں سے مرجائے پکانے والی اس لیے یہاں کھلے میں بناتے ہیں۔ دھواں اڑ جاتا ہے۔ تم کوئی بچی ہو یا پہلی بار یہ سب دیکھ رہی ہو جو میں تمہیں کھول کھول کر سمجھاؤں؟" آمنہ آخر میں خفا ہوجاتی، مگر آگے بھی یمنی تھی۔

"ہاں! تمہیں یہی سب نظر آئیں گے۔ ماسی زرینہ کا گھر نظر نہیں آتا اور اس آڑھتی شوکت کا..." اس کے منہ سے آگ بھرے جملے نکلے۔

"خدا کے لیے منوں!" آمنہ بھی غصے میں بھر گئی۔ "ماسی زرینہ کے گھر تین بیٹوں کی دبئی کی آمدنی ہے۔ وہ شہر لاہور میں جاکر گھر بنا سکتی ہے... اس سے بھی بڑا، وہ تو ساس سسر کے منہ یہاں بیٹھے ہیں... اب ان کی آنکھ بند کہ تب... اور آڑھتی شوکت، اس کی زمین داری اور پھر کاروبار... ہم ان سے کیا مقابلہ کریں۔ ابا جی کی آمدنی کل دس ہزار۔ تمہارے ابا، کبھی کام کیا، کبھی نہیں، بیمار بندے پھر سر پر چڑھا قرضہ، اعزاز کی ساری تنخواہ اس ہاتھ آتی ہے، ادھر نکل جاتی ہے۔ اوپر سے اعجاز کی پڑھائی پر اتنا پیسہ خرچ ہو رہا ہے۔ شہباز ابھی چھوٹا ہے۔ دادی جی ہر بار ڈاکٹر کے ہاں میں سب کسر نکال دیتی ہیں۔ اوپر سے میری شادی کا بار۔ میرے بس میں ہو تو اسی جلیے میں جو جیسے کی بنیاد چلی جاؤں، مگر ہمارا کلچر۔ جہیز کی ایک ایک چیز وہاں سسرال میں جاکر ڈھیروں چارپائیاں بچھا کر اس پر سجانی ہوتی ہے۔ زیور، کپڑا، برتن، بستر، شلوار میں ڈالنے والے ناڑے تک کو سرخ ڈبے میں سجایا جاتا ہے۔ میں تو سوچ سوچ کر خود کو مجرم سمجھتی ہوں کہ ابا جی اور دادی جی یہ سب کہاں سے کریں گے۔ فرنیچر اور کھانا اس کے علاوہ اور اس پہ قیامت کی مہنگائی اور تم اتنی سمجھ دار، عقل مند اور یہ سامنے کی کھلی باتیں جان بوجھ کر اگنور کرتی ہو۔ خود بھی تپتی جلتی ہو اور ہمیں بھی جلاتی ہو۔ خوامخواہ۔"

آمنہ عموماً اتنی لمبی بات نہیں کرتی تھی، مگر آج اس کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا تھا۔

آمنہ اس کے تایا کی اکلوتی بیٹی اور اس سے پانچ سال بڑی تھی، مگر دونوں کی بہت دوستی تھی، محبت تھی۔ آمنہ ماں کی طرح اس کا خیال رکھتی۔ وہ بھی اسے اتنا ہی احترام دیتی۔

آمنہ کی امی اس کے بچپن ہی میں دوران زچگی فوت ہوگئیں۔ پیدا ہونے والی بچی بھی ڈیڑھ ماہ بعد ختم ہوگئی۔ یمنی کی امی نے جٹھانی کے دونوں بچوں آمنہ اور بڑے اعزاز کو اپنے بچوں کی طرح پالا، کوئی باہر کا بندہ جان ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ دو بھائیوں کی اولادیں ہیں۔

آمنہ نے میٹرک کیا تھا۔ یمنی کی امی کی بیماری کے بعد وہی گھر کو سنبھالتی رہی۔ یمنی کی امی نے چھ سال بستر پر گزارے۔ آمنہ نے دن رات ان کی خدمت کی۔ دو سال پہلے وہ دنیا سے رخصت ہوگئیں تو آمنہ نے پرائیویٹ انٹر کا فیصلہ کیا اور اب اس کے فائنل پیپرز بھی ہوگئے تھے۔

یمنی کی الگ کہانی تھی۔ وہ پڑھائی میں بہت تیز تھی اور شوقین بھی مگر میٹرک کے بعد دو سال پہلے ماں کی شدید بیماری اور پھر انتقال نے اسے توڑ پھوڑ دیا۔ ہر شے سے جی اچاٹ ہوگیا۔ اب یہ تیسرا سال تھا۔ آمنہ کے بھی انٹر کرلینے کے بعد وہ کسی حد تک مائل ہوئی تھی تو اب ساتھ جانے کا مسئلہ تھا۔ ساتھ کی واحد لڑکی فریدہ آگے نکل چکی تھی۔ پرائیویٹ کرنا اسے پسند نہیں تھا۔ پتا نہیں کیا ٹھان کر بیٹھی تھی۔ دادی چاہتی تھیں، وہ پڑھائی شروع کردے۔ اس سے اس کے مزاج پر اچھا اثر پڑے گا، حالانکہ عنقریب آمنہ کی

شادی کے بعد انہیں گھر میں تنہا رہنا پڑتا۔ اسے ان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ ابا جی صبح کے منڈی جاتے تو شام کے بعد لوٹتے۔ ادھر یمنی کے ابو جی دھاگا بنانے کی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ وہ بھی صبح سویرے نکلتے تو پھر رات کے کھانے پر ہی پہنچتے۔ شہباز صبح سائیکل پر میلسی کے گورنمنٹ اسکول جاتا۔ تین بجے کے بعد واپسی۔ ایسے میں آمنہ کی شادی کے بعد یمنی کا کالج ناممکن سی چیز تھا، مگر دادی جی فیصلہ کیے بیٹھی تھیں کہ سعیدہ کے ساتھ یمنی کو بھی داخلہ لینا ہے۔ خالی ذہن شیطان کا گھر۔

یمنی اس ساری صورت حال سے واقف تھی۔ دل کے کسی خانے میں یہ خیال بھی تھا کہ وہ پڑھ لکھ کر اپنی زندگی سدھار سکتی ہے، مگر دادی جی کو اکیلا چھوڑنا۔ دادی جی نے کہا بھی کہ وہ اپنی ہم عمر سہیلیوں کی ڈیوٹی لگا دیں گی کہ گھنٹے گھنٹے بعد ہر سہیلی ان کے پاس بیٹھے گی اور میراثیوں کی نوں (بہو)... کو باقاعدہ پیسے دیے جائیں گے۔ وہ تین سے چار گھنٹے دادی جی کے ساتھ رہے گی اور کھانا وغیرہ پکائے گی، مگر سوچنے اور کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ پھر پکانے کے لیے کسی کی بھی خدمات لی جاتیں، اسے پیسے بھی دینے پڑتے۔ دادی جی صاف کہتیں۔

"کڑیے! تو کالج جائے یا نہ جائے" آمنہ کے بعد میں نے بھوکوں ہی مرنا ہے، یہ مجھ سے لکھوا لو۔ لوگ پوچھیں گے، بڈھی کیسے مری۔ کہہ دینا چار دن سے روٹی نہیں ملی۔ تو سن لے آمنہ!"

آمنہ کانوں کو ہاتھ لگاتی "توبہ توبہ۔"

یمنی واک آؤٹ کر جاتی۔ دادی اپنے بیان پر ڈٹی رہتیں۔

"تاں! اس میں توبہ کس بات کی۔ پہلے اس نے مجھے سو باتیں سنائی ہیں۔ گیس نہیں ہے، مجھے چولہا پسند نہیں، مجھ سے آگ نہیں جلتی۔ پھر شرما شرمی اٹھ بھی گئی تو جتنی دیر میں اس نے چلا بالنا (چولہا جلانا) ہے۔ میں نے بجھ جانا ہے۔"

آمنہ کی زور سے ہنسی نکل جاتی۔ وہ اٹھ کر انہیں بانہوں میں بھر لیتی۔

"نہ دادی جی! یمنی دل کی بری نہیں ہے۔ ابھی کم عمر اور نا سمجھ ہے اور آپ کی خاطر تو وہ آگ میں کود سکتی ہے اور آپ..."

"آگ میں کود سکتی ہے۔ ہونہہ پہلے آگ جلا تو لے... اس کے ساتھ کی کڑیوں کے دو دو بچے ہیں۔ اس کا حال دیکھو..." وہ آمنہ کو یاد دلاتیں۔

"تو آپ میری شادی بھی کر دیتیں، اس کے ساتھ ہی تو میں دو کی جگہ چار بچے پیدا کر لیتی۔ دو دو کی جوڑیاں۔ اب بغیر شادی کے اس کا مقابلہ تو کر نہیں سکتی۔" یمنی تن فن کرتی اندر آئی۔

"توبہ... توبہ! تیرا بیڑہ تر جائے (تیری کشتی پار لگے) یمنی... یمنی!" دادی جی کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ پہلے تیزی سے اٹھنے کی کوشش کی، مگر یہ مشکل تھا، سو پہلے اپنے تکیے کے پاس رکھا دوائیوں کا تھیلا اس کی سمت پھینکا، پھر تختی ______ اور آخر میں اپنی لاٹھی...

آمنہ کی ہنسی... اس کا سانس رک رہا تھا۔ یمنی کو بھی اپنے جملے کا احساس ہوا۔ آمنہ اسے باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے دادی سے لپٹی انہیں پُرسکون کر رہی تھی۔

دادی جی ارد گرد نگاہ کر کے اور چیزوں کی تلاش میں تھیں۔ نیچے پڑے جوتے اٹھا کر اسے مارنا چاہتی تھیں مگر آمنہ کی گرفت سخت تھی۔ وہ پھڑپھڑا کر رہ گئیں۔

✵ ✵ ✵

"تم نے کس کو خط لکھا ہے... یہ کراچی میں کون رہتا ہے... اور تم اسے کیسے جانتی ہو... کون ہے...؟" شہباز کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔ وہ چن کے چبوترے پر کھڑا خط لہرا لہرا کر دادی جی کو متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ دادی جی کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ آمنہ آٹا گوندھ رہی تھی۔

"میں نے خوامخواہ تمہیں پکڑایا، ابا جی کو ہی دے دیتی۔" یمنی نے چیل کی طرح اچھل کر اس کے ہاتھ

سے خط لے لیا۔

کراچی والا خط دادی جی کے لیے بھی شک میں مبتلا کرنے کا باعث تھا، مگر دادی جی نے لمحے میں دو باتیں سوچیں۔ پہلا آمنہ کا مسکراتا مگن چہرہ، انہیں آمنہ پر خود سے زیادہ اعتبار تھا اور دوسرے خط ایسا ویسا ہوتا تو یمنی بھائی یا باپ کے ہاتھ کیوں پوسٹ کرواتی، سو سب ٹھیک ہے۔

وہ دوبارہ اپنی دوائیوں والی تھیلی میں مگن ہو گئیں۔

"میں ابا جی کو بتاؤں گا۔" اس نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

"سو مرتبہ... بلکہ یہ خط اب ابا جی ہی پوسٹ کریں گے۔ سمجھے تم!" یمنی نے خط لہرایا۔

آمنہ آٹا گوندھ کر فارغ ہو گئی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ فریج تھا نہیں، اسے تین ٹائم آٹا گوندھنا ہوتا۔ شہباز رات کے ہلکے خمیرے آٹے کے پراٹھے کے ساتھ انڈا اور چائے کے دو کپ پی کر اسکول کے لیے روانہ ہوا تھا۔ ابھی ابا جی اور چاچا جی کو جانا تھا۔ اس نے مرغیوں کو باہر نکالا اور ساتھ تین انڈے بھی۔ انڈے پالینے کی خوشی سے چہرہ ہر روز دمکتا تھا۔

آمنہ نے ہری پیاز دو انڈوں میں ملا کر آمیزہ بنایا اور یمنی کو اشارہ کیا کہ وہ اندر کمرے میں رکھے سلنڈر پر آملیٹ بنا کر لے آئے۔ وہ بھی فرماں برداری سے اندر گھس گئی۔ پھولا پھولا ہرا سفید آملیٹ، دہی کا پیالا، رات کی بھنڈیاں، لسوڑھے کا اچار اور پراٹھا چائے۔ ابا جی، دادی جی، ابو جی، آمنہ اور یمنی نے ناشتا کیا۔

یمنی نے اپنا خط نکال کر ابا جی کو دیا اور انہیں خواجہ [illegible]سن کے خواجہ کی طرح یاد کروایا بلکہ رٹوایا کہ خط کس طرح لیٹر بکس میں ڈالنا ہے۔

"سمجھ گئے ناں ابا جی!"

"پتر! سمجھ گیا۔ ہر ماہ اعزاز کو... خط ڈالتا ہوں۔ مجھے خط ڈالنا آتا ہے" وہ بھولا منہ بنا کر بولے۔ آمنہ ہنس دی۔ یمنی جھینپ گئی۔ آمنہ کے منہ سے چائے بوچھار کی صورت گری اس نے جلدی سے پلو ہونٹوں پر رکھا تھا۔

✵ ✵ ✵

فریدہ اپنے اسکول کی استانی کے تین سوٹ کڑھائی کے لیے دے گئی تھی۔ یمنی نے ہفتے میں پورے کر دیے، گیارہ سو روپے ملے۔ اس نے ہزار کا نوٹ پیٹی میں غائب کیا۔ سو روپے ڈائجسٹ کے لیے فریدہ کو دیے۔ خدا خدا کر کے دس تاریخ کے بعد شمارے ملے۔

اس نے جوش بھرے انداز میں ورق پلٹے۔ ایک بار دیکھا، دوبارہ، سہ بارہ... کچھ بھی نہیں میلسی ہی کے علاقے سے کسی اور قاری کا خط شامل تھا، مگر دونوں جگہ اس کے خط نہیں تھے۔ وہ شدید ترین مایوسی اور بعد میں غصے کا شکار ہو گئی۔ ہر ہر شے پر غصہ نکالا۔ عملاً "قولاً"... زیادہ کم بختی آمنہ اور شہباز کی آئی۔ آمنہ کو اس کی ساری بھڑاس سننی پڑی اور شہباز۔ حساب کے سوال کی غلطی پر اسے خوب کوٹا گیا۔

"مجھے پتا ہوتا تم نے ایسے ڈرامے کرنے ہیں تو میں تمہیں خط لکھنے ہی نہ دیتی۔" آمنہ چڑ گئی۔

"اتنے پیارے خط میں نے لکھے۔ تعریفیں ہی تعریفیں... پھر بھی..." اس نے ناک چڑھائی۔

"تم پاگل ہو... کوئی کام کی بات پوچھتیں۔ الٹا پلٹا خط لکھا ہوگا۔" آمنہ نے شکوہ کیا۔

"تمہارا ذکر بھی کیا تھا کہ آمنہ ہمیشہ پرانے شمارے لا کر دیتی تھی۔ اب میں خود نئے خریدوں گی۔ دادی کے بارے میں بھی بتایا کہ وہ منع تو کرتی ہیں، مگر سختی سے نہیں، لیکن ہم ان کے سامنے پڑھتے نہیں... پہلے ہماری پھپھو سلطان بی بی پڑھتی تھیں۔ ان سے آمنہ کو لت لگی اور آمنہ سے مجھ کو۔"

آمنہ ہنس پڑی "سارا محلہ تو ہو گیا، تم نے مرغیوں اور وہ ہماری مر جانے والی بکری کا ذکر نہیں کیا؟"

"کہا تھا کہ دادی کی بکری نے فوت ہونے سے پہلے فرحت اشتیاق کے ناول کی پوری قسط چبالی تھی۔ پھر میں نے اسے ڈنڈے سے مارا تھا۔ پورا ناول پڑھ لیا ہے۔ وہ قسط آج تک نہیں پڑھی۔"

آمنہ کی ہنسی میں شدت آ گئی۔ "مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ تم نے کیسا خط لکھا ہوگا... اور وہ شائع کیوں نہ ہوا۔"

یمنی اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔۔۔ پھر شہباز کا اسکول بیگ لیے باہر نکلی' پھر چھت کی جانب۔

"اب کیا کرنے لگی ہو؟" آمنہ نے آواز دی۔

"نیا خط لکھنے لگی ہوں۔" اس نے اونچی آواز میں کاغذ لہرایا۔

"یا اللہ رحم!" آمنہ یہی کہہ سکی۔

☼ ☼ ☼

وہاڑی سے پھپھو سلطان بی بی آئی تھیں۔ اس بار وہ اہم مشن پر تھیں۔ آمنہ کی تاریخ پر تبصرہ ہونا تھا۔ کمیٹی کب کھلے گی۔ لسٹ بنائی تھی کیا کیا خریدنا باقی ہے' کس کو کیا کیا دیا گیا اور اب کیا ملے گا۔

پھوپھو دادی کے کانوں میں گھس کر "اُدھر" کی تیاریاں بتا رہی تھیں۔ دراصل یہ رشتہ پھوپھو نے اپنے شوہر کے تایازاد بھائی عظیم سے کروایا تھا۔ وہ وہیں پھوپھو کی سسرال وہاڑی میں جوائنٹ فیملی میں رہتا تھا۔ ابھی سال پہلے ہی انہوں نے بیچ میں دیوار کرکے اپنا الگ بڑا گھر بنایا تھا۔ عظیم چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ تائی مجیداں نے پھوپھو کی پندرہ سالہ شادی شدہ زندگی دیکھ رکھی تھی۔ صبر' شکر' تحمل' برداشت' ہر مشکل گھڑی میں خاندان کے ساتھ' سب سے بنا کر رکھنے والی اور آمنہ' پھوپھو کا پرتو تھی۔

وہ دو سال پہلے بڑے مان و محبت سے رشتہ لے گئیں۔ اب آمنہ کی نند کی رخصتی میں آمنہ کا ولیمہ تھا۔ دیر آمنہ کی نند کے سسرال کی جانب سے تھی اور اب وہاں بھی ہلچل تھی۔

شام کو دادی کی دونوں بڑی پیٹیاں کھولی گئیں۔ یمنی کو اس موقع پر عموماً" غصہ چڑھتا تھا' مگر وہ بھی سنجیدہ بنی اوپر چڑھ کر پیٹی میں گھس گئی۔ اب وہ سامان نکال کر چارپائیوں پر پھوپھو کو دیتی جارہی تھی۔ دادی جی لاٹھی ٹیکتی خود دروازہ پر اندر سے تالا ڈال کر آئی تھیں۔ آمنہ کی امی کے جہیز کی شنیل والی آتشی گلابی رضائیاں' سفید سبز دھاری والے کھیس' ہاتھ کی بنی رنگ برنگی دریاں' گدے البتہ نہیں تھے۔ دادی جی کے جہیز کے دیسی روئی کے تکیے پڑے تھے۔ پھوپھو سامان چھانٹ کر الگ کر رہی تھیں' ایک چارپائی پر سلور اسٹیل کا پتیلیوں کا سیٹ' اعزاز کا لایا ہوا ہاٹ پاٹ سیٹ' کولر۔ اسٹیل کے برتن آمنہ کی امی کے جہیز کے تھے بلکہ بیشتر سامان انہی کا تھا۔ وہ خوب اچھا جہیز لائی تھیں پر یہاں سسرال میں دادی کی پوری گھر گرہستی تھی۔ ان کا سامان پیٹی ہی میں رہا۔ اب آج نکل رہا تھا۔

"سلائی مشین اور واشنگ مشین آمنہ کے نانکے دیں گے۔" دادی جی نے بیٹی کو بتایا۔ پھوپھو مطمئن ہوگئیں۔

"اس کے مامے کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ آپ جب مرضی کی تاریخ رکھو۔ میں اگلے مہینے بھجوا دوں گا۔" شام تک سارا سامان نکلوا کر دیکھ لیا گیا۔ بہت کچھ موجود تھا۔ بہت کچھ لینا تھا۔

"یہ چیزیں زیادہ ہیں۔ یہ الگ رکھ دو۔ تمہارے کام آئیں گی۔" دادی جی نے دوسری چارپائی کی چھوٹی ڈھیری کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ ہاٹ پاٹ کے سیٹ ڈبل ہوگئے ہیں۔ یہ رضائیوں کے فالتو کور ہیں اور اسٹیل کے جگ گلاس یہ بھی تمہارے لیے۔۔۔" یمنی کا چہرہ تن گیا۔

"مجھے یہ سب نہیں چاہیے۔" وہ آمنہ کی پیٹی کو تالا ڈال کر کھینچ کر بولی۔

"اچھا! چلو چھوڑو۔ اعزاز کو بھی یہ سب نہیں چاہیے۔" پھوپھو نے دادی جی کو مسکراتی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ بھی کھل کر مسکرائیں۔

"اور مجھے اعزاز بھی نہیں چاہیے۔" یمنی نے دوسری پیٹی کا ڈھکن یکدم چھوڑ دیا۔ دھڑک' ڈھا۔۔۔ کنڈیاں اندر کی جانب بند ہوگئیں۔ یمنی جھاڑن چارپائی پر گولا بنا کر پھینکتے ہوئے باہر نکل گئی۔ دادی جی نے بڑی پریشان نگاہوں سے پھوپھو کے حیران اور آمنہ کے شرمندہ چہرے کو دیکھا۔

☼ ☼ ☼

"جس طرح اللہ نے رزق پانی باندھ رکھا ہے۔ اس

اس وقت اس جگہ سے، نہ قسمت سے کم نہ زیادہ جو لکھا ہے، وہ مل کر رہے گا۔ اسی طرح مجھے لگتا ہے خدا نے منظر بھی باندھ رکھے ہیں۔ ہماری آنکھوں کو اتنی خوشی اتنی تراوٹ اتنی وسعت ملنی ہے۔ نہ زیادہ نہ کم۔

یہاں تاحد نگاہ ریت ہے۔ صرف دو رنگ، مٹی ریت کا مٹیالا رنگ جو دھوپ میں سونے سے زیادہ لشکارے مارتا ہے، پھر آسمان جو کبھی اتنا نیلا ہوتا ہے جیسے کسی نے سفید چادر کو نیل دے دیا ہو، پھر دھوپ بڑھتی ہے اور سارا نیل اڑ جاتا ہے۔ ڈب کھڑبا آسمان دن بارہ بجے تو کبھی آسمان کی طرف دیکھتا ہی نہیں کہ اس وقت سورج خود سے آنکھ ملانے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ ہم سب سر جھکا کر ہاتھوں کے چھجے سے آنکھوں کو ڈھانپے بظاہر احترام میں لیکن سورج سے ڈرتے چلتے جاتے ہیں۔ آپ کو صحرا میں رہنا ہے تو سب سے پہلے سورج کی حاکمیت کو ماننا ہوگا۔ میلسی ایک گرم میدانی علاقہ ہے۔ تم سے یہاں کی گرمی برداشت نہیں ہوتی۔ اس صحرا کی گرمی کو دیکھو تو تم میلسی کی گرمی کو ٹریلر کہو گی۔ فلم روز ہم دیکھتے ہیں۔

تم نے پوچھا میں نے اتنی اچھی باتیں کرنی کہاں سے سیکھ لیں۔ کہیں سے نہیں۔ صحرا کی تنہائی آپ کو سوچنا سکھا دیتی ہے۔ میں تو پھر بھی بارہ جماعت پاس ہوں۔ تم ہمارے باورچی بمشکل مڈل پاس بندوق خان کا خط پڑھو تو عش عش کر اٹھو۔۔۔ مستنصر حسین تارڑ اور تمہاری وہ راحت جبین کی منظر نگاری بھول جاؤ گی۔ اس نے اپنی بیوی کو خط لکھا۔ بدلے میں اس نے پیر بابا سے بنوا کر تعویذ اور پانی بھیج دیا کہ "خوچہ بندوق خان پر صحرا کی چڑیل کا قبضہ ہو گیا ہے۔ ایک بھی سیدھی بات نہیں کرتا۔ پھول، خوشبو، ہوا، بادل اور رنگ۔ سات صفحوں کا خط لکھ دیا۔ یہ نہ بتایا کہ چھٹی لے کر کب آئے گا۔ بیٹی کا نام تک نہ بتایا کہ کیا رکھنا ہے۔۔۔ تم کو صحرا بہت پسند آ گیا ہے۔ ام نے صحرا خان ہی نام رکھ دیا ہے۔" اور فون بند۔ بتاؤ! جب بندوق خان کا علمی قد وہاں تک پہنچ گیا (جہاں اسے کبھی نہیں پہنچنا چاہیے تھا) تو ہم تو پھر عشق گزیدہ ہیں۔ کبھی میرا کوئی خط اسے بھی پڑھوا دو۔ شاید قطرہ قطرہ پتھر میں سوراخ کر دے۔ اسے بتاؤ کہ میں دن میں سورج سے تو آنکھ نہیں ملا پاتا، مگر ساری رات چاند میرے لیے ٹی وی بن جاتا ہے، جس میں اس کا ہر سین لائیو ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے اور تمہیں پتا ہے، صحرا کا چاند تمہارے گھر کے چاند سے بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔ جب چاند کی طرف مسلسل دیکھو تو وہ پھیل کر سارے آسمان کو ڈھانپ لیتا ہے۔

اب تم سوچو میں کتنی بڑی یمنی روز دیکھتا ہوں (ہاہاہا) اجازت دو میں چھٹیاں بچا کر رکھ رہا ہوں۔ اپنی جگہ سب کو بھیج چکا ہوں۔ اب تم شادی کر لو۔۔۔ یہاں تمہارے لیے کچھ لانا مشکل ہے۔ میلے میں گیا تھا۔ ایک چولستانی کڑھائی والی چادر لی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کا لباس کھا گھرا چولی ہے۔ حسب معمول اس خط کو بھی چاندنی رات میں چاند کی روشنی میں لکھ رہا ہوں۔ یقین نہیں آیا؟ کر لو یار۔۔۔ تم اس منظر کو تجربہ نہیں کر سکتیں، میں نے کہا ناں۔۔۔ منظر اور تجربے بھی ہر شے کی طرح نصیب سے ملتے ہیں۔

دادی اور چاچو کی صحت کا بہت خیال رکھو۔ اعجاز کو بھی خط لکھا ہے۔ شہباز کی پڑھائی کا دھیان رکھو۔ میں اسے فوج کا اعلیٰ افسر بنانا چاہتا ہوں۔ ابا جی کو سلام اور ان سے کہنا میں بہت دور سہی، مگر ہمیشہ ان کے ساتھ ہوں۔ تمہارے لیے ڈھیروں پیار۔ اسے بھی دینا۔۔۔ بھائی میں صرف تمہارا ہوں (یاد رہے)۔

اللہ نگہبان

تمہارا بھائی اعزاز مطلوب

آمنہ کے چہرے کی ہلکی مسکراہٹ پھیل کر پورے جسم پر حاوی ہو گئی۔ اس نے طمانیت کا سانس بھرتے ہوئے خط کو اعزاز کے گزشتہ خطوط کے ڈھیر میں سلیقے سے جما کر رکھا اور دزدیدہ نگاہوں سے یمنی کو دیکھا۔ وہ بظاہر ڈائجسٹ پڑھنے میں مگن تھی، مگر آمنہ جانتی تھی۔ اعزاز کا خط پڑھتے ہوئے جو جو رنگ اس کے چہرے پر آیا تھا، یمنی سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ اس نے ایک بار اعزاز کا خط پڑھنے سے انکار کیا تھا۔ "بڑے کے لیے اور بہت کچھ ہے۔" آمنہ نے دوبارہ کہا نہیں کہ ہر چیز اپنے وقت پر خود بخود ہو جاتی ہے۔

✵ ✵ ✵

بقر عید کے ساتویں دن شادی رکھ دی گئی تھی اور اب تیاریاں زوروں پر تھیں۔ یمنی کو شاپنگ کرنا تھی اور سب سے اہم، آمنہ سے چھپا کر کرنی تھی۔ سو وہ فریدہ اور سعیدہ کو لے کر صبح صبح بازار چلی گئی۔ شام گئے جب دادی جی ہول ہول کر آدھی رہ گئیں، وہ لدی پھندی گھر لوٹیں۔ یمنی نے کسی کو بھی دکھائے بغیر پیٹی بند کر دی۔

"پتا نہیں کون سی الم غلم چیزیں خرید لائی ہے۔ پتا نہیں اس نے کون سے چاند مارے خریدے ہیں۔"

آمنہ مسکراتی رہی۔ اس کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔

"اعجاز آجائے تو گھر پہ سفیدی پھیر دے۔" وہ چارپائی پر چت لیٹی اونگھ رہی تھی۔ جب دادی جی لاٹھی کے سہارے گھر کی دیواریں دیکھتے ہوئے آمنہ سے رائے طلب کر رہی تھیں۔

"جی دادی جی۔۔۔ اعجاز کے دوست بھی ساتھ مل جائیں گے۔"

"مگر اس سے فرق کیا پڑے گا۔ گھر کو سفیدی کی نہیں، صفائی کی ضرورت ہے۔ اس اینٹوں کے ڈھیر کو ہٹوا لیں آپ ذرا۔۔۔ گھر کی پہلی بیٹی کی شادی اور چونا پھیر لو۔ ہونہہ!" وہ سوتی بنی لیٹی تھی۔ لڑاکا انداز میں اچھل کر بولی۔ آمنہ نے لمبا طویل سانس بھرا۔

"ایک نئی بحث شروع۔"

"کس بات کی اینٹیں۔ خیر سے بنیادیں ڈال رکھی ہیں۔ کمرے بنائیں گے۔ ذرا آمنہ سے فارغ ہو لیں۔۔۔" دادی جی پر عزم تھیں۔

"ہاں! پہلے امی کی بیماری سے فارغ ہوئے۔۔۔ پھر ابو جی بیمار ہیں۔۔۔ پھر فراغت کا انتظار۔۔۔ پھر آمنہ کی شادی۔۔۔ پھر ذرا مقدمہ جیت لیں۔۔۔ اور آپ مجھ سے لکھوا لیں۔ مقدمہ کبھی جیت ہی نہیں سکتیں آپ۔ حقدار کو حق دیں۔ وہ بھی خوش۔۔۔ ہمارے مسئلے بھی حل ہوں۔"

یمنی کی سارے دن کی تھکاوٹ زبان کے رستے نکلی۔ دادی جی کو مانو بچھو نے ڈنک مارا۔

"تیرا بیڑہ تر جائے منوں۔۔۔ نہ مجھے یار جا کے دشمن لبھنے (ڈھونڈتے) کی کیا لوڑ (ضرورت) ہے۔ ہائے وے ربا۔۔۔ کون سے حقدار۔۔۔ کیسے حقدار۔۔۔ ہائے۔۔۔ ہائے!" دادی نے سینے پر دو ہتڑ مارے۔

"دادی جی! آرام سے۔۔۔ آرام سے۔" آمنہ لپک کر انہیں روکنے آئی۔

"تو میں کون سا غلط کہہ رہی ہوں آج ہو یا پچاس سال بعد فیصلہ یہی ہوگا۔ میں نے تو آپ کو فتویٰ بھی سنایا تھا 'اخبار' سے پڑھ کے۔" یمنی ڈٹی رہی۔

"ہائے! میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ منوں پانی دے۔" دادی جی کی زبان سوکھ رہی تھی۔ آمنہ گلاس بھر پانی لائی اور یمنی کا پیر بری طرح کچلا۔ خاموش رہنے کی التجا۔۔۔

"ہٹو ظالم۔۔۔" وہ پیر سہلانے لگی۔ آمنہ نے یمنی کو چھت پر بھیجا اور دادی جی کو۔۔۔ سہلانے لگی۔ وہ چھت پر لیٹی تھی۔ پہلے تو نیچے سے آتی دادی جی کی آوازیں اور ہزار بار کا دہرایا قصہ سنتی رہی، پھر آنکھ لگ گئی۔

"ابو جی اور ابا جی دونوں تمہیں بلا رہے ہیں اور غصے میں ہیں۔ خدا کے لیے چپ رہنا۔ کہہ دینا غلطی ہو گئی۔" رات گئے آمنہ اسے اوپر لینے آئی۔

"اچھا! آتی ہوں۔ تم چلو۔۔۔" وہ آنکھیں مسلتے جمائیاں روکتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"تمہاری باتوں سے امی جی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ تم بچی ہو یمنی!" ابو جی مدھم مگر سخت لہجے میں بولے۔

"میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی۔ سب لوگ جان بوجھ کر نظریں چراتے ہیں تو چراتے رہیں۔" وہ ڈٹی رہی۔ "مجھے نہیں پسند یہ کھنڈر مکان۔۔۔ ساٹھ مرلے کا گھر اور یہ صرف چار کمرے، دادا جی کے زمانے

کے بنے ہوئے۔ پلاٹ متنازعہ ہے۔ دس سال پہلے یہ بنیادیں ڈالی تھیں۔ ایک ایک اینٹ بھی رکھتے تو عالیشان گھر بن جاتا۔ اب یہ حال ہے کہ ایک کیل بھی نہیں لگا سکتے۔ دس سال سے فیصلہ نہیں ہوا۔ ساری آمدنی مقدمے پر لگادی۔ بلاوجہ کی بھٹیک (ٹینشن)۔ مجھے شرم آتی ہے ایسے گھر میں رہتے ہوئے۔ کوئی آجائے تو میں تو سامنے بھی نہیں آتی۔ کھودی مٹی کھوتے لگ گئی (کنویں کی مٹی کنویں پر لگ گئی)۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں نمی بھی آگئی۔

بات تو سو فیصد درست تھی۔ ابا جی مکمل اور ابو جی آدھے متفق تھے مگر دادی کو کون منائے۔

"جاؤ! اپنے کمرے میں سو جاؤ۔" ابو جی دھیمے لہجے میں بولے۔ دونوں آگے پیچھے نکلیں۔

"تعریف کروں تو تم بڑی بہادر ہو... اور برائی کروں تو صاف بات ہے تم بہت بدتمیز ہو یمنی!" آمنہ نے اللہ جانے تعریف کی یا تنقید... یہ کچھ نہ بولی۔

"وقت گزرتا ہے تو ہر چیز بدل جاتی ہے۔ تم اتنی مایوس کیوں ہوتی ہو۔ تمہیں بھی سب اچھا مل جائے گا۔" آمنہ پرامید لہجے میں بولی۔

"بات یہ ہے آمنہ! کہ تم ایسی باتیں کر سکتی ہو... تمہارا راستہ آگے روشن ہے... مجھے تم سب مل کر مزید تاریکی میں دھکیل دو گے۔ میرے منہ سے زہر ہی نکلے گا۔" وہ خار لہجے میں بولی۔ آمنہ حق دق رہ گئی۔

"تم اتنا برا سوچتی ہو یمنی؟" وہ بہت دیر بعد بولی۔

"اس سے بھی زیادہ برا۔" وہ بے نیازی سے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔

"تم پریشان مت ہو۔ تمہاری مرضی کے بنا کچھ نہیں ہوگا۔ تم اپنا رستہ خود چننا۔" وہ بہت دیر بعد بولنے کے قابل ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگر حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو یمنی ٹھیک کہتی ہے۔ غربت کسے اچھی لگتی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ہم اوروں سے بہت اچھے ہیں۔ اپنے سے اوپر دیکھنے سے پہلے نیچے دیکھیں تو دل ہمیشہ ٹھکانے پر رہے۔ اب یہ جو ساری لڑائی تمہیں بتائی ہے میں اس کی وجہ سمجھتی ہوں۔ یہ اس دن بازار گئی۔ اسے بڑے بڑے دروازے والے خوب صورت پکے ماربل والے گھر بھاتے ہیں۔ بازار کی چیزوں کو دیکھتی ہے تو نہ خرید سکنے کا احساس، بے بسی میں ڈھل کر رلاتا ہے، لڑواتا ہے۔

ابھی اس میں بچپنا ہے۔ اسے اپنا یہ ماحول، کلچر، رہن سہن کچھ پسند نہیں۔ یہ اس ماحول سے فرار چاہتی ہے۔ اس دن تو اس نے یہاں تک کہہ دیا "کاش! پھوپھو کی تائی ساس میرا رشتہ ہی مانگ لیتیں۔" بعد میں بہت شرمندہ ہو کر معافیاں مانگتی رہی۔ اسے شاید تمہاری ذات پر تو کوئی اعتراض نہ ہو مگر اسے تمہارا ساتھ قبول کرنے سے جو زندگی گزارنی ہوگی، وہ اسے قطعاً "قبول نہیں۔ برملا کہتی ہے۔ اعزاز! میرے بھائی! تم کچھ کرو بلکہ تم ہی کچھ کر سکتے ہو، دادی تمہاری بات سمجھتی ہیں۔ تم انہیں منا سکتے ہو۔ یمنی بالکل غلط بھی نہیں ہے۔

یہ بات صاف اور سیدھی ہے کہ دادی جی دادا جان کی دوسری بیوی تھیں اور ان کے پہلی بیوی سے بیٹے یعنی تایا یعقوب دادا جی کی اولاد ہیں اور اس گھر میں ان کا بھی ابا جی اور چاچو جی کے برابر حصہ ہے مگر دادی جی دینے کو تیار نہیں۔ سیدھا سیدھا حل ہے۔ یہ سارا پلاٹ بیچ کر انہیں ان کا حصہ دیں اور ہم کہیں دوسرا گھر لے لیں جب تک ہم انہیں دیں گے نہیں، یہاں عمارت بنانا ممکن نہیں... مگر دادی امی حق تسلیم ہی نہیں کرتیں۔

سالوں پہلے ہم نے جب گھر بنانا شروع کیا تو تایا آگئے کہ میرا حصہ نکالو اور پھر جو مرضی بنالو۔ اس وقت کی ڈلی بنیادیں واقعی کھنڈر کا نقشہ لگتی ہیں۔ دراصل یمنی کو رونا یوں آتا ہے کہ تم سے شادی کی صورت میں اسے اس کھنڈر میں زندگی گزارنی ہوگی۔ اتنی تلخ باتیں کرتی ہے کہ حد نہیں۔ تمہاری محبت بھی اسے رام نہیں کر سکتی۔

اب تم ہی کچھ کرو ایک اچھا خوب صورت گھر ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے وہ حق بجانب ہے۔ اب تم اتنی زیادہ محبت کا دعوا کرتے ہو۔ ثبوت پیش کرو... لوگ دودھ کی نہریں نکال لیتے ہیں۔ تاج محل بنا دیتے ہیں۔ تم سے دو کمرے اور ایک کچن نہیں بن سکتا... تمہیں خط لکھا تو دل ہلکا ہوا ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔

تمہاری بہن
آمنہ مطلوب
اللہ نگہبان

☼ ☼ ☼
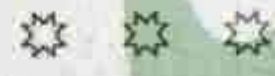
یمنی سارے گھر میں خوشی سے گھومتی پھر رہی تھی۔ "میں بن پتنگ اڑ جاؤں رے" وہ گنگنائی۔

"میں تار والی ڈور سے کاٹ دوں گا۔ وہاں گندے نالے میں جا کر گرو گی" شہباز نے حظ اٹھایا۔

"پراں ہو... سارا مزا خراب کردیا۔" یمنی بدمزا ہو گئی۔ آمنہ ہنستے مسکراتے دوبارہ اس کا لکھا خط پڑھ رہی تھی جو کوئی ساتویں کوشش میں شائع ہو گیا۔ ڈائجسٹ کی مندرجات پر تبصرہ، پسندیدہ مصنفہ کی تحریر کی فرمائش، اپنا مختصر سا تعارف...

آمنہ کو بھی بڑا مزا آیا۔ خط میں اس کا بھی ذکر تھا۔

"یمنی! میری شادی کا احوال لکھنا۔" اسے یونہی خیال آیا۔

"دماغ خراب ہے، تمہاری شادی کا احوال بھی کوئی احوال ہوگا۔ چندرے کا جہیز، ٹانکوں کی سلائی مشین اور واشنگ مشین۔ دادی جی نے اپنا سو مرتبہ کا دھلا کاسنی سفید سوٹ پہن لینا ہے۔ نہ مووی نہ فوٹو سیشن، نہ بیوٹی پارلر کا میک اپ، نہ تصویریں... کون پڑھے گا دلچسپی سے"

"تم ایسے سوچتی ہو منوں!" آمنہ کی آواز بھرا گئی۔ آمنہ ڈائجسٹ چھوڑ کر یکدم کمرے کی سمت بھاگی۔

"یا اللہ!" شہباز نے حیرت سے اپنی بے حد نرم خو، صلح جو، تحمل سے لبریز بہن کو دیکھا، وہ کچھ سمجھا تو نہیں مگر یہ پتا لگ گیا کہ یمنی باجی نے کوئی "نہا" کردی ہے۔ اس نے یمنی کو گھورا اور کمرے کی جانب بڑھا۔ مگر یہ کیا دروازہ بند...

"تم بہت بری ہو چھوٹی منوں... تم سب کو ناراض کرتی ہو... میں بتاتا ہوں دادی امی کو۔" خود یمنی کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ ٹھک ٹھک... اس نے دونوں ہاتھوں سے دروازہ بجایا۔

"دروازہ کھول دو منوں... خدا کی قسم زبان پھسل گئی۔ قسم سے معاف کردو۔ یہ دیکھو۔ میرے ہاتھ جڑے ہیں... سچ بڑی غلطی ہو گئی۔ میری توبہ..." یمنی کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

شہباز اچھل کر دیوار سے ٹنگ گیا۔ روشن دان سے جھانکا۔ آمنہ چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بہہ رہا تھا۔ ہر حال میں مسکراتی آمنہ کو یوں روتے دیکھنا شہباز کے لیے کڑا امتحان تھا۔ اس نے یمنی سے انتقام لینے کا منصوبہ فوراً "بنایا۔

"نہیں کرو منوں! باجی! نہیں کرو... قسم خدا کی... نہیں کرو... مر جاؤ گی تم... دوپٹہ کا پھندا نہیں بناؤ۔ پنکھے سے لٹکنے میں بہت مشکل ہوگی۔ تمہارے پاس تو اسٹول بھی نہیں ہائے میری باجی..."

"کیا کہہ رہا ہے شہباز... کیا کر رہی ہے آمنہ...؟" یمنی کے پیروں سے زمین نکل گئی۔ اس نے پوری شدت سے دروازہ دھڑ دھڑایا...

"خود کشی حرام موت ہے، اگر بچ گئی ناں تو بھی ہاتھ پیر ٹوٹ جائیں گے۔ تمہارا تو دوپٹہ بھی کچا ہے۔ یہ ابا جی کی سرمئی دھوتی کا پھندا بناؤ آپا! ہاں اس تکیے پر کھڑی ہو جاؤ... ہاں ٹھیک ہے، مگر سن لو ذرا میرے بیگ سے کاغذ پنسل لے کر لکھ دو، یہ سب یمنی کی حرکتوں اور باتوں کی وجہ سے کر رہی ہوں۔"

"کک... کک... کیا شہباز... ! اندر کود کر دروازہ کھول ہائے آمنہ... آمنہ ایسا نہ کر..." یمنی حلق کے بل چیخی۔

شہباز جو کچھ "دیکھ رہا" تھا، اس کی کمنٹری مسلسل کر رہا تھا۔ یمنی دھڑ سے زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کے جسم

کی ساری جان نکل گئی۔ ”آمنہ میں مرجاؤں گی۔ خدا کے لیے تم ایسی تو نہیں تھیں... ہائے! میں ہی منحوس ہوں سب کی دشمن۔ آمنہ میری زبان پر کوئلہ رکھ دے مگر ایسے نہ کر... ہائے!“

شہباز نے چٹخارا لیا ”تمہارے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے چھوٹی منوں!“ وہ دھڑام کر کے نیچے کودا ”اب یہاں بیٹھ کر بین کرو۔ میں لوگوں کو بلاتا ہوں۔ میں اکیلا لاش اتار نہیں سکتا۔“ وہ بڑی ذمہ داری سے کہہ کر باہر کو لپکا۔

”ہائے آمنہ!“ یمنیٰ حلق کے بل چیخی ”دادی جی... دادی جی... ہائے میں مرگئی۔“ وہ چکرا کر زمین پر آرہی۔

اتنی دلدوز دلخراش چیخوں پر آمنہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ پورے وزن کے ساتھ دروازے سے چپکی یمنیٰ دروازہ کھلتے ہی آمنہ کے پیروں پر گر پڑی ہوش و حواس سے جدا ہونے سے پہلے اس نے آمنہ کا متورم چہرہ حیرت سے دیکھا تھا۔

”اب مزا آیا؟ ایسا ہوتا ہے میرا انتقام۔“ شہباز منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ یمنیٰ کے سر پر گومڑا ابھر آیا تھا۔ فرش بڑی زور سے لگا تھا۔

”میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا کہ لوگ اس لیے شادی کا احوال لکھتے ہیں کہ اپنی دولت و امارات رہن سہن کی شو مار سکیں۔ میں نے تو ہمیشہ مختلف کلچر اور رسم رواج جاننے کے لیے مزے لے کر اس سلسلے کو پڑھا۔“

رات یمنیٰ کے بہت زیادہ منانے کے بعد آمنہ دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر تم نے کبھی کسی غریب غربا کی شادی کا احوال پڑھا ہے؟“ یمنیٰ نے اعتراض اٹھایا۔

”نہیں پڑھا۔“ آمنہ نے اعتراف کیا۔

”مگر تم یہ تو دیکھو! شادی بیاہ کے معاملات میں لوگ ہر قیمت پر بہت اچھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر چیز کو بہتر سے بہتر دکھانے کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ بچتیں علین دین ادھار سب اس موقع کے لیے رکھا جاتا ہے پھر یہ موقع اتنی محنتوں کے بعد بہت اچھا بن کر سامنے آتا ہے۔ ہمارے گھر کی شادی بھی اتنی اچھی ہی ہوگی۔“ آمنہ نے تفصیلی جواب دیا۔

”نہیں ہو سکتی کبھی بھی۔“ یمنیٰ قطعیت سے بولی۔

”اچھا! تمہاری شادی ہم اس طرح کریں گے کہ وہ سب لوازمات ہوں جو تمہارے خیال میں ڈائجسٹ کی شادی میں ہونے چاہئیں پھر میں تمہاری شادی کا احوال لکھ بھیجوں گی۔“ آمنہ نے ہنستے ہوئے اپنا آئیڈیا بتایا۔

”بہت خوب...“ یمنیٰ کی ہنسی استہزائیہ تھی۔

”تمہارے تو پھر کچھ خواب، ارمان پورے ہو ہی رہے ہیں۔ ادھر سے نہ سہی ادھر سے تو کھلا ہاتھ اور کھلا دل ہے۔ میرے لیے تو ایسا کوئی چانس دور دور تک نہیں۔ تمہیں سب مل رہا ہے۔ تم اتنی خوش امیدی کی باتیں کر سکتی ہو... میں نہیں...“ اس نے حتمی کہا۔ آمنہ کے پاس جواب تھا مگر اب اس نے دوبدو جواب دے کر سمجھانے کی کوشش ترک کر کے ”عملی اقدام“ اٹھانے کا سوچا تھا، سو خاموش رہی۔

تمہیں ہمیشہ آدھا گلاس بھرا دکھائی دیتا ہے جبکہ...“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”اپنی اپنی سوچ، وسعت نظر کی بات ہے۔“ آمنہ کا موڈ پھر خراب ہونے لگا۔

”اچھا! تم اتنی اپنے حال میں مست الست ہو تو چلو!“ یمنیٰ نے ہتھیلی پر مکا مارا ”ایک بات تو بتاؤ... یہ جو یہ یہاں آخری صفحات پر۔“ اس نے ڈائجسٹ کے ورق پلٹے ”آپ کا باورچی خانہ“ نامی سلسلہ تھا۔ ”تم اس میں شرکت کر سکتی ہو؟“

آمنہ نے صفحہ کو بغور دیکھا۔ یمنیٰ چیلنج دیتی طنزیہ نگاہوں سے آمنہ کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھ رہی تھی۔ آمنہ نے لمحہ بھر سوچا۔ یمنیٰ کو یہ لمحہ بھر کی طوالت بھی کھلی۔ وہ اس کے ہار جانے کا اعلان کرنے ہی والی تھی۔

”بالکل کر سکتی ہوں۔“ آمنہ بھرپور اعتماد سے بولی۔

”میں اس کچن کی بات کر رہی ہوں۔“ یمنیٰ نے ہاتھ لہرا کر کچن چبوترے کی طرف اشارہ کیا۔ ”تمہارے ”ہونے والے“ کچن کی نہیں۔“

”میں بھی اسی کچن کی بات کر رہی ہوں۔ میں اس سلسلے میں عنقریب خط لکھوں گی۔“ وہ بے حد پرعزم لہجے میں قطعیت سے گویا ہوئی۔

”شائع ہوگا؟“ گہرے طنز نے یمنیٰ کے لہجے اور چہرے کو بگاڑ دیا تھا۔

”اوں!“ آمنہ سوچ میں پڑ گئی... یمنیٰ کا چہرہ اور سخت ہو گیا۔

”ہنڈرڈ پرسنٹ شائع ہوگا... شرط لگالو۔“ آمنہ نے ہتھیلی پھیلائی۔

یمنیٰ متزلزل تھی۔ ”مجھے یقین نہیں۔ ڈائجسٹ میں سب اچھا بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ وہاں دیہاتی کچن کی گنجائش کہاں۔“

”شہری زندگی شاید تیس فیصد ہے اور یہ ہمارا دیہاتی کلچر ستر فیصد... اور یہی ہمارا اصل ہے۔ اب میں تمہیں لکھ کر دکھاؤں گی اور شائع ہوگا... بلکہ تم بھی لکھو... پھر دیکھتے ہیں۔“ آمنہ نے جواباً اسے چیلنج دے دیا۔

”مجھے منظور ہے“

☼ ☼ ☼

یمنیٰ کو مسلسل احساس ہو رہا تھا کہ کوئی اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے۔ وہ جتنا زیادہ پرسکون رہ کر اپنا فیشن مکمل کرنے والی تھی، دماغ اب اس سے ڈبل کھول رہا تھا۔ دراصل اس نے آمنہ اور اپنے لیے ایک بیوٹی پلان ترتیب دیا تھا، جس کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ اس نے آمنہ سے برتن دھونے کی ڈیوٹی لے لی۔ بالن کی کوئی بھی قسم ہو خواہ لکڑیاں، پاتھیاں، چھٹیاں یا اور کچھ بھی، یہ سب پتیلوں کو نیچے سے کالا سیاہ کر دیتے ہیں پھر انہیں دریائی ریت سے خوب رگڑ رگڑ کر مانجھنا پڑتا ہے تو ایسے میں ہاتھوں بالخصوص ناخنوں میں جو کالک بھرتی ہے، وہ پھر مستقل ہی رہ جاتی ہے۔ انگلیوں کے جوڑ سیاہ پڑ جاتے ہیں سو دلہن کے ایسے ہاتھ بہت برے لگتے۔ اس لیے آمنہ کو سب سے پہلے اس ڈیوٹی سے مستثنیٰ قرار دیا۔ اور دوسرے نمبر پر صحن میں جھاڑو دینے سے کہ پیر خراب ہوں گے اور چہرہ گرد آلود ہوگا۔ وہ فریدہ کے ساتھ جا کر شہر کی سب سے مستند دکان سے ماسک، کریمیں، لوشن اور ایسی دوسری ڈھیروں چیزیں لے آئی تھی اور بہت ماہرانہ انداز میں روز آمنہ پر اور بعد میں تھوڑی بہت خود پر آزماتی۔ شہباز کے لیے کبھی مٹی ملا منہ، کبھی پیلا منہ اور کبھی بدرنگا منہ بڑی حیرانی اور دلچسپی کا باعث تھا۔ ایسے میں بہنیں آنکھیں بند کر لیتیں، اور چہرے پر ایک بھی تاثر نہ آنے دیتیں۔

” شہباز اسی وقت دلچسپ سے دلچسپ لطیفے سناتا جو بندے کو اندر تک ہلا دیں ہنسا ہنسا کر۔

اب اس وقت شہباز اسکول جا چکا تھا۔ دادی جی دوائی کے زیر اثر سو رہی تھیں۔ آمنہ کپڑے دھو رہی تھی۔ گھر میں اور کوئی تھا نہیں۔ پھر اسے یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے مسلسل۔ اسے اپنے چہرے پر باقاعدہ تپش محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے جھٹکے سے آنکھوں پر دھرے کھیرے اٹھائے۔ نم پلکیں کھلتے ہی سامنے موجود شکل دیکھ کر وہ جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ چہرے پر پہلے حیرت پھر شرمندگی، پھر ناگواری کے تاثرات نے مڈ ماسک کو لکیر لکیر کر دیا۔

”پہلے خیال آیا، سرخ سوٹ میں وہ چہرہ بھی سرخیاں چھلکاتا ہوگا، پھر گلابی رنگ دھیان میں آیا۔ اس کے گال بھی کچھ ایسے ہی ہیں، پھر دھیان سیاہ رنگ پر گیا، وہ کوئلے میں ہیرے کی مانند دمکتی ہوگی۔ بارڈر سے نکلا ہوں تو دروازہ کھولنے تک دنیا کے سارے ہلکے گہرے رنگ آزما کے دیکھ لیے۔ کوئی تمہارے شایان شان نہیں لگا، پھر سوچا وہ تو ہر حال میں اچھی لگتی ہے، چلو خیر! میری ایک سوچ کی تو نفی ہوئی کہ تم کبھی بری لگ نہیں سکتیں۔ پہلی نظر پڑنے پر میں نے اپنی چیخ جس طرح روکی ہے میں جانوں یا میرا خدا جانے۔“ اس نے

اپنے چہرے پر مصنوعی سہم طاری کرلیا۔

یمنی نے طویل سانس بھری اور اتنے جذبوں بھرے جملوں کے جواب میں اس نے اپنے تاثرات بمشکل روکے۔ ایک گہری سرد نگاہ ڈالتے ہوئے وہ سامنے لگی ٹونٹی پر جھک گئی۔ اس نے نلکے سے دو، تین چلو پانی حلق میں بھی اتار لیا۔ تولیے سے چہرہ خشک کرتے ہوئے اس نے دیکھا، وہ سامنے چارپائی پر ڈھیر کریموں کے نام اور کاغذ پر یمنی اور آمنہ کے ہاتھ سے لکھے طریقہ استعمال اور فائدے و نقصانات پڑھ رہا تھا۔

"تعزیرات پاکستان میں ایک دفعہ کا اضافہ یہ بھی ہونا چاہیے، حسینوں کا اقدام قتل کے منصوبے بنانا' یہ سب۔" اس نے ڈھیر کریموں کی جانب اشارہ کیا۔ "ان پر بھی دفعہ لگنی چاہیے، کمزور دل بندے ان کے استعمال سے پہلے ہی جاں بلب ہوتے ہیں۔ ان کے استعمال کے بعد تو گنجائش ہی نہیں رہتی۔" اس کے نکھرے چہرے کو اپنی سرخ تھکان زدہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے وہ دل سے مسکرایا۔

"آمنہ! آمنہ! ادھر آؤ، تمہارا بھائی آگیا ہے۔" وہ اونچی آواز میں بولی اور سامان بیگ میں بھرنے لگی۔

"آمنہ! آمنہ! ادھر آؤ، تمہاری بہن نے آدھا کام کرلیا ہے۔ یہ اتنا تو مان گئی ہے کہ میں صرف تمہارا بھائی ہوں۔" اس نے یمنی جتنی اونچی آواز میں اسی کے لہجے میں پکارا۔

"ہیں سچ!" آمنہ جھاگ لگے ہاتھوں کے ساتھ بھاگی آئی۔ اب پتا نہیں اس نے حیرت کا اظہار کس بات پر کیا تھا۔ بھائی کے آنے پر یا یمنی کے بے ساختہ جملے پر۔ وہ اعزاز سے لپٹ گئی' اس کے بالوں پر جھاگ مل دی۔ اعزاز نے اس کے بالوں پر ہلکا سا بوسہ دیا آمنہ اور اعزاز کی محبت اور دوستی بہت خوب صورت تھی۔ یمنی کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کتنے کمزور ہوگئے ہو۔" آمنہ نے تفکر سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"اور کتنے کالے بھی۔" یمنی نے استہزائیہ بھرا ٹکڑا لگایا اور بیگ سمیت اندر بڑھ گئی' اعزاز کا بے ساختہ قہقہہ۔۔۔ اندر تک سنائی دیا۔

☼ ☼ ☼

ابو جی صبح صبح منڈی جاکر اعزاز کی پسند کی تمام چیزیں لے آئے تھے۔ وہ سات ماہ بعد ڈیڑھ ماہ کی چھٹی پر آیا تھا۔ اس نے اپنی چھٹی بچا بچا کر رکھی تھی کہ آمنہ کی شادی سے کم از کم مہینے پہلے پہنچ جائے اور سب کام سنبھال لے۔ یہ اس کی بارڈر پر دوسری مرتبہ کی پوسٹنگ تھی۔

اسے پڑھائی کا بہت شوق تھا' مگر یمنی کی امی کے آخری چار' پانچ سال بیماری کے باعث معاشی لحاظ سے بہت مشکل تھے۔ یمنی کے ابو جی گٹھیا کے مرض کے باعث سردیوں میں بالکل ناکارہ ہوجاتے تھے۔ اکیلی آمدنی ابا جی کی' وہ ابا جی کے ساتھ مل گیا' مگر بجھا بجھا رہتا' یہ اس کے خواب نہیں تھے۔ وہ تو بہت اعلا مقام پر بابو صاب والی نوکری کرنا چاہتا تھا۔

یمنی کی امی کی وفات کے بعد خود ابا جی نے کہہ دیا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کرے' مگر اب اعزاز کے لیے یہ مشکل تھا۔ اس نے یوں ہی شغل شغل میں رینجرز میں درخواست دے دی۔ حوالدار بھرتی ہوگیا نو ماہ ٹریننگ ہوئی اور پہلی پوسٹنگ بارڈر کی تھی' صحرا خشک' بے رنگ' بے دل' مگر اعزاز کو زندگی کا یہ روپ بہت بھایا۔ اس نے آمنہ کو بتایا۔

"شدید ترین گرم لو کے تھپڑوں کے درمیان جب آپ اونٹوں پر گشت کرتے ہیں' جب راتوں کو راتفل تھامے اندھیرے میں عقابی نگاہوں سے ہیولے تلاشتے ہیں۔ ایسے میں دماغ یاد کرواتا ہے۔ تمہارے اس طرح آنکھیں مل مل کر جاگنے کے باعث اٹھارہ کروڑ بے فکر سو رہے ہیں۔ سمجھو لہو کی جگہ بجلی دوڑنے لگتی ہے۔ نس نس بھڑک جاتی ہے۔ اس انتہائی سخت زندگی پر غالب آجانے والا یہ فخر اتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ سب بھول جاتا ہے۔ ہم نگہبان ہیں۔ ہماری بے خواب آنکھیں کتنی آنکھوں کو خواب ...پر مائل کرتی ہیں۔ یہ احساس دنیا کے ہر احساس ...خوب صورت ہوتا ہے۔"

...اور گھر کے سب افراد کو لگتا ہے کہ اعزاز کے لیے ...یہی بہترین شعبہ تھا۔ وہ انگوٹھی میں نگینے کی مانند ...فٹ ہو گیا تھا' مگر جب جب وہ چھٹی پر آتا۔ اس کی ...حالت دیکھ کر آمنہ پہلے دکھی ہوتی' پھر ہنسنے چلی جاتی۔

"جذبے نے تمہارے دل و دماغ کو سختی بخشی ہے' ...دی ہے' مگر اعزاز! مان لو' تمہارا جسم اب تک ...سختی کا عادی نہیں ہوا۔"

وہ اس کی حالت دیکھ کر تاسف کا اظہار کرتی' اعزاز ...کو طعنہ تیر کی طرح لگتا ہے۔ وہ تڑپ کر رہ جاتا۔

"جذبہ جوان رہنا چاہیے' جذبہ جسم کا محتاج نہیں ...ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت جعفر طیار سیدھا بازو کٹنے ...پر الٹا استعمال نہ کرتے اور الٹا بازو کٹنے پر تلوار دانتوں ...میں نہ پکڑ لیتے۔ جذبہ زیادہ اہم ہوتا ہے' جسم نہیں۔"

اس کا اتنا مدلل' جوش بھرا جواب سن کر سب کے ...سب ہکا بکا رہ گئے۔ آمنہ کی آنکھیں یکایک آنسوؤں ...سے بھر گئیں۔ اس نے اعزاز کا ہاتھ اپنے گال سے ...لگالیا۔ ابا اور ابو جی کی آنکھوں میں تفاخر در آیا' اور تو اور ...یمنی بھی دم بخود تھی۔ دراصل آمنہ کا تجزیہ بظاہر غلط ...نہیں تھا۔ وہ جب جب چھٹی پر آتا اس کی حالت دیدنی ...ہوتی۔ رنگ کالا سیاہ' دھوپ سے چہرہ جل جاتا۔ اس کی ...پوسٹنگ صحرا میں تھی' جہاں موسم کی سختیوں اور دیگر ...سہولیات میسر نہ ہونے کے باعث خاصی ابتر صورت ...حال تھی۔ ایسی صورت حال میں وہاں کے پیدائشی ...باشندے بھی بڑی دقتوں سے زندگی گزارتے تو پھر رینجرز ...کے یہ جوان جو ملک کے طول و عرض سے آئے ہوئے ...بڑی مشکلوں سے خود کو ان موسموں کا عادی ...کرتے۔

شروع شروع میں اعزاز کے لیے بھی بہت مشکل ...تھی۔ مگر اس نے وہ دو سال بہت ہمت سے گزار دیے ...یہ عمل نوکری کا حصہ تھا اور پہلی پوسٹنگ بارڈر کی ...ہوا کرتی ہے۔ مگر قسمت خراب تھی یا کیا؟ وہ دو سال ...پورے کرکے جب ونگ میں واپس لوٹا تو یہاں اس سے غلطی ہوگئی' سزا کے طور پر دوبارہ ایک دوسرے صحرائی بارڈر پر جو پہلے سے زیادہ مشکل اور ناقابل برداشت تھا' بھیج دیا گیا۔

گھر والوں کے لیے یہ جھٹکا زور کا تھا۔ بالخصوص آمنہ کے لیے اور در پردہ یمنی کے لیے' اسے اپنی آنے والی زندگی بالکل تاریک دکھائی دینے لگی۔ دراصل یہ ایک خاموش معاہدہ تھا کہ یمنی کی شادی تایا زاد آمنہ کے بڑے بھائی اعزاز سے ہی ہوگی۔ شروع شروع میں جب یمنی اس حقیقت سے آشنا ہوئی تو نہ اسے خوشی ہوئی اور نہ ناگواری' مگر وقت کے ساتھ ساتھ مایوسی بڑھتی گئی۔

آمنہ نے اس کے ہاتھ میں پہلے خوابوں کی ریشمی ڈوریاں تھمادیں کہ اعزاز کی ترقی ہوگی' وہ حوالدار سے سب انسپکٹر بنے گا۔ ونگ میں واپس آئے گا تو بیٹ مین ملے گا' اسے تمام سہولیات حاصل ہوں گی۔

یمنی نے ریشمی ڈور کھینچ کر تھان بنا کر خود سے لپیٹ دی۔ اس چادر کا پہلا چھید اس کے سامنے آیا' جب پھوپھو سلطان بی بی نے آمنہ کا رشتہ اپنے سسرال میں طے کیا اور اس کی ہونے والی ساس کو بہت خوشی و طمانیت سے بتایا کہ یمنی کا رشتہ گھر ہی میں طے ہے۔ گھر کی بیٹی گھر ہی میں رہے گی' اعزاز کی تو مختلف جگہ پوسٹنگ ہوتی رہے گی' پھر وہ ہفتہ پندرہ دن بعد آیا کرے گا تو کوئی فکر ہی نہیں۔ آمنہ کے جانے کے بعد پیچھے گھر کا کوئی مسئلہ نہیں' یمنی ہوگی' وہی باپ' بھائی' دادی۔

یمنی منہ کھول حیرت سے پھوپھو کے جملے سنتی رہی' یہ منصوبہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا تھا۔

"یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔" یمنی نے پیشانی مسلی۔ شادی نئی زندگی شروع ہونے کا نام ہے تو میرے لیے یہ کیسی نئی زندگی' یہی گھر' یہ ٹوٹے پھوٹے در و دیوار' یہ اینٹوں کا اونچا نیچا فرش۔

یہی نواڑی پلنگ اور کبھی کبھار نکالے جانے والی چادریں اور کمرے کا آسمانی چونا۔ یمنی کا حلق خشک

ہو گیا۔

اسے اپنے پڑوسیوں کی شادی یاد آئی جو ایسے ہی چاچے تائے کی اولادوں کے بیچ ہوئی تھی۔ اچھا ریشمی جوڑا، تھوڑا بہت سرخی پاؤڈر اور ایک کمرے سے دوسرا کمرا، زندگی شروع ہونے سے پہلے ختم، اس کے اندر احتجاج سر اٹھانے لگا، اس نے ساری بھڑاس جاکر آمنہ پر نکالی۔ وہ حیرت زدہ سی سنتی رہی۔

"ایسا نہیں ہوگا یمنی! تم تسلی رکھو، زندگی ہمیشہ آگے بڑھتی ہے، تمہیں تمہاری قسمت کی ہر شے مل کر رہے گی۔"

"مگر اعزاز کے ساتھ نہیں۔" اس نے بدلحاظی سے آمنہ کی بات کاٹی۔

"تمہیں اعزاز پسند نہیں؟" آمنہ کی مدھم آواز بوجھل ہو گئی۔

"اعزاز کا کیا سوال، میں نے زندگی کے دس سال بے خبری اور دس سال آنے والے اچھے وقت کی آس میں گزار دیے۔ دادی نے ہر بات پر کہا، اپنے بندے دے کار (شوہر کا گھر) جاکے ارمان پورے کرو۔ میں غریب تو یہی سب دے سکتی ہوں۔ پہلے ہمیں بتایا کہ عورت کی زندگی میں بندے دا کار، ہی سب کچھ ہے۔ وہی منزل مقصود ہے، تو پھر مجھے ایسا بندہ (شوہر) ہی نہیں چاہیے، جب یہیں رہنا ہے، یہی سب کرنا ہے تو پھر دم چھلا ساتھ کیوں لگاؤں؟"

"تم خود کو خوش نصیب نہیں سمجھتیں یمنی! کہ تم کچھ چھوڑنا نہیں پڑے گا۔ وہی گھر، باپ، بھائی نگاہوں کے سامنے، ماں سے بڑھ کر محبت دینے والی دادی جی، میرا تو کلیجہ منہ کو آتا ہے، ایک شہر سے دوسرا شہر، نئے لوگ، نیا ماحول، الگ مزاج سسرال اور شوہر برا مل گیا، تو قصہ ہی ختم، بھول جاؤ پچھلوں کو اور ہر لحاظ سے اچھا بھی مل جائے تو تب بھی اتنی دور سے روز روز کون لڑکی اپنی گرہستی چھوڑ کر آسکتی ہے۔ یہاں دو، دو گھنٹے کے فاصلے پر رہنے والی بیٹیاں آخری لمحوں میں پانی کا گھونٹ پلانے نہیں آسکتیں۔ وہ سرائیکیوں کی بیٹی نسیماں بھول گئیں، سی این جی کی ہڑتال تھی، وہ دس سواریاں بدلتی جب روتی پیٹتی پہنچی۔ جنازہ گلی میں رکھ کے دو منٹ کو باپ کا منہ دیکھا جنازہ آگے نکل گیا۔ وہ وہیں مٹی میں لوٹنیاں لگاتی رہی۔ بین ڈالتی رہی۔ یمنی! میں نے تو اس وقت دعا کی کہ خدایا! ایسا حال دشمن کو بھی نہ دینا اور تم......"

یمنی کے چہرے پر حیرانگی کے ساتھ شرمندگی رکی، اس نے آمنہ کی باتوں کو گہرائی سے جانچا تو ملال کے رنگ بھی شامل ہو گئے۔ اس نے یہ بچ اس سے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ آمنہ کے متورم چہرے دیکھتے ہوئے نظریں جھکا گئی، اس نے حلق تر کرتے ہوئے صفائی دینے کی کوشش کی۔

"جو باتیں تم نے کہی ہیں، وہ سب درست مگر میں بھی تو غلط نہیں۔" یمنی کی آواز بھرا گئی۔ "مجھے بھی یہ سب لوگ، بہت پیارے ہیں۔ تم سب لوگ..... میری زندگی میں اس کے علاوہ ہے کیا۔ مجھے ایک پیارا سا خوب صورت گھر، آسائش، تعیش نہیں چاہیے، بس ضرورتیں صحیح طرح بلا رکاوٹ پوری ہو جائیں۔ مجھے اپنی چادر کا اندازہ ہے۔" اس کی آواز گم ہو گئی۔ آمنہ نے بڑھ کر اسے سینے میں بھینچ لیا۔

☼ ☼ ☼

آمنہ ڈھیروں ساگ پھیلائے بیٹھی تھی۔ برتن دھو کر آئی تو آمنہ کے کانوں سے اعزاز کا فون اس میں لگی ہینڈز فری نکال اپنے کان میں ٹھونس لی۔ دادی ——— کے پیروں کے پاس نیم دراز ہو گئی اور مزے سے گانا سننے لگی۔

"تیرا ہونے لگا ہوں، جب سے ملا ہوں۔"

اعزاز نہا کر باہر نکلا۔ اس نے ٹراؤزر پر بنیان پہن رکھی تھی۔ گیلے بال تولیے سے خشک کیے اور شانوں پر تولیہ پھیلائے آمنہ کے پاس بیٹھ گیا۔ دونوں پورا پورا دن باتیں کر کے گزار دیتے، نہیں کون کون سی۔

"اب رنگ ذرا نارمل ہوا ہے۔" آمنہ نے اسے دیکھا۔

"ہوں، جلن بھی کم ہے۔" اعزاز نے آنکھوں کے اس گالوں کی ہڈیاں تھپتھپائیں۔

"یہ جس طرح کا ساگ تم بنا رہی ہو، اس کا سارا آئرن تو ختم ہو جائے گا پک پک کے۔"

"تمہارے لیے اسپیشل پالک بنائی ہے۔ ایک پیاز کالی کر کے لہسن، ادرک ڈالا، دو ٹماٹر پھر دھلی ہوئی پالک کاٹ کر ہانڈی کے اندر اور ڈھکن بند۔ بس پانچ منٹ تیار لو۔ روٹی یمنی ڈال دیتی ہے۔" آمنہ نے تفصیلی ترکیب بتلا کرائی۔

"ہاں تو ٹھیک ہے نا، ذائقہ بھلے اچھا نہیں لگے گا، مگر آئرن بہت زیادہ ملے گا۔ تم لوگ بھی ہفتے میں چار مرتبہ ایسا سالن کھالیا کرو، تو کبھی خون کی کمی نہ ہو۔"

"ہمارے ملک میں عورتوں میں خون ہوتا ہی کہاں ہے۔ وہ تو سارا مرد چوس جاتے ہیں۔" آمنہ نے قہقہہ لگایا۔ "پہلے ابا کا ڈر، پھر بھائی کا، پھر بندے کا اور آخر میں ان پتر بھی آنکھیں دکھاتے ہیں۔"

"ہمارے گھر میں ایسا کون سا مرد ہے؟ بولو!" اعزاز اس الزام پر بھڑک ہی تو گیا۔

آمنہ کی ہنسی بے قابو ہو گئی، دادی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ پیر لمبے کرنے لگیں تو یمنی پائنتی پر تھی۔

"ہاں! تو ادھر لمی پے گئی ہے۔ (لیٹ گئی ہے) ادھر ساگ کون بنوائے گا۔ اٹھ بہن کے ساتھ لگ۔"

یمنی تک آواز ہی نہ پہنچی۔ وہ اگلے گانے پر جھوم رہی تھی۔

"جب سے توں سوہنیا۔"

اعزاز نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں تھرک رہی تھیں، سر بھی ہلکے ہلکے ہل رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ آگئی۔

اعزاز نے اپنے تئیں آمنہ سے نگاہیں بچا کر اس کے چہرے کو آنکھوں کے رستے دل میں جذب کیا۔

مگر آمنہ کو سب خبر تھی۔ ایک اقرار کی انتہا پر تھا اور دوسرا انکار کی، ان کے درمیان پل آمنہ ہی کو بننا پڑتا۔ دادی جی نے دوسری اور تیسری بار یمنی کو کوسا اور چوتھی بار اپنا پیر اس کے پیروں پر زور سے دے مارا۔

"ہائے..... کون کون؟" یمنی ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔

"اب تو اندھی کے ساتھ بوڑی (بہری) بھی ہو گئی ہے۔ نہ ادب، نہ لحاظ، میں نے کتنی آوازیں ماریں۔" دادی جی کا غصہ۔

"لیکن میں نے تو آواز ہی نہیں سنی۔" یمنی نے حیرت سے سب کو دیکھا۔

"چل ساگ بنوا لے، نیستی کڑی!"

یمنی چپل پیروں میں پھنساتی چبوترے پر چڑھ آئی۔ "میں نے آواز ہی نہیں سنی۔"

"یہی تو دکھ ہے، تم آواز سنتی ہی نہیں۔" جواب اعزاز نے دیا۔ وہ بہت میٹھی نظروں سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ اس نے فوراً "ان سنی کر دی۔

"لاؤ ابھی کتنا باقی ہے۔" اس نے پتے الگ کرنے شروع کیے۔ اعزاز سرسوں کے ساگ میں سے پھول اکٹھے کرنے لگا۔

آمنہ اٹھ کر آگ جلانے لگی۔

اعزاز نے پیلے چھوٹے چھوٹے پھولوں کا بہت مختصر سا گلدستہ بنالیا اور یمنی کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے، اسے نہیں کاٹتے ساگ میں....." یمنی نے جھنجھلا کر کہا۔

اعزاز نے ایک نظر پھولوں پر اور دوسری اس کے چہرے پر ڈالی۔ "یہ محبت ہے اور بہت زیادہ ہے۔" اعزاز کی آنکھوں میں محبت کا جہان آباد تھا۔

اس کا پھولوں والا ہاتھ ابھی بھی آگے تھا۔ یمنی کی پلکیں لرز گئیں۔ وہ قطعاً "نہیں لینا چاہتی تھی۔ مگر مستقل سرخ جذبے چھلکاتی آنکھیں دیکھ کر غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ آگے بڑھ گیا۔ اعزاز نے ایک پل رک کر اس کا چہرہ جانچا، پھر سرعت سے نیچے اتر گیا۔ وہ چارپائی پر ٹکا موبائل اٹھا کر چارجنگ پر لگانے لگا۔ آمنہ روٹی لیے آگئی۔

"یمنی کی بچی! تمہیں ساگ چننے کو کہا تھا' تم پھول چننے لگیں۔" اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے پھولوں کی سمت اشارہ کیا۔

"یہ محبت ہے اور بہت زیادہ ہے۔" یمنی اتنا دھیمی بولی کہ آمنہ کے خاک پلے نہ پڑا۔ یمنی نے دزدیدہ نگاہوں سے اعزاز کو دیکھا' وہ فون پر نمبر ملا رہا تھا۔ گیلے بال ماتھے پر سوکھ چکے تھے۔ تولیہ کندھوں پر..... یمنی کے ہاتھوں میں پھولوں کا گچھا تھا۔ ہاتھ سینے سے لگا ہوا تھا اور پھول ٹھوڑی کو چھو رہے تھے۔ اس کی سماعتوں پر ایک جملہ مسلسل دستک دے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

آمنہ اور اعزاز بہت دنوں سے کھچڑی پکا رہے تھے۔ کبھی دونوں چھت پر دھیما' مگر زور و شور سے مگن کسی موضوع کو چھیڑے ہوتے' اعزاز فون پر نمبر ملاتا اور نہ جانے کہاں کہاں باتیں کرتا۔ پھر ایسی ہی ایک نشست میں تایا ابا اور ابو جی شامل ہوئے۔ سلطان بی بی پھوپھو سے بھی ٹیلی فون پر بات ہوئی۔ یمنی کے کان کھڑے تو ہوئے' مگر پھر اس نے اپنی رائے کو حرف آخر سمجھتے ہوئے سارے تجسس پر مٹی ڈال دی۔

اعزاز کے آجانے کے بعد یمنی اکیلے پن کا شکار ہوجاتی تھی کہ آمنہ کی ساری توجہ اس کی جانب مبذول ہوجاتی تھی۔

اس دن آمنہ کے ہاتھوں میں بہت پھرتی تھی۔ اس نے ساگ بنا کر دیسی گھی کا بگھار لگایا۔ مرغی کا گوشت بھونا' ساتھ الائچی کے تڑکے والا سویوں کا زردہ' یمنی خود ساختہ غصے و ناراضی کا شکار تھی کہ آمنہ منہ سے کچھ پھوٹتی کیوں نہیں۔ اس کے ملکے سے حیرت کے اظہار پر آمنہ نے بڑی طمانیت سے کہا۔

"تم بس دیکھتی جاؤ۔" سو اب دیکھتی جا رہی تھی۔

اعزاز بہت پرجوش سا اندر آیا' ساتھ قاری صاحب اور ایک بڑے پاک باز چہرے والا نوجوان تھا۔ ہاتھ میں کچھ کتابیں' یمنی کے ہاتھ سے ٹماٹر زمین پر گر کے ادھر ادھر لڑھک گئے۔

"کہیں یہ لوگ میرا نکاح تو نہیں پڑھا رہے اعزاز کے ساتھ؟" اس کے دل نے زور' زور سے دھڑکنا شروع کیا۔

"میری شادی بس سادگی سے ہوگی' مگر ایسے۔" اس کے حلق میں گولا اٹکا۔ اعزاز کمرے سے نکلا تو وہ وہیں خالی چنگیر لیے مجسمہ بنی کھڑی تھی۔

"کیا ہوا تمہیں؟" اعزاز نے انگلیوں سے اس کا سر ہلایا۔

وہ نفی میں سر ہلا گئی۔ ابا جی کی آواز پر اس نے گھوم کر دیکھا۔

ابو جی کے ساتھ قدم سے قدم ملائے' تایا یعقوب تھے۔ دادی جی کے سوتیلے بیٹے' اسے سب سمجھ آگیا۔

وہ اپنے خیال پر شرمندہ ہوئی اور بڑی ہلکی پھلکی ہوکر پیار لینے تایا جی کے سامنے جا پہنچی۔

"جیتی رہ' جیتی رہ! اوئے تو تو وڈی ساری ہوگئی۔" انہوں نے بڑی محبت سے دونوں ہاتھوں سے جیسے اس کی مانگ سنواری۔

"اور تو اتنی لمبی ہوگئی اور اتنی ہی پتلی۔ اوئے کوئی دودھ لسی' کوئی دیسی گھی کے پراٹھے۔"

اب وہ آمنہ کے دبلے پتلے سراپے کو دیکھ رہے تھے۔ آمنہ نے سر آگے کردیا۔ انہوں نے اس کے بھی بال سنوار دیے۔

آئیں تایا جی! آپ اندر چلیں۔ اعزاز دادی جی کے کمرے کی سمت ان کی رہنمائی کرنے لگا۔

"تو اتنے دنوں سے تم دونوں یہ کر رہے تھے؟" وہ آمنہ کی سمت گھومی۔

"ہاں تو....." آمنہ نے چائے کا پانی رکھا۔

مگر کیا فائدہ..... کیا تایا یعقوب دستبردار ہوجائیں گے؟" اس نے چبا چبا کر کہا' وہ لڑاکا انداز میں کمر پہ ہاتھ ٹکائے کھڑی تھی۔

"نہیں! دادی جی انہیں حصہ دے دیں گی۔" آمنہ نے گویا دھماکا کیا۔ یمنی اچھل پڑی۔

"وہ تو کہتی تھیں میرے مرنے پر ہی ایسا ہوگا۔"

"تو تمہارے خیال میں دادی جی نے مزید کتنا جی

ہے۔ اعزاز نے یہی سمجھایا ہے۔ ان کی خوشی کی خاطر مقدمے پر پیسے خرچ ہوئے اور جب وہ دادی جی کے پہلے بیٹے ہیں۔ اسی گھر میں پیدا ہوئے ہیں تو ان کا شرعی و قانونی حق ہے۔ دادی جی کی ضد فضول ہے۔ اور یہ اتنا بڑا پلاٹ مردہ جسم بنتا جا رہا ہے۔ تایا جی مقدمہ واپس لیں گے۔ دادی ان کا شرعی حق دیں گی' قاری صاحب کے ساتھ ان کا بیٹا ہے' ایک اسلامی قانون بتائیں گے' دوسرے پاکستان کا قانون' ابھی فیصلہ ہوگا۔"

آمنہ کا ہوم ورک پورا تھا۔

"وہ جو دادی جی کہتی ہیں کہ یعقوب کے پاس اتنی جائیداد ہے جانور' زمین' گھربار۔ ماں کی طرف سے ملا ہوا اور دادی جی بیوہ اور کمزور مالی حالت۔"

"وراثت میں یہ سب نہیں ہوتا۔ یہ تو ان کے باپ کا ترکہ ہے ناں۔" آمنہ چائے کپوں میں بھرنے لگی۔

"تو کیا ہم حصہ لگا کر انہیں حساب سے پیسے دیں گے؟" یمنی کی حیرت دوچند ہوگئی۔

"نہیں! ہم یہ پلاٹ بیچ دیں گے۔" اس نے جیسے یمنی کے سر پر بم پھوڑا۔

"کیا.....؟ دادی کا پتا ہے تمہیں....."

اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا۔ وہ اس کی صورت تکنے لگی۔

"دادی مان گئی ہیں۔ پھوپھو اپنا حصہ لینا نہیں چاہتیں مگر تایا جی نے کہا' وہ بہن ہے۔ اس کے آگے بہن بیٹیاں ہیں۔ آگے زمانہ مشکل ہے' حق چھوڑنا رائض چھوڑنے کی راہ پر لے آتا ہے۔ یہ گھر اس حساب سے بکے گا کہ تایا یعقوب اور پھوپھو کو پیسے مل جائیں گے اور ہم لوگ مل کر یہاں رہیں گے۔ اگر ساتھ والے پڑوسی جو اتنے سال سے احاطہ خریدنا چاہتے ہیں۔ خرید لیں آدھا پلاٹ..... ابھی تو بات نہیں کی اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر سارا پلاٹ بکے گا اور اعزاز کہتا ہے پھر ہم مین شہر میں بھلے تھوڑا چھوٹا' مگر اچھا گھر لیں گے۔"

آمنہ کے چہرے پر مستقبل کا بہت خوب صورت خواب دکھائی دے رہا تھا۔

وہ منہ کھولے سب سن رہی تھی۔

"منہ بند کرو..... پاگل لگ رہی ہو..... اعزاز..... اعزاز بھائی! چائے لے جائیں۔" وہ اٹھ گئی یمنی کا منہ ابھی تک نیم وا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام تک سب طے ہوگیا' ساری منہ زبانی کارروائی مکمل..... تایا یعقوب خدا حافظ کہہ کر کمرے سے باہر آگئے۔ یہاں آمنہ' یمنی اور شہباز بیٹھے بھنے چنے کھا رہے تھے۔ وہ دوبارہ چارپائی پر ٹک گئے۔ دادی جی دل گرفتہ اور ملول دکھائی دیتی تھیں۔ وہ دل سے یہ چاہتی تھیں کہ یعقوب اپنا حصہ چھوڑ دیں مگر وہ باپ کا ترکہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ دادی جی روایتی سوتیلی ماں نہیں بنی تھیں کہ یعقوب زیادہ تر اپنے ننکے رہا اور جب کبھی ملنے بھی آیا تو گھڑی دو گھڑی کے مہمان کی طرح..... سو وہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی تھیں کہ یہ پلاٹ ان کا اور ان کی آل اولاد کا تھا۔

آج اعزاز کی بدولت یہ ایک بالکل ناممکن کام ہوگیا تھا۔ اس نے بتایا۔

"آپ کے گزر جانے پر عدالت خود فیصلہ دے دے گی۔ قبضہ بھی دلوائے گی۔ ابا جی اکیلے کیسے یہ سب دیکھیں گے۔ ابو جی میں اتنی ہمت نہیں - وہ بیمار بندے' میری پوسٹنگ نجانے کہاں ہو۔ اعجاز دور کالج میں' شہباز چھوٹا..... اکیلی یمنی۔ گھر میں عدالت پولیس بھیجے گی۔" اس نے بڑا ڈراؤنا منظر پیش کیا۔

"اور دادی! آپ سچ کہیں تو وہ حقدار ہیں۔ ان کے باپ کی زمین ہے یہ..... اور آپ کو بتاؤں' یہ تو آپ کے سامنے کا بیٹا ہے۔ اگر آج کہیں سے کوئی دوسرا دعوے دار آئے کہ جی میں میاں عبدالکریم کا بیٹا ہوں' بیٹی ہوں اور یہ ثابت کردے تو وہ بھی حقدار ہوگا اور شریعت اسے حق دے گی۔"

پھر وہ مولوی صاحب اور ان کے وکیل بیٹے کو لایا۔

مولوی صاحب نے وراثتی تقسیم کے ایسے ایسے مسائل بیان کیے کہ دادی جی کو لگا ان کا حساب کتاب

قبر میں جانے سے پہلے شروع ہوا چاہتا ہے۔

✡ ✡ ✡

گھر بھر میں رونق ہی رونق تھی۔ خوشبو' زرق برق کپڑے' مہمان ہنسی خوشی' طمانیت' اعجاز لاہور سے آگیا تھا۔ اور رواج کے مطابق کل شہباز کے ساتھ جاکر پھوپھو کو لے آیا تھا۔ ان کے آنے ہی سے اصل رونق آئی تھی۔ اتنے دنوں سے شادی کے حوالے سے کام ہو رہے تھے مگر اب گھر واقعی شادی والا گھر لگ رہا تھا۔

صبح جہیز کا سامان جانا تھا۔ یمنی نے اپنی ذاتی چھوٹی پیٹی کھولی تو سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ سب کچھ مکمل ہو گیا تھا۔ ہر چیز جو ضروری تھی' آگئی تھی۔ شیشے کے جگ' گلاس جن پر گولڈن پھول تھے۔ شیشے کا آئس کریم اور فروٹ سیٹ' سوپ سیٹ فریدہ کے بھائی سے بہاولپور سے منگوایا جانے والا گرے نان اسٹک پتیلیوں کا سیٹ' بہت خوب صورت گلدانوں کی جوڑی جن کے پھول اصلی لگتے تھے۔ ٹشو بکس اور ڈسٹ بن سیاہ اور براؤن' رنگین بیڈ شیٹ جنہیں بنانے میں یمنی ماہر تھی۔ ایک بہت پیارا اسلک کا سیاہ اور سرخ سوٹ جو بتیس سو کا بہاولپور ہی سے آیا تھا۔ سب سے نیچے جیولری بکس میں آرٹی فیشل جیولری کا سیٹ تھا۔ وہ کہیں سے بھی آرٹی فیشل نہ لگتا تھا۔ نازک گلوبند' چھوٹی چھوٹی جھمکیاں جن کی کٹوریوں پر سرخ نگ لگے تھے' دو خوب صورت چوڑیاں۔۔۔

آمنہ سحر زدہ ان چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ سب وہ چیزیں تھیں جنہیں آمنہ نے اپنی تمام تر قناعت پسندی' صبر و شکر والی فطرت کے باوجود دکانوں پر رک رک کر بار ہا دیکھا تھا۔ جگ گلاس کا سیٹ اس نے پانچ بار قیمت پوچھ کر چھوڑا تھا۔ "سوپ سیٹ بہت پیارا ہے مگر ہم تو سوپ بناتے نہیں۔"

"تمہیں پسند ہے تو تمہارے جہیز میں رکھ دیں گے۔" یمنی نے تسلی دی تھی۔

"ارے چھوڑو! میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔" آمنہ نے یمنی کا بازو پکڑ کر اسے دکان سے باہر دھکیلا تھا۔ یمنی ایک انچ بھی نہ ہلی۔

"جب برتن ہوں گے تو سوپ بھی بنانے کو دل چاہے گا' ہم تو یہ لیں گے بھائی یہ کتنے کا ہے؟" یمنی آمنہ سے بازو چھڑا کر دکاندار کی سمت گھومی۔

"پانچ ہزار کا۔"

"کیا؟" یمنی لڑکھڑا گئی۔۔۔ پھر اس نے باقاعدہ ہاتھ رکھ کے منہ بند کیا۔

اور آج وہی سوپ سیٹ سامنے تھا۔ لشکارے مارتی چیزیں جن کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ آمنہ نے کسی معمول کی طرح ہاتھ بڑھا کر سوپ کا پیالا اور چمچ پکڑ لیا۔ اس پر انگلیاں پھیریں۔ اگلے پل وہ یمنی سے لپٹی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"تم۔۔۔ تم۔۔۔ نے۔۔۔ اتنی مہنگی چیزیں ہم نے۔۔۔" اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پہلے دادی جی کچھ سمجھیں نہیں۔ پھر ان کی بوڑھی آنکھوں سے بھی قطرے بہنے لگے۔

"تھوڑے آنسو بچاؤ۔ رخصتی کے وقت رونا۔"

"وے بابلا ہائے!" اس نے ہو بہو نقل اتاری۔

پھوپھو نے آگے بڑھ کے اس کے سر پر چپت رسید کی۔

"تم بڑی گھنی ہو۔" پھوپھو نے احتیاط سے گلدان ڈبے میں رکھے۔

"گھنی نہیں' چالاک مکار۔۔۔ یہ سب میں نے اسی لیے کیا کہ کل کو تم میرے لیے اس جیسا بلکہ اس سے بڑھ کر کرو۔" اس نے اپنے بارے میں انکشاف کیا۔

"تم۔۔۔ تم" آمنہ ایک بار پھر زور و شور سے رونے لگی۔ وہ اس سے لپٹ گئی۔

"ہائے اللہ! یہ تم بار بار جپھیاں (گلے ملنا) کیوں ڈال رہی ہو ارے ہٹو! میرا دم نکل گیا۔" یمنی چلائی۔۔۔ خود کو مشکل سے چھڑا کر دادی جی کے پلنگ پر ڈھے گئی۔

"اللہ تجھے اس سے بھی بڑھ کر دے گا۔۔۔ یاد رکھنا۔۔۔" دادی جی نے اسے خود سے لپٹاتے ہوئے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

یمنی کی پلکیں بھیگ گئیں۔ آمنہ اس کے لیے کیا تھی۔ وہ الفاظ میں نہیں بتا سکتی تھی اور کاش وہ۔۔۔ وہ سب کر سکتی جو وہ سوچتی تھی۔ اس کی تو اتنی ہی بساط تھی بس۔

✡ ✡ ✡

صبح بڑی گہما گہمی تھی۔ آج آمنہ کا سامان جانا تھا۔ ایک بڑا بکسا اور بیگ۔ چھوٹا باقی سامان کے لیے لڑکے والے آگئے تھے۔

"دادی جی تھوڑی تھوڑی دیر بعد آنکھیں پونچھتیں۔ پھر آمنہ کو لپٹا لپٹا کر روتیں" دیکھ دھیے! تیری ماں اللہ بخشے ہوتی تو نجانے کیا کچھ کرتی پر میری تو اتنی ہی اوقات' سمجھ بوجھ۔۔۔ کوئی شکوہ ہو' کوئی ناراضی تو اپنی بوڑھی دادی کو معافی دینا۔" دادی جی نے آمنہ کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔

آمنہ کو جیسے بچھو نے ڈنک مارا۔ "توبہ توبہ دادی جی! کیوں میری آخرت خراب کر رہی ہیں۔" اس نے بندھے ہاتھوں کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ پے در پے بوسے دیے۔ یمنی نے پیچھے سے آکر دادی جی کو جکڑ لیا۔ شانوں سے گردن نکال کر جھریوں بھرے گالوں پر بوسہ دیا۔

✡ ✡ ✡

"ہم سب نے کوشش کر لی ہے۔ وہ اٹھتے ہی نہیں۔" حرا اور نمرہ نے یمنی کے سامنے آکر ہار مان لی۔

"تم یہ پانی ان پر ڈال دو۔" یمنی نے بھرا جگ حرا کی جانب بڑھایا۔

"میں؟ نہیں۔۔۔ ماریں گے وہ۔"

"نہیں مارتے۔۔۔ میرا نام لینا۔۔۔"

"تو آپ خود ڈال کر آئیں ناں۔۔۔ امی ہمارے کپڑے نکال رہی ہیں اور ہماری جیولری بھی۔ ہم نے تیار ہونا ہے یمنی باجی۔۔۔" دونوں نے اپنا مسئلہ بیان کیا اور بھاگ گئیں۔ چار و ناچار یمنی کو اٹھنا پڑا۔۔۔

"اتنی دیر سے آوازیں دے رہے ہیں سب' اٹھتے کیوں نہیں۔۔۔ منڈی جانا ہے۔ ابو جی انتظار کر رہے ہیں۔" اوندھے لیٹے اعزاز نے کہنیوں کی جھری سے یمنی کو دیکھا۔ آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔

"میں اب جاکر ابو جی کو بھیجوں گی۔۔۔ تم تو سنتے ہی نہیں۔"

"سنتا ہوں' تم ہی کو سنتا ہوں' تم ہی کو سننا چاہتا ہوں۔"

"مجھے گالیاں دینی بھی آتی ہیں۔" وہ سابقہ انداز میں بولی۔

"تمہارے منہ سے تو وہ بھی پھول بن کر جھڑیں گی۔" وہ بہت شوق سے اچھل کر بیٹھ گیا۔

"دو۔۔۔ دو ناں۔"

یمنی جبڑے بھینچے چپ چاپ اعزاز کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"بلکہ وہ جو رات کو ٹپے گا رہی تھیں۔ وہ کون سا' دنی ایک پھل موتیا دا مار کے جگا سوہنیے۔" اس کا مطلب ہے تمہارے قول و فعل میں تضاد ہے۔" وہ بڑی دلچسپی سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔

"پھول ماروں تو جاگو گے؟" یمنی نے فیصلہ کن انداز میں پوچھا۔

"بالکل! کیا تم میرے لیے ایسا کرو گی؟" اعزاز نے للچائی ہوئی نگاہ سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"کیوں نہیں۔ تم آنکھیں بند کر کے لیٹو' میں ابھی آئی۔۔۔"

وہ مڑ گئی۔ اعزاز نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے دروازے کو دیکھا جہاں چند لمحے پہلے روشنی ہی روشنی تھی۔

اس نے موبائل اٹھا کر ٹائم دیکھا۔ صبح کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ باہر ہوتا شور بتا رہا تھا کہ سب جاگ گئے ہیں۔

اعزاز کے موبائل پر دوست کا میسج تھا۔ وہ پڑھنے میں مگن ہوا جب دھڑ دھڑام اس پر جیسے تاک کر پتھر پھینکے گئے۔ وہ بری طرح چونک کر کھڑا ہو گیا۔ سفید کھلے کھلے۔۔۔ گوبھی کے چھوٹے بڑے چار پانچ پھول اس کے سر اور شانوں سے ٹکرانے کے بعد زمین پر اور

چارپائی پر پڑے تھے۔ یمنی سینے پر ہاتھ لپیٹے بڑی طمانیت بھری مسکان سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اب تو کوئی حسرت نہیں رہی۔ اب تو اٹھ جاؤ گے ناں۔"

"تم... تمہیں تو میں۔" وہ جارحانہ عزائم لیے اس کی جانب لپکا، مگر وہ ہوشیار تھی۔

☼ ☼ ☼

ولیمہ بارات کے دو دن بعد رکھا گیا تھا کہ آمنہ کو بیاہ کے لانے کے اگلے دن اس کی نند کی مہندی ہوئی کہ بہن نے بارات میں شرکت کرنی تھی۔

یہاں کا ایک ناقابل فہم رواج یہ بھی تھا کہ بارات کے ساتھ درجنوں لوگ آتے، لیکن لڑکے کی ماں نہیں آتی، مگر دادی جی نے بصد اصرار اکلوتے بیٹے کی بارات کے ساتھ ماں کو آنے کی تلقین کی تھی۔

دوسرا رواج یہ تھا کہ ولیمہ کے دن لڑکی والے نہیں جایا کرتے تھے۔ صرف وہی دو چار افراد جو کلاوہ لے کر آتے، وہی شرکت کرتے سو یمنی، اعجاز، اعزاز، شہباز اور اباجی آئے تھے، یمنی نے جب پہلے آمنہ کے گھر کو دیکھا تھا تب بھی بری طرح متاثر ہوئی تھی، مگر اس بار تو شان ہی جدا تھی۔ گھر کو مزید ڈیکوریٹ کیا گیا تھا، خصوصاً" اوپری پورشن نیچے بنے دو بڑے کمروں کے اوپر ایک کمرہ بنایا گیا تھا، اور اٹیچ باتھ روم، سفید اور گرے ٹائلز اور فرنیچر جو اعزاز نے یہاں آکر پھوپھا جان کے ساتھ پسند کیا تھا۔ سیاہی مائل براؤن ڈبل بیڈ تھری ڈور الماری تھری پارٹ ڈی وائیڈر ڈریسنگ ٹیبل، میرون اور ڈارک براؤن ویلوٹ کے صوفہ سیٹ کو دیکھ کر تو یمنی کی آنکھیں خیرہ ہی ہو گئیں۔ یہ تو اس نے صرف ڈراموں میں دیکھ رکھے تھے۔

یمنی، آمنہ کے کمرے میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی کہ دونوں نند بھاوج بیوٹی پارلر تیار ہونے گئی تھیں۔ یمنی رشک آمیز انداز میں ہر شے کو سراہ رہی تھی جب دلہنوں کے آنے کا غلغلہ مچا۔ آمنہ کی نند سرخ شرارے اور آمنہ گہرے میرون شرارے میں بے پناہ حسین لگ رہی تھیں۔ یمنی کے گلے لگ کر وہ زور و شور سے رو دی۔

"اتنی بری طرح رو رہی ہو۔ سب ٹھیک ہے ناں؟" یمنی نے خدشات میں گھر کے پوچھا۔

"ہاں! سب ٹھیک ہے۔ میں ترس گئی تمہاری شکل دیکھنے کے لیے سب اتنا یاد آ رہے تھے۔ دو دن اتنی مشکل سے کاٹے ہیں۔" وہ بے بسی سے بولی۔ یمنی ہنس دی۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو۔ دلہن شرارے میں ہی اچھی لگتی ہے۔" یمنی کے لہجے میں ستائش ہی ستائش تھی۔

جب ہی عورتوں کا گروپ دلہن دیکھنے کے لیے اندر آگیا، یمنی ذرا دور کھسک گئی۔

واپسی کے لیے دو کاریں کرائے پر لی گئی تھیں۔ ایک میں ڈرائیور، اباجی اور لڑکے تھے۔ دوسرے میں پھوپھو، آمنہ، یمنی اور دولہا صاحب۔ اعزاز نے بیک ویو مرر یمنی پر سیٹ کر رکھا تھا۔ وہ اتنے لمبے سفر سے تھکی ماندی آنکھیں موندے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ یکدم شدید احساس ہوا کوئی اسے گھور رہا ہے۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئی تو اس نے سامنے دیکھا۔ اعزاز کی بولتی سرخ ڈوروں والی آنکھیں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں... وہ جیسے اس کے ایک ایک نقش کو آنکھوں کے رستے دل میں اتار رہا تھا۔ اس نے اسے گھورا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں نامعلوم نتائج کی دھمکیاں دیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے باقاعدہ جتا کر آئینہ مزید سیٹ کیا۔ یمنی بل کھا کے رہ گئی۔ اعزاز نے وکٹری کا نشان دکھا کر اس کے آج کے روپ کو سراہا۔ ہلکے اور گہرے نیلے امتزاج کا سوٹ وہ شہر سے خرید کر لایا تھا۔ یہی کام رنگ کے فرق (سبز اور گلابی) آمنہ کے لیے بھی تھا۔ تھکاماندہ حسن، کاجل آنکھوں سے بہہ نکلا تھا، صبح کے سنورے بال اب لٹوں کی صورت چہرے کے اطراف میں بکھرے پڑے تھے۔ دوپٹا گلے سے لپٹا تھا اور سیاہ چادر سر سے گر کر شانوں پر ٹکی تھی۔ یمنی نے دانت بھینچ کر چادر سر پر ٹھہرائی۔

نگاہوں میں شوق کا جہان آباد کیے مسلسل دیکھتا شخص۔ قصداً" کوششوں سے دل کو لاتعلقی کی راہ پر لگایا تھا، وہ بے قابو ہونے لگا، وہ تو ہمیشہ سے بہت سنجیدہ مصروف بندہ تھا، مگر یہ کبھی کبھار کی شوخی۔ یمنی کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہو گئیں۔

اس طرح گاڑی میں یہ پہلا سفر تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس طرح سب کی موجودگی میں وہ اسے تنگ کرے گا۔ یمنی نے چادر دائیں گال سے گزار کر دادی جی کی طرح دانتوں میں پکڑی اعزاز ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ یمنی نے اکلوتی آنکھ سے اسے بغور دیکھا۔ سوا ماہ کی چھٹی گزارنے کے بعد اس کی رنگت نارمل ہو گئی تھی اور صحت بھی بہتر ہو گئی تھی۔ گالوں کی ہڈیوں پر، جو ابھری ہوئی تھیں، اب گوشت چڑھ گیا تھا۔ ماتھے پر پڑے بال ہوا سے ہل رہے تھے۔ اس کے مضبوط ہاتھ مشاقی سے اسٹیرنگ کو گھما رہے تھے۔

"اتنا تو آمنہ ٹھیک کہتی ہے۔ اس کا بھائی لاکھوں میں نہ سہی، ہزاروں میں ایک تو ہے ہی۔" اس نے بے خیالی میں تسلیم کر لیا۔

اپنے محلے کا موڑ مڑنے سے پہلے قریبی گھر کا بچہ اپنی ٹرائی سائیکل پر سامنے آگیا۔ اسے بچانے کی خاطر ان کی گاڑی زوردار چکر کھا گئی اعزاز کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ ذرا سی غلطی بچے کے لیے جان لیوا تھی۔ پھوپھو اور آمنہ ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کرنے لگیں۔ اعزاز نے رومال سے ماتھا اور چہرہ پونچھا۔

"ایکسیڈنٹ بچا کر رکھو۔ سال بعد ونگ میں آنے کے بعد کرنا تاکہ دو سال مزید پکے ہوں۔" یمنی نے سارے سفر کا بدلہ لے لیا۔

عظیم بھائی جناتی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ پھوپھو نے زیر لب استغفراللہ پڑھی۔ آمنہ نے اس کے بازو میں چٹکی کاٹی۔

اعزاز نے آئینہ میں اس کا چہرہ دیکھا، وہ بہت گہری نگاہ سے جیسے اسے اندر تک پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یمنی نے نظریں پھیر لیں۔ گھر آنے پر گاڑی سے نکلنے پر یمنی کو دفعتاً" احساس ہوا اعزاز خطرناک حد تک سنجیدہ نظر آرہا تھا گہری سوچ کی لکیریں ماتھے پر نمایاں تھیں۔ وہ لب بھینچے بس ایک نظر اسے دیکھ کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

آج بہت سرد رات تھی۔ ابو جی گٹھیا کے درد کے باعث تقریباً" مفلوج ہو کر رضائی میں شام ہی سے گھس گئے تھے۔ دادی جی پر کھانسی کا شدید دورہ تھا۔ شہباز اباجی کے ساتھ ٹی وی پر خبریں سن رہا تھا۔ یمنی کچن چبوترے پر لکڑیوں کی آگ جلائے، برتن دھونے کے لیے پانی گرم کر رہی تھی۔ آمنہ دس دن رہ جانے کے بعد کل ہی واپس لوٹی تھی۔

اعجاز تو شادی کے پانچویں دن ہی چلا گیا تھا۔ کل سے ایک روٹین لائف شروع ہوئی تھی۔ یمنی کچھ اداس تھی۔ آج اعزاز بھی جانے والا تھا۔ سامنے چارپائی پر اس کے بیگ دھرے تھے۔ سب گھر والے سر شام ہی کھانا کھا چکے تھے۔ اعزاز کسی کام سے گیا تھا۔ یمنی اس کے لیے روٹی ڈال کر فارغ ہوئی تھی۔ اس نے گاجر، مٹر، آلو کا سالن کٹوری میں نکالا۔ ساتھ دیسی گھی لگی گرم روٹیاں تھیں اعزاز چوکی گھسیٹ کر چولہے کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ یمنی نے وہیں رخ پھیر کے برتن دھو لیے۔

دونوں کے درمیان اجنبیت کی دیوار اس دن کے جملے نے اٹھادی تھی۔ اور اب وہ دیوار پروان چڑھ کر اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں ملانے سے بھی گئے۔ بس ایک مکمل لاتعلقی اور خاموشی۔ اعزاز خاموشی اور رغبت سے کھانا کھا رہا تھا۔ پیلے بلب کی روشنی میں اس کا چہرے بے تاثر تھا... یمنی نے نئی لکڑی ڈال کر چائے کا برتن رکھا۔ دو انڈے بھی دھو کر پانی میں ڈال دیے۔ انڈے چائے ساتھ ساتھ تیار...

یمنی آگ پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی۔ شعلوں کا کھیل، رنگ ہی رنگ، نیلے، پیلے رنگ... جلتی لکڑی کی

خوشبو میں قہوہ کی خوشبو اور رات کی ٹھنڈک کی مہک۔ اعزاز روٹی کھاچکا تھا۔ وہ شعلوں کا رقص دیکھنے لگا۔ اس کی خاموشی یمنی کو بے چین کررہی تھی۔ اس نے تو بس اس دن تپانے کو جملہ کہہ دیا۔ تھا اسے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنا بڑا ردعمل ظاہر کرے گا۔

"سنو ں..." یمنی چونک کر اعزاز کی شکل دیکھنے لگی۔ وہ شعلوں ہی کو دیکھ رہا تھا۔ یمنی کو شک ہوا کہ کیا اسے وہم ہوا ہے یا واقعی اسے پکارا ہے۔

"کیا وہ اس دن کا تمہارا جملہ 'تمہارے دل کی خواہش تھا؟ کیا تم واقعی ہی چاہتی ہو کہ میں دو سال مزید اور آنے والے بہت سارے دو دو سال صحرا میں گزاروں' جہاں انسان محبت تو محبت' نفرت تک کو بھول جاتا ہے۔ خود کو بھول جاتا ہے۔" اس کی نگاہیں شعلوں پر اور لہجہ بے تاثر تھا۔

یمنی سٹپٹا گئی۔ وہ تو بچ نکل جانے پر خوش تھی۔ اعزاز کی نگاہوں کی خفگی اور مچلتا سوال شرمندہ کرنے کو کافی تھا۔ ستم در ستم اس نے براہ راست جواب مانگ لیا۔

"اب کیا کہوں۔" یمنی متزلزل تھی۔

اس نے نو ماہ کی ٹریننگ کے بعد دو سال بارڈر پر گزارے' پھر ونگ میں واپس آیا۔ حوالدار سے سب انسپکٹر بننے کی دعائیں ہی شروع ہوئی تھیں کہ اس سے آن ڈیوٹی جانے انجانے غفلت میں ایک ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ بندہ شدید زخمی ہوگیا سزا کے طور پر اعزاز زیادہ مشکل سرحدی صحرائی علاقے میں بھیج دیا گیا۔

یمنی نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔ "نہیں' وہ تو اس دن تم نے اتنا تنگ کیا سارا رستہ' غصہ میں بس یوں ہی کہہ دیا۔" وہ سچائی سے بولی۔

"کیا واقعی؟"

"ہاں۔" وہ اثبات میں سرہلا گئی۔ اعزاز کے خوابوں اور خواہشوں کی ڈور پل بھر میں آسمان کو چھونے لگی۔

یمنی نے تین کپ چائے اندر پہنچائی اور اعزاز کے آگے کپ رکھا۔ انڈے اس کے ٹفن میں رکھے۔

اعزاز خاموشی سے چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ وقتاً فوقتاً "چیزیں" سمیٹتی یمنی کو بے یقینی سے دیکھ لیتا۔ یمنی نے لکڑی نکال کر اس پر پانی کا چھینٹا دیا اور اپنے چولہے کے سامنے پھیلا دیے' گرمائش کے لیے۔

"زاد راہ کے لیے کچھ نہیں دوگی؟" خالی کپ کو اٹھاتی یمنی کا ہاتھ اس کے سلونے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ اس نے بری طرح چونک کر ہاتھوں کو دیکھا۔

"آلو کے پراٹھے ہیں' چکن دہی ڈال کر بھونی ہے' انڈے دو ہی تھے۔ تھرمس میں دودھ پتی بھر دی ہے۔" اس نے آنکھوں سے بیگ کے پاس رکھے ٹفن کو دکھایا۔

اعزاز زور سے ہنس پڑا۔

"تمہیں یقین ہے کہ میں نے یہی پوچھا ہے؟" اس نے ٹفن کو دیکھا۔ یمنی اسے دیکھ کے رہ گئی۔

"کوئی جملہ' کوئی بات' کوئی پیغام جو اتنی سختیوں میں آرام کا باعث ہو' جو دل و جان کا رشتہ قائم رکھے۔" اس نے جذبوں بھرے لہجے میں اس کا چہرہ کھوجا۔

"کسی جراثیم کش صابن سے ہاتھ دھونا اور شربت فولاد استعمال کرتے رہنا' ستو بھی رکھ دیے ہیں۔" یمنی نے بڑی ذمے داری سے ہدایت دی۔ اعزاز کا جاندار قہقہہ سناٹے کو چیر گیا۔

"تم بڑی چیز ہو' یمنی محبوب! تم پر تو نام کا بھی اثر نہیں۔" وہ جست لگا کر چبوترے سے اتر گیا۔ اندر کمرے میں جاکر سب کے گلے ملا' پیار لیا' پھر واپس ادھر آیا۔

"اب یہاں کیوں بیٹھی ہو' سردی لگ جائے گی' اندر رضائی میں چلو۔" وہ اسی طرح پیر چولہے کے نزدیک کیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے سینک رہی تھی۔

"ہاتھ سینک رہی ہوں۔" اس نے نظریں ملائے بغیر کہا۔ اعزاز چبوترے کے نزدیک آگیا' ایک پیر اوپر رکھ دیا' چہرہ یمنی کے چہرے کے نزدیک کیا اور چولہے کے اندر جھانکا۔ لکڑی کب کی نکال چکی تھی۔ سفید سفید راکھ' کہیں نہ کہیں کوئی چنگاری چھب دکھلا جاتی تھی۔ شدید سردی میں بھی یہاں گرمائش سی تھی۔

"یہ دم توڑتی چنگاری اتنی گرمی دے رہی ہے تو یہاں..." اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ "یہاں تو پورا آتش فشاں دہکتا ہے' مشکل ہے کہ آنچ نہ پہنچی ہو۔" وہ بہت گہری نگاہوں سے اسے دیکھتا گمبھیر لہجے میں تیقن سے بولتا چلا گیا۔ یمنی نے کچھ گھبرا کر ہاتھ اور پیر سمیٹ لیے۔ چند پل اسے تکتے رہنے کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔

"اچھا سر! گڈ بائے' رب راکھا۔"

وہ الٹے قدموں گھوم گیا' یمنی بے ارادہ کھڑی ہو گئی۔

"رب راکھا۔" وہ آیت الکرسی پڑھنے لگی۔ اسے یاد تھا' آمنہ اسے اسی طرح دعاؤں کے حصار میں رخصت کرتی تھی۔

✵ ✵ ✵

وہ گہری نیند میں تھی۔ جب اچانک آنکھ کھل گئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو بارش کا شک ہوا۔ وہ پیروں میں چپل پھنسائے برق رفتاری سے باہر کو لپکی۔ چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ ٹپ ٹپ ٹپ بادلوں کی گرج چمک... اس نے گہرا طویل سانس لے کر مہک اندر اتار لی۔ شہباز یقیناً گلیوں میں بھاگتا پھر رہا ہوگا۔ کچے چولہے پر توی ڈھک دی تھی۔ (بڑا توا جس پر بیک وقت چار سے چھ روٹیاں بنائی جاتی ہیں) اوپر پلاسٹک شیٹ' مرغیوں کو بھی بند کرکے پلاسٹک شیٹ ڈربے پر ڈال دی تھی۔

یمنی کو پتا نہیں چلا' کب آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بہنے لگی۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ بارش جو خوشی اور رحمت کا دوسرا نام ہے' دل کو اندر سے خالی اداس بے قرار کر دیتی تھی۔ وہ دور تک دیکھنے کی خواہش میں نڈھال ہو رہی تھی۔ دور تک دیکھ لینے والی آنکھ شاید کوئی اور ہوتی ہے۔ مجھے یہ کیوں لگتا تھا کہ میں رہٹ کا بیل ہوں' جو گھنٹی کی آواز کو کل دنیا سمجھ کر چلتا رہتا ہے۔ آمنہ کہتی ہے' یہ بے یقینی' دراصل خدا کی رحمت سے مایوسی ہے' دل کو ہر وقت مستقبل کے ہول سے ہولائے رکھنا' ایمان کی کمزوری ہے' مگر میرا دل چاہتا ہے' میرے پاس جادوگرنی کا شیشہ آجائے اور میں بس پل بھر یہ دیکھ لوں کہ کیا ہوگا' کیسا ہوگا' مگر یہ تو خدائی ہے' بندہ خدا تو ہو نہیں سکتا تو پھر خدا سے اتنا نزدیک ہوجائے کہ اس پر انکشافات کا دروازہ کھل جائے اور میں تو خود اپنے آپ سے بھی قریب نہیں۔

وہ مایوسی سے آنکھیں پونچھنے لگی۔

اندر شاید فون بج رہا تھا۔ اس نے جلدی سے فون اٹھایا۔

"میں آمنہ... تمہیں پتا ہے کتنی بارش ہو رہی ہے۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ یمنی کا دل خوشی سے بھر گیا۔

"تو یہ کون سی بات ہے' یہاں بھی بارش ہو رہی ہے... چھوٹو کہاں ہے؟" یمنی نے اشتیاق سے نوزائیدہ بچے کے بارے میں پوچھا۔

"وہ اپنی کاٹ میں سو رہا ہے' سب پکوڑے سموسے کھا رہے ہیں' جلیبیاں لائے ہیں' مگر میرے لیے کچھ نہیں' بہت سوچ کر امی نے دودھ جلیبیاں دی ہیں' مگر میں اس چکر میں ہوں ایک پکوڑا تو مل جائے۔"

یمنی طمانیت سے مسکرائی۔

"تم دو پکوڑے کھاؤ' ایک میرے نام کا بھی۔"

"تم بنالو نا یمنی۔" آمنہ نے مشورہ دیا۔

"کیسے بنالوں' ایک تو میں اکیلی ہوں۔ دوسرے سارا چولہا' ہر شے بھیگ گئی ہے۔ اب برسات میں تو سلنڈر ہی استعمال ہوگا۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ اکیلے کچھ مزا نہیں آتا۔" وہ مدھم ہو گئی۔

"فریدہ کی طرف چلی جاؤ۔" آمنہ کو اس کے موڈ کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"نہیں دادی جی سو رہی ہیں اور شہباز دروازہ بند کرکے گیا ہے۔ اچھا چھوڑو' بارش کا مزا تو لے لیا ہے' اب گھر سمیٹنا باقی ہے' کیچڑ کیچڑ ہو گیا ہے۔" یمنی اردگرد دیکھتے ہوئے متاسف ہوئی۔

"رہنے دو! خود ہی سورج نکلے گا تو سوکھ جائے گا' تم بلاوجہ مشقت مت کرنا۔" آمنہ نے ہدایت کی۔ "یہ بتاؤ کب آؤ گی؟ تیاری کرلی ہے؟" آمنہ اشتیاق سے

پوچھ رہی تھی۔
"ہاں! پوری تیاری ہے۔ دادی جی منے کے لیے کچھ نہ کچھ بنا رہی ہیں' خرید رہی ہیں۔"
"اچھا پھر فون رکھتی ہوں' ہم بھانجے کے لیے پیارا سا نام سوچ کے آنا۔" آمنہ کی آواز کی کھلکھلاہٹ صاف محسوس ہو رہی تھی۔
بارش رک گئی تھی' بجلی چلی گئی تھی' وہ چیزیں سمیٹتے ہوئے مسلسل آمنہ ہی کو سوچے گی۔ رواج کے مطابق اسے زچگی کے لیے یہاں آنا تھا۔ مگر پھر اس کی ساس اور خود آمنہ نے منع کر دیا۔ ابھی تین دن پہلے خدا نے اسے بیٹے سے نوازا تھا۔ تائی مجیداں نے دھوم دھام سے ساتویں روز عقیقہ کا اعلان کیا تھا اور ان سب کو جانا تھا۔

☼ ☼ ☼

یمنی دو دن پہلے ہی یہاں آئی تھی' اور اب عقیقہ کی تقریب کے اختتام پر سب آمنہ کے بڑے سے کمرے میں بیٹھے تھے۔
آمنہ کے سر پر سرخ زرتار دوپٹہ تھا اور وہ دلہن سے زیادہ روپ سنبھالے کچھ نقاہت سے نیم دراز تھی۔ یمنی بہت دل گرفتہ تھی۔ سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی وہ یہاں نہیں تھی' ذہن و دل میں خیالات کی یلغار تھی' جنہیں بڑی کوشش سے چہرے پر آنے سے روک لیا تھا۔ آمنہ جو اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔ دو' تین بار اسے گہری نگاہ سے جانچ چکی تھی۔ مگر بند ناک اور بھاری آواز نے اس کے راز کو ڈھانپ لیا۔
کہاں تو آمنہ خود اور وہ بھی یہ سوچ رہی تھی کہ وہ دس بارہ دن رہے گی' مگر اب وہ اس ماحول سے اس گھر سے بھاگ جانا چاہتی تھی' وہ پھوپھو کے گھر منتقل ہو گئی کہ اچھا نہیں لگتا۔ وہ اس طرح بہن کے گھر رہے۔
پھوپھو کا گھر آمنہ کے گھر کے عین سامنے تھا۔ یہ وہاڑی کا شہری علاقہ تھا۔ جیسے کراچی یا لاہور کا کوئی علاقہ تمام تر سہولیات سے آراستہ۔

یمنی بس ایسی ہی زندگی چاہتی تھی' اسے ماسی کا گھر بہت پسند تھا' مگر یہ...... آمنہ کا گھر...... جب اس نے پہلے دیکھا تو اچھا تھا۔ بہت پیارا' عظیم کا کاروبار اچھا تھا' مگر وہ اتنی تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہو گا۔ اندازہ نہ تھا۔ عقیقہ والے روز لوگ کہہ رہے تھے۔
"آمنہ کا نصیب' بہت زور آور ہے' تو کیا میرا نصیب ماٹھا ہے' میرے لیے بس وہی سب لکھ رکھا ہے۔"
اس نے دکھتے سر کو ہاتھوں پر گرا لیا۔
"لیکن اب دوسرا راستہ بھی نظر آگیا ہے...... تو کیا مجھے اس پر قدم رکھنا چاہیے۔" وہ تذبذب کا شکار تھی۔
بات صرف یہ تھی کہ آمنہ کی شادی میں تایا یعقوب کے چھوٹے لاڈلے بیٹے ظہور نے یمنی کو پسند کر لیا۔ چھ ماہ کا عرصہ لگا' اسے اپنی ماں کو منانے میں کیونکہ وہ اپنی بھانجی بیاہنا چاہتی تھی۔ تایا جی نے خوشی کا اظہار کیا' وہ ایک روز دعا لے کر حاضر ہوئے۔ آمنہ ان دنوں آئی ہوئی تھی۔ اور یہ بھی کوئی ہفتہ پہلے کی بات تھی کہ وہ دونوں بازار گئیں۔ واپسی میں غضب کی گرمی آمنہ تو آمنہ' یمنی کا بی پی بھی لو ہونے لگا۔ سارا پسینہ بہہ نکلا اوپر سے رکشہ ندارد۔ آمنہ بے دم سی درخت کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ یمنی گھبرا گئی اگر آمنہ کو کچھ ہو گیا۔
تب ہی ایک چھوٹی سفید گاڑی ان کے پاس سے گزری اور پھر فوراً" واپس ہوئی۔ یمنی نے لمبے لمبے سانس لیتی آمنہ کو دیکھا اور دو قدم پیچھے ہو گئی۔ ڈرائیور انہیں پہچان چکا تھا۔ وہ بڑے مسرت آمیز انداز میں چہکا۔
"آمنہ باجی! آپ......" آمنہ نے بھی مندی آنکھوں سے اسے پل بھر میں پہچان لیا۔
"آپ ٹھیک ہیں؟"
یمنی نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ تایا یعقوب کا بیٹا ظہور تھا۔
"چلیں آپ لوگ میرے ساتھ... ایسی حالت ... میرا مطلب ہے اتنی گرمی میں گھر سے نکلنے کی کیا

ضرورت تھی؟" اس نے آمنہ کو آگے اور یمنی کو پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
اندر اے سی آن تھا۔ آمنہ نے بے دم ہو کر سیٹ کی بیک سے ٹیک لگا لی۔ دوزخ سے جنت میں آنے کا احساس تھا۔ وہ پہلی بار اے سی والی گاڑی میں بیٹھی تھی۔
"اب تمہاری طبیعت ٹھیک ہے آمنہ؟" اس نے آگے ہو کر آمنہ کا چہرہ دیکھا۔
"ہاں! ٹھیک ہوں بس......"
گاڑی پانچ منٹ بعد ہی ایک نئی کالونی میں داخل ہو رہی تھی۔ یہ بہت اچھی اسکیم کی کالونی تھی۔
"یہ تم ہمیں کہاں لے آئے؟" آمنہ حیرانی سے بولی۔
"یہ میرا گھر ہے۔ آپ یہاں کھانا کھائیں گی۔ تھوڑا آرام کریں گی' پھر میں آپ کو گھر چھوڑوں گا آپ کو شاید علم نہیں آج سال کا گرم ترین دن ہے۔"
"لیکن......؟" آمنہ نے یمنی کی شکل دیکھی' مگر وہ اس کی جانب متوجہ نہیں تھی۔ گھوم گھوم کر چاروں جانب دیکھ رہی تھی۔ ظہور باہر نکلا۔ اس نے خود ہی بڑے سیاہ گیٹ کو کھولا' پھر انہیں لیے اندر آیا۔ دائیں جانب کار پارکنگ اور بائیں جانب لان میں ننھے ننھے پھول پودے تھے۔ یہ بیس مرلے کا بنا گھر تھا۔ تازہ پینٹ کی خوشبو۔ یمنی نے کبھی خواب میں بھی یہ سب نہیں دیکھا تھا۔ وہ بچ مچ منہ کھولے بچوں کی طرح ہر شے کو حیرانی سے تکے جا رہی تھی۔
ظہور فریج میں سے موسم کے سارے پھل اور جوس کے ڈبے نکال لایا۔
"ابھی تو یہی خدمت کر سکتا ہوں۔" وہ جھینپا۔
"تو تمہاری گھر والی؟" آمنہ ڈھیلی بیٹھی تھی۔
"وہ تو ابھی نہیں ہے۔" ظہور نے گہری نگاہ سے یمنی کو دیکھا۔ پھر آمنہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ آمنہ چپ ہو گئی۔ وہ بچی نہیں تھی۔ اس نے یمنی پر نظر کا صاف پتا چل رہا تھا۔

"ہمیں گھر چھوڑ آؤ۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا سیب چھوڑ دیا۔
"ابھی سے...... آپ کچھ کھائیں تو......" وہ اچھل پڑا' یمنی نے بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں رکنے کی استدعا کی۔
"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بس گھر جا کر آرام کروں گی۔" آمنہ کھڑی بھی ہو گئی۔
"آپ پہلے یہ سیب ختم کریں' پھر میرا گھر بھی تو دیکھیں ناں......" وہ مصر تھا۔
"میں آپ کا گھر دیکھ لوں؟" یمنی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔
"جی...... جی ضرور......" وہ کھڑا ہو گیا۔
"ابا جی نے سالوں پہلے یہ پلاٹ بک کروایا تھا۔ پھر ابھی دو سال پہلے میری ملازمت یہاں ہو گئی تو میں نے سوچا' کرائے کے گھر سے بہتر ہے' میں اپنا گھر بنا لوں۔" اس نے تائیدی انداز میں یمنی کو دیکھا اس نے بھی فوراً" سے اثبات میں سر ہلایا۔
"آپ کیا کام کرتے ہیں؟" یمنی کا اشتیاق ہر بات سے عیاں تھا۔
"میں یہاں بینک میں ہوں۔" یمنی متاثر ہو گئی۔ آمنہ کو بھی اچھا لگا مگر اسے خطرے کی بو آ رہی تھی۔
دانے کی تلاش میں نچلی پرواز کرتا کبوتر' یمنی...... اور اگلا وہ جال لے کر تو بیٹھا ہی تھا۔
یمنی دنوں ظہور کے گھر' گاڑی' عہدے' کالونی کی تعریفیں کرتی رہی۔
اور جب تایا یعقوب نے آ کر یمنی کا نام لیا۔
تو گویا دھماکا ہی ہو گیا' دیکھو جی! بات صاف کروں گا۔ اس کی ماں اپنی کوئی بھانجی بھتیجی لانا چاہتی ہے۔ مگر اب اس نے یمنی کا نام لیا ہے۔ پھر ہم بھائیوں کا رشتہ اور مضبوط ہو گا۔"
دادی جی بالکل چپ' آمنہ خطرناک حد تک سنجیدہ اور ابا جی اور ابو جی خاموش تھے۔
"آپ نے صاف منع کیوں نہیں کیا؟" ان کے جانے کے بعد آمنہ چلائی۔ "صاف صاف کہتے یمنی

اور اعزاز..."

"تو غصہ نہ کر بیٹی! جہاں کڑی ہو' ایسے رشتے آتے ہیں' پھر وہ ہمارا بھائی ہے۔ اس نے تو بس بات کان میں ڈالی ہے۔ میں فوراً" منہ پھاڑ کے کہتا تو صاف لگتا' سوتیلے ہیں۔ اس نے ہماری سنی کب؟ اپنی سنا کر چلا گیا۔ اب آئے گا تو کہہ دیں گے۔" ابو جی نے بڑے سبھاؤ سے کہا۔

"ہاں کڑیے! غلط تو بھی نہیں اور تیرا باپ بھی نہیں۔" دادی جی نے تائید کی۔ آمنہ صبح و شام بڑبڑاتی رہی۔ وہ اعزاز سے فون پر بات کرنے کو بے قرار تھی' مگر سگنل کا مسئلہ تھا۔

یمنی اگلے دن فریدہ کے گھر گئی تو اس کی غیر موجودگی میں ظہور آیا۔ وہ دادی کے لیے ڈھیروں پھل' بکرے کا گوشت اور جوس لایا تھا۔ یمنی لوٹی تو آمنہ اسے باقاعدہ کوستے ہوئے چیزیں ٹھکانے لگا رہی تھی۔

"تم سب لوگ اپنی رائے اپنا فیصلہ سنا رہے ہو۔ جس کا مسئلہ ہے اس سے بھی تو پوچھو۔" یمنی نے آم کاٹتے ہوئے سرسری لہجہ اپنایا۔ "کس کا مسئلہ؟" آمنہ نے ڈپٹ کر استفسار کیا۔

"میرا... مجھ سے بھی تو کچھ پوچھ لو۔"

"تم سے کیا پوچھیں... اور تم کہو گی کیا؟" آمنہ کا نقشہ بگڑا۔

"ہو سکتا ہے' مجھے کچھ کہنا ہو۔" وہ بہت طمانیت سے آم کی قاش کھانے لگی۔

آمنہ کے دل پر جیسے ہاتھ پڑا۔ "تمہیں احساس ہے کہ تم نے کیا کہا ہے؟" وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"کچھ غلط تو نہیں..."

"اعزاز کو بھول گئیں؟"

"یاد رکھنے کو ہے ہی کیا؟"

یہ ان دونوں کی زندگی کی سب سے زوردار جنگ ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں یہ نہیں رکھ سکتی۔ یہ میرے کسی کام نہیں آئیں گے۔" یمنی نے شاپر بیڈ پر الٹ دیا۔ سفید بارڈر والے کھلے پائنچوں کا پاجامہ... آسمانی اے لائن شرٹ جس کے کنارے زمین تک گرتے تھے۔ ہم رنگ دوپٹہ...

"اس میں کیا برائی ہے۔ عام سا کاٹن کا سوٹ ہے۔ عظیم لائے تھے لاہور سے' سرخ رنگ میں میرے لیے۔ میں نے تمہارے لیے بعد میں منگوایا۔"

"مجھے کوئی بھی نہیں چاہیے۔ ہمارے کچے پکے گھر میں ایسے کپڑے نہیں چلتے۔"

"میں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی تمہارے لیے پسند کیا ہو گا۔"

"مجھے تمہاری کسی پسند کی ضرورت نہیں۔ تم اپنے لیے کچھ اور پسند کرتی ہو' میرے لیے کچھ اور..."

"یقین کرو' دونوں سوٹ ایک جیسے ہیں' بس رنگ کا فرق ہے' تم وہ لے لو... ایسی کیا بات ہے..." آمنہ الماری کی جانب بڑھنے لگی۔

"رہنے دو آمنہ! مجھے نہ یہ چاہیے' نہ وہ اور نہ کچھ اور... تم اپنے لیے وہ سب پسند کرتی ہو اور میرے لیے یہ سب..." وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر کمرے میں گھوم گئی۔ اشارہ اس کمرے کی ہر شے کی جانب تھا۔ آخر میں اس سفید پھولوں والی بے پناہ خوب صورت اونچی چھت پر نگاہ کی۔

"خود لائٹ جانے پر یو پی ایس چلاتی ہو۔ اے سی کمرے میں سوتی ہو۔ امریکن کچن میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر حکم چلاتی ہو اور میرے لیے تمہارے پاس پاتھیاں اور چٹھیاں ہیں۔ تم اپنے گھر میں ماربل پر وائپر پھیرتی ہو اور میں مٹی میں توڑی ملا کر فرش لیپوں... یہ تمہاری چوائس ہے میرے لیے... تم اپنے..."

"تم ایسا سوچتی ہو یمنی؟" آمنہ جیسے ہوش میں آئی۔ "یہ سب میں نے پسند کیا... یہ تو مجھے مل گیا۔ کرتے ہیں یہ سب... میں تو وہی آمنہ ہوں۔"

"تو جب مجھے ملنے لگا ہے تو تم رخنہ ڈال کر کیوں کھڑی ہو؟" وہ زہر خند لہجے میں اونچی آواز سے بولی۔

"تم واقعی... یہ تم بول رہی ہو یمنی؟ تم اتنی

آمنہ کی آواز دکھ سے بوجھل ہو گئی۔

"پینے کے لیے فریج کا ٹھنڈا پانی... بٹن کھول بند کر کے کھانا بنانے کی خواہش... ایک پکا فرش جس کو دھو کر کرسی ڈال کر بیٹھ جاؤ۔ چند آرائشی گل دان' کچھ جھولتی بیلیں۔ پلستر والی صاف دیوار پر سفید بے داغ چونا۔ یہ سطحیت اور مادیت ہے؟ یہ تو جائز ضرورتیں ہیں جو تمہارے بھائی کے ساتھ رہ کر کبھی پوری نہیں ہوں گی۔ اگر مجھے ایک روشن راستہ مل رہا ہے تو تم کیوں رکاوٹ ڈالتی ہو؟ اوہاں! نہیں تم یہ تو نہیں سوچتیں کہ میں تمہارے برابر آجاؤں گی۔ تمہاری ہم پلہ..."

"خدا کی قسم یمنی! میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم... تم ایسا بھی سوچ سکتی ہو۔" آمنہ منہ پر دوپٹہ رکھ کر رو پڑی۔

"اگر تم مجھے واقعی چھوٹی بہن سمجھتیں تو میرے لیے اچھا سوچتیں' مگر تم... میری تو ماں بھی زندہ نہیں۔ آج اگر وہ ہوتی۔" اسے اپنا پرانا جملہ یاد آگیا۔ "تم صرف اپنے بھائی کا سوچتی ہو۔"

"یمنی! بس کرو۔" آمنہ نے اپنے پورے جسم کی طاقت سے تھپڑ اس کے گال پر دے مارا۔ "بے شرم بے لحاظ! بیس سال کی زندگی اور اتنا زہر... میں تو ہر شے کو جوڑ رہی تھی۔ آنے والے وقت کو دیکھ رہی تھی۔ واقعی تو اس قابل ہے ہی نہیں کہ اعزاز جیسے بے لوث محبت کرنے والے شخص کی زندگی میں شامل کی جائے' چار چمکتی دیواریں اور ایک پکی چھت بھی سیمنٹ سے نہیں بنتی۔ وہ اعتماد کی ہوتی ہے۔ جس کے پیچھے تو لپک رہی ہے' وہ بچپن کی منگیتر کو چھوڑ کر تیری طرف آرہا ہے اور وہ مکان جو بظاہر خالی تھا۔ وہاں کوئی عورت مستقل نہیں ہے۔ وقتاً فوقتاً جو آتی ہیں۔ ہم نے اس دن جانے انجانے میں جا کر بہت بڑی غلطی کی...... جس جس نے دیکھا' نجانے کیا سوچا ہو گا' اور اگر تمہیں یہی سب چاہیے تو جاؤ! لے لو۔ میرے بھائی کی محبت سنبھالنے کے لیے تمہارا دامن بہت تنگ ہے۔ اور پیالے میں گنجائش برابر ہی چیز سما سکتی ہے۔ تم چلی جاؤ یہاں سے۔"

آمنہ نے ہاتھ لہرا کے اسے دروازہ دکھایا' جو گال پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ اور سن رہی تھی۔ آمنہ دونوں ہاتھ منہ پر جمائے اپنے رونے کی آواز کو روکنے کے لیے بے حال ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اعزاز لوٹ آیا تھا۔ دادی جی اس کی بلائیں لیتی نہ تھک رہی تھیں۔ آمنہ کے بارے میں دادی کے منہ ہی سے سنا۔ وہ دو چار روز میں آنے والی تھی۔ اس کا بچہ ڈیڑھ ماہ کا ہو چکا تھا اور اسے اب لمبے قیام کے لیے آنا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ابو جی کے گھٹنوں کو آرام تھا سو وہ کام پر جاتے تھے۔ شہباز کا اسکول بدل دیا گیا تھا' اور پڑھائی کے معاملے میں وہ بہت سنجیدہ تھا۔

تایا یعقوب یہاں پیغام ڈال کر خود عمرہ کرنے سعودیہ گئے ہوئے تھے اور بعد میں وہاں رہائش پذیر بیٹی کے ہاں رہ رہے تھے۔ ابا جی نے کہہ دیا تھا کہ یمنی کے لیے اعزاز ہے۔ اعزاز اور ظہور دونوں گھر کے بچے ہیں' مگر یہ بات پہلے سے طے ہے۔

تایا یعقوب نے تسلیم کیا' مگر مصیبت یہ تھی کہ ظہور ہر دس بارہ دن بعد ظہور پذیر ہو جاتا۔ وہ بڑی تابع داری سے دادی کے پلنگ پر بیٹھ جاتا اور زمانوں پرانے قصے سنتا۔ ڈھیروں کھانے پینے کے تھیلے لاتا۔ یمنی نے پہلی بار چاکلیٹس اور پزا کھایا... شہباز کو اس کے آنے سے خوشی ہوتی تھی۔

"یہ بڑی گاڑی میرے بھائی کی ہے۔" وہ کسی بچے کو نزدیک نہ آنے دیتا۔ ابو جی اور ابا جی نے اسے گھر کا بچہ سمجھتے ہوئے نظر انداز کر رکھا تھا اور وہ بھی بہت شرافت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ یمنی اس کے آگے پیچھے چائے پانی رکھتی۔ نجانے یمنی کے کس انداز سے ظہور نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اپنے ماحول سے متنفر ہے' فرار چاہتی ہے۔ وہ اسٹیج کا آخری فنکار ہے اور جس کے حصے میں صرف ایک اختتامی ڈائیلاگ ہے' مگر نتیجہ خیز... سارے ڈرامے کا نچوڑ وہ ایک جملہ ہے۔ وہ اسے

بظاہر بہت سرسری انداز میں اپنی بتاتا۔

"گھر میں یہ کام کروا رہا ہوں۔ ٹائلز کا رنگ بہتر نہیں تھا۔ میں نے بدلوانے کا سوچا ہے۔ یمنی! کون سا رنگ اچھا لگے گا؟ تم نے تو دیکھا تھا۔" یمنی کی آنکھوں میں لش لش کرتا گھر دوڑ جاتا۔

وہ گم صم اس کی شکل دیکھتی۔ وہ جیسے اپنے پھیلائے کھیل کو سمیٹ چکا تھا۔ اصلیت جان کر پیچھے ہٹ گیا تھا، مگر نہیں.... وہ سنار تھا اور دھیرے دھیرے چوٹ مار رہا تھا۔

یہ جھٹپٹے کا وقت تھا۔ روشنی اور اندھیرا ایک دوسرے سے گتھم گتھا ایک دوسرے کو ہرانے کے در پہ تھے۔ سورج کی پسپائی کا لمحہ بس آیا چاہتا تھا، جب صبح سے بے خبر سویا اعزاز اپنی بے پناہ سرخ آنکھوں پر پانی کے چھپاکے مار مار ٹھنڈا کرنے کے جتن سے فارغ چبوترے پر آگیا۔ اس کی دراز قامتی کمزوری کے باعث زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بخار میں مبتلا رہا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں اور اس کی جھلسی ہوئی رنگت شب دیجور کو شرماتی تھی۔ وہ چوکی گھسیٹ کر چولہے کے نزدیک آگیا۔

یمنی نے مدعا جان کر آگ سلگائی۔ کھچڑی اور یخنی گرم کرکے اس کے سامنے رکھی۔ چولہے پر چائے کا پانی رکھ رہی تھی، جب ظہور چلا آیا۔ وہ بہت اچھا تازہ فروٹ کیک لایا تھا۔ اعزاز کھڑے ہو کر گلے ملا۔ موڑھا لا کر دیا، مگر وہ چوکی گھسیٹ کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ یمنی نے چائے کا پانی چڑھایا۔ ظہور بہت بااعتماد تھا جبکہ اعزاز پرسکون اور محتاط... وہ بہت خوش دلی سے گفتگو میں شریک تھا۔

"بس سزا ختم.... حوالدار سے سب انسپکٹری مل گئی ہے۔ اب ونگ میں جوائننگ ہوگی۔ ابھی تو چھٹی پر آیا ہوں۔ رپورٹ کرنی ہے مگر بخار آگیا۔" اس کی آواز میں نقاہت تھی۔

"بہت مشکل زندگی ہوتی ہے یہ پولیس، فوج کی۔ ہمارے عیش ہیں، نائن ٹو فائیو کی جاب، پھر فارغ۔" اس نے تکبر سے ہاتھ جھاڑے۔

"فوجی اتنی مشکل زندگی نہ گزارے تو بینک چھو... ایک موچی جوتا بھی نہ گانٹھ سکے۔ فوجی اپنا سکون تیاگ کر نائن ٹو فائیو کو ممکن بناتا ہے۔ مشینوں کے ... پیٹرول سے نہیں، اپنے محافظوں کا خون پینے کے بعد چلتے ہیں۔"

اعزاز نے بے حد سکون سے طمانچہ رسید کیا۔ اس نے آنکھیں چندھی کرکے اعزاز کو بغور دیکھا۔

"تم ناراض ہوگئے یار....!"

"نہیں.... ہمیں سکھایا جاتا ہے اور ہم نے اپ... تجربے سے تسلیم کیا ہے۔" وہ بہت سادگی اور یقین سے بولا۔

یمنی خاموش رہی۔ اس نے آگ ٹھنڈی کر... ہوئے ایک نظر دونوں کو دیکھا۔ ظہور نے سفید کلف لگا سوٹ، سنہری چوڑی گھڑی باندھ رکھی تھی۔ ... جوتے۔ کپ پکڑے اس کے ہاتھ بہت صاف ... اور چمکیلے تھے۔ یمنی کو بخوبی اندازہ ہوا کہ وہ روئی ... طرف نرم ہوں گے۔ دوسری جانب اعزاز تھا۔ اس ... انگلیوں کی گانٹھیں سیاہ ترین تھیں، نسیں نمایاں ابھ... ہوئی... ظہور کا ہاتھ گوشت سے پُر تھا جبکہ یہاں ... پنجے پر تھیلی چڑھا کر کس دی ہو۔ یہ جفاکش مضبو... نگہبان ہاتھ تھے۔ پتا نہیں کیوں اپنی تمام منفی سو... سے پرے یمنی کو وہ سیاہ ہاتھ قابل اعتبار لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

پشت جڑے بچوں کی طرح وہ ساتھ ساتھ تو ... مگر ایک دوسرے سے منہ موڑے۔ ننھے عدیم ... سب کو اتنا مصروف کر دیا تھا کہ یہ نظارہ ماسوائے ... کے کوئی نہ دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش تھا، اور ... ضرورتاً" مخاطب کرتا جیسے کچھ ہوا نہیں۔ آمنہ کو ... کو لمبے لمبے خط لکھنے کا جنون تھا اور ہر بات زیر ز... کے ساتھ اس کے علم میں تھی۔ اس نے آمنہ ... شرم دلانے پر بہت سکون سے کہا۔

"میں سخت جان ہوں۔ پہاڑ توڑ کر دودھ نکال... ہوں، مگر پہاڑ سے سخت چیز دل ہوتا ہے۔ لعل...

انگارے ایک ہی طشت میں رکھے ہوں تو نا سمجھ ہاتھ بڑھانے میں غلطی کر جاتے ہیں۔"

"تو تم مانتے ہو، وہ انگارے پکڑے گی؟" آمنہ بھونچکی رہ گئی۔ "تم اسے روکو گے نہیں؟"

"نہیں۔ وہ ہم سے متنفر ہو چکی ہے۔ ناراضی گرہ کی طرح ہوتی ہے۔ بندہ کھولتے کھولتے کھول لیتا ہے۔ شک قینچی ہوتا ہے، کاٹ دیتا ہے۔ میں زبردستی کا قائل نہیں۔ ظہور فطرتاً" فلرٹ.... اسے ہر چیز فرمائش کرنے پر مل گئی ہے۔ وہ یمنی کو بھی چیز سمجھ کر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اخبار میں اشتہار دینے جا رہا ہوں۔ ماسی پڑوسن کے بیٹے نے جب تک دبئی سے آنا ہے، پھر سودا کرنا ہے، دیر ہو جائے گی۔ میں پورا پلاٹ بیچنے کی بات کروں گا، پھر جو حصہ ملے قسمت۔ اب فیصلہ کر لیا ہے تو عمل در آمد بھی تو کرنا ہوگا ناں...."

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ آمنہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ دور چھت پر یمنی کے کھلکھلانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ آمنہ کے بیٹے سے کھیلتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

"اعزاز ٹھیک کہتا ہے۔ وہ ہم سے متنفر ہو چکی ہے۔ اے اللہ! تو دلوں کے حال سے بخوبی واقف ہے۔ ایسا کچھ کردے کہ سب ٹھیک ہو جائے۔"

وہ گڑگڑا کر اللہ سے مدد مانگنے لگی۔ "اگر ایسا ہی رہا تو پہلے مرحلے پر اس نے انسانوں پر سے اعتبار کھویا۔ اگلے پر توکل بھول جائے گی، یعنی آگے پھر گڑھے ہی گڑھے ہیں۔ یا اللہ! اسے یقین دلا دے کہ ہم وہی ہیں۔ اس کا بھلا چاہنے والے۔ اس سے محبت کرنے والے اے اللہ...."

☼ ☼ ☼

"ہمارے گھر میں پسند ناپسند سے زیادہ گھر والوں کی صحت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ دادی جی دل کی مریض، ہائی بلڈ پریشر اور معدہ گڑبڑ ہے۔ ابا جی کو شوگر ہے۔ چاچو کو گٹھیا ہے۔ تو باقی بچے ہم تین افراد۔ طوعاً" وکرہاً" وہی کھاتے ہیں جو ان سب کے حساب سے پکے، جیسے آٹے میں نمک نہیں ڈلتا، جبکہ ہمارے لیے پھیکی روٹی مشکل ہے اور فریج چونکہ نہیں ہے اس لیے آٹے کو گوندھ کر بھی نہیں رکھ سکتے سو وہی کھاتے ہیں، کریلے بہت بنتے ہیں، ٹھنڈی تاثیر کی چیزیں نہیں بناتے کہ چاچو کو تکلیف ہوتی ہے۔ گنجائش نہ ہونے کے باوجود بکرے کا گوشت بنتا ہے جی۔ مسالہ جات بھی ہلکے رکھتے ہیں۔ تیل کم، پسند ناپسند، غذائیت ان سب سے بڑھ کر پرہیز اہم ہے۔

اچانک مہمان والی بات مشکل ہے۔ دادی جی کی ملنے جلنے والیاں ہمسائی تھوڑی دیر بعد آتی رہتی ہیں۔ گرمیوں میں نمکین لسی اور سردیوں میں ایک ایک کپ چائے۔ ہاں مگر کھانے والے مہمان اگر آئیں تو سب سے پہلے ہم گیس کا چولہا استعمال میں لاتے ہیں روٹین کا کھانا لکڑیوں، پاتھیوں (گائے کے گوبر سے بنتی ہیں۔) پر بنتا ہے ناں۔ مرغی کا سالن۔ پھر توی رکھ کے میں اور یمنی جلد از جلد روٹیاں ڈالتے ہیں۔

توی آپ کے قارئین کی دلچسپی کے لیے بتاؤں تو ایک بڑے سائز کا توا ہوتا ہے، جس میں یمنی آگ ڈالتی جاتی ہے۔ میں توے پر دو دو روٹیاں، پھر یمنی گز بھر لمبے چمٹے کو توی کے نیچے گھسا گھسا روٹیاں سینکتی جاتی ہے۔ مہمان کو مرغی کا گوشت کھلاتے ہیں۔ ترکیب تو کوئی خاص نہیں ہے۔ سیدھا سیدھا مرغی کا گوشت دہی ڈال کر گاڑھا مسالہ بنا کر بھون لیں۔ دوسرے ڈونگے میں کلو دہی۔ بعد میں گرما گرم چائے۔ وہ اس سادہ خوراک پر بھی نقد بیس روپے سے لے کر سو روپے تک دے کر جاتے ہیں۔ دعاؤں کا مول اب کیا لگاؤں، البتہ بعض مہمانوں کو جو جیسے کی بنیاد پر جو دال دلیہ ہو، پیش کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ ہمارے مہمان بھی کھانا پکنے کے انتظار کے اپنے گھر میں عادی ہوتے ہیں، سو وہ صبر شکر سے انتظار کرتے ہیں، بلکہ اگر عورتیں ہوں تو وہ ہانڈی بھوننے میں مدد کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیتی ہیں۔ پتا نہیں لگتا مہمان کون سی والی ہیں۔

کچن کی صفائی کا اہتمام۔ دراصل ہمارے گھر میں باقاعدہ کچن نہیں ہے۔ (آپ حیران نہ ہوں۔ ہمارا کچن

پاکستان کے تمام دیہاتی کچنز کا نمونہ ہے۔ یہ زمین سے ڈیڑھ فٹ اونچا ایک چبوترہ ہے جسے مٹی اور توڑی (سوکھا بھوسا) ملا کر لیپ دیا گیا ہے یہاں مٹی کے دو چولہے لگے ہیں۔ جن میں لکڑی جلائی جاتی ہے یا دوسری چیزیں۔ یہاں مستقل کچھ نہیں رکھا جاتا۔ ہم کھانا بناتے وقت سب سامان اسٹور سے اٹھا کر لاتے ہیں اور کام مکمل ہوتے ہی کپڑے سے پونچھ کر ڈبے واپس اندر۔ دراصل اڑتی کالی راکھ ہمارے منہ اور کپڑوں سمیت ہر شے پر پڑتی ہے۔ برتن کھرے میں نلکے کے نیچے بیٹھ کر دھوتی ہیں اور خشک کر کے ٹوکرے میں الٹے جما دیتی ہیں پھر ململ کے کپڑے سے ٹوکرا ڈھک دیتی ہوں۔ جب بھی لیپا ہوا فرش خراب ہو جائے تو مٹی ڈلوا کر بھائیوں سے بنوا کر میں خود ہی فرش لیپ لیتی ہوں (جیسے شہروں میں مزدور سیمنٹ کے فرش پر نیرو پھیلاتے ہیں۔ یہ فرش دو دن میں استعمال کے قابل ہوتا ہے اور اس میں جھاڑو پھیر دی جاتی ہے۔) یہاں کی صفائی کے لیے سب سے ضروری ہے کہ چولہوں سے راکھ لازماً نکال کر پھینک دی جائے تاکہ نئی لکڑی کی جگہ بن سکے۔ کھانے پینے کی تمام اشیا ڈھک کر رکھی جاتی ہیں برتن چونکہ کالے بے پناہ ہوتے ہیں تو انہیں مانجھنا اہم ترین کام ہے۔ مٹی بہت اڑتی ہے۔ چولہے کھلے صحن یا کھلی چھت پر بھی بنائے جاتے ہیں اس لیے کہ دھواں کھلے میں پھیل جائے۔ بند کچن میں خواہ چمنی ہو' دھواں بھر جاتا ہے۔ البتہ اسٹور میں جہاں میں نے سلنڈر لگوا رکھا ہے (چائے یا جھٹ پٹ کاموں کے لیے) اس کی صفائی بہت دل لگا کر کرتی ہوں۔ سلنڈر کو صاف ستھرا اور احتیاط سے رکھنا ضروری ہے ورنہ یہ پھٹ جاتے ہیں۔

چونکہ دادی جی نے مرغیاں پال رکھی ہیں تو انڈا لازمی ہے۔ ابلا ہوا' تلا ہوا (جلا ہوا) ساتھ پراٹھے اور اچار۔ گھر پر دادی کے ہاتھ کا بنا ملی جلی سبزیوں کا اچار نہ صرف ناشتے بلکہ ہمارے ہر کھانے کا لازمی حصہ ہوتا ہے۔ شروع میں اچار میں صرف کیری' مرچ' لسوڑے اور مرچیں ہوتی ہیں' مگر بعد میں اس میں کریلے' گوبھی' گاجر اور پھلیاں شامل ہو جاتی ہیں۔ جب کبھی بھائی چھٹیوں پر آئیں تو حلوہ بناتی ہوں اور سفید چنے کا سونف والا سالن۔ گرمیوں میں لسی اور چائے بھی لازمی ہے۔ مجھے اور یمنیٰ کو آنکھ کھلتے ہی چائے چاہیے۔

باہر کھانا کھانے کا کوئی تصور نہیں۔ جب ہم بازار شاپنگ پر جاتے ہیں تو پہلے سموسے' پھر چھولے' دہی بھلے اور بعد میں ایک ایک ٹھنڈی بوتل' کبھی کبھار فالودہ بھی کھا لیتے ہیں۔ ہاں ایک بار پھوپھو کی فیملی کے ساتھ ہیڈ سلام پر پکنک پہ گئے تھے۔ تلی ہوئی مچھلی کھائی تھی۔ بہت زیادہ مزے دار تھی۔

موسم کو مدنظر رکھتی ہوں۔ لیکن شدید بارش میں جب چولہے بھیگ جاتے ہیں' تب ہم پکوڑوں کے بارے میں سوچتے رہ جاتے ہیں۔ دو دن بعد جب سورج ہر شے سکھا جاتی ہے تو یمنیٰ اور چھوٹا بھائی شہباز یاد دلاتے ہیں کہ ہم نے پکوڑے نہیں بنائے' پھر ہم تینوں دھوپ میں چولہے کے پاس بیٹھ کر پکوڑے کھاتے ہیں اور تلافی کرتے ہیں۔ ہاں! برسات میں گڑ والے چاول بناتے ہیں۔ البتہ گرمیوں میں رائتوں سے کام چلاتے ہیں۔ آلو کا رائتہ' کدو کا رائتہ' بینگن کے بھرتے پر دہی کی تہہ جماتے ہیں۔ دوپہر میں اگر روٹی کھائی جائے (شدید گرمی میں دل نہیں کرتا) تو رائتے بلکہ میں اور یمنیٰ روٹی ہاتھ پر رکھ کے اچار رکھ کے کھا لیتے ہیں۔

ایڈیٹر صاحبہ! محنت بغیر کوئی کام اچھا نہیں ہوتا اور ہمارے ہاں تو کھانا پکانا ایک مشقت طلب کام ہے۔ مسالے پیسنے کے لیے مشینیں نہیں ہیں۔ کونڈی ڈنڈا' چاٹی میں لسی بنانا اور پھونکنی سے آگ جلانے کی مشقت۔۔۔ آنکھوں اور ناک سے خوب پانی نکلتا ہے۔ میں بھائی اعزاز کے لیے سردیوں میں گاجروں کے حلوے اور گرمی میں کدو کا حلوہ ضرور بناتی ہوں۔ کدو کھیت سے منگواتی ہوں۔ میرے پاس شہری اچھی نئی ترکیبیں تو نہیں' بس یہی لکھ رہی ہوں۔ ابھی چند دن پہلے بنایا تھا۔

کدو — پانچ کلو (کدوکش کرلیں)
(کچھ لوگ باریک کاٹ کر بعد میں گھوٹنے سے گھوٹ لیتے ہیں)
چینی — دو کپ
گھی دیسی — ایک کپ بھرا ہوا
کھوپرا — ایک کپ (کدوکش کیا ہوا)
الائچی — پانچ دانے
ملائی — دو پیالی
بادام میوے — آپ کی اپنی مرضی ہے

کدو بہت پانی چھوڑتے ہیں' اس لیے پاس کھڑے رہ کر پانی خشک کریں اب ملائی ڈال دیں الائچی کے ہمراہ اور آدھی رات تک پکنے دیں (میں ایسے ہی پکاتی ہوں) صبح اذانوں کے وقت گھی اور چینی ڈال کر بھوننا شروع کریں۔ پانی خشک ہو کر گھی اوپر آجائے' خوشبو آپ کے پڑوسیوں کے گھر جائے گی (آپ کی پڑوسن چھت سے جھانک جو رہی ہے) بس' حلوہ تیار۔۔۔ مغزیات ڈال کر پیش کریں۔ اس حلوے کو بہت محنت سے بھونا جائے گا۔

کچن ٹپ تو شاید میرے پاس نہ ہو مگر گنے کا رس نکلنے کے بعد بچنے والا پھوک زبردست ایندھن ثابت ہوتا ہے (یہ شہری قارئین کے لیے بے کار ٹپ ہے) ہاں! دو تین آئیڈیے ہیں۔ گوشت کے نام پر گوشت آلو ہی بنتے ہیں۔ مرغی آلو شوربہ' گائے کا گوشت آلو شوربہ تو میں یہ کرتی ہوں کہ ایک دن پیاز براؤن کر کے مسالا بنا کر گوشت ڈالتی ہوں۔ ایک دن سب کچھ اکٹھا ڈال کر بعد میں گھی ڈال کر بھون لیتی ہوں۔ ذائقے میں بہت فرق پڑتا ہے۔ کبھی شوربے میں صرف پسا ہوا گرم مسالا چھڑکتی ہوں۔ اگلے دن ہرا دھنیا اور اس سے اگلی بار ذائقہ بدلنے کو ہانڈی اتارنے کے بعد شوربے میں سوکھی میتھی ہاتھ سے مسل کر چھڑک دیتی ہوں۔ اس طرح ایک ہی سالن مختلف ذائقوں میں بدل جاتا ہے۔

دادی جی کی سخت ہدایت پر ہم سر ڈھک کے کھانا پکانے کے عادی ہیں اس لیے کبھی بال آنے کی شکایت نہیں ملی۔ آپ بھی ایسا کریں۔

ایڈیٹر صاحبہ! میری بہن نے مجھے چیلنج کیا ہے۔ "آپ کا باورچی خانہ" میں میرے کچن کی کہانی شائع نہیں ہو سکتی بلکہ میں بھیج بھی نہیں سکتی کہ بتانے کو ہے ہی کیا' مگر میں خود کو تسلیم کرتے ہوئے' اپنی چیزوں کو بخوشی اپناتے ہوئے حرف بہ حرف سچ لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ میرا دیہاتی بیک گراؤنڈ میرے لیے شرمندگی کا باعث نہیں کہ اسے لوگوں سے چھپاتی پھروں۔ امید ہے اتنے بہت سارے الگ الگ ماحول والے کچن میں آپ سب کو میرا کچن پسند آیا ہوگا۔ شکریہ

آمنہ مطلوب میلسی موضع

نیچے آمنہ کی تصویر تھی' جو اعجاز نے اس کی شادی سے کچھ روز پہلے کیمرہ ٹرائی کرتے ہوئے کھینچی تھی۔ وہ چولہے کے پاس بیٹھی کیمرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتماد سے مسکرا رہی تھی۔

یمنیٰ نے ناک سکیڑی۔ اسے پتا چلا۔ اس کے بہتے آنسو ٹھوڑی سے گرتے گریبان کو بھگو چکے تھے۔ اس نے پلکیں جھپکیں تو دو قطرے ڈائجسٹ کے ورق پر گرے۔ اس نے سرعت سے ہاتھ پھیر کر خشک کرنے کی سعی کی۔ باہر آج پھر ظہور آیا بیٹھا تھا۔ اعزاز' شہباز' آمنہ اور دادی جی وہ پھونکنی استعمال کرتے ہوئے کھانستے کھانستے بھی زور زور سے ہنس پڑتی۔

یمنیٰ دوپہر سے اپنے پسندیدہ ناول کی قسطیں پڑھنے کمرے میں بند تھی۔ ڈائجسٹ بند کرتے ہوئے یونہی اسے شائبہ ہوا کہ وہاں آمنہ جیسی لڑکی کی تصویر ہے۔ اس نے دیکھا' وہ آمنہ ہی کی تصویر تھی اور پھر۔۔۔

☼ ☼ ☼

آمنہ ٹھیک کہتی تھی۔ اسے خود سے جڑی ہر شے سے پیار تھا' فخر تھا۔ اس کے لیے کوئی چیز شرمندگی کا باعث نہیں' جو چھوٹی چھوٹی چیزیں یمنیٰ کے لیے زندگی موت کا مسئلہ تھیں' وہ آمنہ چٹکیوں میں اڑا دیا کرتی تھی۔

اسے چیلنج کرتے ہوئے یمنیٰ کے پیش نظر دو باتیں

تھیں۔اول آمنہ کبھی ہمت ہی نہیں کر سکے گی کچھ بیان کرنے کی اور اگر کیا بھی تو لپیٹ لپاٹ کر (انگلی نے کھو کھول کر بخیے ادھیڑے تھے مگر بہت خوشی و فخر سے)

دوئم اسے یقین تھا کہ ایڈیٹر کاغذوں کو گولا بنا کر پھینک دیں گی اور پھر وہ آمنہ کو تن کر کہے گی۔ اصل میں تمہیں خود شرمندگی ہے کہ کیا لکھوں کیا چھپاؤں۔ کہنے اور کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ اگر یہ طرز زندگی اتنا قابل فخر ہے تو تم نے لکھا کیوں نہیں۔ اور دیکھو! تم نے لکھ لیا۔ ایڈیٹر پاگل نہیں تھیں کہ اسے شائع کرتیں۔ مگر اس کے دونوں اندازے غلط ثابت ہوئے۔ ایڈیٹر نے سلسلے کے اختتام پر بریکٹ میں تعریفی جملہ لکھا تھا۔ قارئین! ہمارے ملک میں ستر فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم ان کے مسائل اور زندگی گزارنے کے اسٹائل سے کتنے ناواقف ہیں۔ بہن آمنہ مطلوب کا یہ باورچی خانہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ ملک کی بیشتر آبادی کی نمائندگی کی ہے۔ ہمیں یقین ہے آپ کو پسند آیا ہوگا۔)

"تو کیا واقعی میں غلط ہوں؟" وہ کنپٹیاں مسلنے لگی۔ اور یہ تو یقین ہے کہ یہ آمنہ نے شادی کے بعد اپنے گھر سے بیٹھ کر لکھا ہے کیونکہ تصاویر تقریباً" ایک ماہ بعد آئی تھیں اور اعجاز خود دے کر آیا تھا۔ وہ یادداشت کو ٹٹولنے لگی۔

"تو کیا میں ہر بات میں غلط ہوں؟" وہ محاسبہ کر رہی تھی۔ "اور... اور میں نے آمنہ کو کتنا غلط کہا۔ کتنی بدتمیزی کی اور وہ ایک لفظ نہیں بولی۔ کیا وہ واقعی مجھے اپنی بہن اور عدیم کی جگہ سمجھتی ہے اور اتنا تو میں مان ہی سکتی ہوں کیونکہ میرے اپنے سامنے کی مثالیں ہیں۔ چاچے، تائے کی بیٹیوں کا آپس میں اٹ کتے دا ویر ہوندا اے (اینٹ کتے کا بیر) حسد، غصہ، نفرت اور آمنہ کو مجھ سے کیا فائدہ ہے؟ اس بات میں کوئی کلام نہیں۔ اعزاز کے لیے آمنہ جس لڑکی پر ہاتھ رکھے گی گلے سر کے بل دینے آجائیں۔"

شادی کے بعد جب محرم میں آمنہ رہنے آئی تو دادی جی بچوں کو کوس رہی تھیں جو ان کے پلنگ پر اچھل اچھل کر اسے ڈھیلا کر گئے تھے اور اب ان کی کمر دکھتی تھی۔ آمنہ نے دبکے کے کام سے بوجھل دوپٹہ تار پر ڈالا اور آستینیں چڑھا کر منجھی کسنے لگی۔ ایک ٹانگ زمین پر دوسری پلنگ کے اوپر۔ وہ اپنا پورا زور لگا لگا کر مگن تھی۔

پھر جانے سے پہلے وہ یمنی کے ساتھ بیٹھ کر چھٹیوں کا ڈھیر ٹھکانے لگواتی رہی۔ جب شادی شدہ عملی زندگی میں قدم رکھا تو تب بھی وہ لپک لپک کر ادھر آتی اور جاتے وقت ہچکیوں سے روتی۔ اس کے گھر میں گرمی شروع ہوتے ہی اے سی لگ گیا تھا۔ عظیم کا کاروبار ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ وہ یہاں لائٹ جانے پر لکڑ فین (لکڑی کا پنکھا) دھیرے دھیرے جھلتے ہوئے نیند میں جاتی۔ پھر گرمی لگتی تو ہڑبڑا کر دوبارہ پنکھی جھلتی پھر نیند کا غلبہ، پھر ہڑبڑا کر اٹھنا۔

اس کے کسی انداز سے نخرہ یا اتراہٹ نظر نہیں آتی تھی۔ اس کی موجودہ زندگی قناعت صبرو شکر اور توکل کا انعام بھی تو ہو سکتی تھی۔

یمنی نے بارہا سوچا کہ وہ خواب جو اس نے خود سے ہی چھپا کر دل کے نہاں خانوں میں غائب کر رکھے تھے وہ عملی تعبیر بن کے آمنہ کو کیسے مل گئے۔ "اگر مجھے سب مل جاتا تو... تو شاید میں آپے سے باہر ہو جاتی۔" اس نے پہلی بار اپنا صحیح تجزیہ کیا۔ "چھوٹا بچہ اپنی ماں کے بھروسے پر جب ٹھہر ٹھہر کر چلنے لگتا ہے تو اسے اپنے چلنے سے زیادہ یقین ماں کے ہاتھ کی پکڑ پر ہوتا ہے کہ وہ گرنے لگے گا تو کوئی فکر نہیں، ماں ہے ناں اور ماں بچے کو کبھی گرنے نہیں دیتی۔ اور ماں کے پیار سے ستر گنا زیادہ پیار اللہ اپنے بندے سے کرتا ہے تو پھر میں اگر اس پر بھروسا کر کے ڈرتے لڑکھڑاتے اس کا ہاتھ تھام کر قدم بڑھاتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مجھے گرنے دیتا۔ میری نیت کا کھوٹ، یقین کی کمی، میری بے سوچیں، میرے شکوک سے پرے، اللہ اپنا کردار نبھاتا، وہ میرا ہاتھ کبھی نہ چھوڑتا۔ وہ مجھے کبھی گرنے نہیں دیتا۔ خود احتسابی کا یہ عمل... سامنے بلیک اینڈ وائٹ تصویر... باہر سے آتی زندگی سے بھرپور، طمانیت سے لبریز پر اعتماد ہنسی کی آواز...

اس کے دل و دماغ پر چھایا کہر، بے خبری کی چادر جیسے سرک رہی تھی۔ "میں... میں اور بس میں... میں تنہائی اکیلے پن کا نشان... "میں" کوئی نہیں دیکھ پاتا۔ "ہم" بہت سارے ہوں تو دنیا بدل دیتے ہیں۔ نہ میں کسی کے ساتھ کھڑی ہوئی اور نہ کسی کو کھڑا ہونے دیا۔ اور آمنہ نے اپنے دونوں بازو پھیلائے ہوئے تھے اور ان کے حلقے میں وہ دادی جی، ابو، چچا، بھائی، بہن اپنے گردو پیش کے ہر بندے کو لیے کھڑی تھی۔ اللہ مجھ اکیلی کو دیکھیں گے جبکہ میں ناشکری ہوں اور اللہ کو یہ پسند نہیں۔

وہ آمنہ کو دیکھیں گے، وہ ہر قیمت پر آمنہ کو دیکھیں گے جو سب کے لیے فکر مند ہے۔ جو گھر کے چھتے سے اترا اصلی کمیاب شہد دادی سے چھپا کر پڑوس کی ایک آنکھ سے اندھی بکری کی آنکھوں میں اس امید پر لگا دیتی تھی کہ شہد سے بینائی تیز ہوتی ہے۔

وہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ پاؤں اوپر کر لیے اور بازوؤں کے حلقے میں سر گھسا کر پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ اس کا جسم جیسے جھکڑوں کی زد میں تھا۔ وہ پھر جیسے رو رو کے تھک گئی۔ نجانے کتنی دیر سے کرسی پر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔ چارپائی پر لیٹ گئی۔ دوپٹا پھیلا کر سر تا پا ڈھانپ لیا، اس کی اتنی لمبی غیر موجودگی باعث تشویش نہیں تھی۔ نیا رسالہ آنے پر وہ اسی طرح غائب ہو جاتی تھی۔ وہ اب کل شام آنے والی فون کال کا سوچ رہی تھی، جو ظہور کی بڑی بہن نجمہ کی تھی۔

"ہم نے تو یہی سنا تھا کہ تمہاری اور اعزاز کی بات طے ہے، بلکہ ابا جی نے آکر کہہ دیا، ظہور کا رشتہ جہاں طے ہے، وہیں شادی کی تاریخ لو، مگر وہ کہتا ہے کہ تم ہی منع کرے گا۔ کیا تم نے کوئی امید دلائی ہے؟"

وہ بہت سادہ مگر الجھن بھرے انداز میں پوچھ رہی تھیں، مگر امید دلانے والے جملے پر یمنی اچھل پڑی۔

"کیا مطلب... کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟"

"وہ کہتا ہے۔ یہ بڑوں کا فیصلہ ہے مگر یمنی کو پسند نہیں۔"

"ہم... میری ان سے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ مہمان بن کے آتے ہیں۔ ہمارے گھر میں اور کوئی ہوتا نہیں تو دادی جی خوش ہوتی ہیں۔ ہم انہیں عزت دیتے ہیں بس۔" یمنی کی حیرانی دوچند تھی۔

"دیکھو یمنی! میں نے تمہیں کوئی دس سال پہلے دیکھا تھا، تب تم چھوٹی بچی تھیں۔ اب ظاہر ہے جوان لڑکی ہو۔ میں یہاں اتنی دور سعودیہ میں ہوں مگر مجھے علم ہے، ماموں کی بیٹی جو ظہور کی منگ ہے، گوری چٹی آٹھ جماعت پاس، مگر بہت موٹی لڑکی ہے۔ یہ کہتا ہے مجھے موٹی عورتیں پسند نہیں۔ وہ پینڈوؤں کی طرح بولتی ہے۔ دیہاتی پچ ہے اس کے اندر۔ ارے بھئی! جب دیہات میں رہے گی تو دیہاتی پچ بھی رہے گا۔ تمہاری تعریف کرتا ہے۔ تم بہت اسمارٹ ہو۔ دبلی پتلی۔ اس نے میرے دیور سے کہا، اس کا فگر قیامت ہے۔ تم کیا گلے میں دوپٹا ڈال کر گھومتی ہو؟"

وہاں اب ہلکا طنز اور گہری کھوج تھی۔

"کک... کیسی باتیں کرتی ہیں؟" یمنی کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے غیر ارادی طور پر خود سے لپٹے دوپٹے کو مزید لپیٹا تھا۔

"وہ کہتا ہے، یمنی اپنے ماحول سے متنفر ہے۔ وہ اعزاز کو پسند نہیں کرتی۔ بلکہ وہ تو یہ بار بار کہتا ہے، اعزاز اس قابل ہی کہاں کہ اسے یمنی جیسی لڑکی ملے۔"

اس نے بمشکل اپنے غصہ کو قابو کرتے ہوئے کہا۔ "پہلی بات اتنے سالوں کی خود ساختہ لڑائی کے بعد کی صلح ہم سب کو اچھی لگی ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر دادی کو ان کا آنا ڈھارس دیتا تھا۔ وہ تنہائی کا شکار، بولنے کی شوقین عورت ہیں۔ اور آپ کے گھنے میسنے بھائی نے اس چیز کا فائدہ اٹھایا۔ نمبر دو ایک بندہ روز روز آئے گا تو بات کرنی پڑتی ہے۔ اب جب وہ کوے کی طرح کان کھائے گا کہ یہ اور وہ... میرا گھر ایسا میرا گھر

ویسا تو دل چاہے نہ چاہے' رائے تو دینی پڑے گی۔ میں نے تو بھائی سمجھ کر گھر میں گھسایا تھا' مجھے کیا خبر تھی کہ وہ اس طرح بہنوں کی کمر ناپتا پھرے گا۔ ہم بہنیں تو دادی کے حکم کے مطابق چوبیس گھنٹے ایسا لگتا ہے جیسے نماز پڑھنے جارہی ہوں۔ اس نے اتنی آرپار ایکسرے جیسے ڈیلے کہاں سے فٹ کروالیے یا پھر بچپن سے گھر میں اپنی بہنوں کے بازو' کمریں ناپنے کا عادی ہے؟"

نجمہ باجی کو یوں لگا جیسے کان کے ساتھ موبائل کی جگہ تیز گرم استری لگی ہو۔

"آپ بتائیں گی تو اسے یقین نہیں آئے گا۔ میں نے ریکارڈنگ کا بٹن آن کرلیا تھا۔ یہ تحفہ میں اسے خود دوں گی۔ خدا حافظ۔"

اس نے تو یہ سوچ رکھا تھا کہ اس کی سوچیں اس کی دسترس میں ہیں۔ ان پر کسی اور کی رسائی نہ ہوگی۔ "یا میں اتنی ہلکی ہوگئی ہوں یا اگلا اتنا گھاگ تھا کہ اس نے اتنے اندر کی بات جان لی۔ میں نے تو اسے کبھی نہیں کہا کہ میں کیا حاصل کرنا چاہتی ہوں' کیا چھوڑ دینا۔"

سر دکھ گیا مگر اس سوال کا جواب نہ ملا۔ اسے خبر نہیں تھی' گفتگو قد آدم آئینہ کی طرح ہوتی ہے۔ نہ صرف معنی بتاتی ہے' بلکہ تشریح بھی کرتی ہے۔ کلام' انعام کی طرح ہوتا ہے جیسا کہا گیا' ویسا پالیا۔ جب ہم کسی ایک چیز کے بارے میں مسلسل سوچتے ہیں تو دراصل اپنی ذات کی چادر میں چھید کردیتے ہیں۔ لاکھ چھپائیں مگر اندر کہیں نہ کہیں سے جھلک دکھلا ہی جاتی ہے۔ سوچیں قلعے کی طرح ہوتی ہیں اور زبان اس قلعے کی سب سے کمزور اینٹ۔ یہ جگہ چھوڑ دیتی ہے' پھسل جاتی ہے' سربستہ راز اس زبان کی لغزش سے زباں زدعام ہوجاتے ہیں۔

اس کے دل ودماغ کی انتہائی گہرائیوں میں چھپی سوچوں' خیالات تک ظہور کی رسائی اسی زبان کے طفیل ممکن ہوئی تھی۔

وہ خوب ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھو کر کچن چبوترے تک چلی آئی۔ اعزاز چارپائی بُن رہا تھا۔

"ڈائجسٹ پڑھنے میں اتنی مگن تھیں' آئے گئے کا پتا نہیں۔"

ظہور نے گہری نگاہ سے اسے دیکھا۔ یمنی نے چادر میں خود کو محفوظ محسوس کیا۔

"آمنہ نے آپ کو چائے پانی پوچھ تو لیا۔" اس نے جیسے اوقات بتائی۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک۔" وہ محظوظ ہوا۔

"سورج ڈھلنے کے بعد کون چارپائی بُنتا ہے؟" اس نے اعزاز کو مخاطب کیا۔ اس کے ہاتھ سے گولہ چھوٹ گیا۔

"ساری صبح بنالی تھیں بس اب یہ دو ہی رہ گئی ہیں۔" شہباز نے جواب دیا۔ "یہ میری چارپائی ہے۔ میں آج اس پر ہی سوؤں گا۔"

"یہ اتنے ڈھیر سارے آم۔۔۔؟" وہ ٹوکرے کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ میں لایا ہوں۔ خریدنے کی ضرورت ہی نہیں۔ دوست کے باغ کے ہیں۔ ذرا چکھو' ایسا ذائقہ کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔" وہ پریقین تھا۔ یمنی نے ہاتھ بڑھا کر آم ہونٹوں سے لگالیا۔

"نہیں' آپ کی غلطی فہمی ہے۔ یہ آم تو بہت ہی کھٹا ہے۔" اس نے آم ہاتھ سے رکھ دیا۔ آمنہ کا پیڑے بناتا ہاتھ رک گیا۔ یمنی کا انداز جارحانہ تھا۔

"دو۔۔۔ دوسرا ٹرائی کرو۔" یمنی نے فوراً عمل کیا۔

"یہ کڑوا ہے۔" اعزاز اور شہباز تعجب سے دیکھ رہے تھے۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟" ظہور نے لپک کر خود ٹرائی ماری۔

"یہ۔۔۔ یہ تو بہت لذیذ اور میٹھے آم ہیں۔" اس نے حیرت سے یمنی اور پھینکے جانے والے آم دیکھے۔

"ضروری نہیں کہ جو چیز آپ کو لذیذ اور میٹھی لگے' وہ دوسروں کو بھی لگے۔" اس کا انداز جتاتا ہوا' چبھتا ہوا تھا۔

"اٹھو آمنہ! میں روٹی بنالیتی ہوں۔" آمنہ نے اپنے ہاتھ دیکھے' وہ سارے پیڑے بناچکی تھی۔

"جاؤ تم۔" وہ سر پر کھڑی تھی۔ آمنہ کچھ نہ کہتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ اب یمنی اور ظہور آمنے سامنے تھے۔ درمیان میں چولہا۔۔۔۔

"میرے پاس جو فون ہے وہ دراصل دادی جی کا ہے۔" یمنی نے بغیر کسی تمہید کے ظہور سے بات کرنی شروع کردی جو ناقابل فہم نگاہوں سے یمنی کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کررہا تھا (کیا یہ مجھ سے فون گفٹ مانگنا چاہتی ہے' دل خوش فہم کی امید)

"تو جب بھی ان کا فون آئے اور ہم ریسیو کریں تو ریکارڈنگ کا بٹن دبادیتے ہیں کہ بعد میں لاکھ بتانے پر بھی وہ پھر۔۔۔ 'آگے کیا ہوا؟' جیسے سوال کرتی ہیں۔ کل بھی میں نے نجمہ باجی کا فون سنتے ہی یہی کیا' مگر اس کا سننا آپ کے لیے بھی دلچسپ ہوگا۔"

اس نے موبائل اس کی جانب بڑھایا۔ ظہور نے فون کانوں سے لگالیا۔ اور دو منٹ بعد چولہے کی آگ زیادہ رنگ بدل رہی تھی یا ظہور کا چہرہ' فیصلہ بہت مشکل تھا۔ لال' نیلا' پیلا رنگ۔ آگ کی لپٹیں توے سے باہر بے خوف ہوکر سانپ کی طرح زبان ہلاتی تھیں اور جس طرح چولہے کے پیچھے والی سیاہ ترین ہوجاتی ہے' فون کان سے ہٹاتے ہوئے ظہور کا چہرہ ایسا ہی تھا۔

وہ دفعتاً کھڑا ہوگیا' تھپ تھپ' یمنی پیڑے کو ہاتھ پر جھلارہی تھی پھر اس نے دھپ کرکے اسے توے سے چپکادیا' ظہور تیزی سے نیچے اترا۔

"ان بہت خاص آموں کو بھی لیتے جائیں۔ ہم اس ذائقے کے عادی نہیں۔" وہ اونچا بولی۔

اعزاز جو ان دونوں کی مدھم گفتگو کے دوران جبڑے بھینچے اپنی ساری بے بسی وبے چارگی منجی کسنے میں لگارہا تھا۔

"ظہور! ظہور! رکو۔۔۔۔" کہتا پیچھے لپکا۔

"جانے دو اعزاز! وہ کبھی نہ آنے کے لیے گیا ہے۔"

یمنی کی مطمئن اعتماد سے پُر آواز نے اس کے قدم روکے۔ وہ کچھ نہ سمجھا۔ یمنی کی روٹی غبارے کی طرح پھول پھولی تھی۔ اس نے چمٹا مار کر اسے پھاڑ دیا' پھس۔ اعزاز کو لگا' یمنی اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ سچ مچ یا اعزاز کو لگا۔

☼ ☼ ☼

چاند تماش بین تھا اور اس پر ستم پیدائشی گونگا۔۔۔ کاش وہ ہلکے پیٹ کی بی جمالو مائی جیسا ہوتا اور ادھر کی خبر ادھر پہنچاتا تو کیوں اور کیسے کے سارے مسئلے حل ہوجاتے۔ اعزاز چھت پر چارپائی ڈالے چت لیٹا چاند کو گھورے جارہا تھا۔ اسے لگا' یہ کوئی دوسرا چاند ہے اور چار سال سے زائد عرصہ تک محرم وہمراز چاند دوسرا' جو اس کے حال دل سے بخوبی واقف تھا۔ جو اس کی ساری بے قراریوں اور بے تابیوں کے جواب میں اپنی ٹھنڈک اور روشنی سے تسلی کرواتا تھا۔

نیچے آمنہ بچے کو شانے سے لگائے لوریاں دے رہی تھی۔ پتا نہیں' سارا دن بڑا بیبا بچہ رہنے والا عدیم رات کو گلا پھاڑ پھاڑ کر کیوں روتا تھا۔

"چندا ماما دور کے' بڑے پکائیں بور کے' آپ کھائیں تھالی میں' عدیم کو دیں پیالی میں۔" بچہ اور گلا پھاڑتا۔ یمنی نے فون آمنہ کی جانب بڑھایا۔

"فارغ ہو تو یہ ریکارڈنگ سن لینا۔ اور مناسب لگے تو اعزاز کو بتانا۔" وہ چھت کی جانب بڑھی۔

آمنہ نے تعجب سے فون کو دیکھا۔

اعزاز کو وہ ایک دم اپنے پیروں کے پاس کھڑی دکھائی دی۔ ایسا خوابوں میں تو بارہا ہوا تھا مگر۔۔۔ اعزاز نے پلکیں جھپک کر یقین کیا تو فوراً اٹھ بیٹھا اور پاؤں نیچے کرکے جوتا ٹٹولنے لگا۔ ایک پیر مل گیا دوسرا۔۔۔

یمنی نیچے جھکی' شاید جوتا پکڑنے جو آگے ہوگیا تھا' مگر نہیں۔ وہ دو زانو اس کے عین سامنے بیٹھ گئی۔ اعزاز نے الجھ کر اس کی صورت دیکھی جو اپنے ہاتھ میں پکڑی سرخ پوٹلی اس کی جانب بڑھا رہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" اعزاز نے ہاتھ بڑھانے سے گریز کیا۔

"یہ تو تم بتاؤ گے؟" اس کا انداز جھجک آمیز تھا۔ اعزاز نے پوٹلی لے کر ایک لمحے میں کھول دی۔

اندر بساند بھرا بہت تھوڑا سا پیلا بُرادہ تھا۔

"یہ... یہ کیا چیز ہے؟" تحیر نے آنکھیں پھیلادی تھیں۔

"یہ محبت تھی جو شاید اب نہیں رہی۔" یمنی کی آواز میں نمی گھل گئی۔ حلق میں نمک بھی آگیا تھا۔ اعزاز کی آنکھوں میں ایک چمکیلی صبح لوٹ آئی۔

"تم نے انہیں ابھی تک سنبھال کرر کھا ہے؟"

"تو کیا تم نے پھینکنے کے لیے دیے تھے؟" وہ ڈپٹ کر بولی۔

"تم کیا کہنے آئی ہو یمنی؟" اس نے اپنے حواس قابو میں رکھے۔

"تم کیا سننا چاہتے ہو اعزاز؟" اس کے لہجے کا اتار چڑھاؤ ہمت بندھا تا ہوا تھا۔

"تو تم وہ کہو گی جو میں سننا چاہتا ہوں۔" اس کے بے یقین جملے میں امید اور جذبے گھل گئے۔

"میں وہی کہنے آئی ہوں۔" وہ ٹھوس لہجے میں یقین سے بولی، مگر اس کی آنکھیں امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ وہ چہرہ اٹھائے اس کے چہرے کو ڈھٹائی سے تکے جارہی تھی۔

ہار جانے کا خوف دنوں میں ہولاتا ہے، مگر جو وقت آخر جب تمام کشتیاں جلادی جائیں تو محض بے خوفی کا سہارا فتح سے ہم کنار کرتا ہے۔ وہ "ہاں" اور "نہ" دونوں سننے کے لیے خود کو تیار کر کے آئی تھی، پر دل کی کیا کرتی جو بس ہاں کا متمنی تھا۔

"میں اب بھی وہی ہوں۔ ٹوٹے پھوٹے کھنڈر مکان کا حوالدار یا چلو اب انسپکٹر کہہ لو۔" اس نے یاد کروانا ضروری سمجھا تھا۔

"مگر میں اب وہ نہیں ہوں۔" وہ انکشاف کرتے ہوئے اس کے گھٹنے پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ رکھتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"اس تبدیلی کی وجہ؟" اب وہ چہرہ اٹھائے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"موسم بدلتے ہیں تو منظر بھی بدل جاتے ہیں۔ چیزیں بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔"

اعزاز پورے قد سے کھڑا ہوا اور لمحہ بھر میں رومال ہوا میں لہرادیا۔ پیلا بُرادہ کہاں اڑا۔ کہاں گرا پتا بھی نہ چلا۔ یمنی کے دونوں ہاتھ بے ساختہ ہونٹوں پر جار کے اور آنکھوں میں تحیر تیرنے لگا۔ سامنے کا چہرہ بے تاثر تھا، مگر انداز فیصلہ کن۔ اس کا دل حلق میں آکر دھڑکنے لگا... وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹی تو تب رکی جب چھت کی چھوٹی دیوار کمر سے لگی۔

یہ رات دس بجے کے بعد کا وقت تھا، اندھیرا ہر شے کو نگل چکا تھا، اس پر مستزاد لائٹ چلی گئی۔ مگر چاند کی روشنی میں دور بہت دور کسی مسجد کے مینار پر لگے سبز اور پیلے برقی قمقمے ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے سمندر کے بیچوں بیچ ڈولتی کشتی کو اچانک ساحل پر روشن مینار نظر آجائے۔

اعزاز نے سرخ رومال بھی چارپائی پر پھینک دیا، یمنی کو خبر نہیں ہوئی کہ کب گال گزر گاہ بنے اور آنکھوں سے نکلتا پانی گردن تک روانی سے بہنے لگا۔ اسے جواب مل گیا تھا۔ یمنی نے اپنی آواز گھونٹ لی۔ اسے کیوں پتا لگے کہ وہ رو رہی ہے۔

اسے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے پیر مَن مَن کے لگے تھے، مگر اب یوں لگتا تھا ٹنوں وزنی لوہے کی گیندیں بہت چھوٹی زنجیر کے سہارے اس کے پیروں سے بندھی ہیں۔ وہ جنبش بھی نہیں کر پارہی۔ اعزاز قدموں میں اس کے عین سامنے بے حد قریب آر کا۔ یمنی نے سانس روک لی۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں چلا گیا۔

"تت... تم نے... پھول پھینک دیے۔ میں... میں نے ایسے ہی سنبھال کرر کھے۔"

دکھ اتنا شدید تھا کہ شکوہ ہونٹوں پر آگیا۔ اس کی آواز نے بھید کھول دیا۔ وہ رو رہی تھی۔ اعزاز نے شہادت کی انگلی اس کی مانگ پر رکھی اور ناک سے گزارتا ٹھوڑی تک لے آیا۔ اب وہ آنسو صاف کرنا چاہتا تھا۔ یمنی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ——— اسے روکا۔

وہ زور سے ہنس دیا... اس کے آنسو اور تیزی

سے۔ آمنہ اسی وقت اوپر آئی تھی۔ اعزاز کا جاندار قہقہہ سن کر وہ رک گئی۔

"تم جاؤ آمنہ! ابھی تمہارے ڈائیلاگ نہیں شروع ہوئے۔" وہ رخ موڑے بنا بولا۔

"لیکن وہ..."

"تم جاؤ۔" وہ دہاڑا آمنہ نے سرپٹ دوڑ لگادی۔ اعزاز نے یمنی کے اطراف دونوں ہاتھ دیوار پر جما دیے تھے۔

"وہ سارا بُسا ہوا بے رنگ بُرادہ... ہونہہ! میں نہیں نئے پھول لا کر دوں گا۔ یہ بہت سارے... روزانہ... صبح، دوپہر، شام۔"

اس کا لہجہ متبسم تھا۔ یمنی نے بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھنا چاہا۔

چاند نے کسی الہڑ دوشیزہ کی طرح ذرا سا چہرہ نکال کر نیچے دیکھا۔ کہانی کا یہ انجام اسے بھی اچھا لگا۔ وہ گونگا تھا، اندھا نہیں۔ سب جانتا تھا۔ ٹھنڈی میٹھی نرم روشنی میں دو سائے۔

"ہٹو پیچھے۔ کوئی دیکھ لے گا۔" یمنی نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکیلا۔

"مگر میں نے تو ابھی کچھ کیا ہی نہیں۔ کوئی کیا دیکھے گا؟" وہ اچانک دھکا لگنے سے پیچھے ہوا۔ بے چارگی سے پوچھنے لگا۔ یمنی کی ہنسی نکل گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

"کٹ! یہ سین لائٹ آنے پر یہیں سے شروع کریں گے۔ مجھے تمہارے چہرے کے رنگ نظر ہی نہیں آرہے۔" اس نے احتجاج کیا۔ یمنی کی رکی ہنسی پھر شروع ہو گئی۔ فضا میں پٹاخوں کی شدید ترین آوازیں گونجنے لگیں۔ دو دن بعد شب برات تھی۔ بہت سارے بچوں نے ایک ساتھ پٹاخے پھوڑے تھے۔ پانچ چھ اناری گولے آسمان پر بہت اوپر جاکر پھٹے۔ آسمان ایسا ہو گیا، جیسے سیاہ چادر پر کوئی چمکیلی رنگ برنگی افشاں چھڑک دے۔ یمنی گردن اٹھائے آسمان کو دیکھنے لگی۔

"کتنا خوب صورت منظر ہے۔ میں نے ایسا کبھی پہلے نہیں دیکھا۔" وہ سب کچھ بھول بھال بچوں کی طرح ایڑیاں اٹھا کر اوپر دیکھ رہی تھی۔ بچے باقاعدہ پلاننگ سے آتش بازی کر رہے تھے۔

ایک کے بعد ایک... اعزاز نے یمنی کا چہرہ دیکھا۔ یہ آتش بازی اور پٹاخوں کی آوازیں... بہت کم تھیں ... بہت کم... ان سے جو اعزاز کے دل میں ہو رہی تھیں۔

محبت بڑھ سکتی ہے
محبت مل بھی سکتی ہے
تم کاسہ تھام کے رکھنا

"اب میں اوپر آجاؤں؟" آمنہ نے نیچے سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں ہاں آمنہ! جلدی آؤ۔ دیکھو تو کتنا مزا آرہا ہے۔"

یمنی نے دونوں ہاتھ لہرا کر اسے اوپر بلایا۔ آمنہ کو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہی نتیجہ معلوم ہو چکا تھا۔ اس نے سرعت سے قدم بڑھادیے۔

☆

مصباح خادم

"اف اللہ کتنی سردی ہے امی! انگیٹھی کے لیے کوئلے کہاں رکھے ہیں؟" سردیاں شروع ہوتے ہی حسب معمول مہر کا واویلا شروع ہو چکا تھا اور آج تو بادل بھی گھرے ہوئے تھے لہٰذا کوئلوں کی یقینی شامت آئی تھی۔

"کچن کے پیچھے اسٹور میں رکھے ہیں۔ احتیاط سے استعمال کرنا..... ساری سردیاں انہی سے کام چلانا ہے۔"

اس کے پوچھنے پر امی نے جواب تو دیا ہی، ساتھ احتیاط کی تاکید بھی کر ڈالی، جسے سن کر وہ ہمیشہ کی طرح جل کر رہ گئی۔

"لو جی..... ایک تو سردی سے بچنے کے لیے کوئلے جلاؤ، نہ بجلی کا بل نہ ہی گیس کی ٹینشن..... اس پر بھی احتیاط کی تاکید..... ویسے امی! سچ ہے، سردی کو ہم مڈل کلاس لوگوں کے گھر آنا ہی نہیں چاہیے۔ یہ تو امیروں کی انجوائے منٹ ہے۔ گاڑی ہو گھر ہو یا دفتر ہر جگہ ہیٹر کے مزے، گرما گرم لذیذ کھانے، رضائی میں بیٹھ کر خشک میوہ جات اور کافی کی عیاشی..... ہم جیسے تو سارا سال کوئلے جمع کرتے ہیں، پھر جب سردیاں آئیں تو احتیاط سے استعمال کریں، کیا فائدہ اتنی مشقت کا۔"

کوئلے دہکانے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے قیمتی خیالات کا بھی اظہار کر رہی تھی، جس پر امی کو حسب توقع غصہ آ گیا۔

"ہاں تو تمہیں کیا تکلیف ہے؟ مشقت تو میں ہی کرتی ہوں..... اور مشقت بھی کیسی! سارا کام تو لکڑیوں پر ہی ہوتا ہے۔ میں اس میں سے بڑے بڑے کوئلے بجھا کر الگ کر لیتی ہوں، کون سا پہاڑ کھودنے پڑتے ہیں مجھے، جو تم یوں اپنا خون جلا رہی ہو۔"

"تو کیوں نہ جلاؤں خون..... مانا کہ مشقت آپ کرتی ہیں مگر استعمال تو مجھے ہی کرنے ہوتے ہیں ناں اور وہ بھی احتیاط کے ساتھ۔" وہ احتیاط پر خاصا زور دے کر بولی تب ہی آگ جسے کب سے پھونکیں مار رہی تھی بھڑک اٹھی اور کوئلے تیزی سے دہکنے لگے۔

"اچھا بک بک بند کرو اور آ کر برتن دھو، صبح سے ایسے ہی پڑے ہیں۔" امی نے بحث سمیٹنا چاہی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس پر ایک نئی بحث چھڑ جائے گی اور وہی ہوا۔

"دیکھا! اسی لیے میں کہتی ہوں، امیروں کی موجیں ہیں۔ برتن، کپڑے سب نوکروں کے ذمے..... اور پھر بھی کبھی جو قسمت سے پانی میں ہاتھ ڈالنا پڑ ہی جائے تو گیزر زندہ باد۔"

"تو تم کون سا برف میں ہاتھ ڈالے بیٹھی رہتی ہو، جب بھی کچھ کرنا ہو، پہلے موٹر چلا کر گرم پانی نکالتی ہو، پھر کسی کام کو ہاتھ لگاتی ہو۔ اب زبان بند کرو اور جلدی سے برتن دھو۔ کالج سے چھٹی کی ہے تو کچھ ہاتھ بٹاؤ میرا۔" امی جو اس کے خیالات سے تنگ آ چکی تھیں مزید کوئی رعایت دینے کے موڈ میں نہیں تھیں، مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ کوئلے چونکہ دہک چکے تھے، لہٰذا جھٹ رضائی میں دبک گئی اور وہیں سے ہانک لگائی۔

"کوئی برتن ورتن نہیں دھو رہی میں..... یہی کام کرنے ہیں تو فائدہ کالج سے چھٹی کرنے کا، ثمر آپا سے کہیں وہ دھو دیں گی برتن..... اور ہاں! اب کسی کام کے لیے مجھے آواز نہ دیجیے گا۔ کھانا بن گیا تو یہیں کمرے میں لے آئیے گا، کچن میں نہیں آنے والی میں..... بہت سردی لگ رہی ہے مجھے۔"

اس کے ارشادات پر امی نے بے بسی سے ثمر کی طرف دیکھا تو وہ جو اپنے چھ ماہ کے احمر کے ساتھ دو دن ماں کے پاس رہنے آئی تھی، ان کا ہاتھ تھام کر مسکرا دی۔

"کوئی بات نہیں امی! آپ پریشان نہ ہوں۔ بس دو منٹ احمر کو سنبھالیں، میں ابھی برتن دھو دیتی ہوں۔" اس نے احمر کو ماں کے حوالے کیا اور کچن میں گھس گئی۔ وہ بند دروازے کو گھورتے ہوئے نواسے کو بہلانے میں لگ گئیں۔

یہ کوئی آج کا رونا نہیں تھا۔ بچپن سے ہی وہ سردی کی بہت کچی تھی۔ سردیاں آتے ہی سردی، سردی کی جو گردان شروع ہوتی تو پھر موسم کے تبدیل ہونے پر ہی تھمتی تھی۔ اسکول کالج سے تو چھٹیاں ہوتی ہی تھیں، ساتھ ماں کا ہاتھ بٹانے سے بھی صاف انکار..... بس رضائی میں دبک کر امیری کے فوائد اور غریبی کے نقصانات پر روشنی ڈالے جاتی۔ بہت سمجھایا مگر وہی ڈھاک کے تین پات۔ یہی وجہ تھی کہ سردیاں ختم ہونے پر اس کے ساتھ ساتھ گھر والے بھی با آواز بلند شکر ادا کرتے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس سرد صبح کا آغاز ایک بری خبر سے ہوا تھا۔ چھوٹے چچا کے چھوٹے سالے کا انتقال ہو گیا تھا۔ رشتہ قریبی ہونے کی وجہ سے امی ابو دونوں کا جانا ضروری تھا۔ رات بھی ہو سکتی تھی اور مہر کو اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا تب ہی امی نے اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ اس نے سیاہ بادلوں سے ڈھکا آسمان اور فضا میں ہلکی دھند کو تیرتے دیکھا تو خوب شور مچایا۔

"افوہ! کیا ضرورت ہے اتنی سردی میں کہیں جانے

کی..... بعد میں جا کر تعزیت کر آیئے گا ناں۔" اس نے اپنی طرف سے شاندار مشورہ دیا تھا، جس پر امی نے غور کرنا تو دور، سننا بھی گوارا نہیں کیا۔

"کوئی فضول بکواس نہیں، جلدی سے کپڑے بدلو تمہارے ابو موٹر سائیکل لے کر آتے ہی ہوں گے شہزاد بھائی سے۔"

شہزاد احمد ان ہی کے گاؤں میں رہتے تھے اور بھائیوں جیسے تعلقات تھے۔ اسی لیے بوقت ضرورت کام آجاتے تھے۔

"کیا ضرورت تھی اس موسم میں انتقال فرمانے کی ..... لے کے مشکل میں ڈال دیا۔" کپڑے بدلتے ہوئے بھی اس کی دہائیاں جاری تھیں، جس پر امی نے جھڑک بھی دیا۔

"شرم تو نہیں آتی۔ اب کیا انسان اپنی مرضی سے مرتا ہے، جو یہ الزام بھی تم نے ان پر ڈال دیا۔" اور اس سے پہلے کہ مزید باتیں سننے کو ملتیں، بھلا ہو ابو کا جو موٹر سائیکل لے کر آگئے۔ مہر گلو خلاصی پر شکر ادا کرتی باہر آگئی۔

موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہی جو سرد ہوا نے استقبال کیا تو باوجود اوپر نیچے گرم کپڑوں کا ڈھیر چڑھائے، وہ کپکپانے لگی۔

"اسی لیے میں کہتی ہوں کہ سردیاں امیروں کے گھر ہی اچھی لگتی ہیں۔ اب بھلا ہیٹر لگی گرم گاڑیوں میں بیٹھنے والوں کو کیا پتا کہ باہر کس غضب کی سردی پڑ رہی ہے۔"

قریب سے گزرتی گاڑی کو دیکھ کر اسے پھر سے خود پر ہوا ظلم یاد آ گیا تھا، مگر امی نے جواب دینا گوارا نہ کیا اور اسے شاید اس سے کوئی خاص فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔

"اور خبردار..... جو آپ نے فوتگی والے گھر میں جا کر مجھے ہاتھ بٹانے کی نصیحت کی ہو تو..... کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی میں۔ ساتھ چل رہی ہوں اسی کو غنیمت جانیے۔" بجتے دانتوں کے ساتھ وارننگ دے کر اس نے شال کچھ اور زیادہ چہرے کے گرد لپیٹ لی تھی۔

سفر اسی طرح جاری تھا کہ اس کی نظر خانہ بدوشوں کی جھگیوں کے سامنے کھیلتے تین بچوں پر پڑی اور وہ جیسے جم کر رہ گئی۔ وہ تینوں انتہائی مخدوش لباس میں تھے۔ اس غضب کی سردی میں بھی ان کے جسموں پر ایک ایک نیکر، پھٹی پرانی شرٹ اور خستہ حال سوئیٹر کے سوا کچھ نہ تھا۔ سر پر ٹوپی اور نہ ہی پاؤں میں جوتے۔ سردی کی شدت سے ان کے نیلے پڑتے چہرے اور کانپتی ٹانگیں اتنی دور سے بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں، مگر وہ اس سے نظریں چرائے گیلی مٹی میں کھیلنے میں مشغول تھے، جو رات کی بارش کی دین تھی، اور جس سے کھلونے بنا بنا کر وہ اپنا وقت بتا رہے تھے یا دھیان بٹا رہے تھے۔ مہر سمجھ نہ سکی..... مگر اس گیلی مٹی کی ٹھنڈک سے اسے اپنا آپ جمتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ ساکت تھی اور سردی کا شدید احساس جیسے یکدم ختم ہو گیا تھا۔ امی اس سے کچھ کہہ رہی تھیں مگر وہ جواب کیسے دیتی، اس کی تو زبان ہی گنگ ہو چکی تھی۔

امی حیران تھیں اور مزید حیران تب ہوئیں، جب وہ انہیں وارن کرنے کے باوجود اور ان کے کہے بغیر ہی فوتگی والے گھر میں ہاتھ بٹانے لگی اور ایک بار بھی سردی کی شکایت نہ کی..... نہ وہاں اور نہ ہی پھر کبھی اپنے گھر میں..... اس کا رویہ یکسر بدل چکا تھا۔ خواہ کیسا ہی موسم ہوتا، وہ بلا چوں چرا کالج چلی جاتی۔ امی جو کام کہتیں، خاموشی سے کر دیتی اور سردی کا واویلا کرنا تو وہ جیسے بھول ہی گئی تھی۔ امی حیرت زدہ تھیں اور اس حیرت کا وہ برملا اظہار بھی کرتیں۔ آپا بھی اکثر اسے چھیڑا کرتیں۔

"کیا ہوا بھئی..... کیا اب ہماری مہر کو سردی نہیں لگتی۔"

وہ کچھ کہنے کے لیے لب کھولتی، مگر گیلی مٹی کی ٹھنڈک اس کی رگ و پے میں ایسی سرایت کر جاتی کہ وہ کچھ بھی کہنے کے قابل ہی نہ رہتی۔

آمنہ ریاض

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے' جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں رواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی "جنت" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پستے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ اچھے مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ ہر دم "اس" کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت بی بی ان کی حراست میں ہے' جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگم بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت شیزوفرینیا کی مریض ہے'، جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے۔ جسے اس نے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کو تلاشنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت دانیال ملنسار اور محبتی خاتون ہیں۔ ولی' ولید اور انیبا ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں انیبا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

شبیہہ العباس طبعیتا "سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے' جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ
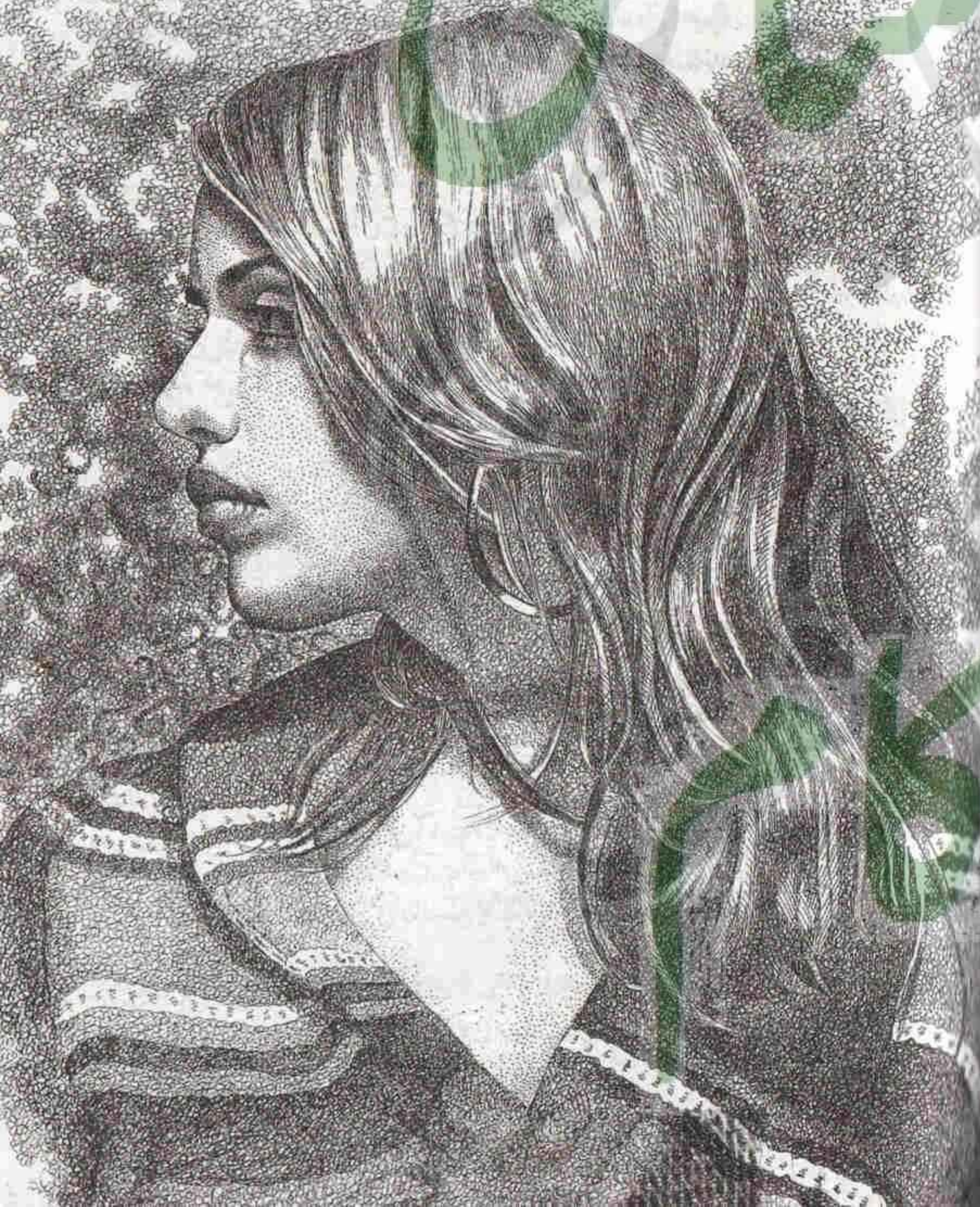
پھپھی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے سخت نالاں ہے۔ شبیہہ، تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبیر اور نمرہ تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہہ، تنوی کا منگیتر ہے، وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔

شبیہہ العباس، ثروت دانیال کی اولاد ہے، جسے انہیں دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑنا پڑا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بد مزاج اور غصیلا بنا دیا۔ وہ انیبا اور ولید سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے بحیثیت بہن بھائی قلبی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انیبا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انیبا پر بری نظر ڈالنے پر وہ جے ڈی کے دوست سعدی کو پیٹ ڈالتا ہے۔ صرف جے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

بیمار پڑنے پر بیگم دانیال، ثمینہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہیں تو ثمینہ ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ انہیں بیگم دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو چوٹ لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زبیدہ کے بیٹے فاروق کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ ساتھ ہی زبیدہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ زہرہ اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد، زہرہ کو باور کراتا ہے کہ وہ جنت کو بیاہ کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا۔ بلکہ اس کے شوہر کو گھر داماد بنائے گا۔

اتفاقاً ماوی کا ٹکراؤ شبیہہ سے ہوتا ہے۔ جس سے ماوی کا پیر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جھنجلاہٹ میں شبیہہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ ثمینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ ثمینہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں، لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے۔ جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ ثمینہ اسے گھر بلاتی ہیں۔ ثمینہ، ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیہہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں، جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہہ بھی کرتا ہے۔

انیبا دل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے.... ماوی، ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان، ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے ثمینہ، ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبیر، نمرہ اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے، وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد، بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پڑوسن کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پنپنے والی منفی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہتک آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔

دین محمد، جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارتے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی ہے۔

ثروت، دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر میکے چلی جاتی ہیں۔ انیبا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن، ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ثمینہ، ماوی کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹتی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیہہ العباس، ماوی کے رشتے دار ہیں ... کہ ماوی کے باپ، رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ، ماوی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام ...

... نے بتایا۔ رجب کے مرنے کے بعد جنت بی بی نے ان کے سامنے رجب کی وصیت رکھ دی۔ جس میں انہوں نے اپنی ساری جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی۔ وہ ساری جائیداد اٹھارہ برس کی عمر ہونے کے بعد رجب کی بیٹی یعنی ماوی کو منتقل ہونا تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ وصیت جعلی تھی لیکن ثمینہ کے اس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ وہ جنت کو چیلنج کر سکتیں۔ وہ خاموشی سے حویلی چھوڑ کر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گئیں۔

بعد میں ایک دن جنت بی بی ثمینہ سے ملنے آئی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اس کے بڑے بیٹے سے شادی کر لیں۔ جو ذہنی ... تھا۔ ثمینہ نے انکار کر دیا۔ تب جنت نے بتایا کہ وہ رجب کی ساری جائیداد اپنے نام کرا چکی ہے۔ ساتھ اس نے انکشاف کیا کہ رجب کو اس نے زہر دے کر مارا ہے۔

ثمینہ نے کہا کہ ماوی آئرش نیشنل ہے۔ جنت اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔ ایمبیسی حرکت میں آجائے گی۔

ثمینہ نے ماوی سے کہا، وہ اس کی شادی جلال سے طے کر چکی ہیں۔ اسے جلال سے نکاح کرنا ہوگا تاکہ حویلی جا سکے۔

انہوں نے کہا اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد ماوی جلال سے خلع لے لے تاکہ شہروز سے شادی کر سکے۔ شہروز کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ماوی نے انکار کیا تو ثمینہ نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔

۱۹
اُنیسویں قسط

انیبا نے دور سے دیکھا ماوی برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اس نے گیلا ... گرل پر پھیلایا اور ماوی سے ملنے کا ارادہ کرتی اپنے کمرے کی طرف پلٹ گئی۔ اسی وقت ثمینہ ماوی کو تلاش کرتی ... انیکسی سے باہر آئی تھیں اور اسے یوں الگ تھلگ بیٹھے دیکھ کر انہیں شدید تاؤ آیا تھا۔

"یہ لڑکی میرا سارا پلان برباد کر کے ہی چھوڑے گی۔" انہوں نے اکتا کر سوچا اور ناچار اس کی طرف آ گئیں۔ ... گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے خدا معلوم کس بیزار کن سوچ میں مبتلا تھی۔

"تم یہاں کیوں بیٹھی ہو ماوی! تمہیں اس وقت اندر ہونا چاہیے۔" ماوی کے چہرے پر پھیلی بیزاری کو لفٹ نہ ... کراتے ہوئے ثمینہ نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

"اب کیا آپ مجھے یہ بھی ڈکٹیٹ کروائیں گی کہ مجھے کہاں بیٹھنا چاہیے اور کہاں نہیں۔" ماوی نے تڑخ کر ...

"جب تک تم اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں کر لیتیں، کم سے کم تب تک تو ضرور۔"

"ہاں..... ذمہ داری۔" ماوی نے زہر خند کہا۔

"اس سے بڑا مذاق آپ نے شاید ہی آج تک میرے ساتھ کیا ہو۔"

"جب تم وہ سب حاصل کر لو گی، جس کا ذکر میں کرتی ہوں تو مجھے الزام دینا بھی چھوڑ دو گی لیکن فی الوقت یہ زیادہ ضروری ہے کہ تم اندر چلو۔"

"آخر اندر ایسی کون سی آفت آ گئی ہے، جسے دیکھنے کے لیے میرا اندر جانا ضروری ہے۔"

"جلال آیا ہوا ہے اور پچھلے سوا گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" ماوی نے مزید بیزاری سے انہیں دیکھا۔
"جلال کو اپنے گھر میں کوئی کام نہیں ہے؟"
"بے تکی باتیں مت کرو ماوی۔" ثمینہ جیسے زچ ہی ہو گئی تھیں۔ "پہلے ہی قسمت نے مجھے کم زچ کیا ہے جواب تم بھی......"
"اوہ کم آن ممی! میں کوئی ایموشنل ڈائیلاگز سننا نہیں چاہتی۔"
"ٹھیک ہے جیسے تم خوش رہو۔" ثمینہ نے تحمل سے جواب دیا۔ "لیکن پلیز جلال کے ساتھ کچھ وقت گزارو۔"
"اس سے کیا ہو گا؟ مجھے کون سا اس کے ساتھ ساری زندگی گزارنی ہے، جو انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ کرنے کی کوشش کروں۔" اس نے پھر پتھر توڑ جواب دیا تھا۔
"بے شک...... لیکن اس کے ساتھ وقت گزارو گی تو تمہیں حویلی والوں کے متعلق معلومات ملیں گی جو بعد میں تمہارے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہیں۔"
"یا اللہ۔" ماوی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔
"ٹھیک ہے آپ جائیں میں آتی ہوں۔" اس کا انداز سراسر جان چھڑانے والا تھا۔ ثمینہ نے بغور اس کا انداز جانچا۔
"شیور؟" ماوی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"ٹھیک ہے لیکن ذرا جلدی آجانا۔" ثمینہ کسی قدر مطمئن ہو کر پلٹ گئیں۔ ماوی کچھ دیر تو اسی طرح بیزاری سے بیٹھی رہی پھر اٹھنے کے لیے پر تول ہی رہی تھی کہ انبیا نے آکر چونکا دیا۔
"تم کہاں غائب ہو گئی تھیں کوئی خیر خبر ہی نہیں۔"
انبیا نے مختصر لفظوں میں ثروت کی بیماری کا احوال کہہ سنایا تو ماوی بوجھل دل کے ساتھ ان کی خیریت معلوم کرنے لگی۔
"تم بتاؤ! کیا ہو رہا ہے؟"
"کچھ خاص نہیں۔ اپنے ایڈمیشن کا تو میں نے تمہیں بتایا تھا ناں! تو شاید کچھ روز تک ہاسٹل شفٹ ہو جاؤں۔"
"ہاسٹل میں رہنے کی کیا ضرورت ہے ماوی! تمہیں یہاں کوئی پریشانی ہے کیا؟"
"نہیں انبیا! پریشانی تو کوئی نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے، ہاسٹل میں رہ کر میں زیادہ بہتر طریقے سے اسٹڈی کر سکوں گی۔ پھر ممی بھی دو ایک روز میں واپس آئرلینڈ چلی جائیں گی تو میرا خیال ہے، میرا دل لگنا مشکل ہو جائے گا۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ شام میں آؤں گی تمہاری طرف۔"
ماوی نے گول مول سا جواب دیا اور انیکسی کی طرف بڑھ گئی۔ انبیا وہیں کچھ حیران سی کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی۔ گو کہ سب کچھ روٹین کے عین مطابق تھا لیکن ماوی کے انداز میں اسے کچھ مختلف محسوس ہوا تھا اور وہ مختلف عنصر کیا تھا، وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

جلال سے اس کی مڈبھیڑ دروازے پر ہی ہو گئی۔ وہ مایوس ہو کر اب واپس جا رہا تھا۔
"میں نے آپ کا بہت انتظار کیا۔"
"کیوں؟ کوئی خاص کام تھا کیا؟" ماوی نے بے حد رکھائی سے پوچھا۔ جلال چپ سا ہو گیا، تب ہی ماوی کو ا[illegible]

[illegible]ساختگی کا احساس ہوا تھا۔
"وہ دراصل انبیا کے ساتھ باتوں میں وقت گزارنے کا پتا ہی نہیں چلا۔" اس نے فوراً بات تو سنبھالی لیکن [illegible] ویسا ہی رکھا تھا۔
"خیر! تم اتنی جلدی کیوں جا رہے ہو...... آؤ بیٹھو! میں تمہیں اچھی سی کافی پلاتی ہوں۔" اب کی بار اس نے [illegible]ستانہ انداز میں کہا تھا۔ اب کیا بتاتی وہ دراصل انبیا سے باتیں کرنے میں اسے دیر نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو اس سے [illegible] کرتی بے دھیانی میں گیٹ ہی عبور کر گئی تھی، جب واپس پلٹی تو دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ جلال اس کے ساتھ کچھ [illegible]ت ضرور گزارنا چاہتا تھا لیکن اسے کسی ضروری کام سے جانا تھا۔
"ثمینہ آنٹی بتا رہی تھیں، آپ واپس آئرلینڈ جا رہی ہیں۔" جلال نے کچھ خیال آنے پر پوچھا۔
"آں...... ہاں میں کچھ روز کے لیے جا رہی ہوں۔ وہاں میری اسٹڈیز سے ______ متعلق کچھ کام [illegible]ادھورے پڑے ہیں۔ انہیں مکمل کرتے ہی واپس آجاؤں گی۔" ماوی نے ثمینہ کی ہدایت کے مطابق بنا بنایا جواب [illegible]

جلال نے قدرے بددلی سے سر اثبات میں ہلا دیا۔
"میں آپ کو مس کروں گا ماوی!"
ماوی نے کوئی جواب نہیں دیا، بس زبردستی مسکرا دی۔
"میں چلتا ہوں...... خدا حافظ۔"
ماوی نے اس بار بھی اس کی امیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے اسے مروتاً بھی رکنے کے لیے نہیں کہا اور خدا حافظ [illegible]ق اس سے بھی پہلے اندر چلی گئی۔ ثمینہ بری طرح پیچ و تاب کھاتی اس کی منتظر تھیں۔
"تمہیں عقل نہیں آسکتی ماوی! کبھی نہیں آسکتی۔ اپنی حماقتوں کے ہاتھوں سب بگاڑ دو گی تم۔"
"ایسی ہی بات ہے تو میری جگہ آپ حویلی کیوں نہیں چلی جاتیں؟" ماوی نے بری طرح چڑ کر کہا تھا، لیکن فوراً [illegible]وہ خاموش ہو گئی۔ اس کا لہجہ بدتمیزی کی حد تک ناگوار تھا۔ وہ سر پکڑ کر صوفے پر گر گئی۔ چند لمحے اس نے بالوں [illegible] ہاتھ پھنسائے رکھے، پھر جیسے خود پر ضبط کرتے ہوئے بولی۔
"جو آپ نے مجھ سے کروانا تھا، آپ کروا رہی ہیں، لیکن پلیز! اب باقی کے معاملات مجھے میرے طریقے سے [illegible] کر لینے دیں۔ آپ کو بابا کے قاتل کا ثبوت چاہیے۔ میں اسے لانے کی پوری کوشش کروں گی، باقی بچا وہ ترکہ [illegible]ابا جان کا حصہ ہے، تو مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے، لیکن محض آپ کی وجہ سے میں اس کی ڈیمانڈ [illegible]ر کروں گی، مگر اپنے طریقے سے۔ اس معاملے آپ مجھے ڈکٹیٹ نہ کریں تو اچھا ہو گا۔"
اس نے تیز لہجے میں کہا اور اپنے بیڈ روم میں گھس گئی۔ سر پکڑ کر بیٹھنے کی باری اب ثمینہ کی تھی۔

☼ ☼ ☼

[illegible]کمرے میں آکر ماوی نے کھڑکی کے پردے گرا دیے اور بیڈ پر گر کر اس ساری صورت حال پر غور کرنے لگی۔ [illegible]کے اردگرد نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک بند گلی میں آکر کھڑی ہو گئی ہو۔ [illegible]معاً وہ اٹھ بیٹھی اور سیل فون پر شہروز کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ کئی بار کوشش کے باوجود دوسری طرف سے [illegible] کوئی رسپانس نہیں ملا تو اسے مزید مایوسی نے گھیر لیا۔
"اب میں یہ کوشش کیوں کر رہی ہوں۔ اب تو کچھ بھی میرے ہاتھ میں نہیں رہا اور شہروز...... شہروز نے بھی تو [illegible] سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیا میں اتنی غیر اہم تھی اس کی زندگی میں کہ معمولی سی تلخ کلامی کے بعد

انسان منہ ہی موڑ لے۔"

اس کے پاس سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا، لیکن پھر بھی ذہن خالی خالی سا محسوس ہوتا۔ وہ اور شہروز ہمیشہ سال ساتھ رہے تھے۔ ان میں بہترین دوستی تھی، پھر دل کا رشتہ بھی ایک دوسرے سے جڑ گیا تو ایک دوسرے کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی۔ کبھی زندگی میں ایسا مقام بھی آئے گا کہ رابطے کے بہانے تلاش کرنے پڑیں۔ کم سے کم ماوی ایسا کبھی نہ سوچا تھا۔

یہ کیا ہو رہا تھا اور زندگی نے اسے کس مقام پر لا کر پٹخ دیا تھا۔ وہ ہر بار ان سوالوں پر غور کرتی، ہر بار الجھتی۔

اس وقت بھی اس کی پیشانی پر ان گنت سوچوں کا جال بچھا تھا اور کوئی حل سجھائی نہ دیتا تھا۔ تھک ہار کر اس نے شہروز سے رابطے کی ایک آخری کوشش کی۔ مسلسل بیل بجنے کے بعد دوسری طرف سے کال اٹینڈ کرلی گئی تھی۔

"ہیلو شہروز..." ماوی نے بے قراری سے کہا تھا لیکن دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز نے جیسے اسے گنگ ہی کر دیا تھا۔ وہ کسی لڑکی کی آواز تھی جو انگلش زبان میں ماوی کا تعارف حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔ ماوی شہروز کے نمبر پر کسی لڑکی کی آواز سن کر جتنا حیران ہوتی، وہ کم تھا۔ شہروز بہت زاہد خشک قسم کا انسان تھا۔ ماوی اس سے کسی گرل فرینڈ کی توقع بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"کیا میں شہروز سے بات کر سکتی ہوں؟" ماوی نے اس دلکش لب و لہجے والی لڑکی سے جھجک آمیز لہجے میں پوچھا تھا۔

"ہاں ضرور... لیکن تمہیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ شہروز باتھ روم میں ہے۔" اس لڑکی نے شائستگی سے جواب دیا تھا۔

"اور کیا میں آپ کا تعارف حاصل کر سکتی ہوں؟"

"اوہ ضرور... کیوں نہیں... میں ایلس ہوں شہروز کی بیوی۔" کھنکتا لہجہ... موبائل فون ماوی کے ہاتھ سے چھوٹتے ہوئے بچا۔

"کیا بکواس ہے یہ..." بمشکل اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"ارے... یہ کیا لہجہ ہے۔" اس لڑکی نے اچنبھے سے پوچھا تھا۔

"کون ہے ایلس..." ماوی ہزاروں میں پہچان سکتی تھی، یہ شہروز کی آواز تھی۔

"کوئی بدتمیز لڑکی ہے۔ اسے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔"

"ہیلو... ماوی؟" یکدم شہروز کی آواز ابھری تھی۔

ماوی چند لمحے بول ہی نہیں سکی۔

"ماوی! یہ تم ہو ناں؟" شہروز نے تصدیق چاہی لیکن اس کا گڑبڑایا ہوا لہجہ ماوی پر بہت کچھ ثابت کرنے کو تیار تھا۔

ماوی نے لرزتی انگلیوں کے ساتھ کال منقطع کر کے سیل فون بیڈ پر رکھ دیا۔ اسے لگ رہا تھا، اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ فون کی بیپ بجنے لگی۔ ماوی اس قدر خالی الذہنی کا شکار تھی کہ اس سے فون کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوا گیا، لیکن کتنی دیر تک وہ یہ لاتعلقی برت سکتی تھی۔

"ہیلو ماوی! پلیز یار! مجھے غلط مت سمجھنا۔ میں تمہیں بتانے ہی والا تھا۔ بلیومی... میرے لیے تم سے زیادہ کوئی اہم نہیں ہے، لیکن ایلس... میں تمہیں بتا دیتا۔" اس کا غیر متوازن وضاحتی لہجہ۔

جھوٹ مجسم نہیں ہوتا۔ اس کا احساس ہوتا ہے، جو لہجوں میں عیاں ہو کر کسی دوسرے انسان کی ہستی بگاڑ دیتا ہے۔

"تم کیا بتا دیتے شہروز؟" ماوی نے بے حس لہجے میں پوچھا۔

"یہی کہ میں ایلس سے شادی کر چکا ہوں۔ میں، میں مجبور ہو گیا تھا ماوی! تمہیں سمجھنا چاہیے میں بہت مجبور ہو گیا تھا۔"

ماوی پوچھ نہ سکی کہ اس کی کیا مجبوریاں تھیں۔ بس ذہن کی چوکھٹ پر کھٹ سے ایک خیال آن گرا تھا کہ اس نے بھی تو جلال سے نکاح کا فیصلہ کسی مجبوری کے تحت ہی کیا تھا۔ ایک فیصلہ اگر شہروز نے بھی کر لیا تو کیا فرق پڑتا ہے۔ آن کی آن میں وہ بے دم سی ہو گئی تھی۔

لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ یہ تقدیر کا ایک کاری وار ہے، جو ثمینہ کی رضا پوری کروانے کے لیے اس کی ذات پر ہوا تھا۔ اب کوئی حیلہ، کوئی بہانہ کام نہ آتا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں اٹھی اور اپنا سامان پیک کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"چند روز بعد بھی تو مجھے حویلی جانا ہے تو ابھی کیوں نہیں۔" اگلے روز ثمینہ کے استفسار پر ماوی نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"آپ کی تو یہی مرضی ہے ناں ممی! کہ میں حویلی جاؤں... تو بس ٹھیک ہے! میں جا رہی ہوں۔ آپ گاڑی اور ڈرائیور کا بندوبست کر دیں... باقی کام میرا ہے۔ مجھے سانپ کے بل میں تو ہاتھ ڈالنا ہی ہے۔ چند روز بعد ڈالوں یا چند روز پہلے، اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔"

اس نے سنجیدگی و کسی قدر لاتعلقی سے جواب دیا۔ اس کے مزاج میں یہ عجیب سا روکھا پن کچھ روز سے در آیا تھا۔

"اچھا تھا کہ تم میری پلاننگ کے حساب سے چلتیں۔" ثمینہ نے بھی سنجیدگی سے کہا تھا۔

"سب کچھ آپ کی پلاننگ کے حساب سے ہی تو ہو رہا ہے۔" ماوی نے پتھر پھوڑے تھے۔

"پھر بھی۔"

"پلیز ممی!" اس نے چڑ کر کہا تھا۔ "میں اس ساری صورت حال سے تنگ آ چکی ہوں۔ واقعی، جب چند روز بعد حویلی جانا ہے تو ابھی کیوں نہیں... اور آخر ان چند روز میں جلال سے حویلی والوں کے متعلق معلومات حاصل کر کے میں کر بھی کیا لوں گی۔"

"تم ابھی نا سمجھ ہو... جو میں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"نا سمجھ؟" ماوی نے زہر خند مسکراہٹ اچھالی۔ "آپ اپنی اسی نا سمجھ بیٹی کو جنت بی بی کا منہ توڑنے بھیج رہی ہیں یاد رہے۔"

"تم کس قدر ضدی اور بدتمیز ہو گئی ہو ماوی۔" ثمینہ نے جیسے صدمے کی کیفیت میں کہا تھا۔

ماوی ایک بار پھر ہنسی۔

"کاش! میں ضدی ہوتی۔ حیرت ہے آپ کو ابھی بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ میں ضدی ہوتی تو آپ کی پروا ہی نہ کرتی اور جہاں تک بدتمیزی کی بات ہے... تو معاف کیجیے گا۔ اس طرح کی ذہنی حالت کے ساتھ میں کسی تمیز کا مظاہرہ نہیں کر سکتی۔" ماوی نے صاف گوئی سے کہا۔

ثمینہ اس کے چہرے کی طرف دیکھے گئیں۔ یہ ان کی ماوی تو نہیں تھی، اتنی ضدی، اتنی ہٹ دھرم... لیکن اگلے ہی پل وہ انہیں حق بجانب لگی، ایک انسان کو کسی بہت ہی نامساعد صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا جائے تو وہ شاید اس سے بھی زیادہ بری طرح رد عمل ظاہر کرے۔

"مجھے شہروز کا فون آیا تھا۔ تم اس کی کال ریسیو کیوں نہیں کر رہیں؟" ثمینہ نے بات ٹالتے ہوئے پوچھا۔

ماوی لحظہ بھر کے لیے ٹھٹکی پھر اس نے ثمینہ کا سوال ہی نظر انداز کرنے کی ٹھان لی۔

"مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے۔" اس نے چند لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ "میں یہ نہیں کہہ رہی کہ مجھے آپ کی باتوں کا اعتبار نہیں ہے۔ یقیناً جنت بی بی نے آپ پر بہت مظالم ڈھائے ہوں گے لیکن بابا جان کے قتل میں اس عورت کا ہاتھ ہے یا وہ اتنی ظالم ہو سکتی ہے، میرا دل ان باتوں پر اعتبار نہیں کر رہا۔ صرف آپ کی تسلی کے لیے میں حویلی جا رہی ہوں لیکن اگر آپ کی باتیں جھوٹ ثابت ہوئیں تو تو آپ ہمیشہ کے لیے مجھے کھو دیں گی ممی! اینڈ اٹس آ پرامس۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا ہے؟" ثمینہ نے صدمے کی کیفیت میں پوچھا۔

"میں نے یہ ہرگز نہیں کہا۔" ماوی نے تیزی سے کہا "میں صرف اتنا کہہ رہی ہوں۔ میرے دل کو اعتبار نہیں آ رہا۔"

"ایک ہی بات ہے۔" ثمینہ نے سرعت سے اس کی بات قطع کی۔

"اور یہ میرے لیے بے حد دکھ کی بات ہے۔"

"ایموشنل نہ ہوں ممی! آپ کے مطالبات نے مجھے اب تک دکھی کیا ہوا ہے، لیکن میں نے تو اس طرح کی جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کیا۔"

اس نے چڑ کر کہا اور نیپکن ٹیبل پر پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ گو کہ اس کے دل میں بہت سے سوالات تھے۔ بہت سے شکوک و شبہات تھے لیکن کوئی چیز تھی جو ان تمام باتوں کا اظہار اسے ثمینہ کے سامنے کرنے سے روک رہی تھی۔ وہ ثمینہ کو الجھا ہوا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

☼ ☼ ☼

ثمینہ کو ماوی کی باتوں نے بے حد دکھ پہنچایا تھا۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، ماوی ان پر شک کر سکتی ہے۔ اب اس شک کے مداوے کا ایک ہی حل انہیں نظر آ رہا تھا۔ وہ فی الفور اٹھیں اور اپنے پورشن سے باہر آ گئیں۔

شام ڈھل رہی تھی اور نیلاہٹیں کھلے آسمان پر اپنے آشیانوں کی طرف لوٹتے پرندوں کی قطاریں گزر رہی تھیں۔ ثروت کی طرف جاتے ہوئے کچھ پل کے لیے ثمینہ دہرے خیالات کا شکار ہوئی تھیں۔

"کہیں ماوی کی باتیں درست تو نہیں..... کہیں ایسا تو نہیں کہ میں اپنا انتقام پورا کرنے کے لیے اپنی بیٹی کو موت کے منہ میں دھکیل رہی ہوں۔ نہیں، نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں یہ سب کچھ محض رجب کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے کر رہی ہوں۔ جنت بی بی کو سزا دلوانا محض میرا ہی خواب نہیں ہے۔ رجب بھی اس سے خوش ہوں گے۔"

ہر بار کی طرح اس بار بھی ثمینہ نے خود کو مطمئن کر لیا تھا یوں بھی وہ انتقام کے بپھرے ہوئے سمندر میں اتنا گہرا اتر چکی تھیں کہ کبھی کبھار سر اٹھانے والے ان خیالات کو رد کر دینا کچھ ایسا مشکل بھی نہ تھا۔

لاؤنج میں ہی ان کی ملاقات انیبا سے ہو گئی۔ وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

"السلام علیکم آنٹی! آپ دروازے میں کیوں کھڑی ہیں۔" انیبا نے خوش اخلاقی سے کہا تھا "اندر آئیں ناں۔"

"نہیں بیٹے!..... اندر آنے کا تو ٹائم نہیں ہے..... میں صرف آپ کی ممی کی خیریت معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔"

انیبا نے نرمی سے جواب دیا۔

"وہ الحمد للہ اب پہلے سے بہت بہتر ہیں لیکن ویک نیس کی وجہ سے ڈاکٹر نے سفر کرنے سے منع کیا ہے۔ شاید نیکسٹ منتھ یا نیکسٹ ٹو نیکسٹ منتھ واپس آ جائیں۔" انیبا نے تفصیل سے جواب دیا۔

"انیبا! کیا مجھے ثروت کا کانٹیکٹ نمبر مل سکتا ہے؟"

"شیور آنٹی! ویٹ اے منٹ۔" انیبا نے ٹیلی فون کے قریب پڑی ڈائری سے کاغذ کا پرزہ پھاڑا اور نمبر لکھ کر ثمینہ کی طرف بڑھا دیا۔

ثمینہ نے شکریہ کہہ کر چٹ پکڑ لی۔ نمبر کو ذہن نشین کرتے ہوئے ان کا دماغ کئی باتیں سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"لو! بات کرو۔"

ماوی اپنے گیلے چہرے کو تولیے سے تھپک رہی تھی جب ثمینہ نے سیل فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

ماوی نے ایک نظر سیل فون پر ڈال کر ثمینہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن بھرا استفہام تھا۔ اگلے ہی پل اس نے ثمینہ کے ہاتھ سے سیل فون لے کر کال ڈسکنیکٹ کی اور فون لاپروائی سے بیڈ پر اچھال دیا۔

"اگلی بار شہروز کا فون آئے تو کہہ دیجیے گا، میں اسے خود کال کر لوں گی..... ابھی میرا بات کرنے کا موڈ نہیں ہے۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو گئیں ماوی!" ثمینہ نے چڑ کر کہا۔

"اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے۔" ماوی نے لاپروائی سے کہا۔ "موڈ نہیں ہے تو نہیں ہے۔ اب کیا اس معاملے میں بھی مجھے آپ کی زبردستی ماننا پڑے گی۔"

"میں نہیں سمجھ پا رہی کہ آخر تم شہروز سے بات کیوں نہیں کر رہیں؟" ثمینہ کے لہجے میں الجھن تھی۔

"کیونکہ اگر میں اس سے بات کروں گی تو اس سے جھوٹ بولنا میرے لیے ممکن نہیں ہو گا۔ کیا آپ چاہتی ہیں، میں اسے سب کچھ بتا دوں؟" ماوی نے بات گھماتے ہوئے کہا تھا۔

ثمینہ خاموش سی ہو گئیں۔ بات تو درست کہہ رہی تھی وہ۔

"ٹھیک ہے۔ شہروز سے بات مت کرو لیکن تمہیں دیکھنا تو چاہیے تھا، فون پر دوسری طرف کون تھا۔"

"کون تھا؟" ماوی ٹھٹکی۔

"ثروت..... میں ثروت سے تمہاری بات کروانا چاہ رہی تھی۔" ثمینہ نے تحمل سے جواب دیا۔

"ثروت آنٹی سے؟" ماوی حیران ہوئی۔ "لیکن کیوں؟"

"تاکہ جنت بی بی کے بارے میں کچھ حقائق وہ بھی تمہیں بتا سکے۔ تمہیں اپنی ماں کی باتوں پر تو اعتبار نہیں آیا۔ ممکن ہے ثروت کی باتوں پر آ جائے۔" ثمینہ نے کہا تو ماوی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"ممی! آپ مجھے مینٹلی کتنا ٹارچر کرنا چاہتی ہیں؟" چند منٹ بعد اس نے صدمے کی کیفیت میں کہا تھا۔ "ایک بات آپ سے شیئر کرنے کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں تھا کہ گواہیاں لانا شروع کر دیں..... کیا ہو گیا ہے آپ کو ممی! کیوں اتنا ڈرامہ کری ایٹ کر رہی ہیں۔ ایک نارمل انسان ہوتے ہوئے ایب نارمل بی ہیو کیوں کرنا شروع کر دیا ہے آپ نے؟"

"میں ایب نارمل نہیں ہوں..... مجھے تو ایسا لگتا ہے ٗ تم ایب نارمل ہو ٗ جس میں کوئی احساس ہی باقی نہیں ہے۔" ثمینہ نے اس سے زیادہ تڑخ کر کہا۔

"تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو ایک منٹ نہ لگاتا اپنے باپ کے قاتل کو سزا دلوانے میں اور ایک تم ہو ٗ جس کو کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔"

"مجھے فرق نہ پڑتا تو آپ کی بات مان کر جلال سے نکاح کی ہامی نہ بھرتی۔" ماوی نے جل کر کہا "آپ ہی کی بات مان کر میں حویلی جا رہی ہوں..... اس کے علاوہ آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں ٗ میں سمجھ ہی نہیں پا رہی۔"

"میں چاہتی ہوں ٗ تم میری باتوں پر اعتبار کرو۔ محض زبان سے ہی نہیں بلکہ دل سے بھی۔" ثمینہ نے اس بار لجاجت سے کہا تھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" ماوی نے اکتا کر کہا۔ "میں حویلی جا تو رہی ہوں ناں۔"

"وکیل کو جب تک اپنے کلائنٹ کی صداقت کا اعتبار نہ آ جائے ٗ وہ اچھا مقدمہ نہیں لڑ سکتا..... اسی لیے میں چاہتی ہوں ٗ تم ایک بار ثروت سے بات کر لو۔ جہاں مجھ پر اتنے احسان کر رہی ہو ٗ وہاں ایک اور سہی۔" ثمینہ نے عجیب سے انداز میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

ماوی نے ثمینہ کو کمرے سے باہر جاتے دیکھا ٗ پھر گہری سانس بھر کر سیل فون کو دیکھا۔ اب اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ فون اٹھاتی اور برضا و رغبت ثروت سے بات کرتی۔ بصورت دیگر اس کی ماں کا تاثر خراب ہونے کا خدشہ تھا اور ثمینہ سے ناراضی کے باوجود وہ ایسا ہرگز نہ چاہتی تھی۔

ماوی نے بددلی سے فون ملایا۔ وہ سمجھ نہ سکی ٗ ثمینہ نے ثروت کو اپنی زندگی کے رازوں میں شریک کرنے کے لیے کس طرح آمادہ کیا ہو گا۔ لیکن ثروت کے پاس جنت بی بی کے خلاف ایک طویل فرد جرم تھی ٗ جسے سن کر ماوی کے دل میں اس عورت کے لیے ناپسندیدگی بڑھی تھی۔ اسے جنت بی بی کی فطرت پر تعجب ہوا تھا اور ثمینہ کی طرف سے ملے ہوئے جذبہ انتقام میں کسی قدر اضافہ ہوا تھا۔

فون رکھ کر وہ کھڑکی کے پاس آ گئی۔ سامنے آسمان صاف تھا۔ ماوی کی پرسوچ نگاہیں اس آسمان کو کھوجنے لگیں۔ اپنی ماں کے مجبور کرنے پر اس نے زندگی کی سب سے بڑی بازی چلی تھی۔ اس نے حقیقتاً "اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ بعض اوقات ہم زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعے کو دوسروں کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں اور کبھی اچھی ٗ بری بات کا ذمہ دار تقدیر کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

ماوی سمجھ چکی تھی کہ اس کے ساتھ جو بھی ہو رہا تھا یا جو وہ کرنے جا رہی تھی ٗ وہ اس کی تقدیر کا لکھا تھا اور انسان کتنے بھی ہاتھ پیر مارے ٗ تقدیر سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ماوی نے خود کو تقدیر کے ہاتھوں میں دے دیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ تقدیر اسے کہاں لے جاتی ہے۔

آسمان کے کناروں پر تاریکی پھیل رہی تھی۔ دن کا اجالا تاریکی میں مدغم ہونے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹیلی فون کی گھنٹی سارے گھر میں گونج رہی تھی۔

انیبا کو فون ریسیو کرنے کے لیے بھاگتے ہوئے آنا پڑا تھا۔ تیز تیز سیڑھیاں اترنے سے اس کی سانس بھی پھول گئی تھی۔

"ہیلو....."

"فیضان بات کر رہا ہوں۔"

انیبا کا دل پوری قوت سے سکڑ کر پھیلا ٗ لیکن فوری طور پر وہ کچھ بول نہیں سکی۔ فیضان نے چند سیکنڈ انتظار کیا تھا۔

"ڈیڈی تو گھر پر نہیں ہیں۔ آپ ان کے سیل پر کانٹیکٹ کر لیں۔" معاً اس نے سرعت سے کہا تھا۔

"میں جانتا ہوں ٗ دانیال بھائی اس وقت گھر پر نہیں ہوتے اور ان کا سیل نمبر بھی ہے میرے پاس۔" فیضان نے تدبر سے کہا تھا۔

"تو پھر؟" وہ الجھی۔

"میں تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔"

"جی کہیے..... میں سن رہی ہوں۔" انیبا نے توقف کے بعد کہا تھا۔

"میں دراصل یہاں آتے ہوئے بھی تم سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن بس..... اس وقت میری ذہنی حالت اتنی عجیب ہو رہی تھی۔" فیضان نے کھسیاہٹ بھرے انداز میں کہا۔ "کہ میں خود کو کچھ بھی کہنے پر آمادہ ہی نہیں کر سکا۔ میں دراصل بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے تم پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا ٗ لیکن وہ بات ہی ایسی تھی انیبا! کہ میں اپنے غصے کو کنٹرول ہی نہیں کر سکا۔ گو کہ میں جانتا ہوں ٗ تم نے وہ تمام باتیں ٗ ماوی کی احمقانہ باتوں میں آ کر کی ہوں گی ٗ اس لیے مجھے اپنے اقدام پر زیادہ شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔"

انیبا نے ہمہ تن گوش ہو کر اس کی بات سنی۔ جملہ مکمل ہوتے ہی گہری سانس بھر کر بولی۔

"آپ شرمندہ نہ ہوں۔ آپ کی جگہ کوئی بھی دوسرا انسان ہوتا۔ وہ اسی طرح ری ایکٹ کرتا۔"

انیبا کا متوازن لہجہ فیضان کو چپ کروا گیا تھا۔

"تو کیا میں سمجھوں تم مجھ سے خفا نہیں ہو.....؟" چند منٹ بعد انہوں نے پوچھا۔

انیبا کسی قدر تلخی سے ہنس دی۔

"نہیں ہوں..... اور اگر ہوتی بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔"

"تمہاری ناراضی سے مجھے فرق پڑتا ہے انیبا! دوستوں کی ناراضی سے سب کو فرق پڑتا ہے ٗ پھر اپنی اس حرکت کے لیے میں بہت گلٹی فیل کر رہا ہوں۔" فیضان نے تیزی سے کہا تھا۔

"آپ گلٹی نہ ہوں..... میں ناراض نہیں ہوں۔ آپ نے جو کیا ٗ وہ ٹھیک تھا ٗ کیونکہ اس وقت آپ حق بجانب تھے مجھے واقعی اس طرح کی بات کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اپنے جذبے مجھے خود تک محدود رکھنے چاہیے تھے۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ آپ کو شریک کرتی....."

اس کا لہجہ تلخ نہیں۔ لیکن دوٹوک ضرور تھا۔ فیضان سے اس سلسلے میں مزید کچھ کہا نہ گیا۔ وہ انیبا سے اس طرح کے رویے کی توقع ہرگز نہیں کر رہے تھے۔

"اچھا تو کیا میں سمجھوں..... تم واقعی خفا نہیں ہو؟" چند منٹ بعد انہوں نے دوبارہ پوچھا۔ اس بار انیبا خوش دلی سے ہنس دی۔

"بار بار ایسا پوچھ کر آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ دوستی تک ٹھیک ہے ٗ لیکن اب اتنی بھی اہم نہیں ہوں میں کہ آپ میری ناراضی کی اتنی پروا کریں۔"

"کیا میں دوبارہ فون کر سکتا ہوں؟" فیضان نے بے ساختہ پوچھا۔

"ضرور..... لیکن کس لیے؟" وہ الجھی۔

"اپنے دل کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ تم مجھ سے سچ مچ خفا نہیں ہو اور محض فارملٹی نہیں نبھا رہیں۔"

"ٹھیک ہے... آپ کا جب دل چاہے مجھے فون کرلیں۔"

مزید چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انیبا نے فون بند کردیا اور فون سیٹ کو دیکھتی رہی۔ اس کا دل عجیب سا ہو رہا تھا اور وہ سمجھ نہیں پارہی تھی کہ فیضان کی کال نے اسے خوشی پہنچائی ہے یا نہیں۔

☼ ☼ ☼

تیسرے روز ماوی، جنت بی بی کی حویلی جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

یہ صبح کے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ تیز چمکیلی دھوپ نے ہر طرف پہرہ گاڑ رکھا تھا۔ ثمینہ نے دیکھا، ماوی بے حد سنجیدہ اور لاتعلق سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے سیاہ جینز پر براؤن کرتا پہنا تھا۔ براؤن ہی لیدر بیگ دائیں کاندھے پر لٹک رہا تھا۔ سن گلاسز اس کے ایک ہاتھ میں تھے جب کہ دوسرے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر وہ تیزی سے میسجز ٹائپ کررہی تھی۔

"بی بی جی! سامان گاڑی میں رکھ دیا ہے۔" ڈرائیور کے کہنے پر ماوی نے اثبات میں سر ہلایا اور اسی مصروفیت کے انداز میں گاڑی کی طرف بڑھی۔ ثمینہ کو اس کی لاتعلقی نے دکھ دیا تھا۔

"مجھ سے مل کر بھی نہیں جاؤگی؟" ثمینہ نے تیزی سے پوچھا۔ ماوی نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ ناراضی اپنی جگہ لیکن پہلی بار وہ ماں سے دور جارہی تھی۔ دل خود بخود گداز ہوگیا۔

وہ واپس پلٹی اور ثمینہ سے لپٹ گئی۔

ثمینہ نے بہت شدت سے اسے خود سے لپٹایا تھا۔

اپنی مرضی کے عین مطابق ہر فیصلہ کروالینے کے بعد بالآخر ثمینہ بے چینی کا شکار ہوگئی تھیں۔

"وہاں اپنا بہت خیال رکھنا... میں جانتی ہوں۔ تمہیں وہاں بھیج کر میں بہت بڑا رسک لے رہی ہوں، لیکن رجب کی قاتل کو سزا دلوانا میری زندگی کی سب سے بڑی، بلکہ واحد خواہش ہے۔"

ثمینہ کے لہجے میں بے حد بے چارگی تھی۔ ماوی کوشش کے باوجود بھی اپنے ہونٹوں پر نمودار ہونے والی طنزیہ مسکراہٹ کو روک نہیں سکی، پھر اس نے خفیف سا جھک کر ——— ماں کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"اپنا خیال رکھیے گا ممی!"

وہ سرعت سے پلٹی اور گاڑی میں سوار ہوگئی۔ ڈرائیور نے گاڑی پیچھے کی اور تیزی سے گیٹ سے باہر نکال لے گیا۔ ثمینہ کی نظریں اس وقت تک گاڑی کا تعاقب کرتی رہیں، جب تک گاڑی کے پیچھے رہ جانے والی ہلکی سی دھول بھی ختم نہ ہوگئی۔

ان کے دل کی حالت حقیقتاً" عجیب ہورہی تھی۔ کچھ بے چینی، کچھ اضطراب، تھوڑی سی آس اور بہت سی دعائیں۔

جوں ہی وہ اندر جانے کے لیے پلٹیں، انیبا کو دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

"آنٹی! ماوی کہاں گئی ہے؟ میرا مطلب ہے مجھے اس سے کچھ ضروری کام تھا۔ کب تک واپس آئے گی وہ؟" انیبا ذرا عجلت میں تھی۔

ثمینہ اس سوال پر قدرے گڑبڑا گئیں۔

"واپسی کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی، کیونکہ ماوی بارہ بجے کی فلائٹ سے واپس ڈبلن جارہی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ واپس آئے گی، کیونکہ چار روز بعد تو میری بھی فلائٹ ہے۔" ثمینہ کی سمجھ میں فوری طور پر جو بہانہ

آیا انہوں نے کہہ دیا۔

"ماوی ڈبلن جارہی ہے... اتنی اچانک؟" انیبا کو بہت ہی حیرانی ہوئی تھی۔ "حیرت ہے ماوی نے مجھ سے تو ذکر ہی نہیں کیا۔"

"ہاں! بس اس کا اچانک واپسی کا پروگرام بن گیا۔ میری بیٹی ہر روٹین سے جلدی اکتا جاتی ہے۔" ثمینہ نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش غیر محسوس انداز میں کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو چاہ رہی تھی ہم دونوں کو ایک ہی فلائٹس کی سیٹیں مل جائیں، لیکن مجھے چار دن بعد کی سیٹ ملی ہے۔ اپنے ڈیڈی سے کہنا، توقیر چند روز میں تم لوگوں کے سارے ڈیوز کلیئر کردے گا...."

ثمینہ جلدی جلدی وضاحتیں دیتی اپنے پورشن کی طرف چلی گئیں۔ یوں جیسے پیچھا چھڑوانا چاہ رہی ہوں۔ انیبا نے الجھن بھری نظروں سے انہیں جاتے دیکھا تھا۔ وہ اسے کچھ پراسرار سی لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

صبح گیارہ بجے شروع ہونے والے سفر کا اختتام شام سوا چار بجے ہوا تھا۔ دھول اڑاتے کچے پکے راستوں پر سفر کرتی ہوئی گاڑی چوہدری دلاور حسین کی حویلی کے سامنے آکر رک گئی تھی۔

اور پتا نہیں سفر ختم ہوا تھا یا شروع ہورہا تھا۔ گاڑی سے اترتے ہوئے ماوی نے سوچا۔ اس کے عین سامنے حویلی کا پھاٹک نما قد آدم دروازہ تھا۔ پشت پر ڈھلتے سورج کی روشنی تھی جو اس کے عقب سے نکل کر پھاٹک پر پڑ رہی تھی۔ پھاٹک کی لوہے کی سلاخیں اس روشنی سے چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔

پھاٹک کے دونوں جانب ناریل کے درخت تھے جو پھاٹک پر جھک آئے تھے۔ پھاٹک کے دوسری جانب طویل سرخ پتھروں کی روش تھی۔ پھاٹک کے قریب ہی دو بھیانک شکاری کتے موٹی زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ جنہوں نے اجنبیوں کی خوشبو پاتے ہی زور زور سے بھونکنا شروع کردیا تھا۔

اپنے تمام تر اعتماد کے باوجود ماوی کسی قدر گھبراہٹ کا شکار تھی، جس کا اظہار اس کے چہرے سے بالکل نہ ہوتا تھا مگر رہی سہی کسر ان کتوں نے پوری کردی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ تب ہی پھاٹک سے متصل چھوٹا دروازہ کھول کر حویلی کا ملازم باہر نکلا۔

ماوی نے دیکھا، اس نے گرم چادر کے ساتھ کندھے پر بندوق بھی اٹھا رکھی تھی۔

"میرا نام ماوی رجب علی ہے۔ میں آئرلینڈ سے آئی ہوں۔ مجھے حویلی کے مالکوں سے ملنا ہے۔" ماوی نے بے اعتمادی کے ساتھ ملازم سے کہا۔ وہ اسے انتظار کرنے کا کہہ کر اندر چلا گیا۔ اس دوران ماوی نے ڈرائیور سے اپنا سامان اتارنے کے لیے کہا۔ سامان اتر چکا تو اس نے ڈرائیور کو کرائے کی رقم ادا کی اور جانے کے لیے کہہ دیا۔

اتنی دیر میں وہ ملازم بھی واپس آچکا تھا۔

"مالکوں میں سے کوئی موجود نہیں ہے۔"

"کب تک آجائیں گے تمہارے مالک؟"

"صاحب لوگ ہیں۔ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔" ملازم نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے! میں انتظار کرلیتی ہوں۔ کیا میں اندر بیٹھ کر انتظار کرسکتی ہوں؟"

"اجازت ملے بغیر آپ اندر نہیں بیٹھ سکتیں۔" ملازم نے کہا۔ "آپ دوبارہ آجائیں۔"

"تمہیں پتا ہے، آئرلینڈ جانے اور پھر واپس آنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟ میرا کیا دماغ خراب ہے کہ پہلے واپس
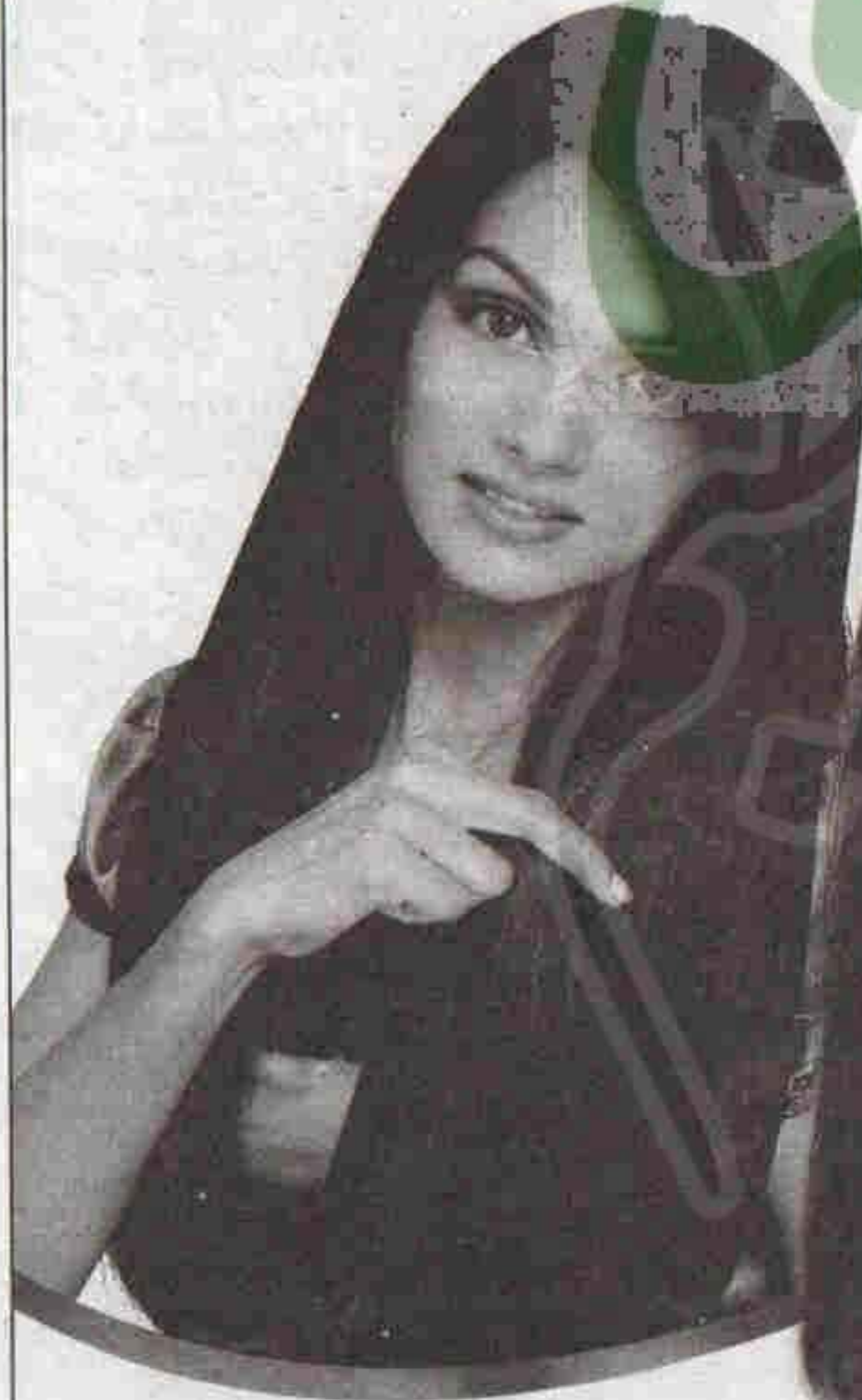
جاؤں، پھر آؤں۔۔۔ حویلی کی عورتوں میں سے تو ضرور کوئی موجود ہوگی۔ ان کو جا کر بتاؤ! ماوی رجب علی آئی ہے اور جنت بی بی سے ملنا چاہتی ہے۔" ماوی نے چڑ کر کہا تھا۔

لمبی چوڑی بحث کے بعد بالآخر ملازم اسے اندر لے آیا تھا اور حویلی کے مرکزی باغ میں پڑی کرسیوں پر بیٹھ کر انتظار کرنے کا حکم دے کر چلا گیا تھا۔ اتنی کوفت کیا کم تھی کہ اس کے بعد خواتین ملازماؤں نے آکر انکوائری شروع کر دی۔

"اب میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔ اندر جاؤ اور جا کر جنت بی بی کو بتاؤ! ماوی رجب علی ان سے ملنے آئی ہے۔" چوتھی مرتبہ جب ملازمہ اس سے کچھ پوچھنے آئی تو ماوی نے پھٹ پڑنے والے انداز میں کہا تھا۔ ملازمہ اپنا سا منہ لے کر واپس چلی گئی۔

ماوی غصے اور اکتاہٹ سے ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ تھوڑی دیر گزری ہوگی، اسی ملازمہ کے ہمراہ ایک بہت خوبصورت لڑکی اس کے پاس آگئی۔

"السلام علیکم۔۔۔ معاف کیجئے میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" ماوی گویا جھوم ہی اٹھی۔ جتنی وہ خوبصورت تھی، اس سے زیادہ دلکش آواز تھی اور خوبصورتی بذات خود کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ ماوی نے کچھ دیر پہلے ہلکی کوفت کو جھڑتے محسوس کیا تھا، لیکن ساتھ ہی اسے وہ چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا تھا، شاید وہ اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکی تھی۔

"آپ مجھے نہیں پہچان سکتیں۔۔۔ مختصر تعارف یہ ہے کہ میرا نام ماوی رجب علی ہے، میں آئرلینڈ سے آئی ہوں اور جنت بی بی سے ملنا چاہتی ہوں۔۔۔ اور دوسری بات یہ کہ آپ لوگوں کے ملازمین بہت ہی ناسمجھ اور irritating ہیں۔ پچھلے تین گھنٹوں سے انہوں نے سوال پوچھ پوچھ کر میرا دماغ پلپلا کر دیا ہے۔۔۔"

ماوی کی بات پر وہ لڑکی ہنسی۔ جھرنوں سی دلکش ہنسی تھی۔

"ملازمین کی اتنی زیادہ غلطی نہیں ہے۔ انہیں تو جو حکم ملتا ہے، وہی کرتے ہیں اور بغیر انکوائری کے کسی اجنبی کو حویلی میں آنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"ایک بار جنت بی بی سے ملاقات ہو جائے، سب کو پتا چل جائے گا، میں اس حویلی کے لیے کتنی اجنبی اور غیر ہوں۔۔۔" ماوی نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ لڑکی کی آنکھوں میں الجھن سمٹ آئی۔

"میں کچھ سمجھی نہیں۔۔۔ کیونکہ میں تو آپ کو بالکل بھی نہیں پہچان پا رہی۔"

ماوی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ لڑکی جو خود کو جنت بی بی بتا رہی تھی، بمشکل اٹھارہ یا انیس سال کی رہی ہوگی۔ وہ جس جنت بی بی کی تلاش میں اس حویلی تک آئی تھی یقیناً "یہ وہ نہیں تھی اور اگر یہ وہ نہیں تھی تو پھر خود کو جنت بی بی کیوں کہہ رہی تھی۔ کوئی گڑبڑ سی گڑبڑ تھی، کیونکہ ماوی کے ذہن میں کوندا سا لپکا تھا۔ اسے یاد آگیا تھا، اس لڑکی کا چہرہ اسے جانا پہچانا کیوں لگا تھا۔

یہ لڑکی سلطانہ آنٹی کے کالج میں پڑھتی تھی اور جب ماوی ان سے ملنے آئی تھی تو اس نے اس لڑکی کو دیکھا تھا لیکن اس کا نام جنت نہیں تنوی تھا۔۔۔ اب وہ تنوی تھی یا جنت۔۔۔ ماوی سمجھ نہیں پا رہی تھی اور الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہی حال تنوی کا تھا۔

باقی آئندہ شمارے میں

مہوش افتخار

ضبطِ عشق

پانچ سال بعد شاہ نواز نے ایک شاپنگ سینٹر میں زرمین کو اس کے شوہر کے ساتھ دیکھا تو پرانے زخم تازہ ہو گئے۔ زرمین بھی اسے دیکھ کر بوکھلا گئی تھی۔

شاہ نواز کو یونیورسٹی میں وہ چہرہ نظر آیا' جس نے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ وہ اس کے پیچھے لپکا لیکن وہ بھیڑ میں گم ہو گئی۔ شاہ نواز ملازم کے ساتھ تنہا رہتا ہے۔ اس کی خوشیاں اس کے والد کی ضد اور انا کی بھینٹ چڑھ گئیں تو اس نے اپنا گھر' اپنا شہر ہی چھوڑ دیا' عالم اس کا انتہائی مخلص دوست ہے' جو اس کے تمام حالات سے واقف ہے۔ عالم کے گھر میں اس نے زرمین کے شوہر یاور کو دیکھا۔

عالم نے شاہ نواز کی بہن رطابہ کو دیکھا تو پسندیدگی محسوس کی۔ رطابہ کو بھی وہ اچھا لگا۔

رائنہ یونیورسٹی میں شاہ نواز سے ملی تو اس نے انتہائی نفرت کا مظاہرہ کیا۔

زرمین کے شوہر یاور نے رائنہ کے والد کو فون کر کے زرمین کے حصہ کی جائیداد کا مطالبہ کیا۔ ان کے انکار پر انہیں دھمکیاں دیں' جس کی بنا پر انہیں دل کا دورہ پڑ گیا۔

شاہ نواز کو پتا چلا تو اس نے عالم کو دوستی کا واسطہ دے کر رائنہ سے شادی کرنے پر مجبور کیا' دوستی کی خاطر عالم نے یہ قربانی دی اور رائنہ سے شادی کر لی۔

مکمل ناول

۲

دوسری اور آخری قسط

شاہ زمان اور حیات احمد بچپن کے گہرے دوست تھے۔ ان کا تعلق ایک ہی شہر سے تھا۔ مگر غم روزگار نے انہیں ایک دوسرے سے دور ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ زمان صاحب نے جب اپنے ایک دوست کے ساتھ ایران کے بارڈر سے امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کیا تو انہیں اپنے بیوی بچوں سمیت کوئٹہ شفٹ ہونا پڑا۔ یوں حیات احمد کراچی میں اور شاہ زمان کوئٹہ میں سیٹل ہو گئے۔ مگر اس کے باوجود دونوں کی دوستی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔

فون پہ رابطے کے ساتھ ساتھ حیات احمد کا زمان کے دیگر فیملی ممبرز سے جن میں ان کے بہن بھائی اور والدہ شامل تھیں، ملنا ملانا تھا اور یہی حال زمان صاحب کا بھی تھا۔ وہ جب بھی کراچی آتے نہ صرف حیات بلکہ ان کی پوری فیملی سے اپنے بہن بھائیوں کی طرح ملتے۔ دونوں کے بیوی بچوں کے درمیان بھی خوب دوستی تھی۔ چونکہ دونوں کی شادی بھی آگے پیچھے ہی ہوئی تھی اس لیے بچے بھی تقریباً" ہم عمر ہی تھے۔

زمان صاحب کا بیٹا، شہباز بچوں میں سب سے بڑا تھا۔ جس کے بعد حیات احمد کی زرمین تھی۔ شاہ نواز، زرمین سے چھوٹا لیکن رائنہ سے بڑا تھا اور آخر میں زمان صاحب کی بیٹی رطابہ تھی جو کہ سارے بچوں میں سب سے چھوٹی تھی۔

حیات صاحب کا چونکہ کوئی بیٹا نہ تھا، اس لیے وہ شہباز اور شاہ نواز کو بیٹوں کی طرح ہی چاہتے تھے اور ان دونوں کو بھی، اپنے سگے چچاؤں سے زیادہ، حیات صاحب سے لگاؤ تھا۔ ان کی آپس میں اس درجہ محبت کو دیکھتے ہوئے زمان صاحب کے دل میں ایک خیال آیا تھا۔ جسے اپنی والدہ اور بیوی سے ڈسکس کرنے کے بعد انہوں نے حیات احمد اور عافیہ بیگم کے سامنے کہہ ڈالا تھا اور ان دونوں کو تو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی۔

زرمین کے لیے شہباز کا اور رائنہ کے لیے شاہ نواز کا رشتہ نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے ہامی بھرنے میں لمحہ نہ لگایا تھا اور یوں چاروں کی بات بچپن میں ہی طے پا گئی تھی۔ جس سے انہیں وقت آنے پر ہی آگاہ کیے جانے کا ارادہ تھا۔

پھر جب شہباز نے انٹر اور شاہ نواز نے میٹرک پاس کیا تب زمان صاحب نے از خود دونوں بیٹوں کو ان کی بچپن کی نسبت کے بارے میں آگاہ کر دیا تاکہ وقت آنے پر کسی قسم کی کوئی بدمزگی نہ ہو۔

زمان صاحب کے انکشاف نے پہلے پہل تو دونوں بھائیوں کو جی بھر کے حیران کیا مگر دھیرے دھیرے انہوں نے اپنے والدین کے اس فیصلے کو دل سے قبول کر لیا اور یوں ان دونوں کی رضامندی بھی اس رشتے میں شامل ہو گئی۔

شہباز چونکہ اس وقت اٹھارہ، انیس سال کا قدرے سنجیدہ نوجوان تھا اس لیے اس پہ یہ انکشاف اتنا اثر انداز نہیں ہوا تھا جتنا کہ شاہ نواز کے کمسن دل و دماغ پہ اس بات نے اپنا اثر دکھایا تھا۔ نتیجتاً" اس کے معصوم جذبوں نے بہت تیزی سے محبت تک کا سفر طے کیا تھا۔ ایسی طاقت ور محبت جس کی جڑیں اس کے روم روم میں پھیلی ہوئی تھیں۔ مگر جس سے رائنہ بے خبر تھی کہ حیات احمد اور عافیہ بیگم نے تب تک بچیوں سے اس بات کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ دونوں لڑکوں کو بھی زمان صاحب کی جانب سے مکمل

زبان بندی کی تاکید کی تھی۔

مگر جب زرمین سیکنڈ ایئر اور رائنہ میٹرک میں پہنچی تب زمان صاحب کی والدہ کی اچانک طبیعت خرابی نے انہیں حیات احمد سے نکاح کا مطالبہ کرنے پر مجبور کر دیا اور چونکہ یہ بی جان کی خواہش تھی اس لیے حیات صاحب اور عافیہ بیگم، دونوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی رضامندی دینی پڑی۔ مگر جب یہ بات رائنہ کے ساتھ ساتھ زرمین کے علم میں آئی تو گویا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں۔ یہ نکاح کبھی نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔"

عافیہ بیگم کی بات مکمل ہونے سے پہلے زرمین ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے چلائی "آپ لوگوں نے کیا سوچ کر ہماری زندگیوں کے فیصلے یوں بچپن میں کر ڈالے؟ ہم کیا جانور ہیں جو ہماری اپنی کوئی سوچ، کوئی مرضی نہیں؟"

بات کرتے کرتے اس کی آواز بھرا گئی تو اس کے لب و لہجے کی گستاخی کو عافیہ تحمل سے نظر انداز کر گئیں۔ وہ اس کی کیفیت کو بخوبی سمجھ سکتی تھیں۔ ہر بات میں اپنی من مانی کرنے والی ان کی اس بیٹی کے لیے یہ انکشاف حقیقتاً" خاصا شاکنگ تھا۔ اسی لیے وہ اس کی بات کا برا مانے بغیر نرمی سے بولیں۔

"ہم نے جو کیا، بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے بیٹا! تم دونوں ہماری اولاد ہو۔ ہم بھلا تم دونوں کے لیے کوئی غلط فیصلہ کر سکتے ہیں؟"

"بے شک کوئی غلط فیصلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن ہماری پسند ناپسند کو جاننا بھی تو آپ کا فرض ہے نا۔"

ان کے لہجے کی نرمی اس کی تندی پر بھی اثر انداز ہوئی تھی۔ جب ہی وہ اپنے اشتعال پہ قابو پاتے ہوئے قدرے آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔ مگر اس بار اس کے جملے نے عافیہ کو ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"کیا مطلب؟" نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی پیشانی پر بل نمودار ہو گئے۔

"م، مطلب یہ کہ مجھے شہباز اس لحاظ سے پسند نہیں۔" گھبراتے ہوئے اس نے بے اختیار ماں سے نظریں چرا لیں تو خاموش بیٹھی رائنہ نے سراسیمگی سے بہن کی جانب دیکھا۔ جس کے حال دل سے وہ بخوبی واقف تھی۔

"تو پھر کون پسند ہے؟" بے اختیار اس کی نظریں رائنہ کی جانب اٹھ گئیں۔ جس نے گردن کی خفیف سی جنبش سے اس سے خاموش رہنے کی استدعا کی تھی۔

"آئی، آئی مین میں نے اس کے بارے میں اس انداز سے کبھی نہیں سوچا امی!" لجاجت سے کہتی وہ ان کے برابر آ بیٹھی تو عافیہ کے چہرے پر پھیلے تناؤ میں قدرے کمی در آئی۔

"ہاں تو اب سوچ لو۔ دیکھو بیٹا! اچھی بیٹیاں ماں باپ کی رضا میں راضی ہوتی ہیں۔ کیونکہ ماں باپ کا تجربہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کی رگ رگ سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ ان کی خوشی، ان کا سکون والدین کی اولین ترجیح ہوتا ہے، اس لیے وہ اپنے طور پہ ان کے لیے بہتر نہیں بلکہ بہترین شخص کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں۔ پھر آگے ان کا نصیب۔

شہباز اور شاہ نواز ہمارے ہاتھوں کے پلے بچے ہیں۔ زمان بھائی اور نگہت تم دونوں کو رطابہ کی طرح چاہتے ہیں۔ عزت، دولت، گھربار کسی چیز میں کوئی کمی نہیں۔ اس لیے بیٹا! تم یہ بے معنی باتیں سوچ کر دل میلا نہ کرو کہ یہ رشتہ ہم نے بچپن میں کیوں طے کیا؟ یا تم لوگوں کو اب تک بتایا کیوں نہیں؟ بلکہ تم دونوں اس رشتے کے مثبت پہلوؤں پہ غور کرو۔ اس بات کا شکر ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے گھر بیٹھے تم دونوں کو اتنے اچھے شریک سفر دیے ہیں۔"

پیار سے اس کے بال سنوارتے ہوئے انہوں نے انتہائی نرم لہجے میں اپنے جذبات سے لے کر اپنے اس فیصلے کے محرکات تک، ہر چیز واضح الفاظ میں بیان کر ڈالی تھی۔ جسے سن کر رائنہ تو دل سے قائل ہو گئی تھی مگر زرمین۔

"پلیز امی! آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں....."

"بس زرمین! بہت ہو گیا! میرا خیال تھا کہ مجھے اب اور کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن تم نے تو زبان درازی کی حد کر دی ہے۔ ہمیں سمجھنے کے لیے تمہاری ضرورت نہیں بلکہ زندگی کی اونچ نیچ سمجھنے کے لیے تمہیں ہماری ضرورت ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم یہ سوچنے سمجھنے کا کام ہم پر چھوڑ دو۔ اور اپنی حد میں رہو' دوبارہ میں اس موضوع پہ تمہارے منہ سے ایک لفظ نہ سنوں' سمجھیں!"

اس کی تکرار پہ وہ قطعی لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے اٹھ کر کمرے سے نکلتی چلی گئی تھیں اور پیچھے سختی سے لب بھینچے ہوئے زرمین تنفر سے بیڈ پہ مکا مارتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

"پلیز زرمین رو مت۔" رائنہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے چپ کروانے کی سعی کی تھی۔ مگر وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے مسلسل روتی چلی گئی تھی۔

"دیکھو! امی صحیح کہہ رہی ہیں۔ ان رشتوں میں حقیقتاً" کوئی کمی نہیں اور شہباز بھائی تو تو ڈاؤٹ ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہیں۔ بلکہ اگر ایمان داری سے دیکھا جائے تو وہ اس یاور ملک سے تو ہزار درجے بہتر ہیں۔ پتا نہیں تمہیں یہ شخص......"

وہ منہ بناتے ہوئے پہلی بار اپنے دل کی بات زبان پر لانے کی جرأت کر سکی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ مکمل کر پاتی۔ زرمین چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے چلائی تھی۔

"شٹ اپ! جسٹ شٹ اپ! تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم یاور کا مقابلہ اس تھرڈ کلاس آدمی سے کرو؟ میں نے اگر اپنی فیلنگز تم سے شیئر کرنے کی غلطی کر ڈالی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم میرے سر پہ چڑھ جاؤ!" بلند آواز سے بولتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"اور اگر ہمارے پیرنٹس ہمیں دوستوں کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں تو اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ تم ان کے سر پہ چڑھ جاؤ۔ اینڈ فار یور کائنڈ انفارمیشن...... تھرڈ کلاس شہباز بھائی نہیں بلکہ تمہارے یاور صاحب ہیں جنہیں اپنی چھوٹی بہن کی فرینڈ سے عشق لڑاتے ہوئے شرم بھی نہیں آئی۔"

اسے یک لخت نجانے کیا ہوا تھا جو وہ آج پہلی بار دوبدو جواب دینے پر اتر آئی تھی۔ مگر سدا کی خود سر زرمین کے لیے اس کی یہ جرأت ناقابل برداشت تھی جبھی اس کا ہاتھ اٹھا تھا اور رائنہ کے دائیں گال پہ اپنا نقش چھوڑ گیا تھا۔

"تم اب مجھے طعنے دو گی۔" اس نے دانت پیستے ہوئے گال پہ ہاتھ رکھے ہکا بکا کھڑی رائنہ کو آگ برساتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"یہ میری زندگی ہے اور میں اسے صرف اپنی مرضی کے لائف پارٹنر کے ساتھ گزاروں گی۔ اینڈ یو اسٹے آؤٹ آف مائی بزنس۔ انڈر اسٹینڈ!" انگلی اٹھا کر وارننگ دیتی وہ کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ ساکت کھڑی رائنہ کی بے یقین آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اگلے ہی لمحے وہ قریب پڑے کاؤچ پر گرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"واٹ؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟" یاور ملک کی آنکھیں بے یقینی کے باعث پھٹ سی گئی تھیں۔

وہ رات زرمین کے کہنے پہ 'اسے آج دوپہر کالج آف ہونے کے بعد گیٹ سے پک کرتا ہوا آئس کریم پارلر لیے چلا آیا تھا۔ جبکہ گھر میں اس نے چھٹی کے بعد پریکٹیکل کا بہانہ بنا دیا تھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اگلے ہفتے میرا نکاح ہے۔" اپنی سرخ ہوتی ناک ٹشو سے صاف کرتے ہوئے اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں اسے مطلع کیا۔

"آئی کانٹ بلیو دس۔ تمہارے پیرنٹس ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟"

اسے اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا تھا۔ یہ سونے کی چڑیا اتنی آسانی سے اس کے ہاتھوں سے نکل جائے گی۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا۔

"وہ ایسا کر چکے ہیں۔ آج نہیں بلکہ ہمارے بچپن میں ہی۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا تو یاور بے اختیار سر تھام کر رہ گیا۔

"تم نے اپنی امی سے بات کرنے کی کوشش کی؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے سر اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

"کی تھی۔ انہیں یہ تک کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے اس لحاظ سے پسند نہیں۔ لیکن وہ میری کسی بات کو اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ ان فیکٹ انہوں نے مجھے وارن کر دیا ہے کہ وہ اب میرے منہ سے اس موضوع پہ ایک لفظ مزید نہیں سنیں گی۔"

اس نے بے بس سے لہجے میں جواب دیا تو یاور لب بھینچ کر رہ گیا۔

"آپ کہیں تو میں آپ کے متعلق امی سے......"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔" یاور نے تیزی سے اسے ٹوک دیا۔ "اگر انہیں اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی کہ تم کسی اور میں انٹرسٹڈ ہو تو شاید وہ اگلے ہفتے کے بجائے کل ہی تمہارا نکاح کر دیں گے اور ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔"

"تو پھر میں انہیں کس طرح روکوں؟" وہ روہانسی ہو گئی تھی اور یاور سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"ایک طریقہ ہے۔" چند لمحوں کی سوچ بچار کے بعد اس نے سر اٹھایا تو زرمین سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

اس کے شیطانی دماغ نے اس مصیبت سے نکلنے کا زبردست حل نکالا تھا۔ جس کے زیر اثر اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر اطمینان لوٹ آیا تھا۔

"کیا مطلب؟" زرمین نے الجھن بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے اسے اپنے پلان سے آگاہ کرنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

آنے والے دنوں میں بڑی عجیب سی بات ہوئی تھی۔ زرمین نے اس موضوع پہ مزید کوئی بحث' کوئی رونا دھونا نہیں مچایا تھا۔ جس پہ عافیہ نے تو اطمینان کا سانس لیا تھا۔ لیکن رائنہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ الجھ بھی گئی تھی۔ اس کے لیے زرمین جیسی ضدی لڑکی کا یوں اچانک خاموش ہو جانا' خاصے اچنبھے کا باعث تھا۔ مگر وہ چاہ کر بھی اپنی حیرت کو زبان نہیں دے سکی تھی کہ زرمین اس سے مکمل طور پر بات چیت بند کیے ہوئے تھی۔

گھر میں اب فنکشن کی تیاریاں زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ چونکہ یہ صرف نکاح کی تقریب تھی اس لیے بہت بڑے پیمانے پر ارینج نہیں کی جا رہی تھی۔ مگر نہ نہ کرتے ہوئے بھی خاندان والوں' قریبی رشتے داروں اور چند ایک دوستوں کی اچھی خاصی گیدرنگ ہو گئی تھی۔ راشد اور اس کی فیملی کے سوا کوئی بھی مہمان شہر کے باہر سے آنے والا نہ تھا۔ زمان صاحب بھی اپنی فیملی سمیت نکاح سے ایک دن پہلے پہنچنے والے تھے۔

دونوں بچیوں کی پڑھائی کا زیادہ حرج نہ ہو' اس لیے عافیہ بیگم نے انہیں نکاح سے محض دو دن پہلے چھٹیاں لینے کی تاکید کی تھی' جو کہ کل سے شروع ہونے والی تھیں۔ سو آج ان دونوں کا اپنے اسکول اور کالج میں آخری دن تھا۔ جس کا روٹین کے مطابق آغاز ہوا تھا۔

نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کے عافیہ سات بجے کے قریب حیات صاحب کو جگانے کے بعد ان دونوں کے کمرے میں چلی آئی تھیں۔ دروازے میں کھڑے کھڑے انہیں ایک دو آوازیں دے کر وہ خود ناشتے کی تیاری کے سلسلے میں کچن میں چلی گئی تھیں۔ جب تھوڑی دیر بعد رائنہ کے زور زور سے پکارنے پر وہ اور حیات احمد دونوں بوکھلا کر ان کے کمرے کی جانب بھاگے تھے۔

ایک جھٹکے سے دروازے کو دھکیلتے وہ آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ مگر روتی ہوئی رائنہ اور بے سدھ پڑی زرمین کو دیکھ کے ان دونوں کے پیروں تلے گویا زمین نکل گئی تھی۔

زندگی قطروں کی صورت اس کے غافل وجود میں اتاری جا رہی تھی۔ جبکہ اس کے سرہانے موجود تینوں

نفوس شاک اور بے یقینی کے زیر اثر بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ رائنہ اور عافیہ بیگم کا ڈر اور پریشانی تو پھر بھی آنسوؤں کی صورت بہہ رہا تھا۔ لیکن حیات احمد تو دونوں ہاتھوں میں سر گرائے بالکل ساکت بیٹھے تھے۔

زرمین نے اس رشتے پہ ماں سے بحث کی تھی' اتنا تو ان کے علم میں تھا۔ لیکن اتنا بڑا قدم؟ سوچ سوچ کے ان کا دماغ ماؤف ہو چلا تھا۔ لیکن کوئی جواز انہیں سجھائی نہ دے رہا تھا۔ بجز اس کے کہ وہ کسی اور کو چاہتی ہو اور یہ جواب ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ بھی اس صورت میں جبکہ دو دن بعد نکاح تھا اور اگر اس بات کی بھنک بھی زمان کو لگ جاتی تو...؟ اور اس تو کے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتے تھے۔

ان کی اپنی بیٹی نے تو ان کی عزت کے ساتھ ساتھ اپنی اور اپنی بہن کی زندگی داؤ پر لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ مگر یہ اللہ کی ان پہ خاص رحمت ہی ہوئی تھی جو ان کے دوست ڈاکٹر مظہر سے ان کا بروقت رابطہ ہو گیا تھا اور انہوں نے نہ صرف پوری چویشن کو ہینڈل کر لیا تھا۔ بلکہ پولیس کیس سے بچنے کے لیے اسے فوڈ پوائزننگ کا کیس بھی بنا دیا تھا۔

ان دونوں نے بھی خاندان میں سب کو یہی جواب دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ جس میں حیات صاحب اور عافیہ بیگم کے بہن بھائی تک شامل تھے۔ کیونکہ اس معاملے میں کسی پر بھی بھروسا کرنا بہت بڑا رسک لینے کے مترادف تھا اور انہیں اپنی بیٹیوں کا مستقبل اور عزت ہر چیز سے بڑھ کے تھی۔ جبکہ کم عمر سی رائنہ کے دل میں ڈر اور خوف نے اس حد تک ڈیرا جما لیا تھا کہ وہ چاہ کر بھی ماں باپ کو کچھ نہ بتا سکی تھی۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں تم نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا؟"

کڑی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے حیات احمد نے سخت لہجے میں استفسار کیا تو تکیوں کے سہارے نیم دراز زرمین نگاہیں جھکا گئی۔ جبکہ کاؤچ پہ گم صم سی بیٹھی عافیہ اک گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

وہ لوگ ابھی کچھ دیر پیشتر زرمین کو لے کر گھر پہنچے تھے۔ جسے ڈاکٹر مظہر نے بارہ گھنٹے انڈر آبزرویشن رکھنے کے بعد ڈسچارج کر دیا تھا۔

"جواب دو زرمین! ورنہ آج تم پہ میرا ہاتھ اٹھ جائے گا۔"

انہوں نے دھیمے لیکن انتہائی سرد لہجے میں وارننگ دی تو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ بے اختیار اس کی خوف زدہ نظریں خاموش بیٹھی ماں کی جانب اٹھی تھیں۔ لیکن ان کے چہرے کے تاثرات اس کا حلق خشک کر گئے تھے۔

"وہ پاپا! میں نے امی کو بتا دیا تھا۔" تھوک نگلتے ہوئے وہ بمشکل تمام کہہ سکی تھی۔

"کیا بتا دیا تھا؟" ان کے کڑے تیوروں میں رتی برابر فرق نہ آیا تھا۔

"یہی کہ میں' میں شہباز سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔" اپنا جواب دہراتے ہوئے وہ باپ کے سامنے بے اختیار نظریں جھکا گئی تھی۔ لیکن ان کا اگلا سوال اسے چار سو والٹ کا کرنٹ لگا گیا تھا۔

"تو پھر کس سے کرنا چاہتی ہو؟" اور وہ حیرت سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی تھی جس پہ برف سی ٹھنڈک پھیلی ہوئی تھی۔

یک لخت اسے یاور کی بات سو فیصد درست لگی تھی۔ واقعی اگر انہیں اس حقیقت کی بھنک بھی پڑ جاتی کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے تو شاید وہ دو دن بعد کے بجائے کل ہی اس کا نکاح پڑھوا دیتے اور پھر وہ دونوں کچھ بھی نہ کر پاتے۔ ان دونوں کا مقصد اس نکاح کو رکوانا تھا' چاہے اس کے لیے اسے جھوٹ کا سہارا ہی کیوں نہ لینا پڑ جاتا۔

"ک' کسی سے بھی نہیں۔" اس نے اٹکتے ہوئے جواب دیا تھا۔ لیکن ان کی آنکھوں میں پھیلی بے یقینی اس سے وضاحت کی متقاضی تھی۔

"آئی' آئی مین پاپا' آپ جس سے چاہیں اور جب چاہیں میری شادی کر دیں لیکن شہباز بھائی سے نہیں ..... پلیز پاپا!"

وہ ملتجیانہ انداز میں گویا ہوئی تو حیات احمد نے اندر

ہی اندر شکر کا سانس لیا ورنہ اگر ان کا بد ترین خدشہ درست ثابت ہو جاتا تو پتا نہیں وہ کیا کر بیٹھتے۔ دوسری جانب یہی حال عافیہ بیگم کا تھا جنہوں نے اپنی تربیت پہ حرف نہ آنے پہ دل میں ڈھیروں شکر ادا کیا تھا۔

"اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر شہباز میں کیا برائی ہے؟" انہوں نے اپنا سابقہ انداز برقرار رکھتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی برائی نہیں۔ لیکن کیا آپ لوگوں کے لیے میری رائے کوئی معنی نہیں رکھتی؟" اس نے بے بسی سے باپ کی طرف دیکھا تو وہ اک گہرا سانس لیتے ہوئے بولے۔

"تم خود کہہ رہی ہو کہ اس میں کوئی برائی نہیں۔ پھر بھلا ایسی بچکانہ اور بے وقوفانہ رائے کے پیچھے میں اپنی دوستی اور سب سے بڑی بات رائنہ کا رشتہ کیسے داؤ پر لگا دوں؟ اور ویسے بھی یہ کوئی آج کی نہیں برسوں پہلے کی طے کی ہوئی بات ہے۔ جس کے ٹوٹنے کا مطلب ہے 'تمہارے باپ کی عزت کا خاک میں مل جانا۔ تم دونوں کی زندگیوں کا مشکل میں پڑ جانا۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ تم اس رشتے کے لیے اپنا مائنڈ تیار کر لو۔"

انہوں نے دو ٹوک اور واضح الفاظ میں اپنا فیصلہ اسے سنایا تو زرمین کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ یوں جیسے کسی نے اس کی گردن کے گرد پھندا سا کس دیا ہو۔

"اچھا آپ مجھے مائنڈ میک اپ کرنے کے لیے ٹائم تو دیں۔"

وہ گھبرا کر روہانسے لہجے میں بولی۔ اسے یک لخت اپنی پلاننگ اور محنت پہ پانی پھرتا محسوس ہوا تھا۔ کتنی ہوشیاری سے اس نے صبح سات بجے سے محض ڈیڑھ گھنٹہ قبل وہ تین سلیپنگ پلز کھائی تھیں اور باقی کی گولیاں پھینک کر خالی بوتل اپنے سرہانے رکھ دی تھی تاکہ اس وقت اپنی منوا سکے۔ لیکن یہاں تو مرغے کی وہی ایک ٹانگ تھی۔ کسی کو اس کی بات ماننا تو دور' جاننے تک سے دلچسپی نہ تھی۔ الٹا حیات صاحب نے اپنا فیصلہ سنا کر بات ہی ختم کر ڈالی تھی۔

"ہاں تو دو دن ہیں نا تمہارے پاس۔" وہ اب کے نارمل سے لہجے میں بولے تو زرمین جھلا اٹھی۔

"دو دن! فار گاڈ سیک پاپا! مجھے کم از کم ایک ہفتہ تو دیں۔" آنسو اس کے گالوں پہ لڑھک آئے تو حیات احمد بے اختیار عافیہ کو دیکھ کر رہ گئے۔

"اور زمان؟ اس کو کیا جواب دوں؟" انہوں نے نگاہیں ایک بار پھر اس کے چہرے پہ جماتے ہوئے پوچھا۔

"میری طبیعت کا بہانہ بنا دیں یا کچھ بھی کہہ دیں۔ لیکن پلیز مجھے اتنا پریشر نہ کریں کہ میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے۔"

زارو قطار روتے ہوئے اس نے جیسے التجا کی تو حیات احمد اک بے بس سی سانس لے کر رہ گئے۔ جبکہ عافیہ بیگم کی زبانی ساری بات سن کے رائنہ کے دل میں ڈھیروں سکون اتر آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن صبح گیارہ بجے کی فلائٹ سے شاہ زمان اپنی فیملی سمیت کراچی پہنچ گئے تھے۔ جنہیں ریسیو کرنے کو آج اپنوں کی اچھی خاصی تعداد ایئرپورٹ پر موجود تھی۔

"واہ بھئی! ہمیں لگ رہا ہے جیسے ہم کوئٹہ سے نہیں جدہ سے آ رہے ہوں۔" یکے بعد دیگرے سب سے ملتے ہوئے زمان صاحب نے مسکرا کر کہا تو سب ہی ہنس دیے۔

"اللہ نے چاہا تو وہ دن بھی آئے گا زمان بھائی!" عافیہ بیگم نے مسکراتے ہوئے ان کی جانب دیکھا۔

"ان شاء اللہ۔ لیکن آپ مجھے یہ بتائیں کہ میری بیٹیوں کو کیوں نہیں لائیں؟" انہوں نے محبت سے شکوہ کیا تو وہاں موجود ینگ پارٹی بمعہ رطابہ کے معنی خیزی سے گلے کھنکھارنے لگی۔ جس پہ دونوں دولہاؤں کے ساتھ ساتھ بزرگ بھی ہنس پڑے۔

"امید ہے اب آپ کو جواب مل گیا ہو گا۔" نگہت ہنستے ہوئے شوہر سے مخاطب ہوئیں تو وہ محظوظ سے

بولے۔
"چلو اگر ان گدھوں کی وجہ سے وہ یہاں نہیں آ سکتیں تو میں تو ان سے ملنے جا سکتا ہوں نا!" انہوں نے شہباز اور شاہ نواز کی طرف اشارہ کیا تو سب ہی ایک بار پھر کھلکھلا دیے۔ جبکہ دونوں بھائی خفت زدہ سے مسکرا کر رہ گئے۔
"آغا جی! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔" پُرجوش سی رطابہ تیزی سے باپ کے قریب چلی آئی۔
"چلو بیٹا بد اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔" زمان صاحب کے بجائے حیات احمد نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا تو وہ خوشی خوشی سامان کی ٹرالی کی جانب بڑھ گئی، تاکہ اپنا وہ بیگ نکال سکے، جس میں اس نے زرمین اور رائنہ کے لیے اپنی طرف سے لیے گئے ڈھیروں گفٹس پیک کر رکھے تھے۔
"بڑے افسوس کی بات ہے سیلفش لڑکی! بجائے اس کے کہ تم یہ کہتیں کہ "ہم سب بھی آپ کے ساتھ چلیں گے آغا جان۔" "تم اکیلی چل پڑی ہو؟" اس کے نزدیک آتے ہوئے شاہ نواز نے دھیمے لہجے میں گھر کا تو وہ شوخ نظروں سے بھائی کا پھولا ہوا منہ دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔
"کوئی بات نہیں۔ میں ابھی آغا جان اور حیات انکل سے کہہ دیتی ہوں۔"
"کیا کہہ دیتی ہو؟" شاہ نواز کے لبوں پر مسکراہٹ در آئی۔
"یہی کہ بھائی کہہ رہے ہیں' انہوں نے بھی جانا ہے۔" وہ شرارت سے ہنستے ہوئے بولی تو شاہ نواز دانت پیس کر رہ گیا۔
"اچھا بچو! اب کل ذرا تم مجھ سے نیگ مانگ کر تو دیکھنا۔ ایک روپیہ نہیں دوں گا۔"
"تو مت دیں۔ میں اپنے شہباز بھائی سے لے لوں گی۔" اس نے جھک کر بیگ اٹھاتے ہوئے کان پر سے مکھی اڑائی۔
"دیکھتا ہوں کیسے لو گی!" وہ تپ کر بولا تو اس کی حالت سے حظ اٹھاتی رطابہ کے دانت مزید نکل آئے۔
"او کے ڈیر برادر بائے۔" اسے چڑاتی ہوئی وہ زمان صاحب کی جانب چلی آئی جہاں عافیہ اور حیات احمد کے بے حد اصرار پر نگہت بھی ان کے ساتھ جا رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی وہ شدید کشمکش کے عالم میں مسلسل ناخن چبا رہی تھی۔ ذہن بیک وقت بہت سی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جبکہ دل امید اور ناامیدی کے درمیان ڈول رہا تھا۔ کبھی یوں لگنے لگتا جیسے سب کچھ اس کے ایما کے مطابق ہو جائے گا اور کبھی یوں محسوس ہونے لگتا جیسے ہر چیز ہاتھ سے نکل جائے گی۔
ابھی کچھ دیر پہلے اس کی یاور سے بات ہوئی تھی۔ حیات صاحب کا فیصلہ سننے کے بعد جو حکمت عملی زرمین نے اپنائی تھی' اسے سراہتے ہوئے اس نے فی الوقت زرمین کو اس پہ ہی ڈٹے رہنے پر زور دیا تھا۔
وقت کا حصول ان کے لیے سب سے اہم تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے زرمین کو اپنے گھر والوں' خصوصاً" رائنہ کو' اپنی طرف سے مکمل طور پہ مطمئن کرنے کی سختی سے ہدایت کی تھی تاکہ ان کے دل سے ہر طرح کا شک دور کیا جا سکے۔
ان کی کامیابی کا انحصار فی الوقت زرمین پہ تھا۔ اسے ہر قیمت پہ کل ہونے والے نکاح کو روکنا تھا اور یہی ذمے داری اسے پتنگے لگائے ہوئے تھی کہ بہرکیف آخری فیصلہ تو شاہ زمان صاحب کا ہی ہونا تھا۔ اس نے تو حیات احمد اور عافیہ بیگم کے سامنے اپنا پورا زور لگا لیا تھا۔ اب آگے جو بھی کرنا تھا وہ تو ان دونوں نے ہی کرنا تھا۔ اور یہی سوچ سوچ کے اس کا دماغ شل ہونے لگا تھا۔ پتا نہیں انہوں نے بات کی بھی تھی یا نہیں؟ اور اگر کر لی تھی تو زمان انکل اور نگہت آنٹی نے اسے مانا تھا یا رد کر دیا تھا؟
مسلسل ٹینشن کے باعث پیٹ میں گرہیں سی پڑنے لگی تھیں۔ مگر نہ حیات صاحب اور عافیہ بیگم کی واپسی ہو رہی تھی اور نہ ہی اس پریشانی سے اسے نجات مل رہی تھی۔ اب تو ان کی فلائٹ آئے ہوئے بھی ڈیڑھ گھنٹہ ہونے کو تھا۔ پتا نہیں یہ لوگ کہاں رہ گئے تھے؟
شدید کوفت کے عالم میں اس کی نظریں ایک بار پھر گیٹ کی جانب اٹھی تھیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے جانا پہچانا سا ہارن سن کے جہاں اس کا دل یک لخت ڈوب کر ابھرا تھا۔ وہیں چوکیدار نے بھی بھاگ کر گیٹ وا کیا تھا۔
لیکن گاڑی میں سے اترنے والی شخصیات کو دیکھ کر تو اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ گھبراہٹ کی شدت میں اس قدر اضافہ ہوا تھا کہ اس کے لیے مزید اپنے پیروں پہ کھڑے رہنا ممکن نہ رہا تھا۔ تیزی سے رخ موڑتے ہوئے وہ بمشکل تمام اپنے بیڈ پہ آ کے گر سی گئی تھی۔ ابھی کچھ ہی دیر میں یا تو اس کا بلاوا آنے والا تھا یا پھر وہ سب یہاں پہنچنے والے تھے اور ان دونوں صورت حال کے لیے وہ کسی طور تیار نہ تھی۔ جب ہی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے وہ خود کو سر تا پا چادر میں چھپائے سوتی بن گئی تھی۔ مگر بے سود۔
تقریباً" دس منٹ بعد اس کی توقع کے عین مطابق وہ سب اس کے کمرے میں چلے آئے تھے اور ان کے منع کرنے کے باوجود عافیہ بیگم نے لمحے کا توقف کیے بنا اسے اٹھا دیا تھا۔
"السلام علیکم!" مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس نے اٹھتے ہوئے دھیرے سے تمام حاضرین محفل کو سلام کیا تو زمان صاحب نے آگے بڑھ کے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔
"وعلیکم السلام! کیسی ہے میری جان؟ مجھے تو اب پتا چلا ہے کہ میری بیٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ شفقت سے اس کے سر پہ پیار کرتے ایک طرف کو ہوئے تاکہ نگہت اس سے مل سکیں۔
"کیسی ہو بیٹا؟" محبت سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے وہ اس کے شانے کے گرد بازو لپیٹے اس کے برابر بیٹھ گئیں۔ جبکہ باقی سب نے بھی اِدھر اُدھر نشست سنبھال لی۔
"ٹھیک ہوں۔" انکل' آنٹی کی اس درجہ محبت اسے اندر ہی اندر شرمندہ کر گئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نظریں جھک سی گئی تھیں۔
"کہاں ٹھیک ہو؟ رنگت دیکھو کیسے زرد ہو رہی ہے۔" بغور اس کا چہرہ تکتے ہوئے انہوں نے تشویش سے کہا۔
"حیات بھائی! ڈاکٹرز نے کیا کہا ہے؟" وہ کاؤچ پہ بیٹھے حیات احمد سے مخاطب ہوئیں تو زرمین کی جھکی نظریں باپ کی جانب اٹھ گئیں اور وہ جواب تک تذبذب کا شکار تھے' ایک نظر بیٹی کے التجائیہ چہرے پر ڈالتے ہوئے آہستگی سے بولے۔
"یہی کہ کمزوری بہت ہے اس لیے مکمل ریسٹ کی ضرورت ہے۔"
"تو پھر کل کا فنکشن؟" انہوں نے پریشانی سے حیات احمد اور ان کے ساتھ بیٹھے زمان صاحب کی جانب دیکھا۔
"یہی تو پریشانی ہے۔ زرمین زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتی۔" جواب حیات احمد کے بجائے عافیہ بیگم نے دیا تو حیات صاحب بے اختیار لب بھینچ کر رہ گئے۔ اولاد انسان کو کبھی کبھی کتنا مجبور کر دیتی ہے۔ وگرنہ زمان سے غلط بیانی کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔
"ہاں تو ایسا کرتے ہیں ناکہ شہباز اور زرمین کا نکاح گھر میں پڑھوا لیتے ہیں اور رائنہ اور نواز کا ہال میں۔" زمان صاحب نے اگلے ہی لمحے اس پریشانی کا حل پیش کیا تو زرمین کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ جبکہ عافیہ کی نظریں بے اختیار حیات صاحب کی جانب اٹھ گئیں۔
"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ مہمان وہاں، ہم یہاں۔ پہلے اِدھر بھاگیں پھر اُدھر جائیں۔ سارا فنکشن خراب ہو جائے گا۔"
نگہت بیگم کو ان کی تجویز قطعاً" نہ بھائی تھی۔ ان کے جواب پہ زرمین نے بے اختیار اک گہری سانس

ہوا کے سپرد کی تھی۔ بصورت دیگر اسے تو اپنا آپ تختہ دار پہ لٹکتا محسوس ہوا تھا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کیا کریں۔" نگہت حقیقتاً پریشان ہو گئی تھیں۔

"زمان بھائی! اگر آپ مناسب سمجھیں تو شہباز اور زرمین کا نکاح ایک ہفتے بعد نہ رکھ لیں۔" عافیہ بیگم نے جھجکتے ہوئے کہا تو شاہ زمان ایک لمحے کو خاموش ہو گئے۔ لیکن نگہت بول اٹھیں۔

"لیکن عافیہ! ساری تیاری، سارا انتظام پھر سے کرنا کوئی آسان کام تو نہیں۔"

"آسان نہ سہی لیکن اتنا مشکل بھی نہیں۔ میرے خیال میں بھابھی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اس مسئلے کا اس سے بہتر حل اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی ہمارا پندرہ دن کا قیام تو ہے ہی۔ اس لیے زرمین کی صحت یابی تک ویٹ کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔" زمان صاحب نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا تو نگہت خاموش ہو گئیں۔ انہیں یوں سب کے سامنے اپنی بات کی نفی خاصی محسوس ہوئی تھی۔ جب ہی وہ یک لخت چپ کر گئی تھیں۔

ان کی یہ خاموشی کسی اور نے نہ سہی لیکن عافیہ نے ضرور محسوس کر لی تھی۔ اور ان کا دل جیسے سہم سا گیا تھا۔ بیٹیوں کے ماں باپ کو کیسے کیسے خدشات ستاتے ہیں کاش کہ اولاد والدین کے ان خدشات کو محسوس کر سکتی۔ مگر......

بے اختیار ان کی دکھ بھری نظریں نگہت کے برابر بیٹھی زرمین کی جانب اٹھی تھیں جس کے زرد چہرے پر محض لمحوں میں رونق اتر آئی تھی۔ لیکن نجانے کیوں اس کا یہ اطمینان ان کے بوجھل دل کو مزید بوجھل کر گیا تھا۔ پتا نہیں انہوں نے اپنی اولاد کا ساتھ دے کر صحیح بھی کیا تھا یا نہیں؟"

☼ ☼ ☼

"کیا؟" شہباز نے الجھ کر بہن کو دیکھا تھا۔ جبکہ شاہ نواز کے چہرے پر بھی کم و بیش ویسے ہی تاثرات در آئے تھے۔

"جی جناب! اب آپ کا اور زرمین آپی کا نکاح نیکسٹ ویک ہوگا۔"

"کیا فضول ہانک رہی ہو۔ میں ابھی جا کے امی سے پوچھتا ہوں۔" وہ تیزی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا تو نواز بھی اس کے پیچھے نگہت بیگم اور زمان صاحب کے کمرے میں چلا آیا۔ جہاں نگہت خاصے آف موڈ میں بیڈ پہ بیٹھی تھیں۔ جبکہ زمان صاحب ان کے مقابل صوفے پہ بیٹھے کچھ بول رہے تھے۔ انہیں آگے پیچھے کمرے میں آتا دیکھ کر وہ یکدم خاموش ہو گئے تھے۔

"امی! یہ رطابہ کیا کہہ رہی ہے؟" شہباز نے کمرے کے وسط میں رکتے ہوئے ماں سے استفسار کیا تو وہ بے زاری سے رخ موڑ گئیں۔

"مجھے نہیں پتا۔ اپنے آغا جی سے پوچھو!"

"ادھر آؤ بیٹا! تمہاری ماں کا مزاج تو خاصا گرم ہے اس وقت۔" انہوں نے مسکرا کر ایک نظر نگہت بیگم کو دیکھا اور پھر رسان سے ساری بات دونوں بیٹوں کو کہہ سنائی۔

"اب تم بتاؤ اگر یہی صورت حال اچانک ہمارے گھر میں ہو جاتی تو کیا ہم فنکشن Delay (ملتوی) نہ کرتے؟" انہوں نے شاہنواز کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"بالکل کرتے۔ آپ نے ٹھیک کیا آغا جی! جو ڈیٹ آگے کر دی۔" اپنے دل میں پھیلتی مایوسی کو نظر انداز کیے شہباز بردباری سے بولا تو زمان صاحب جتاتی نظروں سے سامنے بیٹھی نگہت کو دیکھنے لگے۔

"دیکھ لیں بیگم صاحبہ! آپ سے زیادہ سمجھ دار تو ہمارا بیٹا ہے۔ کم از کم وہ سچویشن کو انڈر اسٹینڈ تو کر رہا ہے۔" انہوں نے محبت سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی تو وہ دھیمے سے مسکرا دیا۔

"آغا جی! اگر آپ برا نہ مانیں تو میں حیات انکل کی طرف ایک چکر لگا آؤں؟" نواز کے اشارہ کرنے پہ اس نے آہستگی سے پوچھا تو اپنے لخت جگر کی اس درجہ

سعادت مندی انہیں بے اختیار مسکرانے پر مجبور کر گئی۔

"تم کیا میری طرف سے بے شک یہ بھی چکر لگا آئیے۔" انہوں نے شاہ نواز کی جانب دیکھا تو مارے بے یقینی کے اس کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔ بے اختیار اس نے حیرت سے ساتھ بیٹھے بھائی کی طرف دیکھا۔ مگر اگلے ہی لمحے نگہت بیگم کی آواز نے اس کی ساری خوشی پہ پانی پھیر دیا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ سب باتیں بنائیں گے۔ فون پہ خیریت پوچھ لو!"

اور وہ دونوں چہروں پہ مسکینی طاری کیے باپ کی جانب مدد طلب نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ مگر جب انہوں نے بھی آنکھوں سے نگہت بیگم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنی لاچاری کا اظہار کر ڈالا تو دونوں بھائی دل مسوس کر رہ گئے۔

✲ ✲ ✲

اگلا دن دونوں گھروں میں خوشیوں کی بارات لے کر آیا تھا۔ آج وہ دونوں دوست اپنا برسوں پرانا عہد وفا کرنے چلے تھے اور اپنے رب کے بے حد شکر گزار تھے جس نے انہیں سرخرو کیا تھا اور یہ دن دکھایا تھا۔

ہر کوئی بہت خوش تھا۔ حتیٰ کہ زرمین بھی۔ جس کی خوشی کی اصل وجہ اس کی گلو خلاصی تھی مگر پھر بھی اس نے رائنہ کے پارلر جانے سے پہلے اپنے گزشتہ رویے کی نہ صرف معافی مانگی تھی۔ بلکہ اسے اپنی جانب سے مطمئن کرتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے ہمیشہ خوش رہنے کی دعا بھی دی تھی۔

ادھر نواز کے دل کی تو آج کیفیت ہی عجیب تھی۔ اپنی محبت کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لینے کا خیال اس کے نو عمر دل کو عجیب سی سرمستی کے احساس سے دوچار کر گیا تھا۔ جس کا عکس واضح طور پہ اس کے چہرے پر آن ٹھہرا تھا۔ اس حد تک کہ اس کے معصوم سے چہرے پر نگاہ نہ ٹھہر رہی تھی اور جب ایجاب و قبول کے بعد چھوٹی سی گڑیا جیسی رائنہ کو اس کے پہلو میں لا کے بٹھایا گیا تب تو اپنوں کے ساتھ ساتھ غیروں نے بھی اس پیارے چھوٹے سے جوڑے کی بلائیں لے ڈالی تھیں۔ یہ جانے بنا کہ خوشیوں بھری اس محفل کے ایک کونے میں کھڑی تقدیر ان سب کی تدبیروں اور سادگی پہ مسکرا دی تھی۔ جنہیں اتنا بھی علم نہ تھا کہ کتنا بڑا طوفان ان کی ہر خوشی نگلنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"بھابھی! زرمین کے ساتھ پارلر کون جا رہا ہے؟" ساجدہ چچی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے عافیہ بیگم کی جانب دیکھا جو سیف کھولے زرمین کا زیور نکالنے میں مصروف تھیں۔

آج رائنہ کے نکاح کے ٹھیک ایک ہفتے بعد زرمین اور شہباز کا نکاح تھا اور یہ ایک ہفتہ کیسے پر لگا کے گزرا تھا، کسی کو خبر ہی نہ ہوئی تھی۔ نئے سرے سے کیے جانے والے انتظامات نے سب ہی کو ایک بار پھر خاصا مصروف کر دیا تھا اور اسی مصروفیت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے زرمین نے یاور کے کہنے پہ اپنا چھوٹا چھوٹا لیکن اہم اور قیمتی سامان نوین کے ذریعہ یاور تک پہنچا دیا تھا۔ جس نے کراچی سے نکل کر ایبٹ آباد اپنے کزن جو کہ یاور کا جگری دوست بھی تھا، کے پاس پہنچنے کی تمام تر تیاری کر لی تھی۔

"نزہت اور زرمین کی فرینڈ نوین۔" انہوں نے ایک لحظہ کو سر اٹھاتے ہوئے دیورانی کی طرف دیکھا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ میں بھی پارٹی میک اپ کروا لوں۔" ساجدہ کاؤچ پہ بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"ہاں تو چلی جاؤ۔" انہوں نے سیف بند کرتے ہوئے زیور احتیاط سے پاس پڑے بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔ اسی اثنا میں کمرے کا دروازہ کھول کے زرمین اندر چلی آئی۔

"جی امی! آپ نے بلوایا تھا؟"

"ہاں بیٹا! ادھر آؤ۔" اسے دیکھ کر انہوں نے ایک بار پھر سارا زیور نکال باہر کیا۔ "بیٹا یہ تمہارا ڈائمنڈ سیٹ، رنگز اور زرقون کے کڑے ہیں۔ باقی گولڈ کی چوڑیاں اور دو سیٹ میں نے نہیں نکالے۔"

"آپ ایسا کریں کہ وہ بھی رکھ دیں۔" زرمین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"جب پہننے نہیں تو لے کر جانے کی کیا ضرورت ہے؟" انہوں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ رکھ دیں نا۔ میں تیار ہونے کے بعد ڈیسائیڈ کروں گی کہ ساری جیولری ڈائمنڈ کی پہنوں یا گولڈ کی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو عافیہ بیگم کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ کوئی چیز گم گئی تو؟"

"نہیں گم ہو گی نا! آپ پلیز رکھ دیں۔ چچی! آپ امی سے کہیں نا۔" وہ ضدی لہجے میں بولی تو عافیہ بیگم ساجدہ کو دیکھ کر رہ گئیں جو اٹھ کر ان کے پاس چلی آئیں۔

"بھابھی ٹھیک کہہ رہی ہیں بیٹا۔ خوامخواہ کچھ گم ہو گیا تو بیٹھے بٹھائے نئی مصیبت پڑ جائے گی۔" انہوں نے رسان سے اسے سمجھایا لیکن بے سود!

"نہیں گم ہو گیا۔ میں خیال رکھوں گی۔ پھر خالہ اور نوین بھی تو میرے ساتھ ہوں گی۔ میں انہیں بیگ دے دوں گی۔" وہ ایک ہی بات کی تکرار کیے گئی تو عافیہ جھنجھلا کر ساجدہ سے بولیں۔

"ساجدہ! تم ایسا کرو کہ ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ میں گولڈ کی جیولری تمہارے حوالے کر دوں گی اور ڈائمنڈ کی جیولری نزہت سنبھال لے گی.... اس لڑکی نے تو مجھے عاجز کر دیا ہے۔" وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے پلٹ کر ایک بار پھر سیف کھولنے لگیں تو زرمین دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر جھوم اٹھی۔

اسے زیور لانے کی خاص تاکید یاور نے ہی کی تھی۔ لیکن وہ سارا زیور نکلوانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس بات کا اسے یقین نہ تھا۔

"ٹھیک ہے پھر میں فٹافٹ نہا کر اپنے کپڑے بھی ساتھ رکھ لیتی ہوں۔ میں وہیں سے تیار ہو جاؤں گی۔" وہ اپنا پروگرام فائنل کرتیں عجلت میں کمرے سے نکل گئیں تو زرمین نے ڈرتے ڈرتے ماں کی پشت کی جانب دیکھا۔

"امی!"

"کیا ہے؟" انہوں نے بنا پلٹے کھا جانے والے لہجے میں پوچھا۔

"امی! وہ میں ڈرائیور کے ساتھ جا کے نوین کو لے آؤں؟"

"کیوں وہ خود نہیں آ سکتی؟ روز تم اسے لاتی ہو کیا؟" وہ پلٹ کر غصے سے بولیں تو ایک لمحے کے لیے زرمین ہچکچا گئی۔

"نہیں۔ وہ روز اپنے بھائی کے ساتھ آتی تھی۔ لیکن آج اس کے بھائی جب گئے ہوئے ہیں۔ اس لیے اسے آج اسے لانے والا کوئی نہیں۔" اور چونکہ عافیہ بیگم جانتی تھیں کہ نوین کے والدین کی ڈیتھ ہو چکی ہے اور وہ صرف دو ہی بہن بھائی ہیں جو کہ اپنی کسی رشتے کی آنٹی کے پاس رہتے ہیں۔ اس لیے وہ وہ اک گہری سانس لیتی خاموش ہو گئیں۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن اپنے ساتھ کسی کو لے کر جانا۔" انہوں نے گولڈ اور ڈائمنڈ کی ساری جیولری بیگ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بیگ لے جا کر اپنی الماری میں باقی چیزوں کے ساتھ رکھ کے، الماری کو لاک کر دو۔ میں نزہت کو کہوں گی کہ وہ جانے سے پہلے اسے دیکھ کر دو حصوں میں کر دے۔"

وہ مڑ کے سیف بند کرنے لگیں تو زرمین جی اچھا کہتی بیگ اٹھائے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ اور اگلے دس منٹ بعد وہ بنا کسی کو بتائے ڈرائیور کے ہمراہ ایک ایسے سفر کی جانب روانہ ہو گئی جو اسے تو اس کی منتخب کردہ منزل پہ پہنچانے والا تھا لیکن پیچھے رہ جانے والوں کا ہر راستہ اس کے قدموں کی دھول سے ہمیشہ کے لیے اٹ گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

"خادم! تم لوگ کہاں رہ گئے ہو؟ اور یہ زرمین کا نمبر کیوں آف ہے؟" گھر سے آنے والی کال ریسیو کرتے

ہی عافیہ بیگم کی غصے سے بھری آواز خادم حسین کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ جو گاڑی سے ٹیک لگائے بے زار سا کھڑا تھا تیزی سے بولا۔

"باجی! میں کیا کروں۔ زرمین بی بی اندر سے نکل ہی نہیں رہیں اور ان کا نمبر ملا ملا کے تو میں بھی تھک گیا ہوں۔"

"تو تم نے بیل بجائی تھی نا۔" وہ جھنجلا کر بولیں تو خادم حسین حیرت سے اپنے سامنے موجود عمارت اور اس کے گیٹ کے اردگرد دیکھتے ہوئے بولا۔

"لیکن باجی سینٹر کے گیٹ پہ بیل تو نہیں ہے۔"

"کون سا سینٹر؟" اب کے ان کی جھنجلاہٹ میں الجھن بھی در آئی تھی۔

"باجی، کمپیوٹر سینٹر۔ جہاں سے ان کی سہیلی کو لینا تھا۔" اسے ان کی لاعلمی پہ حیرت ہوئی تھی۔

"لیکن اسے تو اس کے گھر سے لینا تھا۔" وہ پریشانی سے بولیں تو وہ بے اختیار نفی میں سر ہلا گیا۔

"نہیں باجی! زرمین بی بی نے کہا تھا کہ انہیں اس سینٹر سے لینا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے، تم اندر جا کے دیکھو۔ میں ایک بار پھر اس کا نمبر ٹرائی کرتی ہوں۔ اس کے ساتھ کون ہے؟" انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔

"کوئی بھی نہیں۔" وہ ایک بار پھر متعجب ہوا تھا۔

"کیا؟ یا اللہ! میں اس لڑکی کا کیا کروں۔" انہوں نے بے اختیار اپنا سر تھام لیا۔

"خادم! تم فوراً اندر جاؤ اور جا کے اسے دیکھو اور اگر نظر نہ آئے تو چوکیدار، چپڑاسی کسی سے بھی پوچھو۔ میں تمہیں پانچ منٹ بعد رنگ کرتی ہوں۔"

وہ تیز لہجے میں بولیں تو ڈرائیور اثبات میں سر ہلاتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"کیا؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟" حیات احمد نے بے یقینی سے روتی ہوئی عافیہ کی جانب دیکھا جو ان کے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی دیوانہ وار ان کی طرف بھاگی تھیں۔

باقی سب بھی وہیں حیران پریشان سے موجود تھے۔

"میں، میں صحیح کہہ رہی ہوں حیات! زرمین کا کچھ پتا نہیں۔" وہ زارو قطار روتے ہوئے بولیں تو حیات احمد کا چہرہ فق ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے سامنے کھڑی عافیہ کو بازوؤں سے تھام کر بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔

"کیا بکواس ہے یہ؟ میں پوچھتا ہوں کہاں ہے زرمین؟" وہ حلق کے بل چلائے تو راشد نے تیزی سے آگے بڑھ کے ان کا بازو تھام لیا۔

"حوصلہ بھائی جان! وہ خادم کے ساتھ اپنی کسی سہیلی کو لینے اس کے گھر گئی تھی۔ لیکن اب وہ کہہ رہا ہے کہ وہ وہاں ہے ہی نہیں۔"

وہ اپنی پریشانی دبائے رسان سے بولے تو حیات احمد تیزی سے عافیہ کے بازو جھٹکتے خادم کا نمبر ملانے لگے جسے راشد نے وہیں رکنے کی تاکید کی تھی۔

"ہیلو خادم! کہاں ہو تم؟" اور جواباً اس نے انہیں اپنا حدود اربعہ بتانے کے ساتھ ساتھ پوری بات بھی کہہ سنائی تھی۔ جسے سن کر وہ بے اختیار لب بھینچ گئے تھے۔

"تم وہیں رکو، میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔" موبائل آف کرتے وہ تیزی سے باہر کی جانب لپکے تو راشد کے ساتھ ساتھ عافیہ کے بھائی اور بہنوئی بھی عجلت میں ان کے پیچھے نکل گئے۔ جبکہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے عافیہ وہیں زمین پہ بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

"خود کو سنبھالیں آپی! اللہ نے چاہا تو ہماری زرمین وہیں ہو گی۔" نزہت کے ساتھ ساتھ وہاں موجود سب ہی خواتین تیزی سے ان کی جانب بڑھی تھیں۔

"کیسے سنبھالوں نزی! میری بچی..... ہائے! میری زرمین کے ساتھ کچھ ہو نہ گیا ہو۔ ہائے! ہائے میں کیا کروں میرے اللہ! میری زرمین، میری بچی۔" وہ بہن کے سینے سے لگے روتے روتے بے سدھ ہو گئیں تو لاؤنج میں کھلبلی سی مچ گئی۔ جبکہ لاؤنج کے ایک کونے میں تنہا کھڑی رائنہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے دھاڑیں مار مار کر رو دی۔ وہ اپنی ماں کو کیسے بتاتی کہ ان کی بیٹی اب کبھی واپس نہ آنے والی تھی کیونکہ وہ ان سب کی خوشیوں اور عزت کو داؤ پہ لگائے اپنی خواہشوں میں رنگ بھرنے چل پڑی تھی اور اس بات کا اسے شک نہیں بلکہ یقین تھا۔

آسمان کے کنارے سرخ ہونے لگے تھے جب گرد آلود لباس اور وحشت زدہ وجود لیے حیات احمد گھر میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے پریشان سے راشد، منیر اور نجم بھی تھے۔ ان چاروں کو اندر آتا دیکھ کر بے اختیار سب کی بے چین نظریں ان کی جانب اٹھی تھیں۔

"کہاں ہے میری زرمین؟" حیات صاحب کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی عافیہ بیگم کے بے جان وجود میں جیسے جان سی پڑ گئی تھی۔ جب ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر ان کی جانب بھاگی تھیں۔ مگر انہیں خالی نگاہوں سے اپنی طرف تکتا پا کر وہ بے قراری سے بھائی کا بازو ہلاتے ہوئے قدرے اونچی آواز میں بولی تھیں۔

"میری بچی کہاں ہے حیات؟" مگر ان تک تو جیسے کوئی آواز پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔

"منیر بھائی! آپ لوگ بتاتے کیوں نہیں کہ میری زرمین کہاں ہے؟" زارو قطار روتے ہوئے وہ اپنے بھائی کی جانب پلٹیں جنہوں نے بے اختیار آگے بڑھ کے انہیں سینے سے لگا لیا۔

"کاش! کہ میں تمہیں اتنی ہی آسانی سے بتا سکتا کہ تمہاری زرمین کہاں ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے تو سب متوحش سے آگے بڑھ آئے۔

"ک، کیا مطلب بھائی جان؟" عافیہ کے دل کی آواز نزہت کے لبوں سے سوال بن کے نکلی تو وہ ایک جھٹکے سے خود کو الگ کرتیں خوف زدہ نظروں سے بھائی کا چہرہ تکنے لگیں۔ جن کی خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کن لفظوں میں اپنا مطلب بیان کریں۔

جبکہ کونے میں خوف زدہ سی، گھٹنے سینے سے لگائے بیٹھی رائنہ نے بے اختیار دھڑکتے دل کے ساتھ زرمین کی موت کی دعا مانگی تھی۔ اس کے لیے اس پل اپنی ماں جائی کی موت کا تصور اتنا ہی خوش کن تھا جتنا کہ ایک لب مرگ وجود کے لیے زندگی کا!

"عافیہ! زرمین ہماری عزت کو روند گئی۔ وہ اکیلی ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اس کی سہیلی نوین اور نوین کا بھائی بھی لاپتا ہے۔"

ان کی زبان لڑکھڑا گئی تو وہ تیزی سے نظریں چرا گئے۔ جبکہ عافیہ کتنی ہی دیر نا سمجھی کے عالم میں ان کا چہرہ دیکھے گئیں۔ اور جب جملے کا مفہوم ان کی سمجھ میں آیا تو ان کی رنگت فق اور آنکھیں مارے وحشت کے پھٹ سی گئیں۔ جبکہ تمام حاضرین محفل کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ ماسوائے ایک رائنہ کے جس نے بے اختیار اپنی آنکھیں سختی سے بھینچ لی تھیں۔

"آپ، آپ کو کیسے پتا چلا؟" نزہت نے تیزی سے پوچھا۔

"سینٹر میں ایک لڑکے نے نوین کے ساتھ ایک لڑکی کو پچھلے گیٹ سے نکلتے دیکھا تھا اور جب ہم آفس سے ایڈریس پوچھ کے نوین کے گھر گئے تو وہاں ان کی آنٹی نے بتایا کہ وہ دونوں بہن بھائی تو کل ہی اپنا سارا سامان سمیت کے ان کا کمرا خالی کر گئے تھے۔ یہ کہہ کر کہ اس لڑکے 'یاور' کی ملتان ٹرانسفر ہو گئی ہے۔" جواب منیر صاحب کے بجائے ان کے شوہر نجم نے دیا تو نزہت گھبرا کر بولیں۔

"کہیں ان دونوں بہن بھائیوں نے زرمین کو اغوا تو نہیں کر لیا؟"

"کاش کہ ایسا ہوا ہوتا۔" نجم، عافیہ کی تڑپ کر اٹھنے والی نظروں سے نگاہیں چراتے ہوئے بولے۔

"مگر ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس لڑکے کی حیات بھائی کے فون پر کال آئی تھی۔ اس خبیث نے نہ صرف اپنی ذلالت کا اعتراف کیا ہے بلکہ لاکھوں کی مالیت کے اس زیور کے لیے بھی انتہائی بے شرمی اور جرات سے شکریہ ادا کیا ہے جو وہ بے حیا لڑکی اس گھر سے اٹھا لے گئی ہے۔"

نجم سرخ چہرے کے ساتھ گویا ہوئے تو نزہت شوہر کے منہ سے یہ ساری تفصیل سن کے شرم سے کٹ کر رہ گئیں۔ جبکہ کسی بت کی طرح ساکت کھڑی عافیہ کی

نگاہوں میں یک لخت وہ منظر گھوم گیا جب زرمین ان سے سارا زیور نکالنے کی ضد کر رہی تھی۔

"زرمین! تو نے ہمارے بھروسے کو بے امان کیا، خدا تجھے کبھی اپنی امان نہ بخشے۔" آنسو ان کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ گرنے لگے تو ساجدہ نے آگے بڑھ کے انہیں تھام لیا۔ مگر تسلی دینے کو ان کے پاس بھی سوائے آنسوؤں کے اور کچھ نہ تھا۔

صدمہ اس قدر شدید تھا کہ لاؤنج میں موجود سب ہی افراد لب بستہ کھڑے اس ساری صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے جو سنگین بھی تھی اور غمگین بھی۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ آنے والے وقت کا خوف سب ہی کی دھڑکنیں تیز کیے ہوئے تھا جب شاہ زمان کی فیملی پہ یہ جان لیوا انکشاف ہوتا تھا۔ لیکن کسی میں اتنی ہمت مجتمع نہ ہو پا رہی تھی کہ وہ اپنے اس خوف کو زبان دے پاتا۔ ایسے میں لاؤنج میں حیات احمد کی آمد ان سب کو ان کی جانب متوجہ کر گئی تھی۔ انہوں نے کپڑوں اور نجانے کن کن چیزوں کا ایک ڈھیر اٹھا رکھا تھا۔ جس کے سب سے اوپر پی پنک کلر کا وہ زرق برق سا جوڑا بھی تھا۔ جو زرمین آج پہننے والی تھی۔

انہیں تیز قدموں سے داخلی دروازے کی جانب بڑھتا دیکھ کے سوائے عافیہ اور رائنہ کے، سب ہی ان کے پیچھے لپکے تھے۔ مگر وہ سب کی پکار ان سنی کرتے پورچ میں چلے آئے تھے۔

سارا سامان زمین پہ پھینکنے کے بعد انہوں نے ایک طرف بنی چھوٹی سی کیبنٹ میں سے ایک بوتل نکال کر ان چیزوں پر خالی کرتے ہوئے ماچس کی تیلی جلائی تھی اور اگلے ہی لمحے آگ ہر رنگ، ہر شے کو نگلنے لگی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح ان کی اپنی بیٹی ان کی عزت اور ان کے ہر ارمان کو نگل گئی تھی۔ وہ بیٹی جسے انہوں نے بیٹے کی خواہش کے باوجود "بسم اللہ" کر کے تھاما تھا اور جسے انگلی پکڑ کے انہوں نے نہایت شفقت سے چلنا سکھایا تھا۔

"زرمین! میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں!" باآواز بلند چلاتے وہ زمین پہ دو زانو گرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے تھے اور وہاں موجود سب ہی افراد رو پڑے تھے۔ جبکہ اندر لاؤنج میں عافیہ کا ساکت وجود "دھڑام" کی آواز سے زمین پہ گرا تھا۔

بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ انہوں نے زار و قطار روتی رائنہ کو خود پہ جھکتے پایا تھا۔ "میں نے تیرا ساتھ دے کے اچھا نہیں کیا زرمین!" اندھیرے میں ڈوبتے ذہن کے ساتھ ان کے دماغ میں ایک ہی فقرے کی گونج تھی۔ جس کے بعد ہر سو گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ حیات فون کیوں نہیں اٹھا رہا۔" جھنجلا کر کال منقطع کرتے ہوئے زمان صاحب بڑبڑائے۔

"تو آپ کو ان سے کیا بات کرنی ہے؟" نگہت نے اپنا دوپٹہ سیٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ دونوں تیار ہو کے اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج کی جانب آ رہے تھے۔ جہاں اس وقت خاصی رونق تھی۔ زمان اور نگہت دونوں کی فیملیز یہاں "شاہ ولا" میں موجود تھیں۔ جہاں سے سب نے مل کر اکٹھے ہال کی جانب روانہ ہونا تھا۔

"بھئی میں نے اس سے کہنا تھا کہ وہ۔۔۔۔" معاً شہباز اور اس کے پیچھے شاہ نواز اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلے تو زمان صاحب اپنی بات مکمل کرنا بھول گئے۔

"ماشاء اللہ! کس قدر ہینڈسم لگ رہا ہے میرا بیٹا۔" انہوں نے بلیک سوٹ میں ملبوس وجیہہ شہباز کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ جس پہ آج ڈھیروں روپ آیا تھا۔

"تھینک یو آغا جان!" وہ ان کے نزدیک چلا آیا تو نگہت نے بے اختیار بیٹے کو سینے سے لگاتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔

"اور میں؟" شاہ نواز نے خفگی سے باپ کی جانب دیکھا۔

"تم تو یار بورن پرنس ہو۔" زمان صاحب اس کے شانے کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے مسکرائے تو وہ فخریہ نظروں سے بھائی کی طرف دیکھنے لگا جو اس کے بچپنے پہ بے اختیار مسکرا دیا۔

"میرے خیال میں ہمیں اب نکلنا چاہیے ورنہ لیٹ ہو جائیں گے۔" زمان صاحب نے رسٹ واچ پہ نگاہ ڈالتے ہوئے قدم بڑھائے تو وہ تینوں ان کی تقلید میں لاؤنج میں چلے آئے۔ جہاں بی جان نے اپنے دونوں پوتوں کا صدقہ اتارنے کے بعد روانگی کی اجازت دی۔ مگر اس سے پہلے کہ خوشیوں بھرا یہ قافلہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہوتا منیر صاحب کی کال نے سب کو پریشان کر دیا۔

"اس وقت گھر پہ؟ خیر تو ہے؟" فون کان سے لگائے زمان صاحب نے متفکر نظروں سے نگہت کے سوالیہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے منیر صاحب سے استفسار کیا۔

"اچھا ٹھیک ہے، ہم ابھی آتے ہیں۔" دوسری طرف سے بنا کچھ بتائے "فوراً" پہنچنے کی درخواست دہرائی گئی تو حیران سے شاہ زمان نے مزید کوئی سوال کیے لائن منقطع کر دی۔

"کیا ہوا، خیر تو ہے؟" نگہت نے پریشانی سے پوچھا۔ باقی سب کی نگاہیں بھی ان پہ جمی تھیں۔

"پتا نہیں لیکن منیر بھائی نے فوراً گھر آنے کے لیے کہا ہے۔" وہ از حد پریشانی سے گویا ہوئے تو سب کے چہروں پر تفکر در آیا۔

"یا اللہ خیر!" بی جان کا ناتواں دل کانپ اٹھا۔ "وہاں سب ٹھیک تو ہے نا بیٹا؟" انہوں نے پریشان نظروں سے بیٹے کی جانب دیکھا۔

"پتا نہیں بی جان! منیر بھائی نے کچھ بھی نہیں بتایا۔" وہ پیشانی مسلتے ہوئے بولے۔ تو نگہت تیزی سے بولیں۔

"تو پھر چلیں نا، دیر کیوں کر رہے ہیں۔"

"ہاں چلو۔" وہ نگہت اور دونوں بیٹوں کے ساتھ ساتھ اپنے تینوں بھائیوں اور بڑے سالے کو لیے باہر کی جانب بڑھ گئے تو رطابہ بھی بی جان سے اجازت لے کر بھاگ کے ان کے ساتھ ہو لی۔

☼ ☼ ☼

"کیا؟ یہ کیا، کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" صدمے سے چور شاہ زمان نے اپنے اردگرد موجود چہروں کو بے یقینی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بری سے بری خبر کی توقع کر سکتے تھے۔ لیکن یہ، یہ تو قیامت کے صور سے کم نہ تھی۔ بے اختیار ان کی پھٹی پھٹی سی نگاہیں نگہت کے زرد متوحش چہرے سے ہوتے ہوئے اپنے لخت جگر کے فق چہرے پر آن ٹھہریں جس کی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت پورے وجود سے مترشح تھی۔

"آپ مجھے بتائیں میں۔۔۔۔ او میرے خدا! یہ کیا ہو گیا؟" شاک اتنا اچانک اور شدید تھا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہیں، بے اختیار وہ اپنا چکراتا سر تھام کر رہ گئے تھے۔

"میں تمہارا گنہگار ہوں زمان! مجھے معاف کر دو!" شکستہ و نڈھال سے بیٹھے حیات احمد اچانک اٹھ کر دوست کے قدموں میں آ بیٹھے تو نیم جان سی عافیہ بلک کر رو پڑیں۔ جبکہ متورم چہرہ اور الجھے بال لیے کھڑی رائنہ اپنی سسکیاں دبانے کو لبوں پہ ہاتھ رکھ گئی اور شاہ زمان وہ سر اٹھائے ہوئے فقط خالی اور گم صم سی نظروں سے انہیں دیکھنے لگے۔

"تو کچھ بولتا کیوں نہیں زمان؟" ان کا گھٹنا تھامتے ہوئے حیات صاحب نے روہانسے لہجے میں استدعا کی تو نگہت بے اختیار چلا اٹھیں۔

"کیا بولیں؟ اب بولنے کو کچھ رہ گیا ہے کیا؟" ان کا چہرہ غصے کی تپش سے سرخ اور آنکھیں تکلیف کی شدت سے نم ہو چلی تھیں۔

"میں پوچھتی ہوں اگر آپ کی بیٹی کی مرضی کہیں اور تھی تو آپ لوگوں نے ہمارا تماشا کیوں لگوایا؟ ہمارے بیٹے کی تابعداری کو اس کی رسوائی کا سامان کیوں بنا دیا؟" شدت جذبات سے ان کی آواز پھٹ سی گئی تو حیات احمد تڑپ کے گویا ہوئے۔

"خدا کی قسم بھابھی! ہم لاعلم تھے۔ آپ کی طرح ہم نے بھی بے خبری میں مار کھائی ہے۔ اگر مجھے اس بدبخت کے برے ارادوں کا رتی برابر بھی علم ہوتا تو میں اس بدذات کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیتا مگر آپ کی اور اپنی عزت پہ حرف نہ آنے دیتا۔"

آنسو ٹوٹ ٹوٹ کے ان کے چہرے سے ہوتے ہوئے ان کے گریبان میں جذب ہو رہے تھے۔ مگر نگہت بیگم کے چہرے پر پھیلے تنفر میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔

"ہونہہ! بیٹی کے ماں باپ اور اتنی بے خبری؟ آفرین ہے!" انہوں نے نفرت سے ہنکارا بھرا تو حیات احمد لب بھینچ کر رہ گئے۔

"ایسے ماں باپ کو تو ڈوب مرنا چاہیے جنہیں یہ تک پتا نہ ہو کہ ان کی اولاد ان کی ناک کے نیچے کیا گل کھلا رہی ہے۔" ان کا ہر ہر لفظ زہر میں بجھے تیر کی مانند عافیہ اور حیات کے جگر کو چھلنی کر گیا تھا۔ مگر وہ لب سیے گردنیں جھکائے مجرموں کی طرح ان کی نفرتیں سہنے پر مجبور تھے۔ صرف اس لیے کہ جن کی بیٹیاں ایک غیر شخص کی محبت میں اپنے پیدا کرنے والوں کی محبت کو فراموش کر کے انہیں ان کی شفقتوں کے بدلے میں ذلتوں کے طوق دے جاتی ہیں' وہ بدنصیب پھر کبھی دنیا کے سامنے سر اٹھا کر نہیں جی سکتے۔

"آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ ہم جیسے ماں باپ کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں جن کا جرم صرف اتنا ہے کہ انہوں نے اپنی اولاد کو نا صرف پیار دیا بلکہ مان اور اعتبار بھی دیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ اس کی حفاظت کریں گے۔ مگر میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں غلط تھا۔ میری سوچ غلط تھی۔ میرا نظریہ غلط تھا۔ میں آپ کا' زمان اور شہباز کا مجرم ہوں۔ آپ لوگ مجھے جو چاہیں سزا دے سکتے ہیں۔"

روتے ہوئے حیات احمد نے ہاتھ باندھ دیے تو رائنہ نے تیزی سے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔ اس کے باپ کا "اعتراف جرم" اس کے دل و روح پہ منوں بوجھ ڈال گیا تھا۔ اتنا بوجھ کہ بے اختیار اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا تھا۔

جبکہ اپنے بھائی کے برابر' غم و غصے کی عجیب سی کیفیت میں گھرے کھڑے شاہ نواز کے دل کو بے اختیار کچھ ہوا تھا۔

چاہے کچھ بھی تھا' حیات احمد نے ان دونوں بھائیوں کو ہمیشہ اپنی اولاد کی طرح چاہا تھا۔ سو ان کی اس درجہ تکلیف اور رسوائی اس کا دل کاٹ کر رکھ گئی تھی۔ مگر وہ چاہ کر بھی آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ بے اختیار لب بھینچے اس نے اپنی نم آنکھیں پھیر لی تھیں۔

"ہم نے تمہیں کیا سزا دینی ہے حیات! لیکن میں صرف اتنا کہوں گا کہ تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" حیات صاحب کے چہرے پر نگاہیں جمائے بالآخر زمان صاحب انتہائی بوجھل لہجے میں گویا ہوئے تو بے یقینی کے باعث حیات احمد کے آنسو منجمد سے ہو گئے۔

"زمان! تمہیں' تمہیں بھی لگتا ہے کہ مجھے ہر بات کا علم تھا؟"

"تمہیں علم تھا یا نہیں۔ اس بحث کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ جب تم لوگوں نے زرمین کو اس رشتے کے بارے میں بتایا تھا تب اس نے کیا جواب دیا تھا؟" لایعنی بحث کو طول دینے کے بجائے شاہ زمان نے دو ٹوک انداز میں اصل مدعا کی جانب پیش رفت کی تو سب کی سوالیہ نگاہیں حیات احمد پہ آن ٹھہریں۔ جبکہ عافیہ کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔

اس بات کا نہیں کہ انہوں نے کسی قسم کی کوئی غلط بیانی کی تھی۔ بلکہ اس بات کا کہ کہیں حیات صاحب کا جواب سن کے شاہ زمان اور باقی سب لوگ انہیں ہی قصوروار گرداننے لگیں۔ جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔

"وہ اس رشتے کے لیے تیار نہیں تھی۔ لیکن اس کی وجہ اس نے ہمیں کچھ اور۔" حیات احمد بنا کسی ہچکچاہٹ کے گویا ہوئے تھے لیکن زمان صاحب نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے انہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

"بس بات ختم! پھر تم اب کیوں یہ دہائی دیتے پھر رہے ہو کہ تم نے بے خبری میں مار کھائی؟ جبکہ روز اول سے تم یہ بات جانتے تھے کہ تمہاری بیٹی اس رشتے پر راضی نہیں تھی۔ پھر تم نے مجھے اور میرے بیٹے کو کیوں خوار کیا؟ کیوں مجھ سے یہ حقیقت چھپائی کہ زرمین اس شادی کے لیے تیار نہیں؟"

اس تمام عرصے میں پہلی بار وہ بلند آواز میں چلّائے تو ان کی اس درجہ بدگمانی پہ حیات انہیں دکھ اور بے بسی سے دیکھ کر رہ گئے۔ جبکہ نگہت نے طنزیہ انداز میں گردن کو خفیف سا جھٹکا دیتے ہوئے تنفر سے نڈھال بیٹھی عافیہ کی طرف دیکھا جو اپنے ڈر کو سچا ہوتا دیکھ کر فق ہو گئی تھیں۔ جبکہ شہباز اور نواز' دونوں شاکڈ سے حیات احمد کی جانب دیکھنے لگے تھے۔ جن کے جواب نے ان کے دلوں پر بڑی کاری ضرب لگائی تھی۔

شہباز نے اک گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنے بڑھتے ہوئے اشتعال پر قابو پانے کی سعی کی تھی' جو اگر اس کے اختیار سے باہر ہو جاتا تو شاید پھر آج بہت کچھ اپنے ساتھ بہا لے جاتا۔ جو اسے اس درجہ اذیت کے عالم میں بھی منظور نہ تھا کہ بہرکیف اب بھی اس کا بھائی اس خاندان سے جڑا ہوا تھا۔ وگرنہ اب اس حقیقت کے منکشف ہونے کے بعد تو حیات انکل کا لحاظ جو اسے اب تک چپ رہنے پر مجبور کیے ہوئے تھا' بھی ختم ہو گیا تھا۔

"بولو! اب بولتے کیوں نہیں؟" انہیں خاموشی سے اپنی جانب تکتا پا کر شاہ زمان غصے سے دھاڑے تو نگہت تیزی سے شوہر کے قریب چلی آئیں۔

"میں بتاتی ہوں۔ انہوں نے اس لیے ہم تک زرمین کا انکار نہیں پہنچایا کہ کہیں ہم رائنہ اور نواز کے رشتے سے بھی انکار نہ کر دیں۔"

انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے حیات احمد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو ان کا کیا خیال ہے' میں اب اس رشتے کو قائم رکھوں گا؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ تنفر سے بولے تو اب تک خاموش تماشائی بنے بیٹھے رشتے داروں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ عافیہ بے اختیار چہرے پر دوپٹہ رکھے باآواز بلند رونے لگیں۔ جبکہ رائنہ اپنا رونا اور نواز ہر بات بھلا کر سناٹے کی سی کیفیت میں باپ کا چہرہ تکنے لگا جو قہر برساتی نگاہوں سے ساکت کھڑے حیات احمد کو گھور رہے تھے۔

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو زمان؟ ہوش سے کام لو۔" نگہت کے بڑے بھائی نے آگے بڑھتے ہوئے انہیں گھر کا تو وہ تیز لہجے میں بولے۔

"ہوش سے ہی تو کام لے رہا ہوں۔ اگر کل کو یہ بھی کسی کے ساتھ بھاگ گئی تو میرا تو پورا خاندان تباہ ہو جائے گا نا!" الفاظ تھے یا آگ! رائنہ کا پورا وجود لمحوں میں بھڑ بھڑ جلنے لگا تھا۔ تڑپ کر اس کی نظریں نواز کی جانب اٹھی تھیں۔ جس نے اتنی سختی سے لب بھینچے تھے کہ نچلا لب کٹ گیا تھا۔ جبکہ عافیہ تو تڑپنا تک بھول گئی تھیں۔

"زمان!" حیات احمد کا صبر جواب دے گیا تو وہ بے اختیار چلّا اٹھے۔ میری پاک باز بچی پہ اتنی بڑی تہمت مت لگاؤ۔"

"تہمت؟" انہوں نے کاٹ دار نظروں سے حیات کی جانب دیکھا۔ "یہ تمہارے نزدیک تہمت ہو گی لیکن میرے نزدیک یہ ایک بہت بڑی سچائی ہے۔ جس گھر کی ایک بیٹی نے یہ گل کھلائے اس گھر کی دوسری بیٹی پہ بھلا کوئی کیوں اعتبار کرے گا؟ مجھے کسی پاگل کتے نے نہیں کاٹا کہ میں ایک ہی جگہ سے دوسری مرتبہ دھوکا کھانے کے لیے تیار ہو جاؤں گا جن لڑکیوں نے ماں باپ کی عزت کو بیچ چوراہے پہ نیلام کر دیا' وہ بھلا شوہر اور سسرال کی عزت کی کیا حفاظت کریں گی؟ تم سے رشتے داری جوڑ کے مجھے اپنی آنے والی نسلوں کو برباد نہیں کرنا۔ اس لیے میں ابھی اسی وقت رائنہ اور نواز کا رشتہ ختم کرتا ہوں۔"

وہ انتہائی سخت اور سرد لہجے میں بولے تو پورے لاؤنج میں سناٹا سا چھا گیا۔ جبکہ ان کے لفظوں کی مار سہتی رائنہ نڈھال سی' زمین پہ گھٹنوں کے بل گر گئی۔

اسے یوں مصلوب سے دیکھ کر جہاں کتنی ہی

سسکیاں بلند ہوئی تھیں۔ وہیں ساکت کھڑا نواز بھی جیسے ہوش میں آگیا تھا۔

"آغا جان! یہ' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ بجلی کی سی تیزی سے درمیانی فاصلہ طے کرتا باپ کے نزدیک چلا آیا۔ محبت نمی بن کے اس کی متوحش نگاہوں سے چھلکنے کو بے تاب تھی۔

اس ایک ہفتے میں ان معصوم دلوں نے کتنی تیزی سے ایک دوسرے کی ذات تک کا سفر طے کیا تھا۔ یہ کوئی ان سے پوچھتا جنہوں نے محض سات دن کے قلیل عرصے میں اپنی آنے والی زندگی کے بہت سے خوب صورت خواب اپنی پلکوں پہ سجا لیے تھے۔

"میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں۔ تمہیں ابھی اسی وقت اس لڑکی کو طلاق دینا ہوگی۔" ان کی برفیلی نگاہیں اس پہ آن ٹھہریں تو وہ بے یقین سا کتنے ہی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"نہیں! میں' میں ایسا کبھی نہیں کروں گا۔" نفی میں سر ہلاتا وہ وحشت زدہ سا نگہت کی جانب پلٹا۔ "امی آپ آغا جان کو سمجھاتی کیوں نہیں؟ اس میں رائنہ یا میرا کیا قصور ہے۔ جو وہ ہمیں اتنی بڑی سزا دینے چلے ہیں۔ پلیز امی! خدا کا واسطہ ہے انہیں روکیں۔ نہیں تو میں مر جاؤں گا۔ میں مر جاؤں گا امی!"

ان کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے وہ گرد و پیش سے بے خبر زارو قطار روتے ہوئے بے اختیاری کے عالم میں چلایا تو بیٹے کی اس درجہ تڑپ پہ نگہت کا دل کٹنے لگا۔ بے اختیار انہوں نے پریشان نظروں سے شوہر کی جانب دیکھا جو ان کی کیفیت بھانپتے ہوئے سرد لہجے میں بولے۔

"خبردار! جو ایک لفظ بھی کہا تو۔" انہیں انگلی اٹھا کر وارننگ دیتے انہوں نے آگے بڑھ کے ایک جھٹکے سے نواز کا رخ اپنی طرف کیا۔

"اور تم! بند کرو یہ تماشا اور غور سے میری بات سنو۔ آج اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میرا مرا ہوا منہ دیکھو گے۔ اب یہ تم پر ہے کہ تمہیں باپ کی زندگی چاہیے یا اس لڑکی کا ساتھ!" اسے بند گلی میں کھڑا کر کے انہوں نے فیصلے کا اختیار اسے سونپ دیا تو وہ تڑپ اٹھا۔

"پلیز آغا جان! یہ سب مت کریں۔" پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔

"ہاں زمان! تمہارا گنہگار میں ہوں۔ تمہیں جو سزا دینی ہے مجھے دے لو۔ لیکن یوں اپنے بچوں کی زندگی برباد مت کرو۔ دیکھو' میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ ان معصوموں کو بنا کسی وجہ کے اتنی بڑی سزا مت دو۔" حیات احمد نے تیزی سے ان کے نزدیک آتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر انہیں ان کے ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر شاہ زمان ان پہ اک نگاہ غلط ڈالنے کے بھی روادار نہ تھے۔

"فیصلہ کرو شاہ نواز!" انہیں مکمل طور پہ نظر انداز کیے وہ زور سے دھاڑے تو نیم جان ہوتی عافیہ نے بھاگ کر ان کا بازو تھام لیا۔

"خدا کے واسطے زمان بھائی! میری رائنہ بے قصور ہے۔ اس پہ اتنا بڑا ظلم مت کریں۔" ان کے آنسو تھے کہ دیکھے نہیں جا رہے تھے۔

"ہاں زمان! ہوش سے کام لو!"

"پلیز زمان بھائی! کچھ تو خوف خدا کریں۔" یکایک بہت سی آوازیں ان کے ارد گرد سنائی دینے لگی تھیں۔ مگر شاہ زمان نے تو جیسے کان بند کر لیے تھے۔

"شاہ نواز! اپنا فیصلہ سناؤ۔" وہ پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز میں چلائے تو نواز بے بس سا باپ کے آگے ہاتھ جوڑ گیا۔ مگر اگلے ہی لمحے ان کا ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب کی جانب بڑھتا دیکھ کے وہ فق ہو گیا تھا۔ بے اختیار اس کی خوف زدہ نظریں ان کے چہرے کی طرف اٹھی تھیں۔ مگر وہاں موجود چٹانوں کی سی سختی نے اسے لمحوں میں یہ باور کروا دیا تھا کہ اگر اس نے ان کے خلاف جانے کی کوشش بھی کی تو وہ اپنی پسٹل نکالنے میں لمحے کا توقف نہ کریں گے۔ بلکتے ہوئے اس کے دل نے سسک کر آخری ہچکی لی تھی اور فیصلہ ہو گیا تھا۔

"رائنہ حیات! میں شاہ نواز زمان تمہیں طلاق دیتا

ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔"

آنکھیں بھینچے اس نے ایک جھٹکے سے اپنی روح کو اپنے جسم سے کھینچ نکالا تھا اور خود درد کی اذیت سے نڈھال ہوتا دو زانو زمین پہ آگرا تھا۔

بند آنکھوں کے ساتھ اس نے اپنے ارد گرد شور اور چیخیں بلند ہوتی سنی تھیں۔ مگر اپنے اندر سوائے سناٹوں کے اسے اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسے عجیب سناٹے جو سنسناتے ہوئے اس کے رگ و پے میں سرایت کرتے جا رہے تھے اور اس کا دم لحظہ بہ لحظہ گھٹتا چلا جا رہا تھا۔

بے اختیار گھبرا کر ایک جھٹکے سے اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے اس نے اس اذیت سے نجات حاصل کرنا چاہی تھی۔ مگر رائنہ کی وحشت زدہ پھٹی پھٹی' بے یقین سی نظریں خود پہ جمی پا کے وہ سانس تک لینا بھول گیا تھا۔ کیا کچھ نہ تھا اس اک نگاہ میں کہ وہ مارے خوف خدا کے کانپ اٹھا تھا۔

تب ہی دو بازوؤں نے اسے زبردستی اٹھاتے ہوئے کھڑا کیا تھا اور کسی کٹھ پتلی کی مانند اسے کھینچتے ہوئے باہر کی جانب قدم بڑھائے تھے۔ مگر شاہ نواز کی آنکھیں اس پتھرائے ہوئے چہرے پر سے ہٹنے سے انکاری ہو گئی تھیں۔ جس پہ اسے کسی سائے کا گمان ہو رہا تھا اور اس سے پہلے کہ اس کے قدم اس دہلیز کو پار کرتے' ساکت کھڑا' وہ سایا لہرایا تھا اور اگلے ہی لمحے نہ صرف خود زمین بوس ہوا تھا۔ بلکہ شاہ نواز زمان کے بے جان وجود کو بھی ہمیشہ کے لیے ہزاروں ٹکڑوں میں بکھیر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

حادثہ تھا یا کوئی قیامت' حیات احمد کے پورے خاندان کی بنیادیں ہل کر رہ گئی تھیں اور خمیازہ تو آنے والی کتنی نسلوں کو بھگتنا تھا۔ ذلت' شرمندگی اور بربادی نے مل کر ان کے ہنستے بستے گھر پہ ایسا شب خون مارا تھا کہ وہ خود میں دنیا کا سامنا کرنے کی طاقت ہی کھو بیٹھے تھے اور جب لڑنے کا حوصلہ ہی نہ رہا تھا تو دل کی دھڑکنوں کا منتشر ہو جانا کوئی اتنے تعجب کی بات نہ تھی۔

ادھر حیات احمد آئی سی یو میں تھے اور ادھر رائنہ شدید قسم کے نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو کے زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھی۔ ایسے میں عافیہ کے لیے سوائے ماتم کے اور کچھ بھی نہ بچا تھا۔

خانہ شادی یوں لمحوں میں خانہ غم بن جائے گا۔ کسی نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا اور اب جبکہ حقیقت ایک بھیانک خواب کا روپ دھار چکی تھی تو سب ہی اس کڑی آزمائش کے مزید طویل نہ ہونے کے لیے رب تعالیٰ کے حضور سربسجود تھے کہ مزید دکھ اور نقصان اٹھانے کا حوصلہ اب ان میں نہ رہا تھا۔

دو دن کی طویل اور سخت آزمائش کے بعد جب بالآخر ڈاکٹروں نے انہیں حیات احمد کی طبیعت سنبھلنے اور اسی شام رائنہ کے ہوش میں آنے کی نوید سنائی تو زندگی کی ایک نئی لہر ان سب کے اندر دوڑ گئی تھی۔ اور اس نئی لہر کو قائم رکھنے کے لیے حیات احمد نے اس شہر سے ہی کوچ کر جانے کا فیصلہ کیا تھا جس کی فضائیں تک انہیں خود پر ہنستی محسوس ہوتی تھیں۔ اور یوں باہمی صلاح مشورے سے وہ راشد کے پاس اسلام آباد شفٹ ہو گئے تھے۔ جہاں کچھ عرصہ ساتھ رہنے کے بعد انہوں نے اپنا الگ گھر لے لیا تھا۔ بزنس بھی انہوں نے راشد کی مدد سے نئے سرے سے شروع کیا تھا۔

زندگی رفتہ رفتہ ہی سہی لیکن ایک بار پھر اپنے مدار میں گھومنے لگی تھی۔ لیکن ایک چیز جو بکھر کر رہ گئی تھی وہ تھے جذبات و احساسات۔ جن کے ٹوٹے تار روح میں کچھ ایسے چبھے تھے کہ ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ دل اپنے نقصان پہ سسک اٹھتا تھا۔ اس پہ مستزاد رائنہ کی خالی آنکھیں اور لبوں پہ لگی چپ انہیں دوہری اذیت میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔

اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنی بڑی اور سخت آزمائش نے اسے دنوں میں لڑکپن سے نکال کر پختگی کی سرحد پر لا پھینکا تھا۔ اس ظالم اور خود غرض دنیا نے فہم و ادراک

کے جو سبق اسے پڑھائے تھے انہوں نے اس کے اندر کی بچی کا گلا گھونٹ کر ایک شکست خوردہ عورت کو جنم دیا تھا۔ جسے بہلانا، کھینچ کے زندگی کی طرف لانا اور اس کا خود اپنی ذات اور اپنے رشتوں پہ اعتماد بحال کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ لیکن حیات احمد نے ہمت نہ ہاری تھی۔ ان کی بیٹی ایک ایب نارمل شخصیت کی مالک بن جاتی، یہ انہیں کسی طور قبول نہ تھا۔ ان کی انتھک محنت اور کوششوں کے نتیجے میں رائنہ نہ صرف زندگی کی جانب پلٹی تھی۔ بلکہ ان کے مان، حوصلہ افزائی اور سہارے نے اس کے اندر خود اعتمادی اور خودداری کے ایسے رنگ بھرے تھے کہ اس ٹوٹی بکھری خود ترسی میں مبتلا رائنہ کی جگہ ایسی بااعتماد، ذہین اور مضبوط لڑکی ابھر کر سامنے آئی تھی کہ دیکھنے والوں کو کبھی گمان تک نہ ہوا تھا کہ وہ کتنے بڑے حادثے سے دوچار ہو کر اس مقام تک پہنچی ہے۔

ماضی اور اس سے جڑا ہر تلخ تجربہ اس نے ہمیشہ کے لیے فراموش کر دیا تھا اور شاہ نواز زمان کا نام کسی حرف غلط کی طرح اپنی زندگی سے مٹا ڈالا تھا۔ لیکن شاہ نواز کے لیے اس حادثے نے زندگی کے معنی ہی بدل ڈالے تھے۔ اس کے لیے رائنہ کو فراموش کرنا اور اپنے اندر سلگتے ہوئے جرم کے احساس سے نجات حاصل کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔

اپنے ماں باپ خصوصاً" زمان صاحب کو دل کی گہرائی سے معاف کرنا اس کے بس میں نہ تھا اور منافقت سے اسے شدید نفرت تھی۔ اس لیے وہ ان سے دور ہو گیا تھا۔ بلکہ وہ ایک ان سے کیا سب سے ہی کھنچ سا گیا تھا۔ تنہائی اور سناٹوں نے اس کے وجود میں ایسے پنجے گاڑے تھے کہ وہ کھل کر مسکرانا تک بھول گیا تھا۔

اس کے رویے کا یہ تناؤ، لبوں کی یہ خاموشی اور خود کو سزا دینے کا یہ عمل جلد ہی نگہت کو اپنی غلطی کا احساس دلا گیا تھا۔ انہوں نے عافیہ اور حیات احمد کو اپنے تئیں ان کے جھوٹ اور دغابازی کی سزا دینا چاہی تھی۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ سب یہ بھول گئے تھے کہ سزا اور جزا کا اختیار صرف اس پاک ذات کے ہاتھ میں ہے جو خود یہ کسی کا رائی برابر حق نہیں رکھتا اور پھر اس نے یہی کیا تھا۔

انہوں نے زرمین کے کیے کی سزا رائنہ کو دی تھی تو اللہ نے بھی ان کے دل کو اولاد کے دکھ سے آشنا کر دیا تھا۔ ان کا بیٹا ان کا ہوتے ہوئے بھی ان کا نہ رہا تھا۔ وہ ان سب سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ وہ ان سے کوئی قلبی تعلق، کوئی لگاؤ محسوس نہ کرتا تھا۔ یہ سب سزا نہیں اور کیا تھا؟ مگر اب ان کا اپنی غلطی کو ماننا اور پچھتانا کس کام کا تھا۔ جب حوصلے اور درگزر کا وقت تھا تب انہوں نے انا اور غصے میں اپنے شوہر کے غلط فیصلے کے آگے خاموشی اختیار کرتے ہوئے اپنی اولاد کو تنہا کر دیا تھا۔ پھر اب اگر یہ تنہائیاں ان کے بیٹے کے اندر تک اتر گئی تھیں تو وہ اس کی بربادی کا ذمہ دار کس کو ٹھہراتیں؟ کس کو اس سرد جنگ کے لیے مورد الزام ٹھہراتیں جس نے نواز کو ان سب کے مقابل لا کھڑا کیا تھا؟

ضمیر کی اس بازپرس نے ان کا رہا سہا سکون بھی برباد کر دیا تھا۔ کاش کہ نواز نے اپنے دل کے اجڑنے کا ماتم با آواز بلند سب سے لڑ جھگڑ کے کیا ہوتا تو شاید ان کی یہ خلش اتنی شدید نہ ہوتی۔ لیکن اس نے تو اپنا ہر احتجاج ہر آنسو اپنی ذات کے اندر ہی دفن کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ جب نگہت نے اس سے معافی مانگی تب ہی اس نے بنا کچھ جتائے انہیں بڑی نرمی سے معاف کر دیا تھا۔ یہ جانے بنا کہ اس کی یہ اعلا ظرفی انہیں اپنے رب کے حضور کس قدر شرمندہ کر گئی تھی۔ ان کی دعاؤں میں کتنی التجاؤں کا اضافہ کر گئی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ بیٹے کی حالت اور دوری نے شاہ زمان کو بھی اپنے جذباتی فیصلے کا احساس دلا دیا تھا۔ مگر چونکہ وہ باپ تھے اس لیے خود میں بیٹے سے معافی مانگنے کا حوصلہ پاتے تھے۔ لیکن ان کی نظریں ہر لحہ نواز سے خاموش التجائیں کرتی تھیں۔ جنہیں وہ سمجھ کر بھی نظرانداز کر جاتا تھا۔

اور جب بالآخر پانچ سال بعد اللہ نے اس کی دعاؤں اور توبہ کو قبول کرتے ہوئے اسے اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنے کا ایک نادر موقع عطا کیا تھا تو اس نے بھی اپنے رب کے اس درجہ فضل و کرم پہ اپنے ظرف کو وسیع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر وہ اپنے باپ کے حق میں سختی دکھا کر ایک بار پھر اپنے اللہ کو ناراض کرنے کی غلطی نہیں دہرانا چاہتا تھا۔ وہ عفو و درگزر سے اپنا رشتہ توڑ کے خود کو باطلوں کی صف میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ اللہ کے حضور اپنے کفارے کو مقبول بنانا چاہتا تھا اور اس کے لیے دل اور نیت کا ہر طرح کی کثافت سے پاک ہونا اشد ضروری تھا۔ سو شاہ نواز زمان نے بھی یہی کیا تھا۔ اس دعا کے ساتھ کہ اس کا دوست اور اس کی محبت دونوں ہمیشہ خوش رہیں۔

٭ ٭ ٭

عالم نے اک بے بس سی نظر اپنے ہی کمرے کے دروازے پر ڈالی تھی اور پھر اک گہری سانس کھینچتے ہوئے اس نے ہینڈل پر دباؤ بڑھایا تھا۔ نتیجتاً" دروازہ کلک کی آواز سے کھل گیا تھا اور اسے نہ چاہتے ہوئے بھی قدم بڑھانے پڑے تھے۔

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پہ بیڈ پہ نگاہیں جھکائے بیٹھی رائنہ کا ڈوبتا ابھرتا دل، کسی بے قرار پرندے کی مانند جسم کے قفس میں پھڑپھڑایا تھا اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں اپنی بے بسی پہ بھر آئی تھیں۔ نجانے آنے والا اس کے دامن میں عمر بھر کے پچھتاوے ڈالنے والا تھا یا اس کے بے اعتبار اور بکھرے ہوئے وجود کو عزت کی ردا اوڑھا کر اس کی آزمائشوں کو ختم کرنے والا تھا۔

بہت کوشش کے باوجود بھی ایک بے اختیار سسکی اس کے لبوں کی قید سے آزاد ہو کر کمرے کے خاموش ماحول میں ہلکا سا ارتعاش برپا کر گئی تو اب تک دروازے کی سمت چہرہ کیے ہوئے عالم نے چونک کر پلٹ کے رائنہ کی جانب دیکھا اور باوجود اس کے کہ وہ سائیڈ سے اس کے چہرے کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا۔ اس کے آنسو اس سے مخفی نہ رہ سکے تھے۔

"یہ لیجیے پانی پییں۔" رائنہ کو اپنے دائیں جانب قدموں کی آواز آئی اور پھر گلاس میں پانی ڈالنے کے بعد ایک نہایت خوب صورت آواز نے مخاطب کیا تو اس کی نظریں اپنے سامنے آن ٹھہرنے والے نفیس سے شیشے کے گلاس سے ہوتی ہوئی اسے تھامنے والے مضبوط ہاتھ پہ آٹھہریں۔

اگلے ہی لمحے اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے گلاس تھام لیا۔ تو ایک پل کے لیے اس مرمریں ہاتھ کی سفیدی اور اس پہ چھب دکھلاتی حنا کی سرخی نے عالم کا سارا دھیان اپنی جانب مبذول کروا لیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ سر جھٹکتے ہوئے رسان سے بولا۔

"اگر آپ کے یہ آنسو اپنے ماں باپ کی جدائی کے احساس سے بہہ رہے ہیں تو بے شک انہیں بہنے دیجیے۔ لیکن اگر یہ کسی واہمے یا وسوسے کا نتیجہ ہیں تو انہیں فوراً" سے پیشتر صاف کر ڈالیں کیونکہ میں حال میں زندہ رہنے والا انسان ہوں۔ ماضی میرے نزدیک صرف اچھی یادوں کو دہرانے اور غلطیوں سے سبق سیکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کی تلخیاں، اس کی کڑواہٹیں مجھے حال میں شامل کرنا پسند نہیں اور اس وقت تو بالکل بھی نہیں جب یہ کسی اور کی گھولی ہوئی ہوں۔"

بات کرتے ہوئے وہ آہستگی سے اس کے سامنے آ بیٹھا تو رائنہ کی بھیگی ہوئی بے یقین آنکھیں اپنے سامنے آٹھہرنے والے وجیہہ چہرے پر جم کر رہ گئیں جو اپنے ہر لفظ سے اسے کسی حیرت کدے میں دھکیل رہا تھا۔

دنیا میں خصوصاً" ہمارے معاشرے میں مرد ایسی بھی سوچ رکھتے ہیں اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ دوسری جانب اسے یوں پہلی بار روبرو پا کر عالم کو اب تک کی سنی گئی اس کی ہر تعریف کم لگی تھی۔

"آپ واقعی بہت خوب صورت ہیں۔" اس کی دھلی دھلی حیران آنکھوں میں تکتے ہوئے عالم نے اچانک گمبھیر لہجے میں کہا تو موضوع کی اس اچانک تبدیلی پہ رائنہ چند سیکنڈ نا سمجھی کے عالم میں اسے

دیکھتی رہی۔ لیکن جونہی بات سمجھ میں آئی وہ جھینپ کر نظریں چرا گئی۔

اس کی یہ بے ساختگی نہ صرف عالم کو بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر گئی۔ بلکہ رائنہ کے لبوں پر بھی ایک مدت کے بعد بھرپور مسکراہٹ بکھر گئی۔ نجانے کیوں لیکن اسے اپنی آزمائش کے ختم ہونے کا یقین سا ہونے لگا تھا۔

✡ ✡ ✡

صبح جب رائنہ کی آنکھ کھلی تو ایک پل کے لیے اجنبی در و دیوار کا احساس اس کے سوئے ہوئے دماغ کو الجھن میں مبتلا کر گیا۔ لیکن جونہی ذہن پر سے نیند کا غلبہ چھٹا اس کی نظریں بیڈ کے دوسری جانب دراز وجود پر جا ٹکرائیں۔ اور وہ آہستگی سے اٹھ بیٹھی۔

وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے وہ ایک نظر عالم کے سوئے ہوئے چہرے پر ڈالتی احتیاط سے نیچے اتر آئی اور ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گئی۔ جہاں موجود دیوار گیر الماری کو کھول کر اپنے لیے ایک نسبتاً ہلکا جوڑا نکال کر وہ واش روم میں گھس گئی۔

تقریباً بیس پچیس منٹ بعد جب وہ دوبارہ کمرے میں واپس آئی تو عالم کو اسی زاویے پر سوتا پا کر تذبذب کا شکار ہو گئی۔ پتا نہیں وہ کتنے بجے تک اٹھنے کا عادی تھا۔ بے اختیار اس کی نظریں گھڑی کی جانب اٹھ گئیں۔ جہاں نو بجنے کو تھے۔ یقیناً ابھی کچھ ہی دیر میں ناشتے کا بلاوا آنے والا تھا اور پہلے ہی دن وہ تاخیر کا سبب بنتی یہ مناسب نہ تھا۔ وہ عالم کو کچھ دیر مزید ڈسٹرب نہ کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے کھڑکی کے پردے کھولتی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ بیٹھی۔ جہاں اپنے عکس پر نگاہ پڑتے ہی وہ ایک پل کو تھم سی گئی۔

کل تک اس کا یہ چہرہ سوچوں اور اندیشوں میں گھرا کتنا اترا ہوا تھا۔ لیکن آج محض چند حرف یقین، مان اور عزت نے مل کر اسے آسودگی کا کیسا عجب نکھار بخشا تھا کہ اس کے لیے خود کو پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ کاش کہ مرد اس حقیقت کو سمجھ سکتے کہ ان کی شریک سفر کے لیے اگر کوئی چیز "محبت" سے بڑھ کر بھی ہو سکتی ہے تو وہ ان کی جانب سے دیا جانے والا "اعتبار" اور "عزت" ہوتی ہے۔ جن کی موجودگی اس رشتے میں بھی محبت کا باعث بن جاتی ہے' جہاں محبت پہلے سے موجود نہیں ہوتی اور جن کی غیر موجودگی اس محبت کا بھی خاتمہ کر ڈالتی ہے۔ جس کے بڑے بڑے دعوے کیے گئے ہوتے ہیں۔

پتا نہیں زرمین نے انجانے میں اس کے ساتھ نیکی کی تھی یا برائی لیکن اب جبکہ زندگی میں ایک مخلص ساتھی کا ساتھ میسر آیا تھا تو اسے احساس ہوا تھا کہ اس کے اندر زندہ رہنے کی چاہ بھی تھی اور رنگوں سے بھری خوشگوار زندگی گزارنے کی تمنا بھی۔ جس پہ تلخ حالات نے برف کی تہہ ضرور جما ڈالی تھی لیکن انہیں منجمد کر کے فنا نہ کر سکے تھے اور اپنے اندر سانس لیتے اس نئے احساس نے اسے عجیب سی خوشی سے دوچار کر دیا تھا۔ جس کے رنگ اس کے چہرے پر واضح طور پہ دیکھے جا سکتے تھے۔

"یوں اکیلے اکیلے کس بات پہ مسکرایا جا رہا ہے؟" اچانک ایک دلکش آواز اس کے خیالات کے تانے بانے کو بکھیر کر اسے چونکا گئی تو وہ بے اختیار گردن موڑتے ہوئے اپنے دائیں جانب دیکھنے لگی جہاں عالم بیڈ کی پشت سے کمر ٹکائے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ کب اٹھے؟" جھینپتے ہوئے وہ دھیمے لہجے میں بولی تو عالم مسکرا دیا۔

"وہی کوئی پانچ منٹ پہلے..... لیکن آپ اپنی سوچوں میں اتنی محو تھیں کہ میں نے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کس بات پہ مسکرا رہی تھیں۔" اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ شرارت سے بولا تو رائنہ کا صبیح چہرہ گلابی پڑ گیا۔

"کچھ خاص نہیں۔" مسکراہٹ دبائے وہ رخ موڑ گئی تو عالم کمبل ہٹاتا بیڈ سے نیچے اتر آیا۔

"اچھا میں سمجھا کہ آپ میرے بارے میں سوچ رہی تھیں۔" چہرے اور لہجے میں سنجیدگی پیدا کرتا

اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تو آئینے میں اس کے بدلتے تاثرات کو دیکھتی رائنہ گھبرا سی گئی۔

"نہیں۔ میں آپ کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔" وہ بوکھلا کر بولی تو اس کے عکس پہ نگاہیں جمائے کھڑا عالم بے اختیار مسکرا دیا۔

"مجھے پتا تھا۔ لیکن آپ نے اتنی آسانی سے بھلا کب اقرار کرنا تھا۔" اور اس کی شرارت سمجھ میں آتے ہی رائنہ مصنوعی خفگی سے اسے تکنے لگی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اس کا موبائل بج اٹھا۔

سائیڈ ٹیبل کی جانب آتے ہوئے اس نے موبائل اٹھایا تو اسکرین پہ جگمگاتا نمبر اس کے لبوں پہ بھرپور مسکراہٹ بکھیرنے کے ساتھ ساتھ اس کا سیروں خون بڑھا گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ فون ہاتھ میں لیے تیزی سے بالکنی کی جانب کھلنے والا شیشے کا سلائیڈنگ دروازہ کھولتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ تو رائنہ قدرے حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ جو عجلت سے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا فون کان سے لگا گیا تھا۔

"آج اگر تو فون نہ کرتا تو پھر دیکھنا۔" عالم نے ہیلو کا تکلف کیے بنا دھمکی دی تو شاہنواز مسکرا دیا۔

"اور آج اگر تو میری کال نہ ریسیو کرتا تو پھر تو بھی دیکھتا۔"

"تجھے اتنا بڑا قدم اٹھاتے شرم نہ آئی؟ یا مجھ پہ یقین نہیں رہا تھا؟" وہ نواز کے کوئٹہ جانے کے بعد آج پہلی بار اس سے بات کر رہا تھا۔ اس لیے بے اختیار پھٹ پڑا تھا۔

"تجھ پہ تو اپنی ذات سے بڑھ کر یقین ہے یار! لیکن اس وقت پہ یقین نہیں ہے کہ کب بدل جائے کچھ پتا نہیں ہوتا اور میں اپنی دوستی کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔" وہ اک گہری سانس لیتے ہوئے بولا تو عالم قصداً بات کو ہلکے پھلکے انداز میں لے گیا۔

"بس بس زیادہ ڈائیلاگ بولنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بتا تو ٹھیک ہے؟"

"میں تو ٹھیک ہوں۔ تو اپنی سنا' خوش تو ہے؟" نواز نے اپنے دل میں سر اٹھاتے اندیشوں کو زبان دیتے ہوئے پوچھا۔ اسے یہ احساس مسلسل پریشان اور نادم کیے ہوئے تھا کہ عالم نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ محض اس کی خواہش اور خوشی کو پورا کرنے کے لیے کیا تھا۔

"ہاں۔" نجانے کیوں لیکن عالم کا لہجہ دھیما پڑ گیا تھا۔

"اور را... رائنہ؟" دوسری جانب نہ چاہتے ہوئے بھی نواز کے انداز میں جھجک اتر آئی تھی۔

"وہ بھی خوش ہے۔" بے اختیار اس کی نظریں اندر کی جانب اٹھی تھیں جہاں وہ اب تنہا نہیں بلکہ آپی اور بھابھی کے نرغے میں سجی سنوری بیٹھی تھی۔

"اللہ تم دونوں کو یونہی خوش رکھے۔ اچھا یار! رکھتا ہوں۔ مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔"

وہ دھیمے پڑتے لہجے میں بولا تھا لیکن عالم کو اس کی آواز میں اترتا بھاری پن آن واحد میں محسوس ہو گیا تھا۔

"ہوں۔" رائنہ پہ نگاہیں جمائے وہ محض یہی کہہ سکا تھا۔

"اپنا بہت خیال رکھنا۔" لائن منقطع ہونے سے پہلے شاہنواز کی نم آواز ایک بار پھر اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی اور وہ بے اختیار لب بھینچ گیا تھا۔ اس کے دوست نے محض اس کی خوشی اور اطمینان کے لیے کس پل صراط سے گزر کر اپنا وعدہ ایفا کیا تھا اسے اس حقیقت کا بخوبی علم تھا۔ اور اب اس نے اس کے لیے کیا کرنا تھا۔ یہ عالم غیاث نے اس پل اور اسی لمحے طے کر لیا تھا۔

✡ ✡ ✡

ولیمہ کی بے حد شاندار تقریب کے بعد رائنہ رسم کے مطابق میکے چلی آئی تھی۔ جہاں اگلے دن غیاث علی کی پوری فیملی ڈنر پر انوائیٹڈ تھی۔

رائنہ کے چہرے سے جھلکتے اطمینان اور خوشی کے احساس نے حیات احمد کے دل و روح کو اندر تک سرشار کر دیا تھا۔ لیکن عافیہ ماں تھیں۔ جب تک

انہوں نے بیٹی کی زبانی اس کا حال دل نہیں سن لیا۔ انہیں کسی طور چین آکے نہیں دیا اور جب رائنہ نے اپنا ہر احساس ماں کے سامنے کھل کر بیان کر ڈالا تو وہ بے اختیار اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو گئیں۔ جس نے انہیں اپنی اولاد کی جانب سے خوشیوں بھرا یہ دن دکھا کر ان کی ہر تکلیف اور اذیت کا بھرپور ازالہ کر ڈالا تھا۔

ان کے نزدیک رائنہ کی خوشی بہت اہم اور یہ احساس بہت تکلیف دہ تھا کہ زندگی کا یہ نیا سفر ان کی بچی نے محض اپنے ماں باپ کو مزید تکلیفوں اور پریشانیوں سے بچانے کے لیے شروع کیا تھا۔ لیکن اب یہ جان کر کہ وہ اپنے اس فیصلے پر دل سے خوش اور مطمئن تھی۔

ان کا رواں رواں اپنے خدا کے حضور شکر گزار تھا۔

ساری رات سب کی ہنستے ہنساتے، باتیں کرتے آنکھوں میں کٹی تھی اور اگلے دن گھر میں پچھلی مصروفیت اور رونق اپنے عروج پر تھی۔ نزہت سمیت شادی کے سلسلے میں آئے سب ہی مہمانوں کا قیام حیات صاحب کی طرف ہی تھا۔ جس کی وجہ سے گھر میں خاصی چہل پہل تھی۔

ہر کوئی رائنہ کے لیے حقیقتاً" بہت خوش اور دل سے دعا گو تھا اور یہ احساس اس کے لیے بہت خوش کن اور مان بھرا تھا۔

اسے وہ دن یاد آگیا تھا جب ہر زبان پہ زرمین کے لیے بددعائیں اور نفرت کا اظہار تھا۔ بے شک بیٹیاں ماں باپ کا فخر اور مان ہوتی ہیں اور یہ اسی فخر اور مان سے سب کی دعاؤں تلے رخصت ہوتے ہی اچھی لگتی ہیں۔ بشرط کوئی سمجھے تو!

دوپہر کے کھانے سے فراغت کے بعد سب وسیع و عریض لاؤنج میں بیٹھے گرین ٹی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے جب مجید کی معیت میں اندر آنے والی ہستی نے نہ صرف سب کو ایک لمحے کے لیے ساکت کر ڈالا تھا بلکہ وہ خود بھی پورے خاندان کو یوں اپنے سامنے پا کر زرد ہو گئی تھی۔ لیکن اب چونکہ واپس پلٹنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے ٹھنڈے پڑتے جسم کے ساتھ وہ آنے والے کڑے وقت کے لیے خود کو تیار کرنے لگی تھی۔ لیکن شاید یہی انصاف خداوندی ہے، جس کا سامنا ہر ظالم کو کرنا ہے۔ ورنہ اتنے سارے دنوں میں سے اسے یہاں آنے کے لیے یہی دن ملا تھا؟

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
ہم دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
ہم دیکھیں گے!

"تم! تمہاری جرأت کیسے ہوئی یہاں قدم رکھنے کی" سرخ چہرہ لیے حیات احمد ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے دھاڑے تھے۔ "مجید! ایک منٹ میں اس لڑکی کو یہاں سے باہر نکالو۔ فوراً"! انہوں نے قہر برساتی نظروں سے مجید کو دیکھتے ہوئے حکم دیا تو وہ گھبرا کر اس کی جانب بڑھا تھا۔ مگر وہ تیزی سے اسے ہٹاتی آگے بڑھ آئی تھی۔

"پلیز پاپا! ایک بار میری بات سن لیں۔ پھر چاہے مجھے نکال دیں۔" اس نے برستی آنکھوں سے اپنے باپ کی جانب دیکھا تھا جنہیں پانچ سال بعد یوں رو برو پا کر نظریں ان کے چہرے سے ہٹنے سے انکاری ہو گئی تھیں۔ جبکہ عافیہ اس دوران اپنی حیرت پہ قابو پاتی کے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں۔

"کیا چاہتی ہو؟ میں پوچھتی ہوں کیا چاہتی ہو تم؟" وہ حلق کے بل چلائی تھیں۔ "کیوں تم کسی خوں آشام بلا کی طرح ہر بار ہماری خوشیاں نگلنے آجاتی ہو؟ کیا ابھی تمہاری ہوس۔ تمہاری نیت نہیں بھرتی؟" انہوں نے بھرائے ہوئے لہجے میں اس کے ہاتھ میں پکڑی فائل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"یہ، یہ میں نے نہیں مانگا امی! میں آپ کو یہی بتانے آئی ہوں۔" روتے ہوئے اس نے فائل ان کے سامنے کر دی تھی۔

"یاور نے کب اور کیسے آپ سے رابطہ کیا۔ کیا کر

کر آپ سے یہ مطالبہ کیا، مجھے کچھ پتا نہیں امی۔"

"تمہیں کچھ پتا تھا یا نہیں۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ تم بس یہاں سے چلی جاؤ!" ہاتھ اٹھائے وہ قطعیت سے بولیں تو زرمین پھپک کر رو پڑی۔

"امی پلیز! مجھے معاف کر دیں۔ آپ سب کو دکھ دینے کی سزا میں روز جھیلتی ہوں..... میں روز جیتی اور روز مرتی ہوں۔ خدا کے لیے امی! مجھے معاف کر دیں۔"

دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے اس نے تڑپ کر استدعا کی تھی۔ فائل چھوٹ کر عافیہ کے قدموں میں آگری تھی۔

جبکہ حاضرین محفل انصاف باری تعالیٰ کے جیسے قائل ہو گئے تھے۔ بے اختیار ہی کتنی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ جبکہ رائنہ اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹنے کو لبوں پہ ہاتھ رکھ گئی تھی۔

"جانتی ہے زرمین! آج اگر تو مجھے اپنی خوشیوں کی اطلاع دیتی تو مجھے بہت حیرت ہوتی۔ کیونکہ میری ہر ہر سانس کے ساتھ تیرے لیے بددعا نکلی ہے۔ جس پل تیرا یہ باپ بھرے مجمع میں، صحن میں دھاڑیں مار مار کر رویا تھا اور جس پل تیری اس بہن کو تیری کرنی، طلاق کی صورت بھرنی پڑی تھی۔ تب میں نے اپنے رب کو روح کی شدتوں سے پکارا تھا اور آج میرا اس کی ذات پہ ایمان اور بھی مضبوط ہو گیا ہے۔ بے شک وہ سب سے بڑا منصف ہے۔"

بہتے اشک صاف کرتے ہوئے انہوں نے مسکرا کر اس کی برستی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ جو زرد چہرہ لیے لڑکھڑا گئی تھی۔

"تو جو پا رہی ہے اور جو پائے گی، یہ اس راستے کی منزل ہے جو تیرا اپنا منتخب کردہ تھا اور یہ وہ ہے، جو ہمارا فرض تھا۔" انہوں نے جھک کر فائل اٹھاتے ہوئے اس کے ہاتھ میں تھمائی تھی۔

"اب تیرا ہم پہ کوئی حق باقی نہیں رہا۔" انہوں نے دکھ بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی جانب سے رخ پھیر لیا تھا اور وہ جو ان کے قدموں سے لپٹ کر معافی مانگنے کی خواہش میں یہاں تک چلی آئی تھی۔ بے بسی سے آنسو بہانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکی تھی۔

بے اختیار اس کی برستی نظروں نے اپنے اردگرد موجود لوگوں میں اپنی ماں جائی کو تلاشنا چاہا تھا۔ مگر امڈتے آنسوؤں اور نفرت برساتی نگاہوں نے اس سے مزید یہاں رکنے کا حوصلہ چھین لیا تھا۔ یہ ہجوم، یہ چہرے نئے نہ تھے مگر آج جہاں وہ کھڑی تھی کل وہ یہاں اپنے ماں باپ کو کھڑا کر گئی تھی۔

"بے شک خدا بہت بڑا منصف ہے۔" سسکیاں سمیٹتے اس کے کانوں میں فقط ایک ہی فقرے کی گونج تھی۔

☼ ☼ ☼

"ارے یار نواز! کچھ پتا چلا۔" وہ سب گھر والوں کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھا رات کا کھانا کھا رہا تھا جب شہباز کے کہنے پہ وہ بے اختیار اس کی جانب دیکھنے لگا۔ باقی سب بھی شہباز کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"کس بارے میں؟"

"عالم کی شادی ہو گئی ہے یار۔" شہباز نے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا تو ایک پل کے لیے وہ خاموش ہو گیا۔ جب کہ باقی سب حیرت زدہ سے رہ گئے۔

"کیا؟ لیکن اس نے تو نواز کو بتایا تک نہیں۔" نگہت بیگم کے چہرے پر خفگی کے آثار در آئے تھے۔ جبکہ رطابہ کا دل نجانے کیوں گم صم سا ہو گیا تھا۔ بہت سے خاموش لیکن با معنی پل اس کے ذہن کی اسکرین پہ نمودار ہوئے تھے، جب کسی کی نظروں کے ارتکاز نے اسے بارہا چونکنے اور مقابل کی جانب متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

تو کیا وہ محض دل لگی تھی؟ مگر وہ یہ سوال کس سے اور کس بل بوتے پر کرتی کہ ان لمحوں میں زبان سے کیا اقرار تو کہیں بھی نہ تھا۔ لیکن پھر اس دنیا میں زبان تو دور خدا اور اس کے رسول کو گواہ بنا کر کیے گئے اقرار سے

بھی پھر نا مشکل نہیں اگر انسان کی نیت بدل جائے تو۔ سو اگر عالم غیاث انجان بن گیا تھا تو یہ کوئی اتنے تعجب کی بات تو نہ تھی۔

"مجھے معلوم تھا۔" نواز پر سکون انداز میں گویا ہوا تو سب کی حیرت دوچند ہو گئی۔

"تمہیں معلوم تھا؟ تو پھر تم گئے کیوں نہیں؟" شہباز نے اچنبھے سے اس کا چہرہ تکتے ہوئے پوچھا۔

"کیونکہ اس کی شادی رائنہ حیات سے ہوئی ہے۔" اپنے سابقہ پر سکون انداز میں جواب دیتے وہ پانی کا گلاس لبوں سے لگا گیا تھا۔ جبکہ تمام حاضرین محفل کی سماعتوں پہ گویا بم آگرا تھا۔

"امی! میں کھانا کھا چکا ہوں۔ آپ پلیز ایک کپ کافی میرے کمرے میں بھجوا دیجیے گا۔" سب کے تاثرات کو نظرانداز کرکے وہ اطمینان سے کرسی کھسکاتا اٹھ کر ڈائننگ روم سے باہر نکل گیا۔ تو وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

"تو یہ تھی اس کی اچانک واپسی کی وجہ اور میں سمجھی تھی کہ......" آنسوؤں کی یلغار نے نگہت کو بات مکمل نہ کرنے دی تھی اور وہ بے اختیار رو پڑی تھیں۔ جبکہ شاہ زمان لب بھینچ کر رہ گئے تھے۔

"امی پلیز حوصلہ کریں۔ بلکہ آپ کو تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے آپ کا بیٹا آپ کو لوٹا دیا ہے۔ ورنہ وہ ہم سب سے کتنا دور چلا گیا تھا آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔"

سیما نے برابر بیٹھی ساس کے شانوں پہ بازو پھیلاتے ہوئے انہیں حوصلہ دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا۔ لیکن میرا بچہ خود کس اذیت سے گزرا ہو گا۔ یہ سوچ کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔ نجانے اللہ کو کیا منظور ہے جو میرے بچے کی آزمائشیں ختم ہونے میں نہیں آرہیں۔"

وہ آنسوؤں کے درمیان بولیں تو اب تک خود پہ ضبط کیے بیٹھے شاہ زمان ایک جھٹکے سے کرسی دھکیلتے اٹھ کر کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

"یہ سب ان کی ضد کا نتیجہ ہے۔ میرے بچے کی خوشیاں......"

"پلیز امی! اگر بھائی نے پچھلی باتوں کو بھلا کر آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تو خدا کے لیے آپ اس پرانی بحث کو چھیڑ کر پھر سے ان کے زخموں کو مت کریدیں۔"

رطابہ نے جھنجھلا کر انہیں ٹوکا تو وہ بے اختیار خاموش ہو گئیں۔

"بھابھی ٹھیک کہہ رہی ہیں امی! بلکہ میرے خیال میں ہمیں اب نواز کی شادی میں مزید دیر نہیں کرنی چاہیے کیا خیال ہے آپ کا۔" اس نے اچانک رخ موڑتے ہوئے مسلسل خاموش بیٹھے شہباز کو مخاطب کیا تو وہ جو کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ بے دھیانی میں اثبات میں سر ہلاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نواز کے کمرے میں جا رہا ہوں، تم دو کپ کافی تیار کروا کے بھجوا دو۔" وہ سیما سے کہتا باہر کی جانب بڑھ گیا تو نگہت کچھ کہنے کی خواہش میں محض اس کی پشت کو دیکھ کر رہ گئیں۔

دستک کی آواز پہ نواز نے بنا دیکھے آنے والے کو اندر آنے کی اجازت دی تو شہباز دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کی پشت پہ آکھڑا ہوا جو کھڑکی میں کھڑا نہ جانے باہر اندھیرے میں کیا تلاش کر رہا تھا۔ اپنے پیچھے مسلسل خاموشی محسوس کرتے ہوئے نواز نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا تو شہباز کو سینے پہ ہاتھ باندھے اپنی جانب تکتا پا کر وہ اک گہری سانس لیتا اس کی طرف مڑ گیا۔

"کہاں سے لائے ہو اتنا حوصلہ؟" شہباز نے بغور اس کا چہرہ تکتے ہوئے سوال کیا۔

"پتا نہیں۔" وہ اپنی تیزی سے بھیگتی آنکھیں چرا گیا۔ بھائی کی صورت ایک مہربان کو سامنے پا کر نہ جانے کیوں اس کی ہمت، اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

"عالم تمہارے اور رائنہ کے متعلق جانتا ہے؟" اس کے سرخ پڑتے چہرے پر نگاہیں جمائے اس نے اگلا سوال کیا۔

"ہاں!" وہ آہستگی سے بولا تو شاہ نواز اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"اس کا مطلب ہے میرا اندازہ درست نکلا۔"

"کیسا اندازہ؟" اس نے آنکھوں میں موجود نمی حلق میں اتارتے ہوئے خود کو انجان ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"یہی کہ عالم اور رائنہ کی شادی ہوئی نہیں، بلکہ تم نے کروائی ہے یا پھر یوں کہو کہ روح پہ دھرے بوجھ میں کمی کے لیے تم نے ایک سبیل نکالی ہے۔" اس نے نواز کو اسی کی کہی بات لوٹائی تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"بھائی!" وہ خود پہ ہر اختیار کھو بیٹھا تو بے اختیاری کے عالم میں شہباز کے سینے آلگا۔

"حوصلہ میرے یار! تم تو بہت بہادر ہو۔" اسے تسلی دیتے شہباز کی اپنی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ رائنہ کے لیے اپنے بھائی کی شدتوں سے بخوبی واقف تھا۔ لیکن وہ اپنے عشق میں اتنا کھرا اترے گا، اس بات کا اسے اندازہ نہ تھا۔

"اللہ تمہاری کوشش کو قبول فرمائے اور تمہیں اتنا پُرخلوص شریک سفر دے کہ تمہاری زندگی سچی خوشی اور حقیقی اطمینان سے مالا مال ہو جائے۔"

اسے خود سے لپٹائے شہباز نے بے اختیار اسے دعا دی تو شاہ نواز کا سسکتا دل قدرے تھم سا گیا۔

☼ ☼ ☼

چوتھی کی رسم سے فراغت کے بعد رائنہ کو ایک بار پھر اسلام آباد والے گھر کے بجائے حویلی لایا گیا تھا۔ جہاں گاؤں میں غیاث علی اور شائستہ بیگم کا پورا خاندان ان کا منتظر تھا۔ خدا، خدا کرکے دعوتوں اور مبارک باد کا سلسلہ کچھ کم ہوا۔ تو غیاث علی نے دونوں کو گھومنے پھرنے کے لیے یورپ بھیجنے کا پروگرام بنایا۔ مگر عالم چونکہ اپنے نئے بزنس پر توجہ دینا چاہتا تھا، اس لیے اس نے رائنہ سے معذرت کرتے ہوئے غیاث علی سے فی الوقت اس پروگرام کو کینسل کرنے کی درخواست کی تھی، جو انہوں نے خاصی پس و پیش کے بعد قبول کر لی تھی۔

اس معاملے کے نپٹنے کے اگلے دن عالم اپنے بزنس کے سلسلے میں لاہور چلا گیا تھا۔ جہاں سے اس کی واپسی آج تین دن کے بعد ہوئی تھی۔ اس دوران رائنہ خاصی اداس ہو گئی تھی۔ اس لیے جب دونوں کو تنہائی میسر آئی تو وہ اس سے اپنی خفگی کا خاموش اظہار کیے بنا نہ رہ سکی تھی۔

"کیا بات ہے، تم اتنی چپ چپ سی کیوں ہو؟" کمرے میں آنے کے بعد وہ قصداً اس کا سوٹ کیس کھول کر سامان ان پیک کرتے ہوئے خود کو مصروف ظاہر کرنے لگی تو وہ، جو کسی کو میسج لکھ رہا تھا، موبائل ایک طرف رکھتے ہوئے دھیرے دھیرے چلتا اس کے پاس آکھڑا ہوا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ اپنا کام کرتے ہوئے آہستگی سے بولی تو عالم اس کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔ وہ اس کی خفگی کی وجہ سے بخوبی واقف تھا۔ لیکن فی الحال اس کے منہ سے سننے کا خواہاں تھا۔

"تو پھر میرے پاس آکے بیٹھو نا۔" وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے محبت سے بولا تو رائنہ آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔

"میں پیکنگ کھول رہی ہوں۔"

"یہ تمہارے نہیں، ملازموں کے کرنے کے کام ہیں۔" اس کے ہاتھ سے شرٹ لے کر واپس سوٹ کیس میں اچھالتے ہوئے اس نے رائنہ کو دونوں شانوں سے تھام کر اپنی جانب موڑا۔

"تو پھر میرا کیا کام ہے؟" سینے پہ بازو باندھے اس نے ناراضی سے عالم کی طرف دیکھا۔

"تمہارا کام ہے میرا خیال رکھنا۔ مجھ سے محبت کرنا اور جب میں تم سے دور جاؤں تو مجھ سے ناراض ہونا۔"

شریر نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے وہ آخر میں مسکرایا تو چند لمحے خفگی سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد رائنہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"جب سب پتا ہے تو انجان بننے کی ایکٹنگ کیوں کر رہے تھے؟" اس نے ابرو اچکاتے ہوئے پوچھا۔

"یونہی تمہیں تنگ کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔" اس نے محبت سے اسے اپنے نزدیک کرتے ہوئے کہا۔

"تین دن ستا کر ابھی آپ کا دل نہیں بھرا جو مزید تنگ کرنے کی خواہش ہو رہی تھی؟" اس نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔

"خواہش ہو رہی تھی نہیں میڈم ہو رہی ہے۔" عالم نے اس کے چہرے پر جھولتی لٹ کھینچتے ہوئے معنی خیزی سے کہا تو رائنہ کا گلابی چہرہ مزید گلابی ہو گیا۔ جے وارفتگی سے تکتے ہوئے وہ ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا جب موبائل کی بیپ نے کمرے میں پھیلا فسوں بکھیر دیا۔

سائیڈ ٹیبل کی جانب بڑھتے ہوئے عالم نے فون اٹھایا تو اسکرین پہ جگمگاتا نمبر بے اختیار اس کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھیر گیا۔ دل ہی دل میں اس پرفیکٹ ٹائمنگ کو سراہتا وہ عجلت میں موبائل ہاتھ میں لیے بالکنی کا گلاس ڈور سلائیڈ کرتا باہر نکل گیا۔

اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے اور فون کان سے لگاتے وہ بنا رائنہ کی جانب دیکھے بھی خود پہ گڑی اس کی نظریں باآسانی محسوس کر رہا تھا۔

"ہیلو!" اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا تو دوسری جانب موجود نواز پریشانی سے بولا۔

"عالم! خیر تو ہے؟ تو نے کیوں مجھے میسج کر کے ارجنٹلی فون کرنے کے لیے کہا تھا؟"

"یوں ہی دل کر رہا تھا یار من! تجھ سے بات کرنے کے لیے۔" وہ مسکرا کر بولا تو نواز بھنا اٹھا۔

"کمینے! یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟ تجھے احساس ہے کہ میں کس قدر پریشان ہو گیا تھا خبیث!" اور اس کی گالیاں عالم کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر گئی تھیں، جبکہ گلاس ڈور کے اس طرف کھڑی رائنہ کی آنکھوں میں موجود الجھن دوچند ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"لائیں بھابھی! میں آپ کی کچھ ہیلپ کروا دوں۔" رائنہ کچن میں داخل ہوتے ہوئے رابعہ سے بولی جو ریں ریں کرتی مریم کو گود میں اٹھائے خانساماں کے ساتھ ساتھ زینت اور سکھاں کو بھی ہدایات دینے میں مصروف تھی۔

آج فیروز کے کچھ غیر ملکی دوستوں کی دعوت تھی۔ اس لیے صبح سے گھر میں خاصی مصروفیت تھی۔ فیروز کی ہدایت تھی کہ ہر چیز پرفیکٹ اور ڈشز میں خاصی ورائٹی ہونی چاہیے۔ اس لیے رابعہ خود ہر کام کی نگرانی کرنا پڑ رہی تھی۔ ورنہ تو گھر کے ملازمین خاصے ٹرینڈ تھے۔

"اگر میری کچھ ہیلپ کروانا چاہتی ہو تو اس کو تھوڑی دیر کے لیے سنبھال لو، میرے تو کندھے رہ گئے ہیں۔" اس نے بے چارگی سے کہا تو رائنہ نے آگے بڑھ کے مریم کو اس سے لے لیا، جو آج بخار کے باعث خاصی چڑچڑی ہو رہی تھی۔

ماں کی گود سے اترتے ہی اس نے خاصا شور مچایا تھا، مگر رائنہ نے اسے کچھ اس طریقے سے سنبھالا کہ وہ تھوڑی ہی دیر میں نہ صرف چپ کر گئی، بلکہ رائنہ کے ہاتھ سے تھوڑا تھوڑا کر کے بسکٹ بھی کھانے لگی۔

"واہ بھئی! تمہیں تو لگتا ہے اس کام کی خاصی پریکٹس ہے۔" کچھ دیر بعد رابعہ اس کے برابر رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ وہ دونوں وہیں کچن میں ایک جانب رکھی چھوٹی ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

"پریکٹس تو نہیں البتہ بچوں سے پیار بہت ہے۔" وہ مسکرا کر بولی تو رابعہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے، تمہارے شوہر نامدار خیر سے بچوں کے دیوانے ہیں، اس لیے خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو!" وہ بے اختیار ہنسی تو رائنہ بھی دھیمے سے ہنس پڑی۔

"ویسے بھابھی! آپ کی فیملی اور یہ فیملی آپس میں ریلیٹوز ہیں نا؟" اس نے مریم کا منہ ٹشو سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں..... فیروز میرے سیکنڈ کزن ہیں، ایکچوئلی ہم میں شادیاں خاندان میں ہی کی جاتی ہیں، اس لیے سب ہی انٹر ریلیٹڈ ہیں۔" وہ اپنے دھیان میں بولی تو رائنہ چونک سی گئی۔

"اچھا تو پھر عالم کی شادی کیسے باہر ہو گئی؟" اس نے قدرے حیرت سے پوچھا تو رابعہ اپنی بے دھیانی پہ خود کو کوس کے رہ گئی۔

"وہ ایسے کہ تم آنٹی کو بے طرح بھا گئی تھیں۔" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی تو رائنہ ہلکا سا مسکرا دی۔

"ہاں، یہ تو میں نے بھی سنا ہے، لیکن پتا نہیں کیوں مجھے یاد نہیں آتا کہ آنٹی نے مجھے یونیورسٹی کے کس فنکشن میں دیکھا تھا۔" وہ ذہن پہ زور دیتے ہوئے بولی۔ "انہیں یونیورسٹی جوائن کیے کچھ عرصہ ہی تو ہوا تھا اور اس دوران گنتی کے چند ایک فنکشنز ہوئے تھے۔"

"ارے بھئی! کسی بھی فنکشن میں دیکھا ہو، تمہیں اس سے کیا؟ اصل بات تو یہ ہے کہ اللہ نے تمہارا جوڑ عالم کے ساتھ بنایا تھا، سو تمہیں یہیں آنا تھا۔ پھر چاہے تم دونوں کہیں بھی ہوتے۔" وہ بات کو ٹالتی قصداً اٹھ کھڑی ہوئی تو رائنہ اثبات میں سر ہلا کر خاموش ہو گئی۔ واقعی ان دونوں کا جوڑ تھا تو انہیں ملنا ہی تھا۔ پھر چاہے بیچ میں شاہ نواز زمان آتا یا کوئی اور.....

بے اختیار اس کی نگاہوں میں فون پہ بات کرتا، قہقہے لگاتا عالم گھوم گیا تھا۔ جو ویسے تو ہر کال رائنہ کے سامنے اٹینڈ کرتا تھا۔ لیکن نہ جانے اس خاص کال پر کیوں اٹھ کر کمرے سے باہر نکل جاتا تھا۔

ایک بات تو کلیئر تھی کہ وہ عالم غیاث کی نہیں بلکہ بیگم غیاث کی پسند تھی، تو پھر کہیں بیچ میں رائنہ حیات کی ذات تو نہیں آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

آنے والے دنوں میں عالم، رائنہ کو لیے اسلام آباد آ گیا تھا، جہاں ایک پورا گھر اور اس کی ذمہ داریاں اس کی منتظر تھیں۔ لیکن ملازمین کی موجودگی کے باعث اسے اس نئی روٹین میں ایڈجسٹ ہونے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی تھی۔ ہاں، مگر یہاں آ کر وہ تنہائی محسوس کرنے لگی تھی۔

گزشتہ ایک ماہ گاؤں میں سب کے ساتھ گزارنے کے بعد اسے اب یہاں تنہا رہنا خاصا دشوار لگ رہا تھا۔ اس پہ مستزاد عالم کے نئے بزنس کی مصروفیات۔ وہ قصداً اس سے اپنے لیے زیادہ وقت ڈیمانڈ نہیں کرتی تھی کہ اسے ڈسٹرب کرنا رائنہ کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ مگر عالم اس کے مسئلے کو بنا اس کے کچھ کہے بھی سمجھ رہا تھا۔ اسی لیے اس نے رائنہ کو اپنی پڑھائی مکمل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ مگر یوں نوکروں پہ گھر چھوڑ کے روز نکل جانے کا خیال اسے کچھ مناسب نہیں لگا تھا۔ سو اس موضوع کو فی الوقت پس پشت ڈالتے ہوئے وہ یوں ہی ایک دن اپنی دوستوں سے ملنے یونیورسٹی چلی آئی تھی۔ جہاں اسے اچانک سامنے پا کر وہ تینوں بے حد خوش ہوئی تھیں۔

"یہ بتاؤ اگر آج ہم تینوں یونیورسٹی نہ آئی ہوتیں تو پھر تم اس سرپرائز کے چکر میں کیا کرتیں؟" اس کے آنے کی خوشی میں وہ تینوں کلاسز بنک کیے، اس کے ساتھ کینٹین میں بیٹھی گپ شپ کے ساتھ ساتھ کولڈ ڈرنکس اور برگر انجوائے کر رہی تھیں۔

"میں واپس چلی جاتی اور کل پھر چکر لگا لیتی۔" وہ مزے سے بولی تو بیین بھنویں اچکاتے ہوئے بولی۔

"لگتا ہے عالم بھائی خاصے فرماں بردار شوہر واقع ہوئے ہیں۔"

"فرماں بردار تو نہیں، لیکن وہ حقیقتاً "بہت اچھے شوہر واقع ہوئے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی تو تانیہ حیرت سے بولی۔

"ہیں؟ یہ تم ہی ہو نا۔ اینٹی محبت اور اینٹی میل ایسوسی ایشن کی صدر؟ خاتون تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھا تو تینوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"بکو مت!" رائنہ نے اس کے دھپ رسید کی۔

"نہیں میں سچ کہہ رہی ہوں، کہاں تو تم محبت، شادی اور مردوں کے نام سے الرجک تھیں اور کہاں اب عالم بھائی کے گن گاتی پھر رہی ہو، یاد ہے اپنی

شادی پہ یہ کیسے انیس سو ساٹھ کی غم زدہ ہیروئن بنی بیٹھی تھی۔" وہ سبین اور شفق کی جانب دیکھتے ہوئے ہنسی تو رائنہ سنجیدہ ہو گئی۔

"ہاں۔ تب مجھے واقعی اندازہ نہ تھا کہ دنیا' خاص طور پہ ہمارے معاشرے میں عالم جیسے باظرف اور سلجھے ہوئے مرد بھی موجود ہیں۔"

"تو اس سے پہلے کس کم ظرف سے وابستہ پڑا تھا جو تم محبت اور شادی کے اتنے خلاف ہو گئی تھیں؟ بات تو ایسے کر رہی ہیں محترمہ جیسے نہ جانے کتنے مردوں کو جانتی ہوں۔" تانیہ نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تو بے اختیار اک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔

"ارے یاد آیا! وہ خاموش ایڈ مائرر بھی کافی عرصے سے یونیورسٹی میں نظر نہیں آیا۔" سبین نے اچانک یاد آنے پہ اسے مطلع کیا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ وہ میرا ایڈ مائرر تھا؟" رائنہ کے چہرے سے اچانک ہر تاثر غائب ہوا تھا۔ جسے ان تینوں نے با آسانی محسوس کیا تھا۔ جب ہی ان کی نظریں بے اختیار ایک دوسرے کی جانب اٹھی تھیں۔

"اندازہ مائی ڈیر' کیونکہ وہ محترم بھی تمہاری غیر حاضری میں دوبارہ نظر نہیں آئے۔" شفق نے عام سے لہجے میں جواب دیا تو رائنہ اک گہری سانس لیتی خاموش ہو گئی۔ ورنہ یہ خیال کہ نواز نے کہیں ان سے کچھ کہہ نہ دیا ہو۔ اسے بری طرح پریشان کر گیا تھا۔ جبکہ دوسری جانب ان تینوں نے ایک بار پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

✡ ✡ ✡

"کیسا رہا تمہارا دن؟" وہ دونوں لان میں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔ جب عالم کو اچانک رائنہ کا آج یونیورسٹی جانا یاد آیا تھا۔

"شکر ہے' آپ کو یاد تو آیا کہ میں آج کہیں گئی تھی۔" وہ شکایتی انداز میں بولی تو عالم مسکرا دیا۔

"ایک تو یار! تم چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پہ لے لیتی ہو۔ میڈم مجھے بالکل یاد تھا کہ آپ آج اپنی فرینڈز سے ملنے گئی تھیں۔"

"صاحب جی! آپ کا فون ہے۔" ریاض ہاتھ میں کارڈلیس پکڑے اندر سے آتے ہوئے بولا تو عالم نے فون اس سے لے لیا۔

"ہیلو.... جی مظہر کیسے ہیں آپ؟" مقابل کی آواز پہچاننے پہ وہ خوش اخلاقی سے گویا ہوا تھا۔ "ہاں براؤن لیدر کی ڈیمانڈ زیادہ ہے۔" دوسری جانب اس کا کوئی کلائنٹ تھا سو گفتگو بزنس کے گرد گھومنے لگی تھی۔ جسے بے دھیانی سے سنتے ہوئے رائنہ اپنے کپ میں موجود چائے ختم کرنے لگی تھی۔ جب معاً" ٹیبل پہ دھرا عالم کا موبائل بجنے لگا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے اٹھاتا۔ رائنہ نے نہ جانے کس احساس کے زیر اثر پہلی بار اس کا موبائل اٹھا لیا تھا اور سامنے بیٹھا عالم اپنی بات مکمل کرنا بھول گیا تھا۔

"ویس۔" کا بٹن دباتے ہوئے ابھی اس نے فون کان سے لگایا ہی تھا کہ عالم نے ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے فون اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر کال ڈس کنیکٹ کر ڈالی تھی اور ہکا بکا سی بیٹھی رائنہ اس کے اکھڑے تیور اور سرخ پڑتا چہرہ دیکھ کر ساکت رہ گئی تھی۔

"جی.... جی.... میں سن رہا ہوں۔" دوسری جانب بھی شاید اس کی بے دھیانی کو محسوس کر لیا گیا تھا۔ جب ہی عالم کو کہنا پڑا تھا۔ "فائن آپ دیکھ لیں پھر بتا دیجیے گا۔ میں دو دن رک جاتا ہوں۔ اوکے اللہ حافظ۔" اس نے فون بند کرتے ہوئے غضب ناک نظروں سے رائنہ کی جانب دیکھا تھا۔

"یہ کیا حرکت تھی؟"

"ک.... کون سی حرکت؟" اس کا انداز نہ چاہتے ہوئے بھی رائنہ کو خائف کر گیا تھا۔ ان ڈیڑھ' دو ماہ میں وہ پہلی بار عالم کو اتنے غصے میں دیکھ رہی تھی۔

"یہ ہی فون اٹھا کر کال ریسیو کرنے والی۔" اس نے سخت لہجے میں کہا تھا۔

"تو اس میں ایسی کیا بات ہے' بیوی ہوں میں آپ

کی۔" نہ جانے اس میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی۔ جو وہ دوبدو گویا ہوئی تھی۔ مگر اگلے ہی لمحے عالم کا جواب اسے سن کرنے کے ساتھ ساتھ شرمندہ بھی کر گیا تھا۔

"بیوی ہو تو اپنی جگہ پہ رہو' مجھے ایسی بد تہذیبی قطعاً" پسند نہیں۔ آئندہ میرے موبائل کو ہاتھ مت لگانا۔" اکھڑے لہجے میں اپنی بات مکمل کرتا وہ اندر کی جانب بڑھ گیا تھا اور رائنہ کی جلتی آنکھیں چھلک اٹھی تھیں۔ عالم کا رویہ چیخ چیخ کر کسی غلط بات کا اعلان کر رہا تھا۔ کوئی ایسی بات جسے رائنہ سے چھپانا مقصود تھا۔ اور وہ کیا ہو سکتی تھی۔ اس بھید کو پانے کے لیے اسے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہ تھی۔

✡ ✡ ✡

اگلی صبح معمول کے مطابق تھی' مگر ان دونوں کے درمیان چھائی خاموشی ان ڈیڑھ دو مہینوں میں پہلا اتفاق تھی۔ اس لیے عالم کو خاصی محسوس بھی ہو رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ کل جب رائنہ نے اس کا فون اٹھا لیا تھا تو اس کی روح فنا ہو گئی تھی اور وہ قصداً" اس سے سختی سے پیش آیا تھا کہ وہ یہ رسک دوبارہ کسی طور نہیں لینا چاہتا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اسے منع کرنے کے چکر میں وہ خاصے سخت جملے بول گیا تھا۔ جواب رہ' رہ کر اسے اپنی غلطی کا احساس دلا رہے تھے۔ مگر اس سب کے نتیجے میں جو ایک بات اسے مثبت لگی تھی' وہ رائنہ کے اس کی ذات کے متعلق پیدا ہونے والے خدشات کا مضبوط ہونا تھا۔ جس کے لیے ان گزرے دنوں میں اس نے بے تحاشا پاپڑ بیلے تھے۔ جن میں سرفہرست ہنی مون کا کینسل ہونا بھی تھا۔

مگر فی الوقت اس کی یہ خاموشی اور سوجی ہوئی آنکھیں عالم کو نادم کر رہی تھیں۔ جب ہی جس وقت وہ نہا کر واش روم سے باہر آیا تو رائنہ کو کمرے میں پا کر آہستگی سے چلتا اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

"ابھی تک ناراض ہو؟" اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیتے ہوئے اس نے چہرہ اس کے کندھے پہ ٹکا دیا۔

"ہونہہ.... میں کیا اور میری اوقات کیا۔" وہ ہاتھ میں پکڑا ہینگر سامنے بیڈ پہ رکھتے ہوئے دل گرفتگی سے بولی تو عالم شرمندہ ہو گیا۔

"اچھا آئی ایم سوری یار!"

"آپ کیوں سوری کر رہے ہیں۔ سوری تو مجھے کرنا چاہیے' مجھے واقعی اپنی حد پار نہیں کرنی چاہیے تھی۔" وہ بھرائے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔ تو عالم کا دل ندامت کے احساس سے لبریز ہو گیا۔

"کیوں مزید شرمندہ کر رہی ہو یار! میں پہلے ہی اتنا گلٹی فیل کر رہا ہوں۔" وہ نرمی سے اس کا رخ اپنی جانب موڑتے ہوئے بولا تو نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو رائنہ کے گالوں پر پھسل آئے۔ جنہیں اس نے محبت سے اپنی انگلیوں پر سمیٹ لیا۔

"میں مانتا ہوں کہ کل شام میں نے تمہارے ساتھ بہت روڈلی بی ہیو کیا تھا اور مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"اور میں بھی مانتی ہوں کہ مجھے یوں آپ کی کال ریسیو نہیں کرنی چاہیے تھی۔" نظریں جھکائے اس نے بھی دھیمے لہجے میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا تو اس کا معصومانہ انداز بے اختیار عالم کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھیر گیا۔

"ہوں.... تو تم مانتی ہو کہ تم ایک گندی بچی ہو' کیونکہ مینرز کے خلاف حرکت کی تھی۔" وہ اس کی ناک کو شہادت کی انگلی سے چھیڑتے ہوئے بولا تو وہ چاہ کر بھی نہ تو مسکرا سکی اور نہ ہی یہ کہہ سکی کہ اسے یہ غیر اخلاقی حرکت کرنے پر اسی کی مشکوک حرکتوں نے مجبور کیا تھا۔

"دیکھو یار! تم میری بیوی ہو اور میرا تمہارا کوئی پردہ نہیں' لیکن میرے موبائل پہ اچھے برے ہر طرح کے مردوں کی کالز آتی ہیں اور مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ کوئی تمہاری آواز سن کے الٹے سیدھے اندازے لگائے۔" وہ اسے باز رکھنے کو قصداً" سنجیدگی سے بولا۔

”کتنے پوزیسو ہیں میرے معاملے میں؟“ آہستگی سے نظریں اٹھاتے ہوئے اس نے بغور عالم کی جانب دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں استفسار کیا۔

”کیوں نہیں ہونا چاہیے کیا؟“ اس نے مسکراتے ہوئے الٹا اس سے پوچھا تو رائنہ دھیرے سے اثبات میں سرہلا گئی۔

”ہونا چاہیے‘ لیکن اگر میں یہ کہوں کہ میں بھی آپ کے معاملے میں اتنی ہی پوزیسو ہوں تو؟“

”تو میں یہ کہوں گا کہ میں تمہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“

”وعدہ؟“ اس نے پرکھتی نظروں سے عالم کے مسکراتے چہرے کو جانچتے ہوئے کہا تو اس نے دھیرے سے رائنہ کو اپنی جانب کھینچ لیا۔

”پکا وعدہ!“ اور اس کے سینے سے لگی رائنہ نے تھک کر اپنی جلتی آنکھیں موندلی تھیں۔

☼ ☼ ☼

”سر! یہ مظہر صاحب کے فائنل آرڈر کی ڈیٹیلز ہیں۔“ ثاقب نے چند لمحے پہلے موصول ہونے والا فیکس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو عالم نے ایک نظر کلائی پہ بندھی گھڑی پہ ڈالتے ہوئے پرچا تھام لیا۔

”ٹھیک ہے‘ آپ اب ایسا کریں کہ اسے علیم صاحب کو دے دیں۔ میں نے انہیں ساری تفصیل سے آگاہ کردیا ہے۔“ وہ بغور ساری ڈیٹیلز چیک کرتے ہوئے بولا تو ثاقب اثبات میں سرہلاتا‘ پرچا اس کے ہاتھ سے لے کر باہر کی جانب بڑھ گیا‘ جبکہ عالم دوبارہ سامنے رکھی فائل کی طرف متوجہ ہوگیا۔ مگر موبائل کی بیل نے اسے ایک بار پھر سر اٹھانے پر مجبور کردیا۔

”زہے نصیب! یہ آج تو نے خود کیسے کال کرنے کی زحمت کرلی؟“ اسکرین پہ جگمگاتا نمبر دیکھ کر وہ بے اختیار فون کان سے لگا گیا تھا۔

”یوں ہی دل کررہا تھا تجھ سے بات کرنے کو۔“ دوسری جانب سے شاہ نواز کی بوجھل آواز سنائی دی تو عالم کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں در آئیں۔

”اچھا! تو پھر یہ بتا کہ پریشان کیوں ہے؟“ اور نواز بے اختیار اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ان کی دوستی کی یہ ہی تو سب سے بڑی سچائی تھی کہ انہیں ایک دوسرے کو خود سے کچھ نہیں بتانا پڑتا تھا‘ بلکہ مقابل آواز سے دل کا حال جان لیتا تھا۔

”میرا رشتہ طے ہوگیا ہے۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولا تو عالم بے اختیار سیدھا ہو بیٹھا۔

”کس سے؟“

”گل رخ سے۔“ چونکہ عالم‘ گل رخ سے واقف تھا‘ اس لیے نواز نے فقط اتنا ہی کہا تھا اور دوسری طرف وہ اس کا مسئلہ جاننے کے باوجود خوش گوار انداز میں گویا ہوا تھا۔

”تو گدھے! اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟ یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے یار!“

”ہونہہ۔۔۔۔ یہ خوشیاں ہی تو مجھے راس نہیں آتیں۔“ وہ جیسے اس کی سادگی پہ ہنسا تھا۔

”اللہ نے چاہا تو اب کے ضرور راس آئیں گی۔“ وہ یقین سے گویا ہوا تو نواز کے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ آن ٹھہری۔

”تو اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتا ہے؟“

”اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ تو نے اپنی غلطی کا اپنی ہمت سے بڑھ کے کفارہ ادا کیا ہے۔“ وہ اپنے سابقہ انداز میں بولا تو نواز کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

”یہ حقوق العباد کا معاملہ ہے‘ یہاں اللہ بھی غلطی کو جب ہی معاف کرتا ہے‘ جب اس کا بندہ اپنے گناہ گار کو معاف کرتا ہے۔ اور میری ذات اب بھی رائنہ کی گناہ گار ہے۔“ دل گرفتگی سے بولتا وہ عالم کے لگائے اندازے کو درست ثابت کرتا چلا گیا تھا۔

”ہاں! لیکن تو یہ مت بھول کہ اللہ نیتوں کے بھید جانتا ہے اور تو نے جس نیک نیتی سے اپنا کفارہ ادا کیا ہے‘ وہ اسے قبولیت کے درجے تک پہنچانے کے لیے کافی ہے‘ اس لیے تو ان فضول کے واہموں اور خدشوں کو ذہن سے جھٹک دے اور اپنی زندگی میں آنے والی اس نئی خوشی کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کر‘

ہوئے اپنے ماضی کے دریچے ہمیشہ کے لیے بند کردے۔“

اس نے نرمی سے اسے سمجھایا تو نواز فقط اک گہری سانس کھینچ کر رہ گیا۔

”اچھا یہ بتا کہ تجھے شادی پہ کیسا گفٹ چاہیے؟“ وہ قصداً موضوع کو پلٹ گیا تھا۔

”تو میری شادی پہ نہیں آئے گا۔“ نواز نے سپاٹ سے لہجے میں اسے مطلع کیا۔

”واہ! کیسے نہیں آؤں گا‘ بلکہ میں تو ہفتہ پہلے ہی پہنچ جاؤں گا۔“ وہ چہک کر بولا‘ تو نواز کا ضبط جواب دے گیا۔

”عالم!“ اس نے سخت لہجے میں تنبیہہ کی تو عالم غیاث کے لبوں پہ بڑی جان دار سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اچھا ٹھیک ہے‘ لیکن پھر تو وعدہ کر کہ شادی سے پہلے تو مجھ سے ملنے ضرور آئے گا۔“ وہ ہاتھ میں پکڑے چین کو انگلیوں کے درمیان گھماتے ہوئے بولا۔ یوں جیسے وہ شاہ نواز زمان ہو۔

”یہ ممکن نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولا۔

”میں رائنہ کو گاؤں بھجوادوں گا۔“ وہ دوبدو گویا ہوا تو شاہ نواز خاموش ہوگیا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس کی ہاری ہوئی آواز عالم کو سنائی دی تو اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

”یہ ہوئی نا بات! اب بتا‘ آنٹی انکل کا کب تک شادی کا ارادہ ہے؟“

”یہ ہی کوئی ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر‘ اندر۔ میری جانب سے اب کوئی رسک نہیں لینا چاہتیں۔“ وہ استہزائیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”عقل مندی کررہی ہیں۔“ وہ بھی ہنس دیا۔ ”چل پھر لائے‘ جلد ہی تجھ سے ملاقات ہوگی۔“

”ہوں۔۔۔۔“ نواز محض ہنکارا ہی بھر سکا تھا۔

”اپنا خیال رکھنا‘ اللہ حافظ۔“ الوداعی کلمات ادا کرتے عالم نے فون ٹیبل پہ رکھتے ہوئے پشت کرسی سے ٹکالی تھی۔ غیر مرئی نقطے پہ نگاہیں جمائے اس کا ذہن سود و زیاں کے سارے حساب لگا رہا تھا‘ جو اس کے اس فیصلے کے نتیجے میں اس کے حصے میں آسکتے تھے۔ لیکن تب ہی اس کے کانوں میں نواز کی یاسیت میں ڈوبی آواز گونجی تھی اور اس کے ذہن سے ہر حساب کتاب نکلتا چلا گیا تھا۔ یکایک اس کا فیصلہ پہلے سے بھی بڑھ کے مضبوط ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایک دوسرے کے تعاقب میں دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ موسم بھی رفتہ رفتہ تبدیل ہورہا تھا اور اس تبدیلی کا اثر عالم کی طبیعت پہ بھی ہوا تھا۔ جب ہی وہ آج گھر پہ تھا اور رائنہ سے تیمارداری کے نام پہ صبح سے اپنے نخرے اٹھواتے ہوئے کافی موڈ میں تھا۔ اس کی توجہ‘ اس کی محبت عالم کو اندر تک سرشار کیے دے رہی تھی اور یہ احساس اس کے لیے خاصا انوکھا اور کیف آگیں تھا۔

نواز کی خاطر جڑنے والا یہ رشتہ کب اور کیسے اس کے دل سے جڑ گیا تھا اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اور اب جب اسے اس حقیقت کا ادراک ہوا تھا تو اس کے اندر رائنہ کی محبت جڑ پکڑ چکی تھی اور وہ اپنی اس پسپائی پہ نہ صرف حیران بلکہ بے حد خوش اور مطمئن بھی تھا۔

”یہ سوپ میں تم نے چلی ساس کم کیوں ڈالا ہے؟“ وہ اس کی فرمائش پہ ہاٹ اینڈ ساور سوپ نہ صرف بنا کے لائی تھی بلکہ اب اس کے پاس بیٹھی اسے پلا بھی رہی تھی۔ جب دوسرے ہی چمچے پہ وہ منہ بناتے ہوئے بولا تھا۔

”میرے خیال میں آپ بیمار ہیں۔“ اس نے طنزیہ نظروں سے عالم کی جانب دیکھا تھا۔

”ہاں تو بیماری کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ انسان کی زبان ذائقہ محسوس کرنا بھی چھوڑ دے‘ حواس کام کرنا چھوڑ دیں۔“ وہ گڑبڑا کے گویا ہوا تھا۔

”عموماً تو یہ ہی ہوتا ہے کہ اصلی بیماری میں مریض کو ذائقہ سمجھ میں نہیں آتا۔“ مسکراہٹ دبائے وہ

چمچہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی تو عالم مصنوعی خفگی سے اسے تکنے لگا۔

"تو تمہارا مطلب ہے کہ میں ڈرامہ کر رہا ہوں؟"

"اللہ نہ کرے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا چمچہ باؤل میں رکھتے ہوئے فہمائشی نظروں سے عالم کو دیکھا۔ جو اس کے جواب پہ مطمئن سا ہو گیا تھا۔

"آپ تو بس تھوڑی سی ایکٹنگ کر رہے ہیں۔" شرارت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے اپنا جملہ مکمل کیا تو عالم کا اطمینان بھک سے اڑ گیا۔

"رائنہ کی بچی!" وہ جب تک سمجھ کے رد عمل ظاہر کرنے کے قابل ہوا تھا وہ باؤل ٹرے میں رکھتی کھلکھلاتی ہوئی دور جا کھڑی ہوئی تھی۔

"آنا ذرا ادھر' بتاؤں گا تمہیں مزا۔" بمشکل تمام اپنی مسکراہٹ دبائے اس نے ہنستی ہوئی رائنہ کو گھورا۔

"قسم سے عالم' اتنی بیماری نہیں جتنا آپ نے شور مچا رکھا ہے۔" وہ ہنسی کے درمیان بولی تو وہ خود پہ سنجیدگی طاری کرتے ہوئے دھونس سے بولا۔

"اتنی یا اتنی' میں جب بھی بیمار ہوتا ہوں' اتنا ہی شور مچاتا ہوں۔"

"یعنی آپ مانتے ہیں کہ آپ شور مچاتے ہیں؟" اس نے اپنی ہنسی کنٹرول کرتے ہوئے عالم کی جانب دیکھا۔

"ہاں.... کیونکہ یہ کلی طور پہ مریض کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ شور مچائے یا چپ کر کے لیٹے۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے اپنا فلسفہ بگھارا تو رائنہ بھی شرارت سے اثبات میں سر ہلا گئی۔

"او اچھا.... اچھا.... تو پھر اب آپ کا کیا پروگرام ہے' شور مچانا ہے یا چپ کر کے لیٹنا ہے؟"

"لیٹنا ہے' اور تم ادھر آ کے میرا سر دباؤ۔" وہ اسے گھورتے ہوئے دراز ہو گیا تو رائنہ مسکراتے ہوئے اپنی جگہ پر آ بیٹھی اور آہستگی سے اس کا سر دبانے لگی۔ وہ آنکھیں موندے اس کے ہاتھوں کی نرمی محسوس کر رہا تھا۔

"رائنہ!" اس نے اچانک اسے پکارا تو وہ اپنے دھیان سے چونکتے ہوئے اس کا چہرہ تکنے لگی۔

"تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟" اس نے اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"اتنی جتنی باوفا بیوی کو ایک اچھے شوہر سے ہوتی ہے' اور آپ کو؟"

"تم سچ سننا چاہو گی یا مبالغہ آرائی سے کام لوں؟" عالم نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"بالکل سچ۔"

"اچھا! تو پھر میں بھی اب تمہیں چاہنے لگا ہوں۔" گمبھیر لہجے میں کہتے اس نے رائنہ کا ہاتھ تھام کے لبوں سے لگا لیا تو وہ چند لمحے اس کے چہرے کو خاموش نظروں سے دیکھتی پھیکے سے مسکرا دی۔ پتا نہیں کیوں' لیکن لفظ "اب" دل کے کسی کونے میں بڑے برے طریقے سے چبھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح وہ آفس کے لیے تیار ہو رہا تھا جب اسے نواز کا میسج موصول ہوا جس میں اس نے دو دن بعد اپنی اسلام آباد آمد کے متعلق اسے بتایا تھا۔ موبائل ہاتھ سے رکھتے ہوئے اس کا ذہن بڑی تیزی سے کچھ نئے تانے بانوں میں الجھا تھا۔ جس کے نتیجے میں جب چند لمحوں بعد رائنہ کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اپنا بند فون کان سے لگائے یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ کسی سے محو گفتگو ہو۔

مگر جوں ہی اس کی نگاہ رائنہ پہ پڑی وہ بے اختیار خاموش ہو گیا۔ اس کے یوں یک لخت چپ کر جانے پہ رائنہ نے ٹھٹک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں اور نہ جانے کیوں وہ رخ پھیر گیا تھا۔

"پانی لے آؤ' مجھے دوائی لینی ہے۔" اس کی بے تاثر سی آواز رائنہ تک پہنچی تو وہ اک گہری نظر اس کی پشت پہ ڈالتی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ مگر ابھی اس کے قدموں نے دہلیز پار ہی کی تھی کہ عالم کی آواز نے جیسے اس کے وجود کو منجمد کر دیا۔

"رائنہ تھی' چلی گئی۔" دوسری طرف عالم قصداً چلتا ہوا کمرے کے وسط میں آ کھڑا ہوا تھا۔ ادھ کھلے دروازے سے نظر آتا رائنہ کا گلابی آنچل اس بات کا غماز تھا کہ وہ اپنے پلان میں کامیاب ہو چکا ہے۔

"ہاں یار' تم اسلام آباد پہنچو تو سہی' پرسوں کا سارا دن تمہارے ساتھ گزاروں گا۔" عالم کی آواز میں موجود کھنک نے رائنہ کو بے اختیار لب بھینچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"رائنہ؟ اس سے کسی ضروری میٹنگ کا بہانہ کر دوں گا۔" چند سیکنڈ مقابل کی بات سننے کے بعد انتہائی مطمئن انداز میں اس نے اپنا لائحہ عمل واضح کیا تو رائنہ کی آنکھوں میں جمع آنسو قطروں کی صورت اس کے چہرے پر بہہ نکلے۔

اندر کھڑے شخص کی اچھائی اور اعلا ظرفی کی وہ دل سے معترف تھی۔ وہ اس کا شوہر ہی نہیں بلکہ اس کا مسیحا بھی تھا۔ جسے وہ دیوانگی کی حد تک چاہنے لگی تھی۔ اس کے متعلق ہر منفی خیال کو اس نے قصداً اپنے ذہن سے جھٹک ڈالا تھا کہ وہ اپنے اللہ کے گناہ گار اور ناشکرے بندوں میں شامل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ مگر اس کا یہ روپ رائنہ کے احساسات کا نہیں بلکہ اس کے پورے وجود کی دھجیاں بکھیر گیا تھا۔ جس کے بعد وہ زندگی کس طور گزارنے والی تھی اسے معلوم نہ تھا۔

"پھر پرسوں سرینا میں ڈنر تو کنفرم ہے نا؟" عالم کی آواز پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اس کے کانوں میں پڑی تو مارے اذیت کے اس نے سختی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"ٹھیک ہے' پھر رات آٹھ بجے میں تمہیں تمہارے فلیٹ سے پک کر لوں گا۔" اس نے اپنا پروگرام فائنل کیا تو رائنہ کے لیے مزید وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔

بے اختیار اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹتے وہ تیز قدموں سے وہاں سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔ مگر پھر بھی اس کی گھٹی گھٹی سی آواز عالم کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔

سختی سے لب بھینچے اس نے ہاتھ میں پکڑا پہلے سے بند پڑا موبائل بیڈ پہ اچھال دیا تھا۔ اس نے بہت بڑا رسک مول لیا تھا۔ جس میں اس نے اپنی دوستی' اپنی خوشیوں بھری زندگی حتیٰ کہ اپنی محبت تک داؤ پہ لگا دی تھی اور اب یہ داؤ صحیح پڑنے والا تھا یا غلط' اسے معلوم نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

سارا دن شدید ذہنی دباؤ اور کشمکش میں گزارنے کا نتیجہ اگلے روز رائنہ کے لیے تیز بخار کی صورت نکلا تھا جو عالم کو ندامت اور افسردگی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل گیا تھا۔ مگر اب وہ اپنے قدم کسی طور پیچھے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اس لیے اس کی تکلیف کی اصل وجہ کو نظر انداز کیے وہ سارا دن اس کی پٹی سے لگا بیٹھا رہا تھا۔

اس کا یہ منافقت بھرا پیار اور توجہ رائنہ کا دل مزید چھلنی کر گئی تھی۔ مگر وہ لب سیے چپ چاپ ساکت پڑی رہی تھی۔ اسے کل رات کا شدت سے انتظار تھا جب اس شخص سے اس نے اس کے کیے وعدے کا حساب طلب کرنا تھا۔

ایئر پورٹ پہ کھڑے عالم نے بے قرار نگاہوں سے باہر نکلتے مسافروں کے درمیان نواز کو کھوجا تھا اور جوں ہی اس کی نظر اس کے چہرے سے ٹکرائی تھی' وہ تیز قدموں سے نواز کی جانب چلا آیا تھا۔ دونوں بے اختیاری کے عالم میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے تھے اور دونوں ہی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"کیسا ہے تو؟" عالم نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے بغور اس کا جائزہ لیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مہینوں بعد نہیں بلکہ سالوں بعد ایک دوسرے سے ملے ہوں۔

"بالکل ٹھیک' اور تو؟" نواز نے مسکراتے ہوئے اپنی آنکھوں میں چھائی دھند صاف کی۔

"ایک دم فرسٹ کلاس۔" عالم نے اس کے ہاتھ سے ٹرالی لے کر گھسیٹتے ہوئے جواب دیا تو نواز بھی اس

کے ساتھ چل پڑا۔

"اور گھر میں سب ٹھیک ہیں؟" عالم نے پارکنگ میں داخل ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"اللہ کا شکر ہے' تیری طرف سب خیریت ہے نا؟" نواز نے گاڑی کے پاس پہنچ کر عالم سے چابی لے کر دروازہ کھولتے اور سامان اندر منتقل کرتے ہوئے قصداً" سرسری سے انداز میں استفسار کیا تو عالم ایک گہری نظر اپنے نگاہیں چراتے دوست کے چہرے پر ڈالتا ڈرائیونگ سیٹ کی جانب چلا آیا۔

"ہاں سب خیریت ہے۔" اس نے بھی سرسری لہجے میں جواب دیتے گاڑی اسٹارٹ کی تو نواز تذبذب کا شکار ہو گیا۔ پتا نہیں رائنہ کو عالم نے گاؤں بھجوایا بھی تھا یا نہیں؟

"تو میرے ساتھ فلیٹ پہ رکے گا نا؟" چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے عام سے لہجے میں ڈرائیو کرتے عالم سے پوچھا تو وہ ایک نظر اس پہ ڈالتا ہوا بولا۔

"آف کورس' لیکن رات کو مجھے گھر جانا پڑے گا' کیونکہ گھر پہ کوئی نہیں۔"

"او اچھا۔" بے اختیار نواز نے اندر ہی اندر سکھ کا سانس لیا تھا۔ اطمینان کی یہ کیفیت تہ چاہتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر در آئی تھی' جسے عالم کی دزدیدہ نگاہوں نے آن واحد میں بھانپ لیا تھا۔

اور پھر اپنے طے کردہ پروگرام کے مطابق اس نے اپنا سارا دن نواز کے ساتھ گزارا تھا۔ موبائل بھی اس نے قصداً" آف کر دیا تھا۔ لیکن پانچ بجے کے قریب وہ ایک ضروری کام کا بہانہ کرتے ہوئے وہاں سے نکل کر گھر چلا آیا تھا۔ جہاں رائنہ اپنی ساری بیماری بھلائے اس کی توقع کے عین مطابق نہ صرف اس کی منتظر تھی بلکہ خاصے غصے میں بھی تھی۔

"کہاں تھے آپ سارا دن؟" وہ چینج کر کے ڈریسنگ روم سے باہر آیا تو وہ خود پہ ضبط کرتی اس کے پاس چلی آئی۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ سارا دن روتی رہی ہے' اس کی حالت پہ بے اختیار عالم کے دل کو کچھ ہوا تھا' لیکن وہ جان بوجھ کر انجان بن گیا تھا۔

"اسلام آباد سے کچھ کلائنٹس آئے ہیں' ان کے ساتھ تھا۔" وہ بالوں میں برش کرتے ہوئے اطمینان سے بولا تو رائنہ اس کے اس درجہ اعتماد کو دیکھ کر رہ گئی۔ بے اختیار اسے اپنے دل میں درد کی ایک تیز لہر اٹھتی محسوس ہوئی تھی۔ جس نے اس کی آنکھوں کے گوشے نم کر ڈالے تھے۔ لیکن وہ کمال ہمت سے خود کو سنبھال گئی تھی۔

"تو آپ نے موبائل کیوں آف کر رکھا تھا؟" اس نے گہری نظروں سے عالم کے وجیہہ چہرے کی جانب دیکھا۔ پتا نہیں کیوں' لیکن یہ چہرہ ایک دھوکے باز کا چہرہ ہو سکتا ہے' اسے یقین نہ آ رہا تھا۔

"یار! بار بار کالز ڈسٹرب کرتی ہیں۔ اس لیے میں نے آف کر دیا تھا۔ تم سناؤ' طبیعت کیسی ہے اب؟" اس نے پوچھنے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ کے اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھ دیا تو مارے اذیت کے رائنہ کی روح تک میں جلن سرایت کر گئی۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے حلق میں پھنسے گولے کو بمشکل تمام نیچے اتارتے ہوئے آہستگی سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا تھا اور عالم اس بات کو محسوس کرنے کے باوجود پلٹ کر بیڈ کی طرف چلا آیا تھا۔

"اب تو آپ گھر پہ رہیں گے نا؟" اس نے اپنے اندر برپا شور کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں یار' انہیں ڈنر پہ لے کے جانا ہے' کیوں خیر ہے؟" اس نے بیڈ پہ نیم دراز ہوتے ہوئے بغور رائنہ کی جانب دیکھا' جس کی رنگت اس کے جواب پہ متغیر ہو گئی تھی۔

"ویسے ہی پوچھ رہی تھی کہ شاید آپ کا ارادہ بدل گیا ہو۔" طنزیہ لہجے میں کہتے اس نے کاٹ دار نظروں سے عالم کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کیسا ارادہ؟" عالم نے قصداً" الجھ کر اسے دیکھا تو رائنہ کا دل چاہا کہ وہ کہے' مجھے دھوکا دینے کا۔ لیکن وہ ابھی کچھ کہہ کے رات کا بھرپور موقع نہیں گنوانا چاہتی تھی۔ جب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونے سے کوئی

نہیں روک سکتا تھا۔ فی الوقت تو اس کے پاس عالم کو دھوکے باز ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہ تھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ سرد لہجے میں کہتی پلٹ کر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

"یار! میرے لیے ایک کپ چائے تو بھجواؤ۔ سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔" پیچھے سے عالم کی آواز آئی۔ تو وہ بنا پلٹے' اثبات میں سر ہلاتی کمرے سے نکلتی چلی گئی تھی۔ آنسو ایک بار پھر بڑی تیزی سے اس کے چہرے کو بھگونے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

شام میں تقریباً" ساڑھے سات بجے کے قریب عالم تیار ہو کے گھر سے نکلا تھا اور ٹھیک آٹھ بجے رائنہ اپنی گاڑی میں سوار' سرینا کی جانب روانہ ہوئی تھی۔

ہوٹل پہنچ کے وہ سیدھا ڈائننگ ہال کے ریسپشن پہ چلی آئی تھی۔ جہاں عالم غیاث کے نام سے دو بندوں کی ریزرویشن نے اسے سراپا سلگا دیا تھا ریسیپشنسٹ سے یہ جان کر کہ عالم صاحب اپنے گیسٹ کے ساتھ اندر ہال میں موجود ہیں' وہ ویٹر کی معیت میں ہال میں چلی آئی تھی۔ جو اس کی ایما پر اسے ایک علیحدہ ٹیبل پر بٹھا کر اس کے لیے پانی لینے چل دیا تھا۔

ویٹر کے جاتے ہی اس نے بے قرار نظروں سے وسیع ہال کو کھنگالنا شروع کیا تھا' مگر اتنے سارے لوگوں کے درمیان کسی کو تلاش کرنا' وہ بھی بیٹھے بیٹھے اور غیر محسوس انداز میں' اتنا آسان نہ تھا۔ اس لیے جب ویٹر اس کے لیے پانی اور مینو کارڈ لے کر آیا تو وہ اپنے ازلی پُراعتماد انداز میں گویا ہوئی۔

"پلیز ذرا ریسپشن سے پتا کروا کے آئیں کہ مسٹر عالم غیاث کس ٹیبل پہ بیٹھے ہیں۔"

"شیور میڈم!" وہ مستعد قدموں سے باہر کی جانب بڑھ گیا تو رائنہ نے پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا اور تب ہی اس کی نگاہیں گویا ساکت ہو گئیں۔

اس کی نظروں کی سیدھ میں کافی آگے کو' تقریباً" ہال کے وسط میں' شاہ نواز کسی آدمی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کھانا کھانے میں مصروف تھا' اس کے مقابل بیٹھے شخص کی چونکہ رائنہ کی طرف پشت تھی اس لیے وہ صرف شاہ نواز کا ہی چہرہ دیکھ سکی تھی۔

"یہ یہاں پہ کہاں سے آ گیا۔" مارے کوفت اور جھنجلاہٹ کے وہ بے اختیار اپنی پیشانی مسل کر رہ گئی تھی۔

"ایکسکیوز می میڈم!" چند لمحوں کے توقف کے بعد اسے ویٹر کی آواز سنائی دی تو وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"میڈم! عالم صاحب وہاں سینٹر میں بیٹھے ہیں۔" اس نے جتاتے ہوئے انگلی سے ہال کے وسط کی جانب اشارہ کیا تو اس کی انگلی کی سمت میں دیکھتی رائنہ کے چہرے پر پریشانی در آئی۔

"وہاں؟" اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے تصدیق کے لیے ویٹر کی جانب دیکھا تو وہ اثبات میں سر ہلا گیا۔

"آپ کہیں تو میں آپ کو ان کی ٹیبل تک پہنچا دوں؟" اس نے مؤدب لہجے میں استفسار کیا تو وہ جو دل میں عالم کے سر پہ پہنچ کر اسے "شاکنگ سرپرائز" دینے کی ٹھانے بیٹھی تھی۔ نواز کی ارد گرد موجودگی کا سوچ کے تذبذب کا شکار ہو گئی۔

"نو۔۔۔ نو تھینک یو!" اس نے ایک نظر نواز کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کین آئی برنگ یو سم تھنگ؟" اس نے اپنی ڈیوٹی نبھائی۔

"فی الحال نہیں۔" وہ رسان سے بولی تو ویٹر دھیرے سے سر ہلاتا آگے بڑھ گیا' جبکہ رائنہ کی نگاہیں بغور ہال کے وسط میں لگی ٹیبلز پہ موجود افراد کے چہروں پر گردش کرنے لگیں۔ جب عالم اسے نظر نہ آیا تو اس نے کچھ سوچتے ہوئے پاس پڑے بیگ میں سے اپنا موبائل نکال کر عالم کا نمبر ملاتے ہوئے فون کان سے لگا لیا۔ اور بغور ہال کے وسط میں' جوڑوں کی صورت بیٹھے افراد کا جائزہ لینے لگی۔ جب معاً" اس کی بھٹکتی نگاہوں کو نواز کے مقابل بیٹھے شخص کی پشت کو دیکھتے ہوئے

عجیب سا احساس ہوا تھا اور تب ہی اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس شخص نے اپنا موبائل کان سے لگایا تھا اور ہیلو کی آواز رائنہ کو یہاں اپنے سیٹ سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

بے یقین نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے بے اختیار کال منقطع کرتے ہوئے ایک بار پھر نمبر ملایا تھا۔ اور دوسری جانب اس کی کال ریسیو ہوتے ہی موبائل ایک بار پھر اس شخص کے کان کے ساتھ آلگا تھا۔

وحشت کے مارے رائنہ کی آنکھیں پھٹنے کو آگئی تھیں، وہ اب باآسانی اس شخص کی پشت اور اس کے کوٹ کے رنگ کو پہچان سکتی تھی۔

معدوم ہوتی دھڑکنوں اور چکراتے سر کے ساتھ رائنہ نے لائن کاٹ دی تو اس نے بھی فون کان سے ہٹا لیا، مگر اب وہ متلاشی نظروں سے اپنے اردگرد جائزہ لے رہا تھا۔ جس پہ نواز نے ہاتھ روکتے ہوئے اس سے کچھ کہا تھا، لیکن وہ نفی میں سر ہلاتا ایک بار پھر اپنے کھانے کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

اور رائنہ اپنے سائیں سائیں کرتے وجود کو لیے پتھرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی چلی گئی تھی۔

لحظہ بہ لحظہ اسے اپنا وجود جیسے کسی دلدل میں دھنستا محسوس ہو رہا تھا، کیچڑ، بدبودار پانی اور کائی کی دبیز تہوں میں گم ہوتا، بے بس اور لاچار وجود! جو اپنے بچاؤ کے لیے جس بھی چیز کو تھام رہا تھا، وہ ٹوٹ کر اس کے ساتھ ہی اس دلدل کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ یہ دلدل اس کی ذات اور اس کی خوشیوں کو مکمل طور پہ نگلتی، اس نے دیوانہ وار ایک بار پھر اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے سرد انگلیوں سے عالم کا نمبر ملایا تھا۔

آنسو تیزی سے اس کے زرد چہرے کو بھگوتے ہوئے اس کے گریبان تک پہنچے تھے۔ مگر اسے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ ماسوائے اس التجا کے کہ اس کا اندازہ غلط ہو۔ لیکن جب تیسری بار بھی عالم کی آواز سنائی دینے سے پہلے اس شخص نے اپنا فون اٹھا کر کان سے لگایا، تو رائنہ اپنی بے اختیار ہوتی سسکیوں کا گلا گھونٹنے کو لبوں پہ ہاتھ رکھتی تیزی سے اٹھ کر ہال تو کیا ہوٹل سے ہی نکلتی چلی گئی تھی۔

اسے یوں زاروقطار روتے اور پاگلوں کی طرح بھاگتے دیکھ کر بہت سی حیران نظروں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ مگر وہ ہر احساس سے بے نیاز اندھا دھند دوڑتے ہوئے فقط ایک ہی حقیقت سے نجات پانے کی شدت سے تمنائی تھی کہ اس دن جو اس کے کانوں نے سنا اور آج جو اس کی آنکھوں نے دیکھا وہ جھوٹ ہو، غلط ہو اس کی نظروں کا فریب ہو۔ مگر تلخ سچائی کسی بھیانک عفریت کا روپ دھارے ایک بار پھر اس کی ذات کو نگلنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

یکایک رائنہ کو دلدل کی ساری غلاظت اپنے ناک، منہ اور آنکھوں میں گھستی محسوس ہوئی تھی۔ جس نے اس کا سانس تک لینا دشوار کر دیا تھا۔ زندگی کے اس شدید وار کو وہ اب کی بار سہہ پائے گی بھی یا نہیں اسے معلوم نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

عالم جس وقت گھر سے نکلا تھا، اسے اس بات کا پکا یقین تھا کہ رائنہ اس کے پیچھے ہوٹل ضرور آئے گی اور یوں بالآخر آج وہ حقیقت بھی منکشف ہو جائے گی۔ جسے وہ کسی طور مزید نہیں چھپانا چاہتا تھا۔

لیکن وہاں رائنہ کو نہ پا کر وہ نہ صرف حیران بلکہ خاصا مایوس بھی ہوا تھا۔ لیکن پے در پے آنے والی اس کی کالز نے عالم کو ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا تھا، نواز کی موجودگی کے باعث وہ اسے رنگ بیک کرنے سے بھی گریزاں تھا۔

غیر محسوس انداز میں اپنے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے رائنہ کو تلاشنے کی کوشش کی تھی۔ مگر نواز کے ٹوکنے پر وہ اپنی اس کوشش کو جاری نہ رکھ سکا تھا۔ لیکن پھر وقتاً "فوقتاً" اس کی نظریں ہال میں بھٹکتی رہی تھیں۔ مگر بے سود۔

کھانا ختم کر کے وہ دونوں لانگ ڈرائیو پہ نکل گئے تھے۔ جہاں سے واپسی پہ نواز کو ڈراپ کر کے وہ جس وقت گھر میں داخل ہوا، گھڑی رات کے ساڑھے گیارہ بجا رہی تھی۔

ملازم کو سارے گھر کی لائٹس اور لاک چیک کرنے کی ہدایت دیتا۔ وہ کمرے کی جانب چلا آیا تھا۔

ہینڈل پہ دباؤ بڑھاتے ہوئے اس نے جونہی دروازہ دھکیلا، کمرے میں پھیلی تاریکی اسے الجھن میں مبتلا کر گئی۔

"رائنہ!" آگے بڑھ کے سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مارتے ہوئے اس نے پریشانی سے اسے پکارتے ہوئے بیڈ کی جانب دیکھا تھا۔ لیکن وہاں کسی کو نہ پا کر وہ تیزی سے پلٹا تھا۔ اور گویا ساکت رہ گیا تھا۔

سامنے دیوار سے سر ٹکائے وہ خلاؤں میں تکتی کسی ایسے مسافر کی طرح نڈھال بیٹھی تھی جس کا تمام تر زادِ راہ کسی راہزن نے لوٹ لیا ہو۔ اور اس کے پاس سوائے آنسوؤں کے اور کچھ نہ بچا ہو۔ اس کی دگرگوں حالت کو دیکھتے ہوئے بے اختیار عالم کے ذہن میں "کلک" سا ہوا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے اس کی اذیت کا احساس عالم کو لب بھینچنے پہ مجبور کر گیا تھا۔

"چار مہینے بعد میں آج ایک بار پھر اسی بند گلی میں آکھڑی ہوئی ہوں، جہاں پانچ سال قبل کھڑی تھی۔"

کمرے کی خاموش فضا میں یکایک رائنہ کی نم آواز ابھری تھی اور اس پہ نگاہیں جمائے کھڑا عالم اپنے شک کو سچ ہوتا دیکھ کر اک گہری سانس لے کر رہ گیا تھا۔

"مگر اس بار درد بہت... بہت زیادہ ہے۔" بات کرتے کرتے یک لخت اس کی آواز کپکپائی تو وہ بے اختیار اپنی آنکھیں بند کر گئی۔ اور کتنے ہی آنسو موتیوں کی صورت اس کے چہرے اور سامنے عالم کے دل پہ بکھر گئے۔

"بدگمان ہو کر سوچو گی تو ہر چہرہ اور ہر کردار بدگمانی کی ہی دھند میں لپٹا نظر آئے گا۔ قیاس آرائیوں کی یہ بھول بھلیاں تمہیں بھٹکا بھٹکا کے اس قدر نڈھال کر دیں گی کہ تم خود کو ہی کھو بیٹھو گی۔ اور میں تمہیں کسی قیمت پہ کھونا نہیں چاہتا۔"

نرم لہجے میں کہتا وہ اس کے سامنے دو زانو بیٹھ گیا۔

"اور میرے لیے ان ساڑھے تین گھنٹوں میں خود کو کھونے سے بڑھ کر خوش کن احساس اور کوئی نہیں۔ لیکن میری ڈھٹائی دیکھو میں اب تک زندہ ہوں اور حرام موت کو گلے لگانے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔"

وہ آنکھیں بند کیے سسکتے ہوئے بولی تو عالم کا دل اسے ملامت کیے بنا نہ رہ سکا۔ کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی؟ لیکن کیا پھر شاہ نواز، رائنہ اور عالم کی اس کہانی کا وہی انجام ہونا چاہیے تھا؟ بے اختیار اس کے اندر سے ایک سوال اٹھا تو وہ محبت سے اس کے بے جان ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ گیا۔

"اتنی جلدی اپنی قسمت سے نالاں ہونا اچھی بات نہیں، وہ بھی اس صورت میں جب انسان بہت سے اہم پہلوؤں سے ناواقف ہو۔ کیونکہ ہر بار کانوں سنا اور آنکھوں دیکھا حقیقت کو بیان کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔"

"تو پھر حقیقت کیا ہے عالم!" وہ ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولتی اپنے ہاتھ کو کھینچتے ہوئے چلائی تھی۔

"یہ کہ تم شاہ نواز زمان کو نہیں جانتے یا یہ کہ تم اس بات سے انجان تھے کہ میں اس کی منکوحہ تھی؟"

اذیت اتنی شدید تھی کہ وہ یہ تک بھلا بیٹھی تھی کہ وہ اپنے شوہر سے کس انداز میں مخاطب ہے۔

"میں نہ صرف شاہ نواز زمان کو جانتا ہوں بلکہ اس بات سے بھی واقف ہوں کہ تم اس کی منکوحہ تھیں۔" اس کی وحشت زدہ نگاہوں میں دیکھتا وہ مضبوط لہجے میں بولا تو رائنہ کی آنکھوں میں درد کے ساتھ ساتھ حسرت بھی اتر آئی۔

"کاش! کاش کہ تم میرا دل رکھنے کو ہی کہہ دیتے کہ صرف یہی دونوں باتیں سچ ہیں۔ باقی سب جھوٹ!"

"اب تک یہی تو کر رہا تھا، لیکن اب مزید نہیں، میں اور نواز ایک دوسرے کو آج سے نہیں بلکہ پچھلے پانچ سال سے جانتے ہیں۔ تب سے، جب وہ اپنی زندگی کے سب سے تلخ حادثے سے گزر کر اپنے ماں باپ، گھربار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں چلا آیا تھا۔

ہماری ملاقات کالج میں ہوئی تھی۔ جس کے بعد ہر گزرتا دن ہمیں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بناتا چلا گیا تھا۔ ایسے میں اس کی زندگی کا کوئی بھی پہلو مجھ سے اور میری زندگی کی کوئی بھی سچائی اس سے چھپی نہیں رہی تھی۔ اور تم چونکہ اس کی ذات اور اس کی زندگی کا سب سے اہم ترین پہلو تھیں۔ اس لیے میں تم سے چند ماہ قبل سے نہیں بلکہ پچھلے پانچ سالوں سے واقف ہوں۔"

اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے عالم نے بالآخر حقائق پر سے پردہ ہٹا دیا۔

رائنہ کا سسکتا وجود ان انکشاف کی زد میں آکے تڑپنا تک بھول گیا۔

"آ... آپ... شاہ... شاہ نواز کے دوست ہیں؟" اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئیں۔

"دوست نہیں بھائی۔ کیونکہ یہ وہ شخص ہے جس نے نہ صرف اپنے حصے کی ساری خوشیاں ہم دونوں کی جھولی میں ڈال دیں۔ بلکہ ہماری زندگی کو ہر الجھن سے بچانے کے لیے وہ خود ان لوگوں میں واپس لوٹ گیا' جنہیں وہ آج تک معاف نہیں کر سکا۔"

"کیا... کیا مطلب؟" اس کے لیے یہ ساری گفتگو ایک معمے کا روپ دھار چکی تھی۔ جو لحظہ بہ لحظہ اسے الجھائے چلا جا رہا تھا۔

"مطلب یہ کہ وہ تم سے محبت نہیں عشق کرتا ہے رائنہ۔ عشق جس میں غرض نہیں ہوتی۔ جو صرف دینا جانتا ہے' لینا نہیں' ان پانچ سالوں میں اس نے صرف "من وتو" کی تسبیح کی ہے۔ تمہاری آبادی اور اپنے لیے تم سے معافی کے سوا اس نے خدا سے تیسری کوئی دعا نہیں مانگی۔

تمہاری بربادی نے اسے پہروں رلایا ہے۔ تمہارے الوژنز نے اسے دیوانہ وار دوڑایا ہے۔ اور تمہاری نفرت نے تو اسے دل کا مریض بنا دیا ہے۔ لیکن وہ پھر بھی تمہارے بارے میں سوچنے سے باز نہیں آیا' یہاں تک کہ جب اسے انکل کے ہارٹ اٹیک اور ریاور ملک کے بارے میں پتا چلا تو وہ پریشانی سے پاگل ہو اٹھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیسے تمہاری راہ کا ہر کانٹا اپنی پلکوں سے چن لے۔ ایسے میں جب میں نے اسے کسی مفتی سے فتویٰ لینے اور تمہیں دوبارہ اپنانے کا مشورہ دیا تو پتا ہے اس نے کیا کہا؟" عالم نے دھندلی آنکھوں سے ایک پل کو رک کر ساکت بیٹھی رائنہ کی طرف دیکھا۔

"کیا؟" وہ جیسے کسی طلسم کے زیر اثر گم صم سی ہو چلی تھی۔

"یہ کہ وہ تمہارے قابل نہیں۔ پانچ سال کی ریاضت کے باوجود وہ خود کو تمہارے لائق نہیں سمجھتا تھا' وہ تمہارے لیے کوئی ایسا شخص چاہتا تھا جو تمہارے سارے دکھوں کا مداوا کر دے۔ جو تمہیں کسی ناکردہ گناہ کی سزا نہ دے۔ جو تمہاری پاک دامنی اور بے گناہی سے بخوبی واقف ہو۔ اور تب... تب اس نے مجھ سے تمہیں اپنانے کے لیے کہا تھا۔" وہ دھیرے سے گویا ہوا تو رائنہ کی سانس رک سی گئی۔

رائنہ حیات' عالم غیاث کی زندگی میں شاہ نواز زمان کی درخواست پہ داخل ہوئی تھی؟ تو کیا عالم غیاث نے محض دوستی میں مجبور ہو کے اس کا ہاتھ تھاما تھا؟ وہ عالم تو کیا اس کے ماں باپ کی بھی پسند نہ تھی؟

بے وقعتی کا احساس کسی تیز دھار آلے کی طرح اس کی عزت نفس اور محبت کا خون کرتا چلا گیا تھا۔ اور وہ مارے دکھ اور بے یقینی کے اف تک نہ کر سکی تھی۔

"اور اس پل میں درد سے چلا اٹھا تھا۔ یہ محبت کا کون سا روپ تھا' میری سمجھ سے باہر تھا۔ وہ شخص ایک تمہاری بہتری کے لیے خود اپنی ذات کو ہمیشہ کے لیے زندہ در گور کرنے کے لیے تیار تھا میں حیران تھا۔ اور اس دن مجھے احساس ہوا تھا کہ شاہ نواز' رائنہ حیات سے 'محبت' نہیں "عشق" کرتا ہے۔ "عشق" جس کا پہلا اصول ہی اس کا آخری اصول بھی ہے یعنی محبوب کی خوشی اور اس کی رضا کے لیے' سود و زیاں کا حساب کیے بنا خود کو فنا کر دینا۔ اور یہی اس نے کیا۔"

نرمی سے اپنی بات مکمل کرتا وہ بے اختیار خاموش ہو گیا۔

"اور آپ نے۔ آپ نے کیا کیا؟" اس نے نجانے کس آس کے زیر اثر پیاسی نظروں سے عالم کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں پوچھا۔

"میں نے؟" اس نے اپنی محبت پاش نگاہیں رائنہ کے چہرے پر جما دیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس پل اس کا اقرار محبت رائنہ کے لیے شاید متاع حیات تھا' اور وہ اس کا دامن بھرنے کے لیے دل و جان سے راضی تھا۔

"میں نے سوائے تمہارے اور کسی کو نہیں چاہا۔ میری محبت کی کہانی تم سے شروع ہو کر تم پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے تم سے شادی نواز کی خاطر کی تھی۔ لیکن اس سے بھی بڑی سچائی یہ ہے کہ میرا یہ فیصلہ کب میرے دل کی گہرائیوں سے جڑ گیا' مجھے پتا ہی نہیں چلا۔"

گمبھیر لہجے میں بولتا وہ اس کی محبت کے مردہ وجود میں جیسے ایک نئی روح پھونک رہا تھا اور رائنہ آنکھیں بند کیے اپنے رب کا شکر ادا کرنے لگی تھی۔ جس نے اسے اور اس کی محبت کو بے مول ہونے سے بچا لیا تھا۔

"میری زندگی میں تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں۔" اس نے نرمی سے اس کے یخ ہاتھ تھام لیے۔ رائنہ نے دھیرے سے آنکھیں کھولتے ہوئے عالم کی جانب دیکھا جو جذب سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"وہ فون کالز نواز کی تھیں۔ جو میں احتیاط کے پیش نظر باہر جا کے سنتا تھا۔ مگر جب مجھے احساس ہوا کہ وہ تمہارے لیے اتنا کچھ کر لینے کے باوجود مطمئن نہیں۔ تب میں نے ایک فیصلہ کیا۔"

"کیسا فیصلہ؟" اس کے خاموش ہو جانے پہ رائنہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"اسے اس کا اطمینان لوٹانے کا فیصلہ۔" عالم رسان سے بولا تو رائنہ کے چہرے پر الجھن در آئی۔

"اور اس کے لیے میں وہ سب کرتا چلا گیا۔ جو آج مجھے اور تمہیں اس موڑ پہ لے آیا' جہاں کوئی راز' راز نہیں رہا' میں چاہتا تو تمہیں یہ سب یوں بھی بتا سکتا تھا۔ لیکن میں نواز سے زبان بندی کے عہد کا پابند تھا۔ اس لیے مجھے تم پہ حقیقت واضح کرنے کے لیے یہ سب کرنا پڑا۔"

"اور اگر اس سب میں ہماری اپنی زندگی داؤ پہ لگ جاتی تو؟" رائنہ کے لہجے میں خوف کی پرچھائیوں نے عالم کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اللہ دلوں اور نیتوں کے بھید جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں نے یہ سب کس جذبے کے تحت کیا ہے۔ مجھے اپنے رب پہ پورا بھروسا تھا کہ وہ میری زندگی پہ کبھی بھی کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔"

"نواز کو اس بارے میں علم ہے؟" رائنہ نے نظریں چراتے ہوئے پوچھا۔ آج نجانے اس نے کتنے عرصے بعد اس نام کو نرمی سے ادا کیا تھا۔ اس کا دل اس وقت بڑے عجیب سے احساسات سے دوچار تھا۔

"نہیں۔ بلکہ وہ تو اسلام آباد بھی میری اس یقین دہانی کے بعد آیا ہے کہ میں اس کی آمد سے پہلے تمہیں گاؤں بھجوا دوں گا۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا تو رائنہ نگاہیں جھکا گئی۔

بے اختیار اسے اس دن اپنی فرینڈز کی نواز کے متعلق گفتگو اور بعد ازاں اس کی غیر حاضری پہ اپنے اندر اترنے والا اطمینان یاد آیا تھا۔ اور وہ مارے شرمندگی کے کٹ کر رہ گئی تھی۔

"نواز! یہ تم نے مجھے کس دوراہے پہ لا کھڑا کیا ہے؟" اس کے دل نے شاہ نواز زمان سے شکوہ کیا تھا۔ جو اس کا محسن تھا یا مجرم' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"تو کیا وہ صرف ہماری خاطر واپس چلا گیا؟" اس نے نظریں جھکائے بوجھل لہجے میں پوچھا تو عالم اک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

"ہاں' وہ صرف ہماری زندگی کو ہر الجھن' ہر پریشانی سے بچانے کے لیے' ہمارا رشتہ طے ہونے کے فوراً بعد مجھے بتائے بغیر واپس چلا گیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر مجھے اس کے ارادوں کی بھنک بھی پڑ جاتی تو میں اسے کبھی نہ جانے دیتا۔ وہ تو مجھ سے ہر تعلق ختم کر دیتا

چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ بلکہ میں نے تو اس سے یہ عہد بھی لیا تھا کہ وہ خود بھی جلد شادی کرلے گا۔ اور مزید خود کو سزا نہیں دے گا۔ اس تمام قصے میں جتنا نقصان نواز کا ہوا ہے شاید ہی کسی اور کا ہوا ہو۔"

بات کرتے کرتے عالم کی آواز میں ملال در آیا تو رائنہ کا بوجھل دل مزید بوجھل ہو گیا۔

کل تک وہ خود کو اس کہانی کا سب سے مظلوم کردار تصور کرتی تھی۔ لیکن آج اسے احساس ہوا تھا کہ اصل خسارہ تو صرف شاہ نواز کے حصے میں آیا تھا۔ جس کے جذبات کو شاہ زمان نے نہیں سمجھا تھا اور جس کی مجبوری کو رائنہ حیات نے معاف نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ جب پانچ سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔ تب بھی اس نے اپنی نفرت کی انتہا جتانے کے لیے اسے دیکھ کر زمین پر تھوک دیا تھا۔ کیسی بے حسی کا مظاہرہ کیا تھا اس نے۔ سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں تو وہ بے اختیار نظریں جھکا گئی۔

"تو کیا پھر اس نے شادی کی؟" اپنے دل کی ملامت سنتے ہوئے اس نے نادم سے لہجے میں استفسار کیا۔

"دو ہفتے بعد ہے اس کی شادی۔" اور اس ڈیڑھ گھنٹے میں پہلی بار رائنہ کو اپنے اعصاب ہلکے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ جبکہ عالم اس کی کیفیت سے بے نیاز بول رہا تھا۔

"اور میری خواہش ہے کہ اس کے اس نئے سفر سے پہلے ہم دونوں اسے اس کی زندگی کا سب سے قیمتی اور یادگار تحفہ دیں۔" اس کے ہاتھ مان سے رائنہ کے شانوں پر آ ٹھہرے تو وہ اسے نم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔

اسے یقین تھا اس کے شریک سفر نے جو بھی سوچ رکھا تھا۔ وہ اچھے کے لیے ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

بیل کی آواز پہ نواز نے ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے رشید کو پکارا تھا۔ مگر اس کی جانب سے کوئی جواب نہ پا کے وہ خود اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

تیز قدموں سے دروازے تک آتے ہوئے اس نے جوں ہی دروازہ کھولا اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔ دہلیز کے دوسری طرف اس کے عین مقابل رائنہ عالم کھڑی اس پہ حیرتوں کے پہاڑ توڑ گئی تھی۔

"اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے؟" اس کی اڑی ہوئی رنگت پہ نگاہیں جمائے وہ نرمی سے بولی تو شاہ نواز کی آنکھیں اس کے انداز پہ بے یقینی سے پھیل گئیں۔ لیکن اس کے قدم میکانکی انداز میں پیچھے ہٹے تھے۔ اور رائنہ ہوا کے سبک جھونکے کی طرح اندر چلی آئی تھی۔

"کس کو ڈھونڈ رہے ہو؟" اسے دروازہ تھامے ساکت کھڑا دیکھ کر رائنہ نے رسان سے پوچھا تو وہ لب کاٹتا، متفکر نگاہوں سے اپنے سامنے موجود خالی راہداری کو دیکھتا، دھیرے سے دروازہ بند کر گیا۔ رائنہ گاؤں کے بجائے یہاں اسلام آباد میں اور پھر اس کے گھر تک کیسے اور کیا لینے آئی تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"میں نے پوچھا ہے، کس کو ڈھونڈ رہے ہو؟" اس کی پشت سے ایک بار پھر رائنہ کی آواز ابھری تو وہ بے اختیار ایک گہری سانس لیتا خود کو نارمل کرنے لگا۔

"کسی کو بھی نہیں۔" وہ آہستگی سے جواب دیتے ہوئے پلٹا تو نظریں رائنہ کے چہرے سے جا ٹکرائیں جو بغور اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"آر یو شیور؟"

"کیا مطلب؟" اس نے الجھ کر رائنہ کی جانب دیکھا۔ اس کے اندر کسی گڑبڑ کا احساس بڑی تیزی سے جاگا تھا۔

"مطلب یہ کہ تمہارا انداز ایسا تھا جیسے تم کسی اور کو بھی ایکسپیکٹ کر رہے تھے۔" وہ نارمل سے انداز میں گویا ہوئی تو اس کا لب و لہجہ نواز کی حیرت کو دوچند کر گیا۔ آخر یہ ہو کیا رہا تھا؟ پریشانی سے سوچتے ہوئے

اس نے اچنبھے سے رائنہ کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی پل اس نے احتیاط سے اس صورت حال سے نپٹنے کی ٹھانی تھی۔

"میں کسی اور کو ایکسپیکٹ کر رہا تھا یا نہیں۔ لیکن رائنہ حیات کو بالکل ایکسپیکٹ نہیں کر رہا تھا۔" وہ بے تاثر سے لہجے میں "رائنہ حیات" پہ زور دیتے ہوئے بولا تو وہ دھیمے سے مسکرا دی۔

"رائنہ حیات نہیں رائنہ عالم۔ میری شادی ہو چکی ہے۔" اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے عجیب سے انداز میں تصحیح کی تو نواز کا بے تاثر چہرہ مزید سپاٹ ہو گیا۔

"مبارک ہو۔"

"تھینک یو۔ تم اپنی فیملی سے نہیں ملواؤ گے؟" وہ اپنے سابقہ انداز میں بولی تو نواز کا ضبط جواب دے گیا۔

"پلیز مسز عالم! آپ یہاں کیسے اور کس سلسلے میں آئی ہیں۔ مجھے کلیئر اینڈ کٹ ورڈز میں بتائیں۔" رائنہ کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے دوٹوک الفاظ میں پوچھا۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر عالم کے سر پہ جا پہنچے اور اس سے رائنہ کی یہاں اسلام آباد اور پھر اپنے گھر میں موجودگی کے متعلق پوچھے۔ لیکن اسے تو ایک لمحے کے لیے بھی عالم کی کسی بات سے یہ نہیں لگا تھا کہ اس نے اس سے جھوٹ بولا تھا اور بھلا وہ یہ سب کرتا بھی کیونکر؟ تو کہیں وہ بھی نواز کی طرح رائنہ کی یہاں شہر میں موجودگی سے بے خبر تو نہیں تھا؟ کہیں رائنہ کو کوئی شک تو نہیں ہو گیا تھا اور وہ اپنے طور پہ یہاں تک چلی آئی تھی۔

اس کی پریشانی تھی کہ لحظہ بہ لحظہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اور کوئی سرا ہاتھ آ کے نہیں دے رہا تھا۔

"مسٹر شاہ نواز زمان! آپ نے کوئی کام کلیئر اینڈ کٹ طریقے سے کیا ہے جو آپ مجھ سے واضح الفاظ میں میری یہاں آمد کا مقصد پوچھ رہے ہیں؟" اس نے یک لخت تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔ تو نواز کا دل دھک سے رہ گیا۔ یقیناً" رائنہ کو بھنک پڑ گئی تھی اور

اب کیا ہونے والا تھا اسے معلوم نہ تھا۔

"میں، میں سمجھا نہیں؟" بظاہر پرسکون انداز میں اس نے خود سے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا تھا۔ پتا نہیں رائنہ کو کیا اور کس حد تک پتا تھا۔ وہ اس پل کسی بھی فاش غلطی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

"سمجھ جائیں گے۔ یہ بتائیں آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟" وہ باقاعدہ کسی مشاق وکیل کی طرح جرح پہ اتر آئی تھی۔ ان کی آوازیں سن کے رشید بھی وہاں چلا آیا تھا لیکن ان کی گفتگو اور انداز پہ وہ اگلے ہی پل حیران پریشان سا وہاں سے کھسک گیا تھا۔

"آئی تھنک اٹس نن آف یور بزنس!" وہ اب کے قصداً" سرد لہجے میں گویا ہوا تو رائنہ دھیمے سے مسکرا دی۔

"تو پھر جب ہمارا کوئی تعلق کوئی واسطہ ہی نہیں۔ تو آپ کیوں یاور ملک کی دھمکی سن کے پریشان ہو گئے تھے؟ کیوں یہ چاہتے تھے کہ میرے لیے کوئی ایسا شخص آئے جو میرے سارے دکھوں کا مداوا کر دے؟ جو مجھے کبھی کسی ناکردہ گناہ کی سزا نہ دے!"

اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے وہ بولتی چلی گئی تھی اور شاہ نواز زمان کی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت ہو گئی تھی۔

"نواز! مجھے عالم نے آپ کی تڑپ سے لے کر آپ کی ریاضت اور آپ کی قربانی تک ہر بات بتا دی ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ کو اپنا محسن کہوں یا مجرم!" بات کرتے کرتے اس کی آواز بھرا گئی تو نواز کا سکتہ جیسے ٹوٹ سا گیا اور اس کا "ضبط عشق" بھی اپنی آخری حد کو آن پہنچا۔

"میں تمہارا مجرم تھا، ہوں اور رہوں گا۔ کوئی بھی عمل، کوئی بھی ریاضت میرے اس ملال کو کم نہیں کر سکتی جو پانچ سال قبل تمہارے وجود کو زمین بوس ہوتا دیکھ کر میرے دامن سے آن لپٹا تھا۔ میری محبت آج بھی اسی دہلیز پہ کھڑی سسک رہی ہے جہاں میں نے کسی کے معصوم یقین، مان اور پیار کو توڑا تھا۔ میں تمہارا گنہگار ہوں رائنہ، پھر بھی میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے معاف کر دو!"

اس کے سامنے ہاتھ باندھے وہ اونچا لمبا مرد پھپک کر رو دیا تو رائنہ عالم کے آنسوؤں میں بھی روانی آ گئی۔

"ایسا مت کہیں نواز! کہ آپ بھی اتنے ہی مجبور تھے جتنی کہ میں۔ ہمارا رشتہ خود غرض اور انا پرست لوگوں کی بھینٹ چڑھ کر ٹوٹا تھا۔ یا پھر ہم ایک دوسرے کا نصیب ہی نہ تھے..... میں نہیں جانتی۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ آپ نے گناہ نہ کرنے کے باوجود جس طرح ان پانچ سالوں میں ہر لمحہ پچھتاوے اور ملال میں گھر کر گزارا ہے اس نے آپ کے گناہ کے وجود کو سرے سے مٹا ڈالا ہو گا۔ آپ میرے گنہگار نہ تھے اور نہ ہیں..... اور اس مثبت سوچ اور رویے تک مجھے پہنچانے والے میرے شوہر اور آپ کی اعلا ظرفی اور سچی محبت ہے، جس کا حق آپ نے ہر پل ادا کیا اور جس کی آج میں بھی قائل ہوتی۔ لیکن اس سب کے باوجود بھی اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ کا سکون میری معافی میں پنہاں ہے تو شاہ نواز زمان میں نے آپ کو دل کی گہرائیوں سے معاف کیا اور میری دعا ہے کہ میرا رب بھی آپ کو معاف کرے اور آپ کی زندگی کو خوشیوں اور سکون کی دولت سے مالا مال کر دے!"

بہتے اشکوں کے ساتھ وہ ایک ایک کر کے اس کے وجود میں گڑا ہر کانٹا نکالتی چلی گئی۔ نواز کے لیے اپنے پیروں پہ کھڑے رہنا ناممکن ہو گیا۔

اگلے ہی پل وہ اس کے سامنے زمین پہ دو زانو گرتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا گیا تھا۔ لیکن اس کی بلند ہوتی آواز رائنہ کا اپنا دل چیر گئی تھی۔ کاش کہ اس کا وجود اس پیارے سے شخص کے لیے آزمائش کا سامان نہ بنایا جاتا۔ اے کاش!

بے اختیار اسے اپنا آپ شاہ نواز زمان کا مجرم محسوس ہوا تھا جس کی محبت نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ لیکن اب وہ اپنی محبت کو مزید اس کی بربادی کا سبب نہیں بننے دے سکتی تھی۔ اسے ہر حال میں شاہ نواز کو اپنی دہلیز سے آگے بڑھنے پر مجبور کرنا تھا۔

"پلیز نواز! ایسا مت کریں..... آپ کے آنسو مجھے

اپنی ہی نظروں میں شرمندہ کیے دے رہے ہیں۔" وہ چند قدم بڑھاتی اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

"میری محبت نے سوائے تکلیفوں کے آپ کو کچھ نہیں دیا اور یہ احساس مجھے اندر ہی اندر کاٹے جا رہا ہے۔" وہ نادم سے لہجے میں بولی تو نواز نے تڑپ کر اپنے ہاتھ ہٹا دیے۔

"تمہاری محبت میرے لیے باعث آزار نہیں بلکہ باعث فخر ہے۔" وہ سرخ چہرہ اور بھیگی آنکھیں لیے گویا ہوا تو رائنہ کے لبوں پہ نم سی مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"اگر ایسا ہے تو اسے میرے لیے بھی ندامت کے بجائے احترام کا باعث بنا دیں اور خوشی خوشی اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں۔ آپ کو اس احساس جرم سے نجات دلانے اور آپ کا حقیقی سکون آپ کو لوٹانے کے لیے عالم نے بہت تگ و دو کی ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنی گرہستی تک داؤ پہ لگا دی۔ صرف آپ کے دل سے ملال دور کرنے کے لیے۔ اس لیے پلیز انہیں مایوس نہ کیجیے گا۔"

اس کے سامنے بیٹھے وہ التجائیہ انداز میں بولی تو نواز کا دل اپنے دوست کی عظمت کے آگے جھک گیا۔ جس سے اس نے صرف ایک احسان مانگا تھا اور اس نے شاہ نواز کی ذات پہ احسانوں کی بارش کر دی تھی۔

بھلا کیا رشتہ تھا اس کا عالم غیاث سے۔ جو وہ اس کے دکھ دور کرنے کے لیے ہر حد پار کر گیا تھا؟ لیکن شاید بعض ہستیاں اور چند سوالات انسان کو یونہی لاجواب اور گنگ کر دیتے ہیں۔ جیسے کہ اس وقت شاہ نواز خود کو محسوس کر رہا تھا۔ بے اختیار اسے اپنا وجود پگھلتا اور آنکھیں نم ہوتی محسوس ہوتی تھیں۔

"عالم کی محبت اور خلوص کا مقروض تو میں بہت پہلے سے تھا۔ لیکن اب تو میں چاہ کر بھی اپنی آخری سانس تک اس کا بدلہ نہیں دے سکتا۔ میری زندگی میں آنے والی یہ انمول گھڑیاں عالم کی مرہون منت ہیں۔ وگرنہ میں تو شاید ساری زندگی اسی خلش کے ساتھ گزار دیتا کہ تمہارا مجرم ہوتے ہوئے بھی، میں تم سے کبھی معافی نہ مانگ سکا۔"

"اور میں حقیقت سے بے خبر کبھی اپنے ظرف کو اتنی وسعت نہ دے پاتی۔" رائنہ نے بھی بلا جھجک اعتراف کیا تو اس تمام عرصے میں پہلی بار نواز دھیرے سے مسکرا دیا۔

"تو پھر یہ ثابت ہوا کہ ہم دونوں کا مسیحا ایک ہی شخص ہے۔" اس نے رائنہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل!" وہ مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اور اس مسیحا کو میری زندگی کا حصہ بنانے کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ!" اس نے اپنے دل میں موجزن تشکر کے احساس کو زبان دی تو نواز بھی مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا بیل کی آواز میں دونوں کو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے اور نواز کو پلٹ کر آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا۔

"زندگی کا نیا آغاز مبارک ہو!" دروازہ کھلتے ہی عالم کا کرنیں بکھیرتا وجود مسکراتے ہوئے گویا ہوا تو نواز کے لبوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی نمی بڑھ گئی۔

"تھینک یو! تھینک یو فار ایوری تھنگ!" دل کی گہرائیوں سے کہتا وہ بے تابی سے عالم کے سینے سے آ لگا تھا۔

اور پیچھے کھڑی رائنہ کی آنکھیں جھلملاتے ہوئے اپنی زندگی میں موجود ان دو منفرد مردوں کو رشک سے دیکھے گئی تھیں۔ جن میں سے ایک اس کے لیے "قابل فخر" اور دوسرا "قابل احترام" تھا۔

☼

شاہدہ ملک

"پھوپھو! آم کب توڑیں گے؟" آم کے گھنے درخت تلے سلائی مشین پر جھکی طیبہ کی سوچوں کا ارتکاز ٹوٹ گیا تھا اس نے انعم کی طرف دیکھا جو للچائی آنکھوں سے آموں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"آم جب پک جائیں گے' تب توڑیں گے نا۔" اس نے جواب دیتے ہوئے الجھے تاگے کو سلجھانے کی کوشش کی تھی۔

"پھوپھو! کب پک جائیں گے؟" اتنے سے جواب سے بھلا اس کی تشفی ہو سکتی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس کے ننھے دماغ میں نیا سوال ابھرا تھا۔

"جب گرمی زیادہ ہوگی تب۔"

طیبہ نے قدرے جھنجلا کر جواب دیا تھا۔ امی کی طبیعت خراب تھی۔ ڈاکٹر کے پاس دوا لینے گئی تھیں۔ تمام کاموں سے فارغ ہو کر وہ سلائی مشین پر آ بیٹھی تھی کہ مس فرزانہ کے کپڑے دو دن میں ہی سلائی کر کے دینے تھے۔ ایسے میں پڑوس کی خدیجہ خالہ کی پوتی انعم اس کے پاس آکر مسلسل اس کا سر کھا رہی تھی۔

"پھوپھو! گرمی کب آئے گی؟" کافی دیر کے بعد طیبہ کالر استری کرکے ______ واپس آئی تو انعم مشین کے پہیے میں انگلیاں پھنسائے سبز کیریوں پر نظر جما کر ایک مرتبہ پھر پوچھ رہی تھی۔

"یہ ادھر دیکھو ذرا اب اگر میں مشین چلاتی تو آپ کا ہاتھ زخمی ہو جانا تھا نا۔" طیبہ کو اس کی حالت پر ہنسی تو بہت آئی مگر ضبط کرتے ہوئے سنجیدگی سے انعم کو سمجھانے لگی تھی۔

اسی وقت کال بیل بج اٹھی تھی۔ "جاؤ جا کر دروازہ کھولو۔" امی کی آمد کا سوچ کر اس نے انعم کو دروازہ کھولنے کے لیے دوڑایا تھا۔ مگر اگلے چند لمحوں میں بے ساختہ مشین سے اٹھ گئی تھی اور انعم کے ساتھ اندر آنے والی ہستی کو حق دق ہو کر دیکھ رہی تھی۔ عطیہ پھوپھو کی یوں بھری دوپہر میں اچانک آمد بغیر کسی وجہ کے نہ تھی۔

"بیٹی! ذرا پانی تو پلاؤ۔" پسینے میں شرابور عطیہ پھوپھو کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اسکول سے سیدھی آرہی ہیں۔ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے طیبہ سے کہا تو گویا اس کا سکتہ ٹوٹا تھا۔

"السلام وعلیکم پھوپھو! میں ابھی لاتی ہوں۔" حیرت کی کیفیت سے نکل کر اس نے انہیں سلام کیا اور جلدی سے پانی کا گلاس بھر لائی تھی۔

"ماں کہاں ہے تمہاری؟" ٹھہر ٹھہر کر پانی پینے کے بعد گلاس واپس تھماتے ہوئے انہوں نے سوال کیا تھا۔

"وہ اماں تو......" ہلکے سے کھٹکے کی آواز پر اس نے بات ادھوری چھوڑ کر پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ جہاں سے اماں کھلے دروازے سے اندر آرہی تھیں۔

"وہ آگئیں اماں۔ اصل میں ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں۔" اس سے قبل کہ تھکی ہاری اماں آتے ہی سوال و جواب کا سیشن بھگتاتیں' وہ خود ہی تفصیل بتانے لگی تھی۔

"کیوں خیریت تو ہے؟" اماں آکر بیٹھیں تو عطیہ

پھوپھو نے قدرے تشویش سے انہیں دیکھا تھا۔

"رات کو ذرا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا تھا تو......"

"حق ہاہ تم تو ماں ہو، تمہارا بلڈ پریشر ہائی نہ ہو تو بھلا کس کا ہو گا۔ میری تو اپنی سوچ سوچ کر راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں۔ ادھر آ طیبہ بیٹی میرے پاس آ کر بیٹھ۔"

پھوپھو نے انتہائی رقت سے کہتے ہوئے اسے بلایا تو طیبہ نے کچھ حیرت سے اماں کی طرف دیکھا جو خود بھی بہت پریشان اور الجھی ہوئی لگ رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ پھوپھو کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

"میری یتیم بھتیجی پر ظلم ڈھاتے ذرا ترس نہیں آرہا ناس مارا جائے ظالموں کا۔" اگلے ہی لمحے وہ مزید آبدیدہ ہو کر اس کا سر اپنے کندھے سے لگا کر کہہ رہی تھیں۔

"کیا ہوا آپا؟ خیر تو ہے؟" اماں انتہائی بدحواس ہو کر پوچھ رہی تھیں کہ ان کی گفتگو کا لب لباب کچھ کچھ سمجھ تو آرہا تھا۔

"بانو بیگم نے صاف صاف کہا ہے نہ تو ہم جمیلہ کی بیٹی کو رخصت کروا کر لائیں گے اور نہ ہی میرا بیٹا اسے طلاق دے گا۔ بیٹھی رہے ساری عمر ماں کے در پر۔ میرا تو سن کر کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ آئے ہائے جمیلہ! تم نے بھی نہ جانے کہاں پھنسا دیا میرے بھائی کی اکلوتی نشانی کو، بیٹیوں کے دکھ تو کلیجے جلا دیتے ہیں۔" پھوپھو نے انتہائی رنجیدہ انداز میں انکشاف کرتے ہوئے بالآخر اماں کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔

ان کی گفتگو کا لب لباب اگرچہ مکمل طور پر واضح نہ تھا۔ مگر اس قدر مبہم بھی نہ تھا کہ کچھ پلے نہ پڑتا ڈیڑھ سال پہلے اس کی زندگی نے جو موڑ لیا تھا۔ اس کے پیچ و خم میں وہ اور اماں دن رات اپنے اپنے طور پر الجھی رہتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"حاجی فراز کے ہاں سے ان کے پوتے کے عقیقہ کا گوشت آیا تھا۔ آپ ابھی تک مبارک باد دینے نہیں گئیں؟" اس روز طیبہ کو خیال آیا تو یونہی پوچھ بیٹھی تھی۔

"یاد ہے مجھے۔ فرزانہ بھی جانے کا کہہ رہی تھی۔" اماں نے قمیص کے گلے کی کٹائی کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"حاجی صاحب کا پوتا چلنے لگے گا۔ تب جائیں گے آپ لوگ؟"

"واقعی دن تو بہت ہو گئے۔ ایک دو روز میں داؤد کی طرف چکر لگاؤں گی پھر وہیں سے فرزانہ کو ساتھ لے کر حاجی صاحب کے ہاں بھی ہو آؤں گی۔"

"اماں! میں بھی چلوں ماموں کی طرف؟" طیبہ نے بڑی لجاجت سے پوچھا تھا۔

"اور تمہارے کالج کا کیا ہو گا؟"

"ایسا ہے، آپ اتوار کو پروگرام بنائیں تو میں بھی جا سکوں گی، فیضی سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے، بچی اس سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔" اس نے ماموں کے اکلوتے بیٹے کا نام لیا تھا۔

"چلو، یہ ٹھیک رہے گا۔" اماں اس کے ترتیب دیے ہوئے پروگرام پر فوراً متفق ہو گئی تھیں۔ جانتی تھیں کہ وہ کون سا روز روز کہیں آنے جانے کی فرمائش کرتی تھی، لے دے کر ماموں داؤد کا گھر تھا۔ جہاں وہ مہینوں بعد جا پاتی تھی۔ ورنہ تو دو محلے چھوڑ کر پھوپھو بھی اپنی ہی غرض سے یاد کرتی تھیں۔

اتوار کو طیبہ اماں کے ساتھ ماموں کے گھر پہنچی تو ممانی کام والی کے ساتھ تفصیلی صفائی کا پروگرام بنائے بیٹھی تھیں جو انہیں موخر کرنا پڑا۔

"فرزانہ! تم تیار ہو جاؤ۔ طیبہ ہے نا، سب کچھ کر لے گی۔" امی کے کہنے پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ارے نہیں بیٹا بیٹھو! ابھی تو آئی ہو، سکینہ صفائی کر لے گی۔" ممانی نے شفقت سے اسے دوبارہ کھینچ کر بٹھا دیا تھا۔

"ارے ممانی! میں سارا دن آپ لوگوں کے انتظار میں بیٹھی تھوڑی رہوں گی۔ کچھ کروں گی تو وقت کٹے گا نا۔"

"اچھا۔ باقی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ واپسی پر مجھے بازار میں تھوڑا کام ہے تو شاید دیر ہو جائے، اپنے لیے ایک دو اچھی سی ڈشز ضرور بنا لینا۔ کیونکہ آپا اور تم دوپہر کا کھانا یہیں کھا کر جاؤ گے۔" ممانی کے کہنے پر وہ ایک مرتبہ پھر سر ہلا کر کچن کی جانب چل دی تھی۔

"آپا! کیا دینا دلانا مناسب رہے گا۔ میں نے مٹھائی کا ڈبا اور بچے کے لیے ایک ریڈی میڈ سوٹ منگوایا ہے۔" امی اور ممانی کی اپنی گفتگو شروع ہو چکی تھی۔

"سکینہ! کاشف اٹھ جائے تو ناشتہ بنا دینا۔" ممانی نے کچن میں جھانک کر چلتے ہوئے سکینہ کو ہدایت کی تھی۔

"کاشف ماموں آئے ہوئے ہیں؟" اس نے چونک کر سکینہ سے پوچھا تھا۔

"جی ہاں، داؤد صاحب ہفتے کے ہفتے سامان خریدنے جاتے ہیں۔ تو کاشف صاحب ہی بیگم صاحبہ کے پاس رہنے آتے ہیں۔" سکینہ نے تفصیل سے جواب دیا تھا اور یہ تو طیبہ خود بھی جانتی تھی کہ داؤد ماموں ہر ویک اینڈ پر اپنے کلاتھ ہاؤس کے لیے کپڑا خریدنے جاتے ہیں تو ممانی کی امی رہنے کے لیے آتی ہیں۔

ممانی کپڑوں کا جو ڈھیر دھونے کے بجائے واشنگ مشین میں ٹھونس کر گئی تھیں پہلے تو اسے دھونے کی ذمہ داری سکینہ کو سونپی اور خود پورے گھر کی تفصیلی صفائی کا بیڑا اٹھایا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کی آمد کی وجہ سے فرزانہ ممانی کا سارا پروگرام چوپٹ ہو کر رہ جائے، برآمدے اور کچن کے فرش کو خوب اچھی طرح دھو کر وائپر سے خشک کرنے کے بعد ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے قیمہ اور شملہ مرچ کا سالن بنانے کے لیے سبزی کاٹ رہی تھی جب برآمدے کے آخری سرے پر کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔

"سکینہ خالہ! ایک کپ چائے بنا دیجیے گا۔" کاشف کی آواز پر اس نے چھری ایک طرف رکھی اور چائے بنانے لگی تھی کہ سکینہ خالہ کپڑے پھیلانے چھت پر گئی ہوئی تھیں۔

وہ خالہ سکینہ کو چائے کا کہہ کر نیم کے پیڑ کے نیچے کرسی پر براجمان پاؤں ٹیبل پر رکھے ترتیب وار اخبارات دیکھ رہا تھا۔

"چائے۔" دھیمی سی آواز پر سمیع اللہ خان کے "دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا" میں تیونس کی تاریخ میں غرق اس نے پاؤں سمیٹ کر ٹیبل سے نیچے رکھے تھے۔

"رکھ دیں۔" کہتے ہوئے اسے خیال آیا کہ یہ آواز کم از کم سکینہ خالہ کی تو نہیں ہے۔ اس نے چونک کر اخبار سے نظریں اٹھائی تھیں۔ مگر اس وقت تک وہ مڑ چکی تھی۔ لیلن کے ڈھیلے ڈھالے سرخ سوٹ میں ملبوس، جس کے پائنچے ٹخنوں سے قدرے اوپر بھیگے ہوئے تھے، سیاہ چپل میں مقید دھلے دھلائے پاؤں اور کمر پر جھولتی سیاہ ناگن سی چٹیا، کاشف حیات کا دل ایک لمحے کے لیے پھیل کر سکڑا تھا۔ بے اختیار ہی اس کا دل چاہا وہ اس کا چہرہ دیکھے۔

"باجی کہاں غائب ہیں؟" کاشف کے پوچھنے پر وہ مڑی تھی۔

"ممانی تو امی کے ساتھ فراز انکل کے گھر گئی ہیں۔ دیر سے واپس آئیں گی۔" ایک لمحے کے لیے رک کر طیبہ نے دیکھا غالباً وہ کچھ اور پوچھے۔

"فیضی کو بھی جگا دو ورنہ سارا دن سویا پڑا رہے گا۔" خاموشی سے سر ہلا کر وہ اندر چلی گئی تھی۔

"کمال ہے، یہ جمیلہ آپا کی بیٹی ہے۔" چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر اس نے اخبار ٹیبل پر ڈالا اور چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے سوچنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"السلام و علیکم ممانی جان!" طیبہ کالج سے واپس آئی تو فرزانہ بیگم کو بیٹھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھی۔

"وعلیکم السلام۔ کیا حال ہے بیٹا! اور یہ آج کل کیا درزیوں والے کام شروع کر رکھے ہیں؟"

"ممانی، درزی ہیں تو درزیوں والے کام ہی کریں گے۔" اس نے تخت پر بیٹھتے ہوئے اماں کی سلائی

مشین اور ادھ سلے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"ارے پاگل! میں یہ کہہ رہی ہوں کہ ابھی کچھ پڑھ لیتیں تو اچھا تھا۔"

"آپ پریشان مت ہوں میں پڑھائی تھوڑی چھوڑ رہی ہوں تھرڈ ایئر کی کلاسز شروع ہونے میں کچھ وقت تھا تو میں نے سلائی کڑھائی کے انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا ہے۔"

"یہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔ پڑھائی کے ساتھ کوئی ہنر ہاتھ میں ہو تو کیا ہی بات ہے۔"

"آپ سنائیے' ماموں کیسے ہیں اور یہ آپ فیضی کے بچے کو ساتھ کیوں نہیں لائیں۔" اس نے حال احوال پوچھتے ہوئے منہ بنایا تھا۔

تھوڑی سی گپ شپ کے بعد وہ کمرے میں آگئی کہ بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔

"جمیلہ آپا! آپ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجئے گا اور جب میں ذمہ داری لے رہی ہوں تو پھر کس بات کا ڈر ہے۔" کھانا کھاتے ہوئے فرزانہ ممانی کی آواز اس کی سماعتوں میں اتری تھی۔

"وہ بات تو ٹھیک ہے.... مگر اعجاز کی تو پڑھائی بھی ادھوری ہے پھر اس کا اٹھنا بیٹھنا پچھلے دنوں بھی۔" وہ بے حد محتاط تھیں شاید اس لیے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"آپا! اس عمر میں لڑکے یونہی ہوتے ہیں اور پڑھائی کا کیا ہے۔ ویسے بھی اس نے ابا کا اسٹور ہی دیکھنا ہے نا۔"

"یوں تو نہ کہو' اپنا کاشف بھی تو ہے۔" اماں کے لہجے میں ستائش تھی۔

"خیر آپا! کاشف جیسا سمجھ دار تو کوئی کوئی ہوتا ہے۔ اور لائق بھی بہت ہے' کمیشن کا امتحان پاس نہ کر سکا تو بینک آفیسر تو بن ہی گیا ہے۔ اب بھی ایک بڑے امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔ آپا! سچی بات تو ہے کہ اس بارے میں بھی میں نے اور داؤد نے سوچا تھا۔ مگر ایک طرف اماں کاشف کی لیاقت کو کیش کروانا چاہتی ہیں اور دوسری طرف مصباح اپنے چکر میں ہے۔"

ممانی جان غالباً" ایک ماں کے خیالات کا اندازہ کر چکی تھیں سو خود ہی تفصیل بتا رہی تھیں۔

طیبہ اتنا تو جانتی تھی کہ مصباح ان کی بڑی بہن ہے' البتہ چکر والی بات اس کے پلے نہ پڑی تھی۔ یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ ممانی اپنے چھوٹے بھائی کے لیے اس کا رشتہ لے کر آئی ہیں۔ مگر یہ سن کر اس کے اندر خوشی کی کوئی رمق نہ جاگی تھی۔

☼ ☼ ☼

طیبہ کے والد کمال احمد کی وفات کب ہوئی تھی۔ اسے کچھ یاد نہ تھا۔ ان کے بارے میں معلومات ہمیشہ اماں کی زبانی اس تک پہنچا کرتی تھیں۔ اماں اور ابا کی دور پرے کی رشتے داری تھی۔ اماں بتاتی تھیں کہ اس کے ابا ریلوے میں ملازم تھے اور جب کینسر جیسے موذی عفریت نے انہیں بھری جوانی میں اپنی آغوش میں سمیٹا تو داؤد ماموں نے اماں کے حصے کی جائیداد نقد رقم کی صورت میں دے دی۔ ابا تو جانبر نہ ہو سکے البتہ ان کی تمام جمع پونجی اور جائیداد کینسر کے مہنگے علاج پر ضرور لگ گئی تھی۔

سو اماں نے مشین سنبھال لی تھی۔ اگرچہ ابا کی قلیل پنشن میں دو افراد کا گزارا ہو سکتا تھا مگر اماں آنے والے وقتوں کے لیے کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیا کرتی تھیں تاکہ ضرورت پڑنے پر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے پڑیں۔ رشتہ داروں میں اکلوتے ماموں اور ممانی تھے جو بہن اور بھانجی سے بے حد مخلص اور محبت کرنے والے تھے۔ دوسری طرف ابا کی اکلوتی بہن عطیہ پھوپھو اور ان کی فیملی' جن کا رویہ اکثر اسے حیرت اور دکھ میں مبتلا کر دیتا تھا۔

☼ ☼ ☼

کچن میں کام کرتے ہوئے اب تو پسینہ گھٹنوں تک بہنے لگا تھا۔ پھوپھو بس کھڑے کھڑے چکر لگاتیں اور کوئی نئی ہدایات دے کر غائب ہو جاتیں۔ ان کی لاڈلی عزہ بھی نہ جانے کہاں تھی۔ شاید مہمانوں کے سواگت کے لیے لیپا پوتی میں مصروف ہوگی۔

اس نے خود سے اندازہ لگاتے ہوئے سوچا تھا۔ بریانی دم پر لگا کر وہ عزہ کے کمرے میں ستانے چلی آئی تھی۔

"کیا بات ہے کوئی خاص مہمان آرہے ہیں کیا!" وہ تو تیاری سے ہی نظر آرہا تھا مگر وہ یونہی چھیڑ بیٹھی تھی۔

"ہاں' وہ بھائی کے ہونے والے سسرال سے کچھ لوگ آرہے ہیں۔" اس نے شرما کر بتایا تھا۔

"مگر تیاری سے تو لگ رہا ہے جیسے تمہارے سسرالی آرہے ہیں۔ اس نے سوچا ضرور مگر کہا نہیں۔

"عفان بھائی کے سسرالی مگر پھوپھو تو کہتی تھیں کہ پہلے وہ تمہاری شادی کریں گی اب یہ اچانک پروگرام کیسے بدل گیا؟" اسے خیال آیا تو وہ چونک کر پوچھنے لگی تھی۔

"امی ہم دونوں کو اکٹھا ہی نبٹانے کا پروگرام بنائے بیٹھی ہیں۔" عزہ کی مزید اطلاع پر وہ غور کر ہی رہی تھی۔ جب پھوپھو بوکھلائی ہوئی اندر آئی تھیں۔

"ارے طیبہ بیٹا! تم یہاں آکر بیٹھ گئی ہو' جلدی جلدی کام نبٹاؤ۔ مہمانوں کے آنے سے پہلے سب کچھ تیار ہونا چاہیے۔" پھوپھو نے عزہ کے کمرے میں جھانک کر اس کی کلاس لی تو وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"میں دیکھوں' یہ عظمیٰ ابھی تک پہنچی کیوں نہیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے واپس ہوئیں تو طیبہ بھی ان کے پیچھے کمرے سے نکل آئی تھی۔

پھوپھو کی تین اولادیں تھیں۔ بڑی عظمیٰ جو شادی شدہ ایک گپلو سے بیٹے کی اماں جان تھیں۔ پھر عفان اور اس سے چھوٹی عزہ۔ صبح ہی صبح پھوپھو نے اماں کو بلا بھیجا تھا کہ ان کے ہاں کوئی دعوت ہے۔ تھوڑی مدد کریں' اماں کی طبیعت ٹھیک نہ ہونے کے باعث وہ انہیں منع کر کے خود آگئی تھی۔ اس چھوٹی سی دعوت کے لیے تین چار ڈشز تیار کرنے میں اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔

"واہ بھئی۔ طیبہ تو بہت سگھڑ ہے۔" کام ختم ہوتے ہی بیٹی کا لاحقہ بھی چھوٹ چکا تھا۔ مگر بہرحال تمام کام کا جائزہ لے کر پھوپھو نے اسے داد ضرور دی تھی۔

"اب تم یوں کرو' فوراً" گھر جاؤ۔ بھابھی اکیلی ہوں گی۔" انہوں نے سوکھے منہ بھی اسے کھانے کا نہ پوچھا تھا اور یہ کون سا پہلی بار ہوا تھا مگر اسے پھر بھی بہت محسوس ہوا تھا۔ لاؤنج میں عظمیٰ آپی سے سلام دعا کرنے میں تھوڑا وقت لگا اور جب وہ عزہ کے کمرے میں چلی گئیں تو وہ جاتے جاتے گڈو کے پاس رک گئی اور اس کی توتلی زبان میں باتیں سنتے ہوئے انجوائے کرنے لگی تھی۔

"ارے طیبہ! کیوں چپک کر بیٹھ گئی ہو۔ مہمان آتے ہی ہوں گے۔ بخشو بھئی۔ تمہارا حصہ میں بعد میں بھجوا دوں گی۔" پھوپھو کا تحقیر بھرا لہجہ' گویا وہ کھانے کے لالچ میں یہاں سے جانا نہیں چاہ رہی یا پھر مہمان اسے دیکھتے ہی بھاگ جائیں گے۔

☼ ☼ ☼

صاحب! یہاں کنسٹرکشن کا سامان ——— پڑا ہے۔

ٹیکسی آگے نہیں جا سکے گی۔" مطلوبہ گھر کی تلاش میں وہ خاصے خوار ہو رہے تھے۔

"آپی! آپ بیٹھیں میں اندر جا کر پتا کرتا ہوں۔" وہ بھائی جان اور آپی کو بیٹھنے کا کہہ کر ٹیکسی سے اتر کر گلی میں چلا گیا تھا۔ اندازے سے مطلوبہ گھر کے گیٹ پر رک کر اس نے بیل بجانا چاہی مگر اس سے قبل ہی زور سے دروازہ کھلا اور کھٹاک سے بند ہوا۔ آنکھوں میں آنسو لیے باہر آنے والی ہستی یقیناً" وہی تھی جو اس کی طرف دیکھے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتی گلی میں چلی گئی تھی اور کاشف کا دل اس کے قدموں سے لپٹ رہا تھا۔

"ارے بھائی! یہاں کیوں جم گئے ہو' پتا کرو یہی گھر ہے کیا؟" پیچھے بھائی جان اتر کر اس کے پاس پہنچے تو اس نے چونک کر بیل پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"ماموں مجھے توتے دیکھنے جانا ہے۔" کاشف ابھی ابھی آیا تھا اور فیضی نے آتے ہی باہر جانے کی ضد شروع کردی تھی۔ پچھلے ہفتے وہ اسے قریبی پارک لے گیا تھا۔ جہاں چھوٹا سا چڑیا گھر بھی تھا۔ وہاں اس کو طوطے اس قدر پسند آئے تھے کہ حد نہیں۔

"چلتے ہیں ماسٹر! تمہارے توتے دیکھنے۔ مجھے چائے تو پینے دو۔" فرزانہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے کر اس نے فیضان کو تسلی دی تھی۔

"نہیں توتوں کے پاس چلیں۔" فیضان نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا تھا۔

"توبہ ہے اس بچے کی' فیضی' ماموں کو چائے پینے دو' پھر توتے دکھانے لے چلیں گے۔" فرزانہ نے اسے جھڑکا تو چند سیکنڈ تو وہ منہ بسور کر کھڑا رہا پھر بھاگ کر کچن میں گیا اور ایک کپ اٹھا کر لے آیا تھا۔

"ماموں! مجھے بھی چائے دیں۔"

کاشف کی ہنسی چھوٹ گئی "باجی! ویسے آپ کا شہزادہ ہے بہت ذہین' اب اسے یہ خیال آیا ہے کہ میں اکیلا چائے پیوں گا تو دیر لگے گی' جبکہ آدھی چائے اسے دے دوں گا تو توتے جلدی دیکھنے کا موقع ملے گا۔"

اس نے تھوڑی سی چائے فیضان کے کپ میں ڈالتے ہوئے اس کی چالاکی پر روشنی ڈالی تھی۔

"اچھا یہ بتاؤ' تم نے اتنا پیارا بیلون کہاں سے لیا ہے؟" کاشف نے اس کا دھیان بٹانا چاہا تھا۔

"طیبہ آپی نے دلایا ہے۔" اس نے خوش ہو کر بتایا تھا۔ تب ہی فون کی بیل بجنے پر فرزانہ اٹھی تو اس نے قدرے آہستگی سے پوچھا تھا۔

"اچھا طیبہ آپی آئی ہوئی ہیں۔"

"پر وہ تو اپنے گھر چلی گئی ہیں۔"

"یار! یہ تو تم نے کوئی اچھی خبر نہیں سنائی۔" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا تھا۔ تب ہی فرزانہ آپی واپس آ گئی تھیں۔

"ماما یہ بیلون آپی نے دلایا ہے۔" وہ خوش ہو ماں کو پھر سے بتانے لگا تھا۔

"ہاں بیلون میرے بیٹے کی آپی لائی ہیں۔" فرزانہ نے مسکرا کر کہا اور پھر کاشف سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"بہت پیار کرنے والی بچی ہے۔ اماں اور داؤد کے کہنے پر میں نے جمیلہ آپا سے بات کی تھی۔ اپنے اعجاز کے رشتے کے لیے' مگر یہ اعجاز بھی آوارہ گردی چھوڑ کر کوئی ڈھنگ کا کام کرے تو......"

کاشف کے حلق میں چائے کا پھندا لگ گیا تھا۔

"ارے بھئی کاشف! ذرا چائے ٹھنڈی ہو لینے دو۔" فرزانہ باجی نے گھبرا کر وہ بات ادھوری چھوڑ دی جس کو سننے کے لیے اس کا رواں رواں بے تاب ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ عمیر کے ساتھ کتابیں ایشو کروانے لائبریری گیا تھا۔ عمیر کا بینک میں ایک کام نکل آیا تو نبٹاتے نبٹاتے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ فارغ ہو کر وہ دونوں لنچ کرنے قریبی ہوٹل میں آ گئے تھے۔ ویٹر آرڈر لینے ان کی ٹیبل پر آیا تو عمیر نے اپنا آرڈر دینے کے بعد مینو کارڈ اس کی طرف بڑھایا تھا' وہ بالکل بھی متوجہ نہیں تھا۔

"کاشف یار! کہاں گم ہو تم؟" عمیر نے مینو کارڈ سے اس کے چہرے کو ہوا دی۔

"کہیں...... کہیں نہیں۔ تم کچھ کہہ رہے تھے؟" وہ بوکھلا کر اس سے پوچھ رہا تھا۔

"کیا منگواؤں تمہارے لیے؟"

"کچھ نہیں۔" جواب دے کر ایک مرتبہ پھر حاضر غائب تھا۔

"چلو جی! یہ تو گئے کام سے۔" عمیر کہہ کر خود ہی ویٹر کو فارغ کرنے لگا اور اس کے جانے کے بعد کاشف کی نگاہوں کی تعاقب میں دیکھا تھا۔ جو کارنر ٹیبل پر موجود ایک خوب صورت سی لڑکی اور اس کے پارٹنر کو گھورے جا رہا تھا۔

"کیا تم بھی اس کے چکر میں ہو آج کل؟" عمیر ٹیبل پر جھک کر اپنا چہرہ اس کے قریب لاتے ہوئے شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

"ارے نہیں بھئی!" وہ ابتدائی شاک سے قدرے باہر آ چکا تھا۔ سر ہلا کر زور و شور سے اس کی نفی کرنے لگا تھا۔

"تو پھر؟"

"یہ اعجاز کے ساتھ کون ہے؟" خود کلامی کرتے ہوئے اس نے اپنی کرسی تبدیل کر کے چہرہ دوسری طرف کیا تھا۔

"اعجاز...... تمہارا بھائی۔" عمیر کو بھی کچھ کچھ بات کی سمجھ آ رہی تھی۔

اس نے کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"تو ابھی جا کر ہیلو ہائے کر لو ان سے۔" عمیر نے مسکرا کر مشورہ دیا تھا۔

"نہیں یار! اچھا نہیں لگتا۔ گھر جا کر پوچھ لوں گا۔ ہمارے درمیان اتنی فرینڈشپ ضرور ہے کہ وہ مجھ سے کم از کم جھوٹ نہیں بولے گا۔" اس نے عمیر کا مشورہ رد کرتے ہوئے وثوق سے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کا یقین بے جا نہیں تھا۔ پہلے تو اعجاز نے اسے حق دق ہو کر دیکھا اور جب یقین ہو گیا کہ کاشف کو کچھ نہ کچھ معلوم ضرور ہے تو آئیں بائیں شائیں کرنے لگا تھا۔

"ادھر آ' بڑا بھائی ہوں تمہارا۔ اب مجھے چکمہ دو گے تم؟" کاشف نے اس کا کان پکڑ لیا تھا۔ "میں نے خود آج دوپہر میں تمہیں اس پری کے ساتھ ہوٹل میں دیکھا ہے۔ سچ بتا کون ہے وہ؟"

"کان چھوڑیں نا بھائی کیوں مجھے کن کٹا بنانے پر تلے ہوئے ہیں' بتاتا ہوں سب۔ ہونے والی بھابھی ہے وہ آپ کی۔" چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا سو کان چھڑا کر اس نے ساری تفصیل اگل دی تھی۔

"ارے گھامڑ! اگر یہ بات ہے تو رشتے کی بات چلا۔ انتظار کس بات کا کر رہا ہے تو؟"

"ابھی نہیں بھائی! میں چاہتا ہوں' پہلے آپ نبٹ لیں تو میں اپنا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کروں۔ ورنہ بڑے مسئلے کے سامنے چھوٹا مسئلہ خوامخواہ ویٹو کر دیا جائے گا۔"

"میرے نبٹنے کا انتظار نہ کر چھوٹے! اپنی قرارداد فوراً" سے پہلے پیش کر۔ تب ہی میرا چانس نکلے گا۔"

"کیا مطلب؟" اعجاز نے الجھ کر پوچھا۔ اس کے پلے کچھ بھی نہ پڑا تھا۔

"تو کچھ نہیں سمجھے گا' مجھے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔"

"آپ مجھے کچھ سمجھائیں گے تو سمجھوں گا نا۔" اعجاز نے جھنجلا کر کہا تھا۔

"پرابلم یہ ہے کہ ظالم سماج تیری ہونے والی بھابھی کا نام تیرے ساتھ جوڑنے پر تلا ہوا ہے۔ اور باقاعدہ پروپوزل بھی بھیجا جا چکا ہے۔"

"کیا؟" حیرت سے اعجاز کا منہ کھل گیا تھا۔

"سچ کہہ رہا ہوں چھوٹے! تیرے بھائی کے ساتھ یہ ظلم کیا جا رہا ہے۔"

"میرے ہوتے ہوئے ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا بھائی!" اعجاز نے فلمی اسٹائل میں بڑھک مار کر کہا تھا اور پھر دونوں زور سے قہقہہ لگا کر ہنس دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" فرزانہ باجی تو سن کر گویا صدمے سے نڈھال ہو گئی تھیں۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں باجی! اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔" اس نے انتہائی اطمینان سے کہا تھا۔

"کاشف میں نے جمیلہ آپا سے بات بھی کر لی ہے اور داؤد کو بھی پتا ہے وہ کتنا ناراض ہوں گے۔"

"تو کیا مجھے کنوارا مارنے کا ارادہ ہے آپ کا؟"

"اللہ نہ کرے۔ کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہو' تمہارا کہاں سے ذکر آ گیا اس بات میں۔"

"واہ! میرا کوئی ذکر کیوں نہیں' چھوٹے کی آپ کو اتنی جلدی ہے کہ رشتہ لے کر پہنچ گئیں اور مجھے اتنا

فالتو سمجھ رکھا ہے کہ کوئی ذکر ہی نہیں۔"

"تنگ مت کرو مجھے۔ تمہارا مصباح آپی نے کہا تو ہے کہ وہ عطیہ کی طرف....."

"خبردار آپی! میرے سامنے کسی نے اس فیملی کا ذکر بھی کیا تو..... اس دن دھوکے سے مصباح آپی مجھے اس مغرور، بدتمیز لڑکی کو دکھانے لے گئیں۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ وہ مجھے اس مقصد کے لیے لے کر جا رہی ہیں تو میں کبھی نہ جاتا۔" وہ آدھی بات سن کر ہی بھڑک اٹھا تھا۔

"اگر اعجاز کو کوئی لڑکی پسند تھی تو اس نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔"

"شاباش ہے باجی! آپ لوگوں نے اپنے بھائیوں کو اللہ میاں کی گائیں سمجھ رکھا تھا یا تیرھویں صدی کی کوئی دوشیزائیں۔ ٹھیک ہے کہ ہم سیدھے سادے معصوم بچے نظر آتے ہوں گے۔ مگر رشتہ دینے سے پہلے آپ پوچھ لیتیں تو یہ نوبت نہ آتی۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں الٹا انہیں ہی موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔

"اب کتنی شرمندگی ہوگی جب میں داؤد کو بتاؤں گی کہ....."

"کیوں شرمندگی ہوگی میں ہوں نا آپ کا جانثار بھائی بھلا اس موقع پر آپ کے کام نہ آؤں گا۔" اس نے بڑی لگاوٹ سے مسکرا کر کہا تھا۔

"تم..... تم کیا کرو گے؟" فرزانہ نے اس کی بک بک پر بیزار ہو کر کہا تھا۔

"افوہ باجی! آپ نے اپنی عقل کہیں گھاس چرنے بھیجی ہے کیا؟ اب منہ پھاڑ کر کہہ تو رہا ہوں کہ میں آپ کی جمیلہ آپا کی بیٹی سے شادی کرلوں گا مسئلہ ختم۔" اس نے چٹکی بجائی تھی۔

"ہوش کے ناخن لو، میاں! اماں جان تمہاری قابلیت اور جاب کے بل بوتے پر دولہن کے ساتھ دولت کا ڈھیر بھی چاہتی ہیں۔ اس کے لیے انہیں اور مصباح آپی کو عطیہ اور صادق صاحب کی بیٹی عزہ پسند آئی ہے۔"

"عزہ کے ساتھ دنیا جہاں کی دولت بھی مل جائے تو وہ بھی قبول نہیں ہے مجھے۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تھا۔

"کیوں؟" فرزانہ نے تیکھے چتونوں سے کہا تھا۔

"وجہ آپا کو بتا چکا ہوں۔" وہ بائیک کی چابی لے کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"سنو۔" انہوں نے پیچھے سے آواز دی تھی۔

"جی!"

"اماں نہیں مانیں گی۔" فرزانہ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"جانتا ہوں مگر میرے پاس ایک ترکیب ہے۔" واپس آکر بیٹھ گیا تھا۔

"بھلا میں بھی تو سنوں۔" فرزانہ نے ہمہ تن گوش ہو کر کہا تھا۔

"یا خدا! اتنے گھنے ہو تم۔" فرزانہ نے ساری بات سنی اور مسکرا کر کہا تھا۔

"جیسا بھی ہوں آپ کا بھائی ہوں، وہ کھل کر مسکرا دیا تھا۔

✲ ✲ ✲

اعجاز کی پسند پر گھر میں کسی کو اعتراض نہ تھا۔ مگر کاشف نے چند سال پہلے لینگوئج یونیورسٹی سے رشین لینگوئج کا کورس کیا تھا۔ اب اس نے فرزانہ کی وساطت سے گھر میں یہ شوشا چھوڑ دیا تھا کہ وہ اپنی کسی رشین ٹیچر کو پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کر کے باہر سیٹل ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ بانو بیگم کی تو گویا جان ہی نکل گئی تھی۔

ان کی رشتے کی خالہ زاد بہن کا ایک بیٹا سالوں پہلے امریکہ چلا گیا تھا۔ اس نے وہیں شادی کرلی۔ ماں نے بہتیرے واسطے دیے مگر ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر وہ اپنی صورت تک دکھانے نہ آیا اور آیا بھی تو کب جب ماں نے اپنے سفر آخرت کے لیے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ سو ایسے روح فرسا مشاہدے کے بعد کاشف کو کسی میم سے شادی کی اجازت دینا بالکل ناممکن بات تھی۔

کچھ دنوں گھر میں کشیدگی کی فضا قائم رہی جس کو فرزانہ اور اعجاز نے یہ کہہ کر کم کیا کہ وہ کاشف کو یہاں کی کسی لڑکی سے شادی کے لیے قائل کرنے کی کوشش کریں گے؟ بانو بیگم کی دو ہی شرطیں تھیں۔ ان کی بہو مالدار ہو اور خدمت گزار ہو۔ اب چند دن کی محنت کے بعد فرزانہ نے کاشف کو طیبہ کے لیے قائل کیا تو وہ تذبذب میں تھیں۔ مگر پھر انہوں نے ماں کو سمجھایا اس طرح کم از کم لڑکا بالکل ہی ہاتھ سے نہیں نکلے گا اور پھر طیبہ کی خوبیاں گنوائیں کہ وہ پڑھی لکھی سگھڑ، ہنرمند اور بڑوں کی فرماں بردار بچی ہے۔ ان کی تابع دار رہے گی۔

بانو بیگم کسی نہ کسی حد تک اعجاز اور فرزانہ کی دلیلوں سے مطمئن ہو گئی تھیں۔ اس صورت میں ایک بڑا خطرہ جو انہیں میم کی طرف سے لاحق ہوا تھا۔ وہ خود بخود رفع ہوتا نظر آرہا تھا۔

البتہ ان کی بڑی بیٹی مصباح اس سارے معاملے سے متفق نہیں تھی۔ بلکہ اسے کوئی سازش قرار دے رہی تھی۔

"کیا ہے، جو کاشف، عطیہ کی بیٹی سے شادی کرلے تو اس طرح میری بچی کا رشتہ عفان سے....."

"اے بھیا (بانو بیگم غصے میں ہر کسی کو یونہی پکارتی تھیں) اب تمہاری بچی کے لیے میں اپنا بیٹا کھو دوں۔ وہ تو یہاں کرنا ہی نہیں چاہتا۔ خدا خدا کر کے راضی ہوا تو تم..... اپنی عمارہ کا جہاں مقدر ہوگا ہو جائے گا۔"

"باجی! اس سے پہلے کہ مصباح آپی اماں کے فیصلے میں گڑبڑ کروادیں ہمیں کوئی پکا کام کر دینا چاہیے۔" اعجاز نے رائے دی تھی۔

"اماں! اس سے پہلے کہ کاشف کا ارادہ بدل جائے اور وہ پھر سے اپنی میم کا ذکر لے بیٹھے۔ ہمیں اس کا نکاح طیبہ کے ساتھ کر دینا چاہیے۔" اگلے روز فرزانہ نے اماں سے کہا تھا۔

"ہائیں! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" اماں پریشان ہو گئی تھیں۔

"اگر وہ موٹی میم کہیں بھائی کو مل گئی اور اس نے کہہ دیا کہ چلو میرے ساتھ میرے ملک، تو بھائی کا تو آپ کو پتا ہی ہے کہ کتنی مشکل سے مانے ہیں۔" اعجاز نے باجی کو آنکھ مار کر اماں سے اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔

✲ ✲ ✲

چاند زمین پر اتر آیا تھا یا فلک سے ستارے اس کے آنگن میں لگے آم کے پتوں کی جگہ لے کر جگ مگ کرنے لگے تھے۔ خوشیاں اس کے گرد رقصاں تھیں، یا وہ خود زماں و مکاں سے آزاد فضا میں پرواز کر رہی تھی۔ کوئی آسمان کو چھو لے یا تاروں کے جھرمٹ کو اپنے تن پر سجا لے۔ یا پھر ہاتھ بڑھا کر چاند کو اپنے آنگن میں اتار لے۔ تو اتنا خوش ہوتا ہوگا جتنی کہ وہ تھی۔ وہ خواب جس نے پلکوں پر دستک دی تھی۔ جسے وہ بند آنکھوں کے ساتھ دیکھنے کی جرات نہ کر سکی تھی۔ وہ دن کی روشنی میں اس کی حیرت سے کھلی آنکھوں میں پورے استحقاق کے ساتھ آن براجمان ہوا تھا۔

روئے زمین پر کوئی ایسا ناپ تول کا پیمانہ ایجاد نہ ہوا تھا۔ جس سے وہ اپنی خوشی کو ناپ سکتی۔ رشک بھری نگاہوں اور ستائشی جملوں نے یتیمی اور کم مائیگی کے احساس کو لمحوں میں دھو کر رکھ دیا تھا۔ نکاح بہت سادگی سے افراتفری میں ہوا تھا۔ صرف گھر کے لوگ تھے۔ فرزانہ ممانی کسی بوتیک سے ہلکے کام والا ریڈی میڈ سوٹ لے کر آئی تھیں۔ ان خوشی بھرے لمحوں میں اس نے مصباح کے روکھے پھیکے رویے کو محسوس تو کیا تھا مگر اپنا وہم جان کر نظر انداز کر دیا تھا۔

اس موقع پر عطیہ بیگم نے ایک عجیب شوشا چھوڑ دیا تھا۔

"ہائے میں نے اپنے مرحوم بھائی سے طیبہ کا ہاتھ اپنے عفان کے لیے مانگ لیا تھا۔"

اگرچہ جمیلہ بیگم کی کبھی یہ شدید خواہش ہوا کرتی تھی۔ مگر اب بھلا دوسری جگہ زبان دینے کے بعد یہ کہنا کیا معنی رکھتا تھا کہ بھائی کے گزرنے کے بعد اٹھارہ سال تک تو انہوں نے منہ سے کبھی کچھ نہ پھوٹا تھا۔

عطیہ بیگم نے اس بات کو جواز بنا کر نہ صرف تقریب میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ تمام رشتے ناتے توڑنے کا اعلان بھی ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی خوشیوں کی عمر اتنی مختصر تھی۔ طیبہ متوحش نظروں سے روتی سسکتی اماں کو دیکھ رہی تھی۔ خود اس کی اپنی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا تھا۔ اس روز جمیلہ بیگم کسی کام سے بھائی کے گھر گئیں تو واپسی پر مصباح کے گھر چلی گئیں کہ نئی نئی رشتہ داری جڑی تھی تو ملنا ملانا بھی ضروری تھا۔ اب گھر کے اندر آتو گئی تھیں مگر گھر کا سناٹا دیکھ کر سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ واپس جائیں یا آگے بڑھیں۔ تب ہی سامنے سے نادر نکلتے دکھائی دیے تھے۔

ارے آپا آپ؟ آیئے نا باہر کیوں کھڑی ہیں؟" جوان بچوں کے باپ ہو کر بھی ان کی شہرت کچھ اچھی نہ تھی۔ چھوٹے موٹے معاشقے اور گھریلو جھگڑے سننے میں آتے رہتے تھے۔

"مصباح کہاں ہے؟ ادھر سے گزر رہی تھی تو سوچا کہ حال احوال پوچھتی چلوں۔" جمیلہ بیگم نادر کی ہمراہی میں کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

"مصباح تو بازار گئی ہے۔ آتی ہی ہو گی۔ آپ بیٹھیں۔"

"نہیں، پھر ان شاء اللہ کسی وقت چکر لگاؤں گی۔" مصباح کے نہ ہونے کا سن کر وہ فوراً" اٹھ کھڑی ہوئی تھیں، تب ہی مصباح گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھیں۔

"تو تم ہو وہ ڈائن جو میرے گھر میں نقب لگا رہی ہے۔"

اس کا شاید اپنے شوہر سے کوئی جھگڑا چل رہا تھا یا کیا بات تھی کہ وہ کسی چیل کی طرح ان کی طرف لپکی تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو جمیلہ بیگم کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس سے مخاطب ہے اور جب سمجھ میں آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اردگرد کے ٹیرس، چھتوں سے کھڑکیوں سے جھانکتے تماشائی اور وہ صحن کے بیچوں بیچ مجرم بنی کھڑی تھیں کہ چالیس سال کی عمر خوب صورتی اور بیوگی کے ثبوت مصباح کے کہے کو مکمل سچ ثابت کر رہے تھے اور پھر رنگے ہاتھوں پکڑے جانا بھلا کون یقین نہ کرتا، نہ جانے کس حال میں وہ واپس آئی تھیں۔ طیبہ اور جمیلہ بیگم کی ذات زلزلوں کی زد میں آ چکی تھی۔

اس واقعے کے بعد دونوں طرف سے خاموشی چھا گئی تھی۔ مگر اب عطیہ پھوپھو کا بلک بلک کر طیبہ کے سسرال والوں کے عزائم سے آگاہ کرنا۔ اس اونٹ کو کسی کروٹ تو بیٹھنا ہی تھا اور فیصلہ بھی جمیلہ بیگم کو ہی کرنا تھا۔ جو عطیہ بیگم کے مشورے سے بخوبی ہو گیا تھا۔

"بجائے اس کے کہ وہ ہماری بچی کی زندگی خوار کریں، ہمیں ایسے ناشکرے لوگوں سے جان چھڑا لینی چاہیے۔" عطیہ بیگم نے کہا تھا۔

"مگر عطیہ! میری بچی پر بیٹھے بٹھائے طلاق کا جو داغ لگے گا اس کے بعد......"

"ارے تم کیوں فکر کرتی ہو طیبہ تو میری بیٹی ہے، میرے عفان کی دلہن بنے گی، بس میری مانو اور ان لوگوں سے جان چھڑاؤ۔"

جمیلہ بیگم سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

"اب تم زیادہ مت سوچو، میری بیٹی کے بارے میں مجھے فیصلہ کرنے دو، میں آج ہی عزہ کے ابو سے کہتی ہوں کہ کسی اچھے وکیل سے مل کر خلع کا کیس دائر کریں اور لعنت بھیجیں ان لوگوں کے منہ پر......"

اس موقع پر پھوپھو نے ان ماں بیٹی کو جس طرح جذباتی سہارا دیا تھا اس کے لیے وہ بے حد شکر گزار تھیں۔

"طیبہ بیٹا! یہ تمہاری پھوپھی عزہ کی قمیص دے کر گئی تھیں فٹنگ کے لیے، کہہ رہی تھیں آج ہی ضرورت ہے ذرا دے کر تو آؤ۔" عطیہ بیگم کے کہنے وہ فوراً" اٹھ کر چل دی تھی۔

پھوپھو کے لاؤنج میں داخل ہوئی تو پہلے تو حق دق رہ

گئی اور پھر جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ عظمیٰ آپی کے سامنے صوفے پر مصباح صاحبہ تشریف فرما تھیں۔

"نکلو یہاں سے، کیوں آئی ہو یہاں؟" وہ چیل کی ـــــ تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف دھکیلنا چاہا تھا۔ پھوپھو اور عزہ کی آوازیں کچن سے آرہی تھیں۔

طیبہ کو ایک لمحے کے لیے خیال نہ آیا کہ مصباح یہاں آئی ہی کیوں تھی۔ یاد تھا تو بس اتنا کہ وہ اس کی خوشیوں کو نگلنے والی ڈائن تھی۔ اس کی ماں کے شفاف کردار پر کیچڑ اچھالنے والی خود غرض عورت......

"آپ یہاں سے چلی جائیں، یہ میری پھوپھو کا گھر ہے یہاں قدم رکھا تو"

"خبردار جو مصباح آنٹی کو کچھ کہا تو۔" عظمیٰ تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس آئی اور مصباح کا بازو اس کے ہاتھ سے چھڑانے لگی تھی۔ شور کی آواز پر عزہ اور عطیہ پھوپھو بھی تیزی سے لاؤنج میں آئی تھیں۔

"مصباح آنٹی! ہماری مہمان ہیں تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ۔" عزہ اس کے اور مصباح کے درمیان آکر کہہ رہی تھی۔

"میری بہن کے ساتھ خبردار کسی نے کوئی غلط بات کی۔" پھوپھا اس وقت باہر سے غالباً" خاطر تواضع کا سامان خرید کر آرہے تھے، غصے سے بولے وہ حق دق سب کو دیکھ رہی تھی۔

"پھوپھو! اس عورت نے مجھے اور میری ماں کو

"

"تمہارے اور تمہاری ماں کے ساتھ جو بھی ہوا۔ اس وقت جاؤ یہاں سے، کمال ہے۔ یونہی آکر فساد ڈال دیا، گھر آئے مہمان کے ساتھ بھی بھلا کوئی یوں کرتا ہے۔" عطیہ بیگم کا لہجہ انتہائی بے مہر تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل آئی تھی۔

ابھی کل شام ہی تو پھوپھو نے خلع کے کاغذات اسے سائن کرنے کے لیے دیے تھے۔ جو پھوپھا صادق کسی وکیل سے تیار کروا کر لائے تھے۔ تب سے جمیلہ بیگم مزید نڈھال پھر رہی تھیں۔ وہ یہ نیا قصہ سنا کر انہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر دل اس قدر برا ہو رہا تھا کہ بات کرنا بھی مشکل لگ رہی تھی۔ سو اماں کی نظر بچا کر چھت پر آگئی تھی۔ کافی دیر تک دل کا غبار آنسوؤں کے ذریعے نکلنے دیا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ دوسری طرف خدیجہ خالہ کی بہو سعدیہ بھابھی کافی دیر سے اسے دیکھ رہی ہیں۔ ان کی بیٹی انعم اس کے پاس پڑھنے آتی تھی اور ان سے طیبہ کی اچھی خاصی گپ شپ بھی تھی۔

"میرا خیال ہے اب کافی ہو گیا ہے۔" سعدیہ بھابھی دیوار پر چہرہ ٹکائے مسکرا کر اس سے کہہ رہی تھیں۔

"اِں...... سعدیہ بھابھی!" اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔

"میں کافی دیر سے تمہیں دیکھ رہی ہوں پھر سوچا نہ جانے کتنا بوجھ ہو گا تمہارے دل پر اسے نکلنے دوں، پھر بات کروں گی۔" وہ بہت سکون سے کہہ رہی تھیں۔ جواباً" طیبہ نے خاموشی سے آنکھیں صاف کی تھیں۔

"ہاں اب بتاؤ۔ کیا مسئلہ ہے؟ وہی پرانا یا کوئی نئی واردات ہوئی ہے؟" طیبہ نے ان کے ہمدردی سے پوچھنے پر نئی پرانی ساری باتیں دوہرا دی تھیں۔

"تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ تمہارے ماموں، ممانی کے علاوہ کوئی بھی تم لوگوں کے ساتھ مخلص نہیں ہے مگر اس معاملے میں ان کی خاموشی سمجھ سے بالاتر ہے۔" سعدیہ بھابھی کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

"اصل میں امی نے جب عیدی لینے سے انکار کیا تھا تو فرزانہ ممانی اور ماموں اس بات کے بے حد خلاف تھے۔ اس لیے وہ بھی ناراض ہو گئے اور......" طیبہ کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر آنسوؤں سے لبریز ہونے لگی تھیں۔

"اچھا اب روؤ مت۔ میرے پاس تمہارے مسئلے کا ایک حل ہے۔ سو فیصد تو یقین نہیں ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا مگر ایک کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔"

"کیا؟" طیبہ نے نظریں اٹھائی تھیں۔

"تم خود کاشف سے بات کرو۔" سعدیہ بھابھی نے دو ٹوک انداز میں مشورہ دیا تھا۔

"میں..... میں کیسے؟"

"کیوں تم کیوں بات نہیں کرسکتیں' شوہر ہے وہ تمہارا' اور میں کون سا کہہ رہی ہوں کہ تم اس سے محبت بھرے ڈائیلاگ بولو ______ کوئی سچ کہتا ہے کوئی جھوٹ اور بات بڑھتی چلی جاتی ہے کم از کم حقیقت تو پتا چلے گی نا اسے۔"

"اتنی مرتبہ امی سے کہہ چکی ہوں ایک موبائل ہی لے دیں مگر....." اس نے بے زاری سے کہنا شروع کیا تھا۔

"تمہارے پاس نمبر ہے کاشف کا؟" جواباً" طیبہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ وہ فوراً" نیچے جا کر موبائل اٹھا لائی تھیں۔

تیسری چوتھی بیل پر فون ریسیو کر لیا تھا۔

"کاشف صاحب بات کر رہے ہیں؟" دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے تصدیق کی تھی۔

"جی آپ کون؟" دوسری طرف قدرے اچنبھے سے دریافت کیا گیا تھا۔

"میں....." وہ بتاتے بتاتے رک گئی مبادا پھر کوئی نئی کہانی کھڑی ہو جائے اسے خیال آیا تھا۔

"طیبہ بات کر رہی ہوں۔" سعدیہ بھابھی کے اشارہ کرنے پر بول پڑی تھی۔

دوسری طرف شور کے پس منظر میں چند الفاظ کہے گئے اور پھر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

"لگتا ہے یہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے۔" موبائل فون سعدیہ بھابھی کو تھما کر وہ نیچے اتر آئی تھی۔ ذرا سی امید کی کرن جو انہوں نے دکھائی تھی وہ بھی معدوم ہوئی تو آنسو ایک مرتبہ پھر راستہ ڈھونڈنے لگے تھے۔ وہ صحن کے کونے میں بنے واش روم میں گھس گئی اور نل کھول دیا تاکہ آواز باہر نہ جائے۔

"آنٹی! آنٹی!" سعدیہ بھابھی نے جوش و خروش سے اسے چند آوازیں دیں اور کوئی جواب نہ پا کر سیڑھیوں سے تیزی سے اترنے لگی تھیں۔

"کیا بات ہے سعدیہ بیٹی؟" جمیلہ بیگم نے پوچھا۔

"آنٹی..... وہ یہ۔" موبائل ایک مرتبہ پھر زور و شور سے بجنے لگا تھا۔

"یہ آپ کا فون ہے۔" سعدیہ اس موقع کو قطعاً" ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سو مبہم سا کہہ کر فون آن کر کے انہیں پکڑا دیا تھا۔

جمیلہ بیگم قدرے حیران ہو کر بات کرنے لگی تھیں۔

واش روم میں آنسو بہاتے ہوئے اسے لگا تھا کہ غالباً" سعدیہ بھابھی اسے بلا رہی ہیں۔ آنکھوں پر پانی کے چھپاکے مار کر وہ تیزی سے باہر نکلی تھی۔ مگر باہر منظر توقع کے بالکل خلاف تھا۔

اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے اسے کاشف کی بات چیت بخوبی سنائی دے رہی تھی جو کہہ رہا تھا۔

"ہمارا رشتہ اتنا کمزور تو نہیں ہے کہ کسی تیسرے فرد کے کہنے سے ٹوٹ جائے' آپ جو کچھ بتا رہی ہیں' مجھے ان باتوں کا قطعی علم نہیں' مجھے عیدی واپس بھجوا کر یہ بتایا گیا کہ آپ لوگ یہ رشتہ برقرار نہیں رکھنا چاہتے۔"

"بیٹا! میں بیوہ عورت بھلا کیوں اپنی بچی کی زندگی داغ دار کروں گی اور پھر یہ رشتہ کرنے کے لیے ہمیں کسی نے مجبور تو نہیں کیا تھا۔"

"چلیں۔ اب سب کچھ کلیئر ہو گیا ہے تو آپ کو پریشان ہونے قطعی کوئی ضرورت نہیں' میں اسی ہفتے فرزانہ باجی اور داؤد بھائی کو آپ کی طرف بھیجوں گا۔"

"بیٹا! وہ مصباح تو....."

"مصباح آپی کا کہا سنا تو آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ مگر میں ان سے بات کروں گا ضرور..... دراصل وہ صادق صاحب کی فیملی میں وٹے سٹے کے لیے مجھے گھسیٹ رہی تھیں تو..... بہرحال وہ اس حد تک جائیں گی' یہ تو مجھے بھی اندازہ نہیں تھا۔"

"بیٹا! میرے لیے یہی بہت ہے کہ تم نے میرا یقین کیا ہے۔ باقی یہ رنجش یونہی مقدر میں لکھی ہو گی۔"

طیبہ ماں کے چہرے پر اترتا سکون بخوبی محسوس کر سکتی تھی۔

"آنٹی! دراصل میں پچھلے چند ماہ سے ایک امتحان کی تیاری کر رہا تھا تو گھر والوں سے رابطہ بھی بہت کم رہا ہے۔ بہرحال اب تو سب کچھ واضح ہے۔ آپ دعا کیجیے گا میں کامیاب ہو جاؤں' باقی گھر والوں کو میں ان شاء اللہ بہت جلد بھیجوں گا۔"

"سعدیہ بیٹا! یہ کاشف کو تمہارا نمبر کیسے ملا؟" فون بند کر کے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے جمیلہ بیگم نے پوچھا تو وہ گڑبڑا گئی تھی۔

"وہ آنٹی..... دراصل طیبہ سے نمبر لے کر میں نے خود فون کیا تھا۔" جلد ہی سنبھل کر اس نے اعتماد سے کہا تھا۔

"اللہ تمہارا بھلا کرے بیٹا۔" جمیلہ بیگم نے اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شادی کی تاریخ طے کرنے کے لیے تین دن بعد ہی فرزانہ ممانی' داؤد ماموں' اعجاز اور بانو بیگم موجود تھے۔ جمیلہ بیگم کے تمام خدشات بھاپ بن کر اڑ گئے تھے۔ بانو بیگم اگرچہ سخت طبیعت کی تھیں۔ مگر طیبہ نے بھی خود کو واقعی سلجھی ہوئی' سگھڑ اور فرمانبردار بہو ثابت کیا تھا۔ پھر اس کی قسمت نے ساتھ دیا کہ انہوں نے دو ماہ بعد ہی اسے کاشف کے ساتھ روانہ کر دیا تھا کہ انہیں اس کے کھانے پینے کی بے حد فکر رہتی تھی۔

بہت دنوں کی گرمی کے بعد موسم میں تبدیلی آنا شروع ہوئی اور دوپہر کے بعد سے تو آسمان بادلوں سے ڈھک گیا تھا۔ اس روز وہ خاصے دنوں کے بعد گھومنے پھرنے کے لیے نکلے تھے۔ کچھ ویک اینڈ کے باعث' اور کچھ موسم میں تبدیلی کا اثر' رش معمول سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ اسے جھیل کا کنارا بہت پسند تھا۔ اس وقت بھی جھیل کنارے گھاس پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے وہ کوک کے گھونٹ لے رہے تھے۔

"کیا بات ہے؟" خاموشی کے مختصر سے وقفے میں سرو کے درختوں کے درمیان سفید پھولوں کی باڑ پر نظریں جمائے کاشف نے اس کی نظروں کا ارتکاز محسوس کیا تو مسکرا کر پوچھنے لگا تھا۔

"کچھ نہیں۔" یکدم ہی ارادہ بدل کر وہ انکار کر گئی تھی۔

"پوچھ لو یار! زبان پر آئی بات دل میں نہیں رکھتے۔" اس نے کچھ فراخدلی کے ساتھ لاپروا لہجہ اختیار کیا تھا۔

"کاشف..... آپ۔"

"چلو یہ تو پتا چل گیا کہ جو بات ہے وہ میرے متعلق ہے۔ اب آگے بولو۔" اس نے ایک پتھر اٹھا کر جھیل میں پھینکا تھا طیبہ گھاس کا تنکا توڑتے ہوئے چند لمحے سوچتی رہی۔

"آپ اپنی رشین ٹیچر سے..... میرا مطلب ہے' شادی سے پہلے انوالو تھے۔"

اس کے بات مکمل کرتے ہی کاشف نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

"یہ بات تم فرزانہ باجی سے پوچھ لیتیں نا؟" بمشکل ہنسی روک کر اس نے کہا تھا۔

"پوچھا تھا۔" وہ منہ بنا کر بولی تھی۔

"پھر؟" وہ دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔

"انہوں نے بھی آپ کی طرح زور سے ہنس کر کہا تھا کہ آپ سے پوچھ لوں۔"

"وہ تو میں نے اور فرزانہ باجی نے اماں کو چکر دینے کے لیے شوشا چھوڑا تھا..... ورنہ ہم تو صرف آپ میں انوالو تھے ڈیئر... شادی سے پہلے بھی' بعد میں بھی۔"

ساری بات تفصیل سے بتا کر وہ اس کی طرف قدرے جھک کر کہہ رہا تھا۔ اگرچہ کاشف کی محبت میں کوئی کمی نہیں تھی۔ مگر دل پہ ہلکا سا بوجھ تھا۔ طیبہ مسکرا کر جھیل میں چلتی کشتیوں کو دیکھنے لگی تھی۔ سفر کے تمام دشوار پیچ و خم کہیں پیچھے رہ گئے تھے۔ ڈھیروں خوشیاں اور ہنستے مسکراتے رنگوں سے زندگی خوشگوار ہو گئی تھی۔

☼

سونیا نوید

عہدِ وفا

عرشی نے گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے تیزی کے ساتھ سامنے والی بلڈنگ کی طرف قدم بڑھائے۔ ساتھ ہی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا جو کہ ایک قطعی غیر ضروری عمل تھا۔ گھڑی دیکھے بنا ہی اسے پتا تھا کہ اسے دیر ہو چکی ہے۔ عرشی نے سن گلاسز آنکھوں پر سے ہٹا کر سر کے اوپر ٹکا لیے اور متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

ایک ہجوم تھا جو اس جگہ جمع تھا۔ سب اپنے شناسا چہروں کی تلاش میں کب سے یہاں آئے کھڑے تھے۔ یہ لاہور کے بین الاقوامی ایئر پورٹ کا وہ بیرونی حصہ تھا، جہاں مختلف پروازوں سے آنے والے مسافروں کے استقبال کے لیے ان کے دوست اور رشتہ دار جمع ہوتے تھے۔

عرشی کو یہ جان کر بے حد مایوسی ہوئی کہ لندن سے

ناولٹ
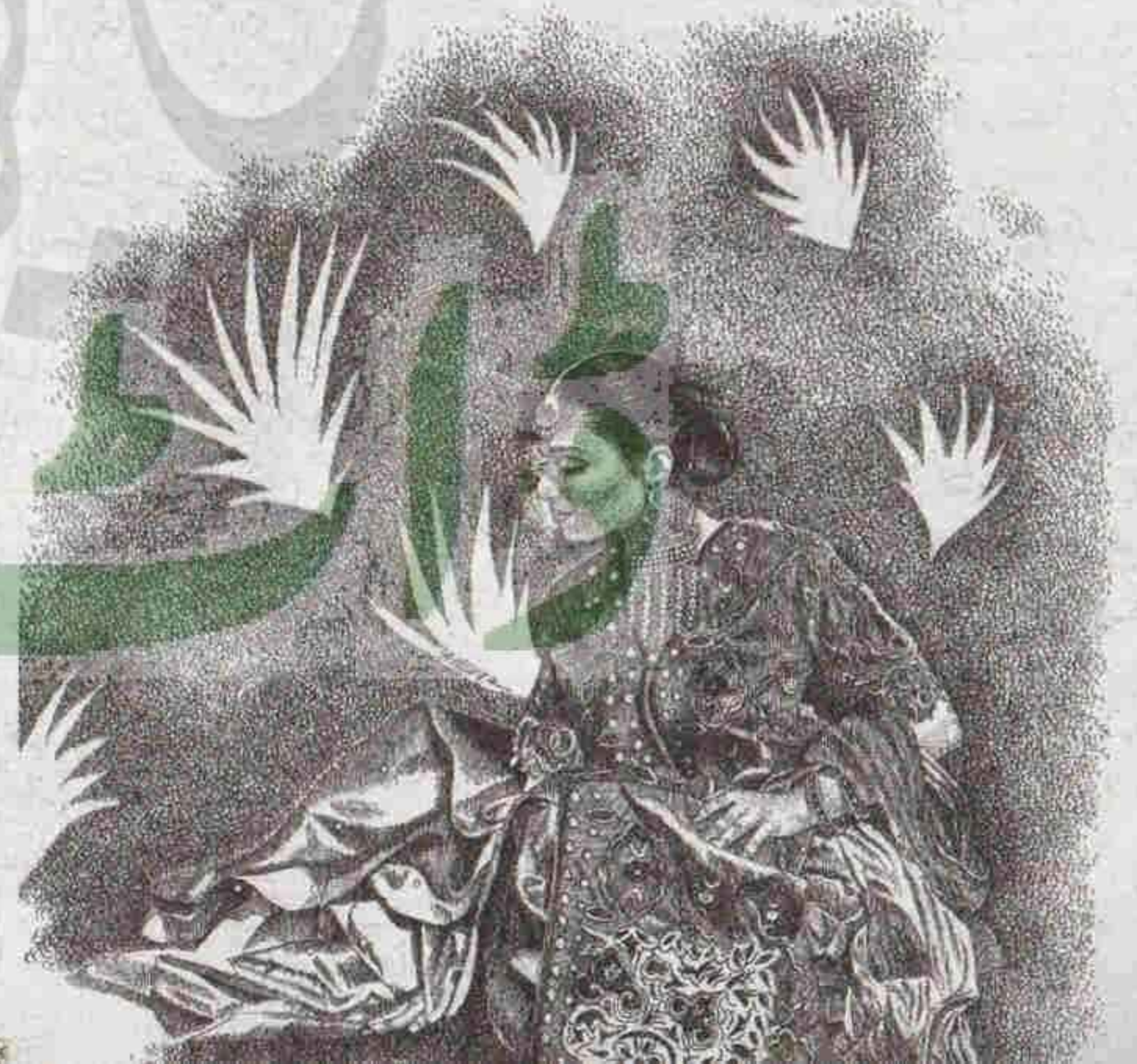
آنے والا جہاز نہ صرف لینڈ کر چکا ہے بلکہ جہاز سے اترنے والے مسافر بھی نکل کر جا چکے ہیں۔

سارا قصور عرشی کا اپنا تھا۔ یہ سوچ کر کہ بین الاقوامی پروازوں کے مسافر کون سا جلدی باہر آجاتے ہیں۔ وہ گھر سے ہی دیر سے نکلی تھی۔ شاید وہ پھر بھی وقت پہنچ جاتی اگر ایک سگنل پر پھرتیاں دکھاتے ہوئے بتی لال ہوجانے کے باوجود اس نے آگے نکل جانے کی کوشش نہ کی ہوتی اور نتیجے میں سائڈ سے آنے والی ایک سوزوکی سے نہ ٹکرا جاتی جس میں گھنی مونچھوں اور تنی بھنوؤں والے ایک کرنل صاحب بیٹھے تھے۔

بے شک۔ بروقت بریک لگا لینے کے باعث دونوں گاڑیوں کا بے حد معمولی نقصان ہوا تھا۔ مگر چونکہ لڑکی نے سگنل توڑ کر ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس لیے اس کی سزا بھی اسے لازمی ملنی چاہیے۔ یہ وہ موقف تھا جس سے اب کرنل صاحب صاحب ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔

آخر بیس منٹ کی بک بک جھک جھک کے بعد، ایک عدد ٹریفک کانسٹیبل کی موجودگی میں یہ معاملہ رفع دفع ہوا پر تب تک اتنی دیر ہو چکی تھی کہ ایر پورٹ پر لندن سے آنے والا ایک بھی مسافر باقی نہیں بچا تھا۔

"ستیاناس ہو اس بڈھے کا۔" عرشی نے نہایت بگڑے موڈ کے ساتھ اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کرنل کو کوسا جس کی وجہ سے اس کا ایر پورٹ کا چکر بے کار گیا تھا۔ باوجود اس کے کہ اب اسے کسی مقررہ وقت پر کہیں نہیں پہنچنا تھا، عرشی نے گاڑی کی رفتار وہی رکھی جو ایر پورٹ جاتے وقت تھی۔

وہ شروع ہی سے ایسی تھی۔ جلد باز اور پارہ صفت جو چاہے بس فوراً" مل جائے، لمحہ بھر کی بھی دیر نہ ہونے پائے۔

تھوڑی دیر بعد عرشی نے اپنی سیاہ رنگ کی ہنڈا اکارڈ بڑے سے آہنی گیٹ سے گزار کر چمکتے ماربل کے فرش والے پورچ میں لا کر کھڑی کی۔

لکڑی کا منقش داخلی دروازہ کھولا اور ایک کشادہ انٹرنس لابی میں داخل ہو گئی، جہاں سے گول چکر کھاتی سیڑھیاں اوپر کی منزل کو جا رہی تھیں۔ عرشی کے دائیں طرف جھاڑن ہاتھ میں لیے گھر کا ایک ملازم لابی میں سجی چیزوں کی صفائی میں مصروف تھا۔

"نوردین! حذیفہ کہاں ہے؟" عرشی نے گردپونچھتے ملازم سے دریافت کیا، عرشی کا اس گھر میں اتنی باقاعدگی کے ساتھ آنا جانا تھا کہ نہ تو یہاں کے کسی ملازم کے لیے وہ اجنبی تھی، نہ ہی کوئی ملازم اس کے لیے انجان۔

"حذیفہ یہاں ہے جناب۔" نوردین کے کچھ بھی کہنے سے پہلے عرشی کو اپنے سوال کا جواب کہیں اور سے موصول ہو گیا۔

عرشی نے فوراً" پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا جہاں سے حذیفہ اتر کر نیچے آرہا تھا۔

"ہیلو کزن! کیسی ہو؟" وہ اپنی شرٹ کا کف بند کرتا ہوا اس کے قریب آکر بولا۔

"میں ٹھیک ہوں اور تم؟"

"دیکھ لو! تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔" حذیفہ مسکرایا۔ اس کی پہنی ہوئی سفید شرٹ کہیں کہیں سے گیلی ہو کر جسم کے ساتھ چپک رہی تھی۔ سر کے بال بھی نم تھے۔ شاید وہ ابھی نہا کر نکلا تھا، جب ہی اتنا فریش لگ رہا تھا۔ نکھرے نکھرے سے حذیفہ کو اپنے سامنے دیکھ کر عرشی کو سارے دن کی کلفتوں کا اثر زائل ہوتا محسوس ہوا۔

"کہاں سے آرہی ہو اس وقت؟" وہ ایک بازو کا کف بند کر لینے کے بعد اب دوسرے کے ساتھ زور آزمائی کر رہا تھا۔

"ایر پورٹ سے؟" عرشی نے جواب دیا۔

"وہاں کیا کرنے گئی تھیں؟" حذیفہ نے چونک کر پوچھا۔ توجہ آستین کے گرفت میں نہ آنے والے ڈھیٹ بٹن سے ہٹ کر عرشی کی طرف ہو گئی۔

"تمہیں لینے۔"

"لیکن میں نے تو تمہیں ایر پورٹ پر نہیں دیکھا۔" وہ الجھ گیا۔

"مجھے پہنچنے میں تھوڑی دیر ہو گئی تھی، تم تب تک

وہاں سے جا چکے تھے۔" عرشی نے اسے بتایا۔

"پر تمہیں وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ڈرائیور آتو رہا تھا مجھے لینے۔"

"ایسے ہی، میرا دل کیا تمہیں سرپرائز دینے کو۔" عرشی نے کندھے اچکا کر لاپروائی سے کہا تو حذیفہ وہیں لابی کے بیچ کھڑا ہو کر اسے گھورنے لگا۔

"تم اور تمہارے سرپرائز، آخر تم کب سدھرو گی؟" عرشی کو گاڑی سیکھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ منع کرنے کے باوجود وہ کسی نہ کسی بہانے گاڑی لے کر اکیلی نکل جایا کرتی تھی۔

"اچھا بس، اب پلیز کوئی لیکچر مت دینا۔" عرشی نے اپنی چھوٹی سی ناک سکیڑ کر اکتائے لہجے میں کہا۔

"اب کیا یہیں لابی میں کھڑے رہنے کا ارادہ ہے یا اندر بھی چلو گے۔" وہ یہ کہہ کر ٹھک ٹھک کرتی اندر کی طرف چلی گئی تو حذیفہ کو بھی چاروناچار اس کے پیچھے جانا پڑا۔

ڈائننگ روم میں دانش علی ہمیشہ کی طرح اخبار پڑھنے اور ناشتا کرنے کا فریضہ بیک وقت انجام دے رہے تھے۔ ان کے پاس والی کرسی پر بیٹھی اسمارہ چائے دانی سے چائے کپ میں انڈیل رہی تھیں۔

"ہیلو ایوری باڈی!" عرشی نے حذیفہ سے دو قدم آگے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ حذیفہ سے تو وہ لابی میں ہی مل چکی تھی۔ اب اس ایوری باڈی میں دانش اور اسمارہ ہی رہ جاتے تھے۔

"ہیلو بیٹا! کیسی ہو؟ آؤ بیٹھو ہمارے ساتھ ناشتا کرو۔" اسمارہ نے آفر کی۔

"تھینک یو۔" عرشی نے بے تکلفی سے کہتے ہوئے اسمارہ کی برابر والی کرسی کھینچ لی۔ حذیفہ بھی اس سے مقابل آکر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کے درمیان رکھی لکڑی کی لمبی سی میز ناشتے کے لوازمات سے بجی تھی۔

"اچھا یہ بتاؤ، لندن میں کہاں کہاں گھومے؟" عرشی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"میڈم! میں لندن گھومنے نہیں بلکہ ڈیڈ کے کام سے گیا تھا۔"

وہ مسکرایا۔ "لیجیے رعنا خالہ بھی آگئیں۔" گلاس میں جوس ڈالتے حذیفہ نے رعنا کو دروازے سے اندر آتا دیکھ کر کہا۔

"آج تو اللہ کی رحمتیں برس رہی ہیں ہم پر۔ پہلے عرشی، اب رعنا خالہ۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"چائے لیں گی آپا؟" اسمارہ نے چائے دانی کو ہلا کر اس میں موجود چائے کی مقدار کا اندازہ لگاتے ہوئے رعنا سے پوچھا۔

"ہاں پلیز ایک کپ بنا ہی دو۔" رعنا نے اسمارہ سے کہا۔ پھر اپنا رخ عرشی کی طرف موڑتے ہوئے بولیں۔

"تم کب آئیں یہاں؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"

"مجھے بتا دیتیں، ہم دونوں ساتھ ہی آجاتے۔ میں سمجھی اپنے کمرے میں سو رہی ہو گی۔" رعنا نے کہا۔

"تم اپنی ممی کو بغیر بتائے چلی آئیں؟ بہت بری بات ہے۔" حذیفہ نے جوس پیتی عرشی کو چھیڑا۔

"تو ممی کون سا مجھے بتا کر آئی ہیں۔ ان کے حساب سے تو میں کمرے میں پڑی سو رہی ہوں۔" عرشی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"عرشی بیٹا! اس طرح بات نہیں کرتے۔" اسمارہ

نے عرشی کے لہجے کی ترشی اور اس کی وجہ سے رعنا کے چہرے کی معدوم ہوتی مسکراہٹ کو دیکھ کر اسے نرمی سے سمجھایا۔

"رہنے دو اسمارہ! اسے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ آج کل کے بچے بھی نا۔" رعنا اسمارہ کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے تاسف سے بولیں۔

میز کے سرے سے اخبار کے کاغذ پھڑپھڑائے اور ان کاغذات کی اوٹ میں سے دانش کا چہرہ برآمد ہوا۔ ابھی تک دانش نے ہر نئے آنے والے کو اخبار کا کونا ہٹا کر ایک خفیف سی استقبالیہ مسکراہٹ سے نوازنے کے علاوہ میز پر ہونے والی کسی گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا۔

"ہاں بھئی، تمہارا آج کے دن کا کیا پروگرام ہے۔" دانش نے اخبار کو تہ لگا کر سائیڈ پر رکھتے ہوئے حذیفہ سے پوچھا جو اپنے لیے گلاس میں اور جوس ڈال رہا تھا۔

"آج کا کوئی خاص پروگرام نہیں، کیوں آپ کو کوئی کام تھا؟" حذیفہ نے جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میں چاہ رہا تھا کہ تم دوپہر کے بعد تھوڑی دیر کے لیے آفس کا چکر لگاؤ، صبح میری ایک میٹنگ ہے اور شام میں اسمارہ کی ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ ہے، اسے وہاں لے کر جانا ہے۔" دانش نے کہا تو حذیفہ نے تشویش سے ماں کی طرف دیکھا، جو ہتھیلی پر رنگ برنگی گولیاں رکھے انہیں نگلنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اسمارہ کو گردوں کی بیماری تھی۔ لیکن ان کی خوش قسمتی یہ تھی کہ ان کی تکلیف شروع میں ہی پکڑی گئی۔ ورنہ عام طور پر اس بیماری کی ابتدائی علامات اتنی معمولی نوعیت کی ہوتی ہیں کہ جب تک لوگوں کو اس کا علم ہوتا ہے بیماری ہاتھ سے نکل چکی ہوتی ہے۔

"ارے تم بھی کیا اس کے پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔ پہلے دفتر کے کام سے باہر بھجوایا۔ اب وہ واپس آیا ہے تو آفس کے چکر لگوانے لگے ہو۔" رعنا بولے بنا نہ رہ سکیں۔ دانش سے عمر میں بڑی تھیں، اس لیے اکثر انہیں بلا جھجک ٹوک دیا کرتی تھیں، یہ الگ بات تھی کہ اپنے اسٹائل سے کٹے بال اور جدید تراش خراش کے ملبوسات کی بدولت وہ اپنی عمر کے چھپن برسوں سے کہیں کم دکھتی تھیں۔ دانش بھی جانتے تھے کہ وہ جو بھی کہتی تھیں۔ حذیفہ کی محبت میں کہتی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ حذیفہ اپنے ماں، باپ سے زیادہ رعنا خالہ کا چہیتا تھا۔

☼ ☼ ☼

حذیفہ نے گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر کے لاک کی اور لز کی عمارت کی طرف قدم بڑھائے۔

حذیفہ کی کلاس شروع ہونے میں ابھی وقت تھا۔ وہ ذرا پہلے آکر اپنے ایک ٹیچر سے اپنے پروجیکٹ کے بارے میں کچھ ڈسکشن کرنا چاہتا تھا۔ لز کے جس حصے میں وہ تھا وہاں پروفیسرز کے آفس وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ اس وقت حذیفہ کے علاوہ صرف ایک اور لڑکی اس لمبی سی راہ داری میں موجود تھی جو عمر اور حلیے سے اسٹوڈنٹ ہی لگ رہی تھی۔ وہ ہر دروازے پر لگی نیم پلیٹ کو پڑھتی ہوئی مخالف سمت سے حذیفہ کی طرف آرہی تھی۔ اس کی چھوٹی سی ہیل والی چپل اٹھنے والے ہر قدم کے ساتھ ٹک ٹک کر رہی تھی۔ آواز اتنی زیادہ نہیں تھی، مگر کوریڈور میں پھیلی خاموشی کی وجہ سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔

حذیفہ کا دھیان بے اختیار ہی اس لڑکی کے پیروں کی طرف چلا گیا۔ کالی پٹی والے سینڈل میں جکڑے، نیل پالش یا دوسری کسی بھی قسم کی آرائش سے عاری پاؤں حذیفہ کو بہت صاف ستھرے لگے۔ حذیفہ نے آج تک کسی کے پیروں پر دھیان نہیں دیا تھا۔ لیکن وہ اس لڑکی کے پیروں کو دیکھ رہا تھا اور یہ ایک بالکل غیر ارادی حرکت تھی جس کا اسے خود بھی احساس نہیں تھا۔ پھر شاید یہ اس کی نظروں ہی کا کمال تھا کہ چلتے چلتے اچانک اس لڑکی کا پیر مڑا اور وہ بری طرح سے لڑکھڑائی۔ خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھا کر قریبی دیوار کا سہارا لیا تو سینے سے چمٹی کتابیں دھڑ دھڑ کرتی زمین پر جا گریں۔ ان میں سے

ایک کتاب کھسکتی ہوئی حذیفہ کے قدموں تک آگئی۔ لڑکی زمین پر جھکی ایک ہاتھ سے اپنی بکھری ہوئی باقی ماندہ کتابیں سمیٹ رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے نیچے ڈھلک آنے والے دوپٹے کو واپس کندھے پر منتقل کرنے کی کوشش کر رہی تھی جب حذیفہ نے اپنے پاؤں کے پاس سے کتاب اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔

"شکریہ۔" لڑکی نے کتاب ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تو حذیفہ نے دلچسپی سے اس کے خفت سے سرخ پڑتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

"سنیے! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ڈاکٹر خاقانی کا کمرا کہاں ہے۔" حذیفہ نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا جب لڑکی نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"ڈاکٹر خاقانی کا آفس اس فلور پر نہیں ہے۔ یہاں سے اتر کر نیچے چلی جائیے۔" حذیفہ نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "گراؤنڈ فلور پر اسی جگہ کے بالکل نیچے جو کوریڈور ہے اس میں الٹے ہاتھ پر تیسرا کمرا ان کا ہے، باہر ان کا نام بھی لکھا ہے۔" حذیفہ نے اس کی رہنمائی کی۔

جانے یہ اس گھبرایا ہوا شرمندہ سا چہرہ تھا یا پھر اس کا سادہ حلیہ، پر وہ حذیفہ کو یہاں ہر سال آنے والی لڑکیوں کی کھیپ سے ذرا مختلف لگی۔ وہ کچھ دیر کھڑا ہو کر اسے ایک ہاتھ سے ریلنگ کا سہارا لیے اور دوسرے سے اپنی کتابیں سنبھالے سیڑھیوں سے سہج سہج اترتا دیکھتا رہا۔ ایک بار لڑکھڑا جانے کے بعد اب وہ بہت احتیاط کے ساتھ قدم اٹھا رہی تھی۔ اس کے بالوں کی لمبی سی چوٹی اس کی کمر پر جھول رہی تھی۔ حذیفہ نے بہت کم کسی لڑکی کے اتنے لمبے اور گھنے بال دیکھے تھے۔

"پہلے پاؤں، اب بال، حد ہو گئی۔" "وہ کیوں خوامخواہ ایک انجان لڑکی کو اتنی دیر سے گھور رہا تھا، جسے وہ جانتا ہی نہیں تھا۔" حذیفہ نے جھنجلا کر خود کو سرزنش کی تھی۔

☼ ☼ ☼

حذیفہ نے جب گاڑی ذیلی سڑک سے نکال کر مین روڈ پر ڈالی تو اس وقت تارکول کی لمبی سڑک آسمان پر جا بجا بادلوں کی ٹولیوں کی وجہ سے دھوپ چھاؤں حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ گاڑی کے بند شیشوں کی وجہ سے گو اس کا احساس نہیں ہو رہا تھا، مگر گاڑی سے باہر گزرنے والے درختوں کی ایک طرف کو جھکی شاخوں اور پودوں کو دیکھ کر پتا چل رہا تھا کہ باہر اچھی خاصی ہوا بھی چلنے لگی ہے جو آسمان پر بکھرے بادلوں کو یہاں سے وہاں دھکیل کر زمین پر پھیلی دھوپ چھاؤں کو بار بار اپنی جگہ بدلنے پر مجبور کر رہی تھی۔

حذیفہ سامنے کے منظر کو دیکھ کر قدرت کی فنکارانہ صلاحیتوں کا قائل ہو گیا۔ سڑک کے جن حصوں پر دھوپ تھی وہاں چمکیلا سنہرا پن تھا اور جہاں بادلوں نے سایہ کر رکھا تھا وہاں نیلگوں اداسی پھیلی تھی۔ ایک ہی منظر میں دو متضاد کیفیات یکجا کر دینا صرف اس خالق کائنات ہی کی صلاحیتوں کا معمولی سا حصہ تھا۔

پھر سڑک کے اداس پس منظر والے حصے میں وہ حذیفہ کو دور ہی سے ایک بس اسٹاپ پر کھڑی نظر آگئی۔

اس کی سرخ رنگ کی قمیص کا دامن ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا، جسے وہ بار بار ہاتھ سے برابر کر کے گھٹنوں کے ساتھ لگانے کی کوشش کر رہی تھی، پر ہوا کی منہ زوری اس کی اس کوشش کو زیادہ دیر تک کامیاب نہیں رہنے دے رہی تھی۔

حذیفہ نے گاڑی اس لڑکی کے پاس لے جا کر روکی۔ حذیفہ کے اس طرح گاڑی روکنے پر نہ صرف وہ لڑکی چونکی بلکہ کچھ فاصلے پر کھڑے وہ دو لڑکے بھی چوکنے ہو گئے جو اکیلی لڑکی کو کمپنی دینے کی غرض سے وہاں موجود تھے۔ دھوپ نہ ہونے کے باوجود آنکھوں پر سستے قسم کے سن گلاسز چڑھائے، کلائیوں میں ربڑ بینڈ جیسے ڈھیروں دھاگے لپیٹے اور شرٹ کے کھلے گریبانوں میں سے نظر آنے والی میل سے کالی ہوتی چینیں لٹکائے ہوئے دونوں کس قماش کے لڑکے تھے۔ اس کا اندازہ حذیفہ کو انہیں دور سے دیکھ کر ہی ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے گاڑی ان دونوں لڑکوں کو وہاں کھڑا دیکھ کر ہی روکی تھی۔ حذیفہ ان سڑک چھاپ لڑکوں کی

نفسیات کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔

"آؤ! میں تمہیں ڈراپ کردیتا ہوں۔" حذیفہ نے بٹن دبا کر شیشہ نیچے کرتے ہوئے لڑکی سے کہا۔

"جی نہیں شکریہ' میں خود چلی جاؤں گی۔" لڑکی نے دھیمے' مگر قطعی لہجے میں انکار کیا۔ حذیفہ کو اس انکار کی توقع نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں رہا۔

"تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔ میں وہی ہوں جس سے تم نے ڈاکٹر خاقانی کے آفس کے بارے میں پوچھا تھا۔" حذیفہ نے یاد دلایا۔

"مجھے یاد ہے' لیکن آپ کو تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود چلی جاؤں گی۔" وہ بدستور روکھے لہجے میں بولی۔

حذیفہ نے ایک نظر پیچھے کھڑے ان دونوں لڑکوں پر ڈالی جو ہمہ تن گوش ہوئے ان کی گفتگو سن رہے تھے' پھر نرمی سے کہا۔

"بس یا ویگن کا کچھ پتا نہیں' کتنی دیر کے بعد یہاں سے گزرے۔ تم جہاں کہوگی میں وہاں چھوڑ دوں گا' مگر اس وقت......"

"آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آرہا کہ مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔ خوامخواہ ہی پیچھے پڑے ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر جائیے یہاں سے۔" لڑکی حذیفہ کی بات کاٹتے ہوئے ترشی سے بولی۔

حذیفہ کا منہ سرخ ہوگیا۔ ایک ہی پل میں اس لڑکی نے اسے اور پیچھے کھڑے لڑکوں کو ایک ہی پلڑے میں ڈال کر تول دیا۔ ذرا سا بھی فرق محسوس نہیں ہوا اسے حذیفہ اور ان لفنگوں کی نیت میں جنہیں اکیلی لڑکی دیکھ کر اپنی قسمت آزمانے کا شوق چرایا تھا۔ حذیفہ نے اپنی ساری زندگی میں کبھی اتنی سبکی محسوس نہیں کی تھی' اس نے غصے کے عالم میں ایکسیلیٹر کو پیر سے دبایا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

موسم کا سنہرا پن ایک دم سے غائب ہوگیا۔ کہیں کہیں بکھری چمکیلی دھوپ گہرے بادلوں کی اوٹ میں جا چھپی۔ ونڈ اسکرین پر ٹپ ٹپ گرتے پانی کے قطروں نے بارش شروع ہونے کا اعلان کیا۔ حذیفہ نے گاڑی چلاتے ہوئے بیک ویو مرر میں دیکھا' وہ اب بس اسٹاپ پر نہیں کھڑی تھی' بلکہ تیز تیز قدموں سے سڑک کے کنارے چل رہی تھی اور اس کے پیچھے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے وہ دونوں لڑکے بھی۔

"بے وقوف لڑکی۔" حذیفہ نے گاڑی لال بتی پر کھڑی کرتے ہوئے بھنا کر سوچا۔

گاڑی کے سامنے والے شیشے پر سے وائپر مسلسل پانی صاف کررہے تھے۔ مگر پچھلے شیشے سے اب کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ نہ لڑکی' نہ ہی اس کا پیچھا کرتے لڑکے۔ حذیفہ کو بے چینی ہونے لگی۔ تھوڑی دیر میں سگنل سبز ہوجانے والا تھا اور حذیفہ کو یہاں سے آگے نکل جانا تھا۔ بتی لال سے پیلی ہوئی اور پھر سبز۔ حذیفہ کی گاڑی آگے بڑھی پر سیدھا جانے کے بجائے یوٹرن لے کر تیزی کے ساتھ واپس پلٹی۔

وہ واپس کیوں مڑا تھا۔ اسے خود بھی نہیں معلوم تھا۔ بس وہ اتنا جانتا تھا کہ وہ اس ضدی' ناسمجھ لڑکی کو بارش میں ان پیچھا کرتے ہوئے لڑکوں کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔

روڈ ون وے تھی۔ حذیفہ اب ساتھ والی سڑک پر مخالف سمت میں پیچھے کو جارہا تھا۔ تیزی کے ساتھ پانی صاف کرتے وائپروں کے درمیان سے وہ لڑکی اب اسے دوبارہ دکھائی دینے لگی۔ اس کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ تیز ہوچکی تھی۔ مگر اتنی نہیں کہ ان دونوں لڑکوں کو پیچھے چھوڑ سکے۔ وہ دونوں بھی اتنی ہی تیزی کے ساتھ قدم اٹھاتے اب اس کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔

کٹ پر پہنچ کر وہ پوری رفتار سے گاڑی کو موڑتا ہوا پہلی سڑک پر واپس لایا اور ان تینوں کے برابر لا کر اتنی زور سے بریک لگائے کہ سڑک پر ٹائروں کے نشان پڑ گئے۔ دونوں لڑکے حذیفہ کو دیکھ کر چھلانگ مار کے لڑکی سے پرے ہوگئے۔ لڑکی اب تک روہانسی ہوچکی تھی۔ حذیفہ کا جی چاہا کہ گاڑی سے اتر کر خود کو ہیرو سمجھنے والے ان لونڈوں کے منہ پر کس کر تھپڑ لگائے جو اکیلی

لڑکی کے سامنے شیر بنے ہوئے تھے اور اب اسے دیکھ کر دم دبا کر پیچھے ہٹ گئے۔

"بیٹھو اندر۔" لڑکوں کے منہ لگنے کے بجائے اس نے تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے لڑکی کو ڈپٹ کر کہا۔

اگلے ہی لمحے وہ لڑکی گاڑی کے اندر تھی۔ اب وہ اتنی کوڑھ مغز بھی نہیں تھی کہ ایک بار کی غلطی کو دوبارہ دہراتی۔ اپنی حماقت کا اندازہ تو اسے اس وقت ہوگیا تھا جب حذیفہ نے اسے وہیں چھوڑ کر گاڑی آگے بڑھائی تھی۔ وہ دونوں لوفر لڑکے جو کافی دیر سے اس کے پیچھے کھڑے کھسر پھسر کررہے تھے' اس کے انکار کو اپنی حوصلہ افزائی سمجھ کر قریب آگئے اور چھیڑ خانی کرنے لگے۔ ان کے بے ہودہ شعروں اور فقروں سے گھبرا کر اس نے چلنا شروع کردیا' پر وہ دونوں کم بخت بھی واہیات ترین گانے گاتے اس کے پیچھے ہولیے۔

لڑکی ابھی تک ڈری ہوئی تھی۔ اس کے گرد لپٹا دوپٹہ بارش سے بھیگ کر اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور جسم سردی سے کانپ رہا تھا۔ حذیفہ نے ہاتھ بڑھا کر ہیٹر آن کردیا۔

"میں مانتا ہوں کہ احتیاط اچھی چیز ہے' خاص طور پر لڑکیوں کے لیے' لیکن انسان میں اتنی صلاحیت تو ہونی چاہیے کہ وہ سامنے والے کی نیت اور خلوص کی گہرائی کو جانچ سکے۔" حذیفہ نے اپنی نظریں بھیگتی سڑک پر رکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

حذیفہ نے لحظہ بھر کو سڑک سے نظر ہٹا کر لڑکی کی طرف دیکھا جو سر جھکائے شرمسار سی بیٹھی تھی' پھر خود ہی اپنی کہی بات پر متاسف ہوگیا۔ شاید ایک نوعمر لڑکی کے لیے لوگوں کے خلوص کو پرکھنا اور ان کی نیتوں کا اندازہ لگالینا اتنا آسان کام نہیں تھا۔

"بائی دا وے! میرا نام حذیفہ ہے۔" اپنی پہلی کہی بات میں رچی تلخی کے اثر کو کم کرنے کے لیے جو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں آگئی تھی۔ حذیفہ نے اس بار لب و لہجہ دوستانہ رکھا۔

"اور تمہارا نام؟"

"جویریہ۔" لڑکی نے اپنے گیلے دوپٹے کو ہیٹر کی گرم ہوا سے سکھانے کی کوشش کرتے ہوئے ہولے سے کہا۔

"کلمز میں یہ پہلا کوارٹر ہے تمہارا؟" حذیفہ نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں۔ ایم بی اے کررہا ہوں۔" حذیفہ نے گاڑی موڑتے ہوئے اسے بتایا۔ وہ خاموش رہی۔ اس نے یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ حذیفہ کے بارے میں یہ سب پہلے سے جانتی تھی۔

نیا یا پرانا۔ ایسا شاید ہی کوئی تھا جو حذیفہ دانش علی سے واقف نہیں تھا۔ آدھے سے زیادہ طلبا اس کے دوست تھے اور باقی اس سے دوستی کے خواہاں۔

گاڑی اب اچھی خاصی گرم ہوچکی تھی' اتنی کہ حذیفہ کو الجھن ہونے لگی' مگر اس نے ہیٹر بند نہیں کیا' کیونکہ برابر والی سیٹ پر بیٹھی بھیگی ہوئی لڑکی کو اس کی گرمائش سے سکون مل رہا تھا۔

"تمہارا گھر کس طرف ہے؟" حذیفہ نے ایک ہاتھ سے گیئر بدلا۔

"جی؟"

"میرا مطلب ہے' تمہیں کہاں ڈراپ کروں۔" حذیفہ نے وضاحت کی۔

"مجھے.... بس یہیں اتار دیجیے۔" اس نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اب ایک خاصی مصروف سڑک پر آچکے تھے' جس پر اچھی خاصی تعداد میں بسیں اور ویگنیں آجا رہی تھیں۔

"یہاں اترنے کی ضرورت نہیں' تمہیں جہاں جانا ہے میں تمہیں وہاں چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں! میں یہاں سے خود چلی جاؤں گی۔" اس نے سہولت سے انکار کیا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔"

حذیفہ نے گاڑی سائیڈ پر لا کر کھڑی کی۔ لڑکی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور قریبی بس اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی' جہاں ایک بس مسافروں کو سوار کرنے کے

لیے رکی ہوئی تھی۔ گاڑی سے لے کر بس تک کا مختصر سا فاصلہ طے کرنے میں اس کے ہیٹر سے سکھائے دوپٹے کو بارش کے قطرے ایک بار پھر بھگونے لگے۔

حذیفہ کو یاد آیا کہ جس دن وہ پہلی بار اس لڑکی سے ملا تھا' اس دن بھی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی' بس ایک عام سا اتفاق تھا' لیکن بعض باتیں عام سی ہونے کے باوجود بہت خاص لگنے لگتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

اس کا پورا نام جویریہ ندیم تھا اور وہ لمز کے نئے شروع کیے جانے والے ناپ پروگرام کے تحت ایڈمیشن لے کر یہاں پہنچی تھی۔ Nop یعنی National out reach programme ملک کے چھوٹے شہروں میں بسنے والے ان طلبا کو اعلا تعلیم کا موقع فراہم کرتا تھا جو ذہین ہونے کے باوجود مالی طور پر غیر مستحکم ہونے کی وجہ سے لمز جیسی یونیورسٹی میں پڑھنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ جویریہ بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔ وہ راہوالی کی رہنے والی تھی اور لاہور میں اس کی رہائش گرلز ہاسٹل میں تھی۔

اس دن کے بعد حذیفہ نے اسے یونیورسٹی میں کئی جگہ دیکھا' کبھی لائبریری میں نوٹس بناتے ہوئے' کبھی پیپر کپ میں بھری چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے یا پھر اپنا رنگ برنگے موتیوں اور سیپیوں سے سجا بیگ کندھے پر لٹکائے یوں ہی یہاں سے وہاں آتے جاتے ہوئے۔ ہمیشہ سر جھکائے' خاموش اور اکیلی' اس کا یہی اکیلا پن حذیفہ کو اس کی طرف متوجہ کرنے کا سبب بنا تھا۔

کلاسیں شروع ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ اب تک نئے داخل ہونے والے لوگوں کی بھی ٹولیاں اور گروہ بن چکے تھے۔ ان لوگوں میں بھی دوستیاں ہو چکی تھیں جو پہلے ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملے تھے۔ پر وہ ہنوز اکیلی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ اس کی اپنی کلاس میں تقریباً سب ہی کے ساتھ ہیلو ہائے تھی۔ اکھڑ مزاج بھی وہ نہ تھی۔ حذیفہ نے اسے جب بھی دیکھا' مہذب انداز میں ہی بات کرتے دیکھا۔ ذہانت' شائستگی' یہاں تک کہ ایک پرکشش شخصیت سب کچھ تو تھا اس کے پاس' پھر کیا وجہ تھی کہ وہ اب تک ایک بھی دوست نہیں بنا پائی۔

رفتہ رفتہ حذیفہ کو احساس ہوا کہ جویریہ کے اس اکیلے پن کی وجہ کوئی اور نہیں بلکہ وہ خود ہے۔ جب بھی کسی نے پڑھائی سے ہٹ کر کسی ایکٹوٹی میں اسے شامل کرنا چاہا یا اکٹھے مل کر اڑائی جانے والی کسی دعوت میں بلانا چاہا' اس نے سہولت سے انکار کر دیا۔ سوائے ٹیچرز کے دیے ہوئے ان پروجیکٹس پر جہاں اسے لازمی طور پر مل کر گروپ کے ساتھ کام کرنا پڑتا' وہ زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتی تھی۔

"ہوتے ہیں کچھ لوگ اس طرح کے بھی۔" حذیفہ نے سوچا۔ "اپنے آپ میں گم رہنے والے رزرووڈ سے۔"

وہ بھی ان میں سے ایک تھی۔ اور اگر تھی تو حذیفہ کو اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ مگر اسے فرق پڑ رہا تھا۔ کیوں پڑ رہا تھا؟ یہ وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس سے پہلے چاہے یہاں پر کسی نے گروہ بندی کی ہو یا اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی ہو' حذیفہ نے کبھی دھیان دینے کی زحمت نہیں کی تھی تو پھر اب کیوں؟ کیا وجہ تھی کہ اس لڑکی کا اکیلا پن اسے اچنبھا لگا تھا۔

کبھی کبھار حذیفہ کے دل میں بے تکی سی خواہش ابھرتی کہ وہ جویریہ کی جمود بھری زندگی میں کچھ ایسی ہلچل پیدا کرے کہ وہ پھر سے کبھی اپنی ساکت حالت میں واپس نہ جا سکے۔

☼ ☼ ☼

موبائل کی بیپ بہت دیر سے بج رہی تھی۔ عرشی نے پرس کی زپ کھول کر موبائل تلاش کرنے کی کوشش کی۔

"ہیلو۔" عرشی نے فون کان سے لگایا۔

"عرشی! تم کہاں ہو۔" دوسری طرف سے رعنا کی جھلائی ہوئی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

"میں اس وقت بیوٹی پارلر میں ہوں' کیوں آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"تم بھی حد کرتی ہو' میں نے تم سے کہا تھا کہ ہم لوگوں کو یتیم بچوں میں تحائف تقسیم کرنے جانا ہے۔ تم پھر بھی پارلر چلی گئیں۔ منیر باقر اور مسز ترمذی کب سے آئی بیٹھی ہیں۔ صرف تمہارا انتظار ہے۔ فوراً گھر پہنچو۔" انہوں نے حکم دیا۔

"سوری ممی! میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے ان کاموں میں کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ کرنا چاہتی ہیں غریبوں کی مدد تو ضرور کیجیے۔ آپ کے لیے اچھی ایکٹوٹی ہے۔ مگر میری اور بھی مصروفیات ہیں۔ میں بالکل نہیں آسکتی۔" عرشی نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا تو رعنا چپ رہ گئیں۔

"آج آجاؤ بیٹا! وہاں پریس فوٹو گرافرز بھی آئے ہوں گے۔" رعنا نے عرشی کی بے زاری بھانپ کر اپنا لہجہ نرم کر لیا اور اسے ساتھ لے کر جانے کا اصل مقصد بھی بیان کیا۔

رعنا ان بے شمار خواتین میں سے تھیں جو وقت کی فراغت اور وسائل کی فراوانی کے باعث فلاحی کاموں میں مصروف تھیں۔ اب اگر رعنا کی نیت میں تھوڑی سی خود غرضی کا عنصر شامل تھا تو کون سی بڑی بات تھی۔ اہم بات تو یہ تھی کہ اپنا مطلب پورا کرنے کی غرض سے ہی سہی وہ کچھ ضرورت مندوں کا بھلا بھی تو کر ڈالتی تھیں۔

شوہر کے انتقال کے بعد سے تو یہ مشغلہ ان کی پسندیدہ ترین مصروفیت بن چکا تھا۔ لیکن ہزار کوشش کے باوجود وہ عرشی کو اس کام کی طرف راغب نہ کر سکیں۔ وہ عجیب من موجی لڑکی تھی۔ موڈ ہوا تو رعنا کی مدد کروا دی۔ نہ ہوا تو صاف انکار۔

"کوشش کر کے تھوڑی دیر کے لیے آجاؤ بیٹا! ہم تمہارا انتظار کر لیتے ہیں۔" رعنا نے ایک بار پھر سے اسے راضی کرنے کی کوشش کی۔

"آپ میرا بالکل انتظار مت کیجیے' مجھے کم از کم دو گھنٹے اور لگ جائیں گے یہاں۔" عرشی نے اپنے سامنے لگے بڑے سے شیشے میں پیچھے کھڑی لڑکی کا عکس دیکھتے ہوئے کہا جو مہارت کے ساتھ عرشی کے بالوں کی لٹیں پکڑ کر انہیں سلور پنی والے کاغذ میں لپیٹ رہی تھی۔ ابھی بمشکل دو چار لٹیں ہی پنی کی تہوں میں چھپی تھیں' باقی سب بال ابھی رہتے تھے۔

"اور بالفرض اگر میں جلدی فارغ ہو بھی گئی تو میرا کسی یتیم خانے جانے کا بالکل موڈ نہیں۔ اس لیے آپ لوگ پلیز میرے بغیر ہی چلی جائیں۔" عرشی نے کورا جواب دیتے ہوئے فون بند کر کے واپس پرس کے اندر پھینک دیا۔

یہ شہر کا مشہور ترین پارلر تھا۔ بے حد مہنگا اور اس سے بھی زیادہ مصروف۔ دیوار گیر آئینوں کے سامنے لگی کرسیوں میں سے ایک بھی خالی نہ تھی۔ ہر ایک کرسی کے پیچھے حالات کی ستائی کوئی نوجوان لڑکی قینچی یا برش پکڑے ہمہ وقت متحرک رہتی۔ اپنی گھریلو اور ذاتی پریشانیوں کو روزانہ گھر سے پہن کر آئے کپڑوں کی طرح پارلر کے پیچھے والے حصے میں بنے ورکرز ڈریسنگ روم میں اتار کر' جسم پر صاف یونیفارم اور ہونٹوں پر شفاف مسکراہٹ سجا کر یہ لڑکیاں پارلر کے اندر قدم رکھتی تھیں اور پھر یہی لڑکیاں جن کو اپنے خود کے بال سنوار کر سیدھی سادی چوٹی کی صورت میں باندھ لینے کا وقت بھی مشکل سے ملتا تھا' سارا دن اپنے ماہر ہاتھوں سے سامنے بیٹھی بیگمات کے بالوں کے منفرد اور انوکھے ہیئر اسٹائل بنانے میں مصروف رہتیں۔ ایسی ہی ایک لڑکی نے کنگھی کے نوک دار حصے کی مدد سے عرشی کے بالوں کی ایک اور لٹ احتیاط سے اٹھائی اور اسے چمک دار پنی میں لپیٹنے کی تیاری کرنے لگی۔ اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اسے ملنے والی تنخواہ اور یہاں تک کہ اس کی نوکری کا دارومدار بھی اس بات پر ہے کہ وہ اپنا کام کتنی صفائی اور مہارت کے ساتھ کرتی ہے۔

عرشی نے اپنا وقت گزارنے کے لیے سامنے پڑا

فیشن میگزین اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

حذیفہ نے سبز مخملیں گھاس پر قدم رکھتے ہوئے گہرا سانس لے کر اردگرد پھیلی ہریالی بھری تراوٹ کو اپنے اندر اتارا۔ اس کے نزدیک قدرت کی عطا کردہ نعمتوں سے لطف اندوز ہونا ہی ریلیکس کرنے کا بہترین طریقہ تھا۔ اس کو جب بھی موقع ملتا وہ تھوڑا سا وقت کسی باغ یا پارک میں جا کر گزار کر آتا۔

موسم بدل چکا تھا۔ ٹھنڈ اچھی خاصی بڑھ گئی تھی۔ حذیفہ کافی دیر تک باغ جناح کی نرم گھاس پر چہل قدمی کرتا رہا۔ ایک سستی اور مفت تفریح جس کی افادیت کو گھر بیٹھ کر کمپیوٹر، ٹی وی اور ڈی وی ڈیز میں بوریت کا حل ڈھونڈنے والے نہیں سمجھ سکتے تھے۔

حذیفہ چلتے چلتے وہاں تک آ گیا جہاں ایک اونچے پیڑ کے موٹے سے تنے کے قریب بیٹھی لڑکی ہاتھ میں کتاب لیے کچھ پڑھنے میں مصروف تھی۔ اسے دیکھ کر حذیفہ کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ عود آئی۔ اس لڑکی کو کتابوں سے عشق لگتا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی کلاس کے علاوہ حذیفہ کو وہ لائبریری کے آس پاس ہی منڈلاتی نظر آیا کرتی تھی۔ اب یہاں آئی تو بھی کتاب ساتھ لے آئی۔

"کہتے ہیں اس کتاب کو ایک بار کھول لینے کے بعد ختم کیے بنا چھوڑ دینا مشکل ہے۔ میں نے بھی اسے ایک ہی نشست میں مکمل کیا تھا۔" حذیفہ اس کے قریب پہنچ کر بولا تو کرنل محمد خان کی بجنگ آمد میں منہ دیے بیٹھی جویریہ ایک دم سے اچھل پڑی۔

اس وقت اس نے گہرے نیلے رنگ کے گرم سوٹ کے اوپر سرخ رنگ کا سویٹر پہنا ہوا تھا۔ جس کا کچھ حصہ سوٹ کے ہم رنگ اوڑھی چادر کے نیچے سے دکھ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی سی ناک اور گال دھوپ کی تمازت سے سرخ ہو رہے تھے۔ اس کے ہلکے اور گہرے براؤن رنگ کے امتزاج والے بال ہمیشہ کی طرح چٹیا کی شکل میں بندھے ہوئے تھے، جن میں سے دو ریشمی لٹیں پھسل کر اس کے چہرے پر آ رہی تھیں۔ عرشی دیکھ لیتی تو صدمے سے فوت ہو جاتی کہ جس شیڈ کو حاصل کرنے کے لیے اس نے چند دن پہلے ہزاروں روپے خرچ کیے تھے، وہ جویریہ کے بالوں کا قدرتی رنگ ہے۔ اس کی آنکھیں بھی بالوں کی ہم رنگ تھیں۔ ہلکی براؤن سنہری پن کی لو دیتی ہوئی اور وہ اس وقت انہی آنکھوں میں دنیا جہان کی حیرت سموئے حذیفہ کو تک رہی تھی۔ حذیفہ کے اس طرح اچانک مخاطب کرنے پر جویریہ کے قریب ہی چادر پر کروٹ کے بل لیٹا ادھیڑ عمر شخص بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"معاف کیجیے گا، میں نے شاید آپ لوگوں کو ڈسٹرب کر دیا۔" حذیفہ نے شرمندہ لہجے میں کہا۔ نہ جانے اسے یہ شخص پہلے کیوں نہیں نظر آیا تھا۔ شاید یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اتنا ہی دیکھتا ہے جتنا وہ دیکھنا چاہتا ہے۔

"یہ حذیفہ ہیں بابا! یہ بھی المز میں ہوتے ہیں۔"

"اچھا ... اچھا کھڑے کیوں ہو بھئی۔ آؤ بیٹھو ہمارے ساتھ۔" جویریہ کے والد اس کے بارے میں جان لینے کے بعد بشاشت سے بولے۔

"مجھے ندیم اسلم کہتے ہیں۔" حذیفہ کے بیٹھنے کے بعد جویریہ کے والد نے بھی اپنا آدھا ادھورا تعارف مکمل کرایا۔ "جویریہ کے کلاس فیلو ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ میں اس سے کافی سینئر ہوں۔ ایم بی اے کر رہا ہوں۔" حذیفہ بتایا۔

"ہوں... بہت ... خوب۔" ندیم صاحب بولے۔ "ارے جویریہ! اپنے دوست کو کچھ کھلاؤ پلاؤ تو سہی۔" انہوں نے جویریہ کی طرف رخ کر کے کہا جو خاموشی سے چادر کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

جویریہ نے پاس رکھے شاپر میں سے کھانے پینے کی اشیا نکالنی شروع کیں۔ چیزیں نکالنے کے دوران وہ بار بار چہرے پر آنے والی لٹوں کو کانوں کے پیچھے پھنسا کر قید کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ پھر سے پھسل کر گالوں پر آ گرتیں۔

"آپ غالباً" راہوالی میں ہوتے ہیں؟" حذیفہ نے جویریہ پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا، اسے معلوم تھا کہ چھٹی والے دنوں میں جویریہ اکثر اپنے گھر راہوالی چلی جاتی ہے۔

"غالباً" نہیں یقیناً"۔" ندیم صاحب نے جواب دیا۔ "اور تمہاری رہائش کہاں ہے؟"

"میں تو یہیں لاہور میں رہتا ہوں۔" حذیفہ نے بتایا۔

"ہوں۔" ندیم صاحب نے اسے غور سے دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر بجنگ آمد اٹھالی جسے جویریہ نے حذیفہ کے آنے پر نیچے رکھ دیا تھا۔

"تو کیا کہہ رہے تھے تم! کہ تم نے اس کتاب کو ایک ہی نشست میں ختم کیا تھا۔" وہ کتاب کے اوراق پلٹتے ہوئے بولے۔ "کبھی میرا بھی یہی طریقہ ہوا کرتا تھا کسی اچھی کتاب کو ختم کیے بنا چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب تو آدھے پونے گھنٹے سے زیادہ کچھ پڑھ لوں تو سر دکھنے لگتا ہے حالانکہ یہ میری پسندیدہ ترین کتابوں میں سے ایک ہے، کئی بار پڑھ چکا ہوں پھر بھی جب کبھی موڈ بنتا ہے۔ کہیں سے کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ آج بھی ساتھ اسی لیے لایا تھا کہ اچھے موسم میں اچھی کتاب کا ساتھ ہو گا تو تفریح کا مزا دوبالا ہو جائے گا پر وہ جو کہتے ہیں ناکہ عمر کے ساتھ انسان کی عقل بھی کم ہو جاتی ہے، بالکل صحیح کہتے ہیں اب دیکھو اتنی دور سے کتاب تو اٹھا کر لے آیا مگر چشمہ گھر بھول آیا ہوں۔ اسی لیے جویریہ کی ڈیوٹی لگائی ہوئی ہے کہ پڑھ کر سنائے اب تو یہ بھی بے چاری تھک گئی ہے۔" ندیم صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لائیے! اس سے آگے میں پڑھ کر سناتا ہوں۔" حذیفہ نے کتاب ندیم صاحب کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ "کہاں سے شروع کروں؟"

"جہاں سے دل کرے شروع کر دو۔ لیکن پہلے تم کچھ لو تو سہی۔" ندیم صاحب نے ان بسکٹوں اور سینڈوچ وغیرہ کی طرف اشارہ کیا جو جویریہ نے شاپر سے نکال کر سامنے رکھے تھے۔

"جی نہیں، میں اس وقت کچھ نہیں لوں گا۔" حذیفہ نے منع کر دیا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی پی سی سے کافی کچھ کھا پی کر آیا تھا جہاں اسے دانش ایک میٹنگ میں لے گئے تھے۔ میٹنگ کے بعد دانش گھر کے لیے نکل گئے جبکہ حذیفہ یہاں آ گیا۔

"کچھ نہ کچھ تو تمہیں چکھنا ہی پڑے گا، ورنہ ہم بھی تم سے کچھ نہیں سنیں گے۔" ندیم صاحب نے دھونس جمائی تو حذیفہ ہنس پڑا۔

"چلیے! آپ کے کہنے پر یہ لے لیتا ہوں۔" حذیفہ نے سامنے رکھا ایک چاکلیٹ بسکٹ اٹھا لیا۔

"بابا! آپ بھی تو کچھ کھا لیجیے۔" پاس سے ہی جویریہ کی آواز ابھری۔

"نہیں۔ اس وقت دل نہیں کر رہا۔" ندیم صاحب نے کہا۔

"پلیز بابا! بس ایک سینڈوچ۔" کچھ تو تھا جویریہ کے ملتجی انداز میں جس نے حذیفہ کو متوجہ کیا، اس نے غور سے ندیم صاحب کی طرف دیکھا۔

وہ پینتالیس اور پچاس کی درمیانی عمر کے دبلے پتلے آدمی تھے جن کے بالوں میں اب سیاہی کی جگہ سفیدی کا رنگ نمایاں ہو رہا تھا۔ لیکن یہ ندیم صاحب کے بالوں میں جابجا چھلکتی سفیدی نہیں بلکہ ان کی نقاہت تھی جو حذیفہ کو پہلی نظر میں ہی کھٹکی تھی۔ یہ وہ دبلا پن نہیں تھا جو انسان میں قدرتی طور پر ہوتا ہے بلکہ اس ناتوانی کے آثار تھے جو کسی بیماری کے بعد کمزوری کی شکل میں انسانی جسم پر وارد ہوتا ہے۔ ندیم صاحب کو کیا مرض لاحق تھا، یہ حذیفہ کو نہیں پتا تھا لیکن جویریہ کی پریشانی کو وہ سمجھ سکتا تھا، یہی پریشانی دانش اور خود اس کے اپنے چہرے پر بھی عود آتی تھی جب کبھی اسمارہ کی طبیعت ذرا سی بھی خراب ہو جاتی تھی۔

حذیفہ نے ہاتھ میں پکڑا بسکٹ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

"اگر آپ نہیں کھائیں گے تو میں بھی کچھ نہیں کھاؤں گا اور نہ ہی آپ کو کتاب پڑھ کر سناؤں گا۔"

"واہ برخوردار! ہمارا داؤ ہم ہی پر چلا رہے ہو۔

بہت چالاک ہو"وہ ہنسے۔

حذیفہ نے تین پیپر پلیٹس میں ایک ایک سینڈوچ اور دو بسکٹ نکال کر رکھے۔

"تم نے تو راشن کارڈ پر ملنے والے سامان کی طرح مال بانٹا ہے۔" ندیم صاحب یہ برابر کی تقسیم دیکھ کر خوب محظوظ ہوئے۔ وہ آدمی مزے دار تھے۔ زندہ دل اور خوش مزاج۔ منٹوں میں یوں بے تکلف ہو جانے والے جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔(یہ جویریہ پتا نہیں کس پر چلی گئی تھی؟)

"تم نے شرطیں ہی اتنی کڑی رکھ دی ہیں کہ اب تو کھانا ہی پڑے گا۔" ندیم صاحب نے ہار مانتے ہوئے پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ اب جب تک میں کرنل صاحب کو موصل سے قاہرہ پہنچاتا ہوں' آپ یہ سب کچھ ختم کیجیے۔" حذیفہ نے کتاب کھولتے ہوئے ان سے کہا۔

☆ ☆ ☆

جویریہ نے سرمئی رنگ کی گرم شال کو جس کے بارڈر پر نہایت باریک بیل کڑھی ہوئی تھی' اپنے گرد اچھی طرح سے لپیٹا۔ اس کا پسندیدہ ترین موسم تھا۔ اسے اچھا لگتا تھا جب صبح سویرے گھاس پر شبنم کے قطروں کی تہہ یوں جمی ہوئی ملتی جیسے کوئی رات میں سبزے پر چاندنی کا چھڑکاؤ کر گیا ہو۔

صبح کے وقت اوس کی سفیدی اوڑھ کر لیٹے سبزے پر ٹھہری دھند کے پردے میں سے لمز کی لال اینٹوں والی پُر شکوہ عمارت عجیب پُر اسرار سی دکھتی۔ پھر دھوپ چڑھنے کے ساتھ جہاں زمین پر پڑی اوس غائب ہونے لگتی وہیں یونیورسٹی کے ماحول پر چھائی پُر اسراریت اور خاموشی کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔ جگہ جگہ اس ماحول میں رنگ و رعنائی بھرتے ہوئے طلباء طالبات کے غول در غول دکھائی دینے لگتے۔ سکوت کی جگہ آوازوں اور قہقہوں کا شور چہار سو بکھرنے لگتا۔

جویریہ نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کرتے ہوئے اپنا بھاری بیگ ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل کیا' اس بیگ میں اس کا موٹا سا رجسٹر رکھا ہوتا تھا' وہ ان طلبا میں سے تھی جو لیکچر کے دوران استاد کی ہر بات نوٹ کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ جنہیں ذہین ہونے کے باوجود اپنے حافظے پر مکمل اعتماد نہیں ہوتا۔

ڈائننگ سینٹر کے باہر اسٹوڈنٹس کا رش لگا ہوا تھا۔ ہنستے مسکراتے' بے فکرے نوجوان لڑکے لڑکیاں جو جویریہ جیسی لڑکیوں کی پالی بے اعتمادیوں سے کوسوں دور تھے اور ان سب کے درمیان' ان سب میں نمایاں اور سب سے منفرد حذیفہ دانش علی تھا جو اپنے دونوں ہاتھوں کو کالی لیدر جیکٹ کی جیبوں میں گھسائے کسی بات پر بے ساختہ ہنس رہا تھا۔ حذیفہ ان لوگوں میں سے تھا جن پر قدرت دل کھول کر مہربان ہوتی ہے' جو ذہانت اور وجاہت کا مرکب ہوتے ہیں' جو جہاں بھی جائیں سب کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں' ان کی ستائش کے حق دار ٹھہرتے ہیں جن کو نظر انداز کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت اپنا آپ منوا کر ہی رہتے ہیں۔

ایک طرف حذیفہ' زندگی سے بھرپور' باصلاحیت اور بے مثال' مجمع میں کھڑا ہوا بھی دور سے دکھائی دے جائے اور دوسری طرف وہ ...جویریہ ندیم' خاموش' سنجیدہ اور غیر اہم جو اپنے کندھے سے لٹکتے بیگ کے اسٹریپ کو مضبوطی سے تھامے ڈھیر سارے ہنستے مسکراتے طلبا کے بیچ میں سے گزر کر نکل گئی اور کسی کو پتا بھی نہیں چلا۔

☆ ☆ ☆

پڑھائی اپنے معمول کے مطابق جاری تھی۔ ساتھ میں غیر نصابی سرگرمیاں بھی اپنے عروج پر تھیں۔ ایسے میں ڈرامہ فیسٹیول کی آمد نے طلبا کے جوش و خروش میں اور بھی اضافہ کر دیا۔

جویریہ ان ساری سرگرمیوں سے دور ہی رہا کرتی تھی مگر اس دفعہ ایک انگریزی پلے کے دیسی ورژن والے ڈرامے میں اس کا بھی چھوٹا سا رول تھا جسے

علاقائی رومان کا رنگ دے کر پیش کیا جا رہا تھا۔ یہ رول بھی اس کے سر زبردستی منڈھا گیا تھا۔ اس نے ہر طرح کا بہانہ گھڑ کر اس سے بچنے کی کوشش کی مگر خدیجہ نے اس کی ایک نہ چلنے دی' خدیجہ' جویریہ کی کلاس فیلو اور ڈرامہ سوسائٹی کی سرگرم عمل ممبر تھی۔

"مگر مجھے تو بالکل ایکٹنگ نہیں آتی۔" جویریہ نے ہر طرح سے جان چھڑانے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد کہا۔

"تمہیں ایکٹنگ کرنی بھی نہیں ہے۔ تم ہمارے ڈرامے کی دلہن ہو۔ تمہیں بس دس منٹ تک آنکھیں نیچی کرکے چپ چاپ بیٹھے رہنا ہے۔ نہ کوئی ڈائیلاگ نہ کوئی مومنٹ۔ اس سے زیادہ سمپل رول تو ہو ہی نہیں سکتا۔" خدیجہ نے اسے تسلی دی۔

"تم پلیز کسی اور کو دلہن بنالو۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔"

"ہرگز نہیں۔ ہمیں پٹھان دلہن چاہیے اور تمہارا رنگ روپ بالکل پٹھانوں والا ہے۔ دلہن تو تم ہی ہوگی۔" خدیجہ نے قطعی لہجے میں کہہ کر بات ختم کردی۔

خدیجہ نے ٹھیک کہا تھا۔ ڈرامے والے دن تھوڑی پر آئی لائنر کی مدد سے تلوں کا تکون بنائے وہ سچ مچ کی پٹھان لگ رہی تھی۔ اس کے گلے اور بازوؤں میں چاندی کے زیورات لدے تھے۔ ایک بھاری سا چاندی کا سیٹ خدیجہ نے پنوں کی مدد سے اس کے ماتھے پر بھی ٹانگ دیا جس کی لڑیاں بار بار ڈھلک کر جویریہ کی آنکھوں پر آجاتی تھیں۔

"آج کل کون سی پٹھانی ایسے کپڑے اور زیور پہن کر شادی کرتی ہے؟" آنکھوں پر پھسل آنے والے سیٹ کو چوتھی بار ہاتھ سے اوپر کرتے ہوئے جویریہ نے زچ ہو کر کہا۔

"ہمارے ڈرامے کی دلہن پہنتی ہے۔ ایک منٹ ہلنا مت گواب نہیں گرے گا۔" خدیجہ نے بھاری سیٹ میں دو تین پنیں اور گھسا کر اسے جویریہ کے سر کے ساتھ مضبوطی سے جمادیا۔

"بس تیار رہو پانچ منٹ میں تمہاری انٹری ہے۔"

خدیجہ یہ ہدایت دے کر اس طرف چلی گئی جہاں ڈرامے کے ابتدائی سین کے اداکار پختونوں والی شلواریں پہنے اور سر پر اونچے شملے باندھے اسٹیج کے پاس کھڑے تھے۔

جویریہ کا رول واقعی سیدھا سادہ سا تھا' اسے صرف سر جھکا کر دس منٹ تک اسٹیج پر رکھے گاؤ تکیوں اور ڈھیر سارے کشنز کے درمیان سہیلیوں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے بیٹھنا تھا۔ اس کے باوجود جویریہ کے دل میں اپنے رول کو لے کر طرح طرح کے واہم آرہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس رول میں بھی گڑبڑ کرنے کا اعلا ریکارڈ قائم کرے گی جس میں گڑبڑ ہونے کی گنجائش نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ گڑبڑ کئی قسم کی ہوسکتی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اسٹیج پر چل کر جاتے ہوئے کسی چیز میں اس کا پیر الجھ جائے اور وہ سب کے سامنے الٹ کر گر پڑے یا پھر یہ کہ دلہن بن کر بیٹھے ہوئے اسے اچانک چھینکیں شروع ہوجائیں جو بند ہونے کا نام ہی نہ لیں۔ اس طرح کے کئی الٹے سیدھے خیالات تھے جو اس کے ذہن میں آکر اس کے پیٹ میں ہونے والی گدگدیوں میں اضافہ کررہے تھے۔

جویریہ نے اسٹیج کے کونے سے تھوڑا سا جھانک کر باہر پنڈال میں دیکھا جو مختلف یونیورسٹی کے عہدے داروں اور پرفارم کرنے والے اسٹوڈنٹ کے والدین رشتہ داروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا' نک سک سے تیار عورتیں اور مرد پروگرام شروع ہونے کے انتظار میں اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ ان میں صرف پہلی دو قطاروں میں بیٹھے لوگ جویریہ کو مکمل طور پر دکھائی دے رہے تھے اس کے پیچھے تو بس سر ہی سر تھے یہ ماحول ان ریہرسلز سے بہت مختلف تھا جن میں ڈرامے سے منسلک لڑکے لڑکیوں کے علاوہ شاذونادر ہی کوئی اور موجود ہوتا تھا۔

جویریہ کی ہتھیلیوں میں ٹھنڈے پسینے آنے لگے اور دل بے تحاشہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہ ایک دم سے پیچھے ہٹی۔

"جویریہ! تم ریڈی ہونا۔ امیرہ اور توصیف کی لائنیں ختم ہوتے ہی تمہیں اسٹیج پر جانا ہے۔" خدیجہ نے اچانک پیچھے سے آکر اس سے کہا۔

"میں اسٹیج پر نہیں جاؤں گی۔" اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ جویریہ سے ٹھیک سے بولا بھی نہیں جارہا تھا۔

"واٹ؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" خدیجہ بھونچکی رہ گئی۔

"میں اسٹیج پر نہیں جاسکتی۔ پلیز مجھے فورس مت کرو۔" جویریہ نے ملتجی نگاہوں سے خدیجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو نیم وحشت کے عالم میں آنکھیں پھاڑے جویریہ کو تک رہی تھی۔ "بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ تمہیں جانا پڑے گا۔" خدیجہ نے جویریہ کا بازو یوں کھینچا جیسے وہ اسے زبردستی گھسیٹتی اسٹیج پر لے جائے گی۔ جویریہ نے جھٹکا دے کر اپنا بازو خدیجہ کے ہاتھوں سے چھڑالیا۔

"جویریہ۔" خدیجہ نے جویریہ کی اس حرکت پر بمشکل غصہ ضبط کرتے ہوئے تنبیہاً کہا۔ پر جویریہ کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہ تھی۔ خوف سے اس کا رنگ فق ہوچکا تھا۔ اس نے اچانک پیچھے مڑ کر دوڑ لگا دی۔

حذیفہ کا کسی ڈرامے میں کوئی رول نہیں تھا لیکن اس کا دوست نصیر ڈرامے میں ایک کردار نبھا رہا تھا۔ حذیفہ اسی کے ساتھ آیا تھا۔ نصیر کو اپنے لمبے بالوں میں ہاتھ پھیر پھیر کر ڈرامے میں بولے جانے والے اتنے ہی لمبے ڈائیلاگ یاد کرتا چھوڑ کر حذیفہ اپنی سیٹ کی طرف واپس جا رہا تھا جب جویریہ گولی کی رفتار سے دوڑتی ہوئی اس کے پاس سے گزری۔

گھیرے دار فراک میں ملبوس' سر سے پیر تک علاقائی زیورات میں لدی ہوئی وہ اس وقت واقعی کوئی پہاڑن لگ رہی تھی جو راستہ بھول کر اس انجان نگری میں آنکلی ہو اور اب اپنی اس غلطی پر پریشان ہو۔ اردگرد ڈراموں میں استعمال ہونے والے کپڑوں' کاغذوں اور دوسری بے شمار فالتو اشیا کے ڈھیر لگے تھے۔ ان سب چیزوں کے درمیان کھڑی جویریہ دائیں بائیں دیکھتی ہوئی اپنے لیے فرار کا راستہ تلاش کررہی تھی۔ اس سے پہلے کہ جویریہ ایسا کوئی راستہ ڈھونڈ پاتی اس کے پیچھے پیچھے بھاگ کر آتی خدیجہ بھی جویریہ کے سر پر پہنچ چکی تھی۔

"جویریہ! تم اس طرح سے بیک آؤٹ نہیں کرسکتیں۔ چلو میرے ساتھ۔"

خدیجہ اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ایک بار پھر سے کھینچنے لگی۔ جویریہ بھی اتنی ہی قوت سے اپنے آپ کو خدیجہ کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش میں لگی تھی۔ حذیفہ نے ہکا بکا ہو کر دونوں لڑکیوں کی کھینچا تانی کو دیکھا۔

"ایک منٹ۔ مسئلہ کیا ہے؟" وہ ایک دم سے بیچ میں آیا۔

"جویریہ کو ڈرامے میں دلہن کا رول کرنا ہے۔ ڈیڑھ منٹ کے بعد اس کی انٹری ہے اور یہ بھاگ کر یہاں آگئی ہے۔" خدیجہ نے حذیفہ کو بتایا اور پھر واپس جویریہ کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔

"صرف دس منٹ کی بات ہے۔ فوزیہ اور ریحانہ مستقل تمہارے ساتھ رہیں گی۔" خدیجہ نے ان دونوں لڑکیوں کے نام لیے جنہیں دلہن بنی جویریہ کو دائیں بائیں سے پکڑ کر اسٹیج پر لے جانا تھا۔

"اگر تم نروس ہو رہی ہو تو کوئی بات نہیں۔ ڈری سہمی دلہن تو اور بھی اچھی لگے گی۔" بات کے اختتام تک خدیجہ کا لہجہ جارحانہ سے التجائیہ ہوچکا تھا۔ بس ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔

"میں نہیں جاؤں گی۔" جویریہ نے ایک ہی رٹ لگائی ہوئی تھی' وہ خود کو خدیجہ سے چھڑا کر وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں کے گرد دونوں بازو سختی سے لپیٹ لیے۔

"او گاڈ۔ اب میں کیا کروں۔" خدیجہ نے سر پکڑ کر

کہا۔ وہ بالکل رو نکھی ہو چکی تھی۔

آگے اسٹیج پر ایکٹر اپنے وہ ڈائیلاگ ختم کر رہے تھے جن کے بعد دلہن کو لایا جانا تھا۔ اگر اگلے ایک منٹ کے اندر دلہن اسٹیج پر نہیں پہنچتی تو وہ لوگ اتنے منجھے ہوئے اداکار نہیں تھے کہ گھبرائے یا سٹپٹائے بغیر سچویشن سنبھال پاتے۔ جویریہ کی اس حرکت سے پورا ڈرامہ بگڑ سکتا تھا۔ خدیجہ کی پریشانی بجا تھی۔

حذیفہ نے ایک نظر خدیجہ کے پریشان چہرے پر ڈالی اور پھر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی جویریہ کی طرف دیکھا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ تم اسے اگلے ایک منٹ میں اسٹیج پر جانے کے لیے راضی کر سکو گی۔ بہتر ہے کہ تم اس کے بغیر ہی مینج کرلو۔" حذیفہ نے خدیجہ کو مشورہ دیا۔

خدیجہ نے ایک سیکنڈ کے لیے حذیفہ کی طرف دیکھا پھر مڑ کر فل اسپیڈ بھاگتی ہوئی واپس اسٹیج کی طرف چلی گئی۔

اگلے تیس سیکنڈ کے اندر کاسٹیومز میں مدد کروانے کے لیے ساتھ آئی ایک اور کلاس فیلو کو ریحانہ اور فوزیہ کی معیت میں دلہن بنا کر آگے بھیج دیا گیا۔ کپڑے اور جیولری پہنانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بس جلدی سے ایک بڑا سا زر تار دوپٹہ ڈھونڈ کر سر پر ڈالا لمبا سا گھونگھٹ نکالا اور دلہن تیار۔

اسٹیج پر موجود اداکاروں کو اگر دلہن کے حلیے میں کوئی تبدیلی نظر آئی تو انہوں نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈرامے کے دوران اس پر تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔

جویریہ اب تک گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ اسے اس بات کی قطعی پرواہ نہیں تھی کہ اس کے چھوڑے رول کو کیسے پُر کیا گیا ہے اور کس نے پُر کیا ہے۔ اس نے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد کس کر لپیٹے ہوئے تھے اور جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ حذیفہ کو جویریہ پر شدید غصہ آیا۔

"کبھی کبھار انسان کو اپنے لیے نہ سہی' دوسروں کی خاطر ہی اپنے خوف پر قابو پالینا چاہیے' خاص طور پر جب ان دوسروں میں آپ کے دوست بھی شامل ہوں۔ تمہیں احساس ہے کہ تمہاری اس حرکت کی وجہ سے تمہارے ساتھیوں کی ساری محنت مٹی میں مل سکتی تھی؟ کیا بگڑ جاتا تمہارا اگر تم تھوڑی دیر کے لیے اسٹیج پر چلی جاتیں۔" حذیفہ نے انتہائی سرد لہجے میں جویریہ سے کہا۔

"میں وہاں نہیں جاسکتی تھی۔" جویریہ کے حلق سے گھٹی ہوئی آواز نکلی جو بمشکل حذیفہ تک پہنچی۔ وہ سر سے پیر تک خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی مگر حذیفہ کو اس پر اس وقت ترس نہیں آرہا تھا۔ وہ خود یاروں کا یار تھا۔ دوستی میں بے ایمانی اسے برداشت نہیں تھی۔

"کیوں نہیں جاسکتی تھیں؟" وہ درشتی سے بولا۔

"کیونکہ اسٹیج کے سامنے میری ماں بیٹھی ہوئی ہے۔" گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی جویریہ نے ایک دم سے سر اٹھا کر زور سے کہا تو حذیفہ بھونچکا رہ گیا۔

"وہ وہاں سب سے آگے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ وہ وہیں بیٹھی ہیں۔" جویریہ بے ربط سے انداز میں بولی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ خوف زدہ تھی۔ مگر یہ خوف اسٹیج پر جا کر پرفارم کرنے کا نہیں تھا بلکہ اس عورت کا تھا جو جویریہ کی ماں تھی اور سامنے کی قطاروں میں کہیں بیٹھی تھی۔

حذیفہ بھی کچھ دیر پہلے تمام حاضرین پر نظر ڈال چکا تھا۔

سامنے والی کرسیوں پر مختلف تعلیمی اداروں کے اساتذہ اور سربراہان کے علاوہ کئی دوسرے مہمان بھی شامل تھے جن میں اتفاق سے خواتین کی ہی اکثریت تھی۔

ان عورتوں میں اعلا ڈگریاں رکھنے والی پروفیسروں سے لے کر بھاری زیورات کی نمائش سے اپنی امارت کا اظہار کرتی عورتیں بھی شامل تھیں۔ ان میں سے کون سی جویریہ کی ماں تھی' اس کا اندازہ حذیفہ نہیں لگا سکتا تھا بلکہ اسے تو ان میں سے کوئی بھی عورت نہ تو

جویریہ کی ماں کے خانے میں فٹ ہوتی ہوئی نظر آرہی تھی اور نہ ہی ندیم صاحب جیسے کسی شخص کی بیوی لگ رہی تھی۔

"مجھے یہاں سے جانا ہے ابھی اسی وقت۔" زمین پر گٹھڑی بن کر بیٹھی ہوئی جویریہ نے کہا۔

حذیفہ نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے مگر جویریہ کی شکل دیکھ کر کچھ بھی کہنے کا ارادہ بدل دیا۔

"ٹھیک ہے' چلو۔" وہ بس اتنا بولا۔

"جویریہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اسے واپس ہاسٹل چھوڑنے جا رہا ہوں۔" اسٹیج کے سائڈ سے نکل کر جاتے ہوئے حذیفہ نے خدیجہ کو بتایا۔ جو ایک کونے میں کھڑی ہوئی اسٹیج پر چلنے والے اپنے ڈرامے کو دیکھ رہی تھی۔

حذیفہ کی بات پر خدیجہ نے مڑ کر جویریہ کی طرف دیکھا جس کا بازو حذیفہ کی گرفت میں تھا اور وہ کسی بے جان گڑیا کی مانند اس کے ساتھ کھنچتی چلی آرہی تھی۔

"جو مرضی کرو۔ میری بلا سے۔" خدیجہ نے یہ کہہ کر توجہ واپس ڈرامے کی طرف کرلی۔

خدیجہ نے اس ڈرامے پر بے انتہا محنت کی تھی۔ لباس اور اداکاروں کے چناؤ سے لے کر ڈائیلاگ اور سیٹ کی بناوٹ تک ہر چیز میں کا خیال رکھا تھا۔

اس نے جویریہ کا دلہن کے طور پر انتخاب اس لیے کیا تھا کیونکہ جویریہ کا بھولا بھالا چہرہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتا تھا اور یہی خدیجہ کا مقصد تھا کہ حاضرین کا دھیان کسی صورت بھی ڈرامے سے ہٹنے نہ پائے۔

پر اب جویریہ کی جگہ گھٹنوں تک گوٹے والے دوپٹے کا گھونگھٹ نکال کر بیٹھی ہوئی اس ایمرجنسی کی دلہن کو دیکھ کر جس کی قمیص کا رنگ بھی اس کے اوڑھے آنچل کے ساتھ ٹھیک سے میچ نہیں کر رہا تھا۔ خدیجہ کو اپنے ڈرامے کا بیڑہ غرق ہوتا نظر آرہا تھا۔

اس کا موڈ تو لازمی آف ہونا تھا۔

باہر نکلتے ہی خنک ہوا کا ایک جھونکا جسم کو چھو کر گیا تو جویریہ لاشعوری طور پر ہلکا سا کپکپائی۔

حذیفہ جویریہ کو گاڑی میں بٹھا کر ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔ گاڑی چلنے کے ساتھ جویریہ کے ماتھے پر ٹکے چاندی کے ہار کی لڑیاں بھی آگے پیچھے ہو کر جھولنے لگیں۔

"تمہاری والدہ کو تمہارا ڈرامے میں کام کرنا پسند نہیں ہے کیا؟" حذیفہ نے گاڑی پارکنگ لاٹ سے باہر نکالتے ہوئے جویریہ سے پوچھا۔

بہت سوچ کر اسے جویریہ کے خوف و گھبراہٹ کی یہی ایک وجہ سمجھ میں آئی کہ وہ گھر والوں کی مرضی کے خلاف یہ سب کر رہی تھی۔ ندیم صاحب تو حذیفہ کو ایسی معمولی باتوں پر پابندیاں لگانے والے شخص نہیں لگتے تھے۔ کیا پتا اس کی ماں سخت گیر عورت ہو؟

"مجھے نہیں معلوم انہیں کیا پسند ہے اور کیا نہیں۔ میں دو سال کی بھی نہیں تھی جب وہ مجھے اور بابا کو چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔" حذیفہ کے ساتھ والی سیٹ پر جھکے سر کے ساتھ بیٹھی ہوئی جویریہ نے آہستہ سے اسے بتایا۔

"آئی سی۔" حذیفہ نے ہونٹ بھینچے۔

اسے یکدم احساس ہوا کہ وہ جویریہ اور اس کے خاندانی پس منظر کے بارے میں کتنا کم جانتا ہے۔ اس نے کبھی یہ غور ہی نہیں کیا تھا کہ باپ بیٹی کے اس سیٹ اپ میں ماں جیسی اہم ہستی شامل نہیں ہے۔ وہ کسی کے ذاتی معاملے میں دخل اندازی کا قائل نہیں تھا مگر جویریہ کا رویہ اس کے لیے الجھن کا باعث تھا۔

"تمہیں نہیں لگتا کہ تم نے اوور ری ایکٹ کیا ہے؟" حذیفہ نے سڑک پر سے نظریں ہٹائے بغیر جویریہ سے پوچھا۔

"تمہارے والدین میں علیحدگی ہو گئی۔ یہ ایک افسوس ناک امر ہے لیکن بہت سے لوگوں کے والدین ایک ساتھ نہیں رہتے۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے ماں یا باپ کو اچانک سامنے دیکھ کر اتنے شدید رد عمل کا اظہار نہیں کرتا جس طرح تم نے کیا۔"

"ان میں سے کسی کے ماں باپ نے ان کو اس طرح ذلیل نہیں کیا ہوگا جس طرح میری ماں نے مجھے کیا تھا۔"

جویریہ بولی تو حذیفہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پر وہ چہرہ دوسری طرف کیے کھڑکی سے باہر تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے لپکنے والے بجلی کے کھمبوں کو دیکھ رہی۔

"سب کو یہی لگتا ہے کہ میرے والدین کے درمیان علیحدگی ہو جانا ایک افسوس ناک بات ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ ان دونوں کی شادی کا ہونا اس سے بھی زیادہ افسوس ناک امر تھا جسے کبھی ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔" جویریہ نے کھڑکی پر سے نظریں ہٹائے بنا کہا۔

وہ اب پہلے کی نسبت کافی بہتر تھی بلکہ حذیفہ نے محسوس کیا کہ جیسے جیسے گاڑی اور آڈیٹوریم کا فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا اس کے خوف و ہراس میں بھی بتدریج کمی آتی جا رہی تھی۔

سردیوں میں دن انتہائی مختصر ہو جاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ دن ابھی پوری طرح چڑھا بھی نہیں اور اتر بھی گیا جب حذیفہ یہاں آ رہا تھا تو گاڑی سے باہر سڑک کے ساتھ دوڑتے درختوں اور بجلی کے اونچے کھمبوں کے لمبے سائے زمین پر دور تک لیٹے نظر آ رہے تھے۔ سورج افق کے پار اترنے کی تیاری پکڑ رہا تھا اور اس کی الوداع کہتی کمزور شعاعوں نے ہر چیز کو اصل اور پرچھائیں میں تقسیم کیا ہوا تھا اور اب جب وہ جویریہ کو لے کر ان ہی راستوں سے واپس جا رہا تھا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ زمین پر دم سادھے لیٹی پرچھائیوں نے سورج کے جاتے ہی اٹھ کر ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

ڈھلتی شام کا ماحول حذیفہ کو ہمیشہ اداس لگتا تھا اور سردیوں کی اس افسردہ رات کو اس رنجیدہ سی لڑکی نے اور بھی زیادہ افسردہ بنا دیا تھا۔

"سنا ہے میرے نانا اپنے علاقے کے بہت بااثر آدمی تھے۔" حذیفہ کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی جویریہ نے جیسے خود کلامی کے انداز میں کہنا شروع کیا۔

"صاحب حیثیت ہونے کے علاوہ وہ نہایت فیاض اور غریب پرور شخص بھی تھے۔ زکوٰۃ اور خیرات پانے والوں کی ایک لمبی قطار تھی جو ہر مہینے باقاعدگی کے ساتھ ان کے دروازے پر جمع ہوتی تھی۔ نانا کی فراخ دلی صرف پیسے تک محدود نہیں تھی۔ وہ عملی طور پر بھی لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے۔" جویریہ نے شیشے کی کھڑکی کے ساتھ ماتھا ٹکتے ہوئے حذیفہ کو بتایا۔

"بابا، نانا کے کسی ایسے دوست کے بیٹے تھے جنہیں حیثیت میں کم ہونے کے باوجود ان کی دوستی نے نانا کے ساتھ برابری کی سطح پر لا کھڑا کیا تھا۔ اپنے عزیز دوست کے انتقال کے بعد ان کے یتیم بیٹے کی پرورش کا ذمہ نانا نے اپنے سر لے لیا۔

نانا کے زیر سایہ ہی پل کر بابا جوان ہوئے۔ نانا نے انہیں پڑھایا لکھایا اور پھر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے ایک ادارے میں نوکری بھی دلوا دی۔

یہاں تک تو سب ٹھیک تھا۔ گھر میں بھونچال اس وقت آیا جب نانا نے اپنی نازوں پلی لاڈلی بیٹی کا ہاتھ بابا کے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ کیا۔

اپنے مرحوم دوست کا لحاظ کرتے ہوئے نانا نے بے شک بابا کو کم حیثیت نہ سمجھا ہو مگر باقی گھر والوں کے لیے بابا کی حیثیت ان خیراتیوں سے کم نہیں تھی جو ہر مہینے گھر کے دروازے پر راشن لینے جمع ہوتے تھے۔

بابا ایک سلجھے ہوئے محنتی انسان تھے۔ پھر بھی یہ رشتہ امی کے لیے ناقابل قبول تھا۔ ہر لڑکی کی طرح انہوں نے بھی اپنے ہونے والے شریک سفر کے بارے میں بڑے بڑے خواب دیکھ رکھے تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ کسی ایسے شخص کی سنگت قبول کر لیتیں جو ان کے باپ کے ٹکڑوں پر پل کر جوان ہوا تھا۔ انہوں نے خوب واویلا مچایا پر نانا نے ان کی ایک نہ سنی۔ بہت ساری خوبیوں کے ساتھ نانا میں ایک خامی بھی تھی جو ہر مطلق العنان شخص میں ہوتی ہے۔

انہیں اپنے کیے گئے فیصلوں سے انحراف بالکل گوارا نہیں تھا۔

باقی گھر والوں کو بھی اس رشتے میں سو طرح کے نقص نظر آتے تھے۔ لیکن وہ اسے روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ تمام جاگیریں، تمام اثاثے نانا کے ہاتھ میں تھے۔ خاندان والے اپنی ہر ضرورت کو پورا

کرنے کے لیے نانا پر انحصار کرتے تھے۔ جس شخص کے ہاتھ میں دولت کی طنابیں ہوں اس کی حیثیت اس کوچوان کی سی ہوتی ہے جو زندگی کی بگھی اور اس میں سوار لوگوں کو جب چاہے، جہاں چاہے موڑ کر لے جائے اور کوئی کچھ بھی نہ کر سکے۔

نانا نے بھی ایسا ہی کیا۔

امی کا سارا شور شرابا بے کار گیا اور بابا سے ان کی شادی کروا دی گئی۔ اس رشتے کے پیچھے نانا کی کیا سوچ تھی، یہ کوئی نہیں جانتا پتا نہیں انہوں نے امی کی شادی بابا کے ساتھ کر کے بابا کو عزت بخشی تھی یا پھر اپنی اکھڑ مزاج بیٹی کا ہاتھ بابا کے ہاتھ میں دے کر اس کا مستقبل محفوظ کیا تھا۔ کیونکہ اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ امی کی بدزبانی اور بدتمیزیوں کو برداشت کرنے کے لیے بابا سے زیادہ متحمل مزاج اور صابر شخص کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔

امی کا مستقبل محفوظ ہوا یا نہیں پر اس شادی کے بعد بابا کی زندگی عذاب بن گئی۔

اگلے دو سال بابا کی زندگی کے بدترین سال تھے۔ جاگیردارانہ نظام اور مغرور رویوں کے درمیان پل کر جوان ہونے کی وجہ سے انہیں بہت زیادہ عزت کبھی نہیں ملی تھی لیکن جو ذلت امی اور ان کے باقی گھر والوں کی طرف سے انہیں شادی کے بعد برداشت کرنی پڑی اس کا تصور بھی کرنا مشکل ہے۔ پر نانا کے ان گنت احسانوں کے بوجھ تلے دبے بابا کی زبان پر ایک بار بھی حرف شکایت نہ آیا۔

امی اور بابا کی شادی کے تین سال کے بعد ایک رات نانا کو دل کا شدید دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی وہ دم توڑ چکے تھے۔

نانا کی اس "آنا فانا" موت کے بعد جہاں اور بہت سی تبدیلیاں آئیں وہاں یہ نام نہاد رشتہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

نانا کی موت اس تالے کی چابی ثابت ہوئی جس نے امی اور بابا کو اس تعلق میں قید کر رکھا تھا۔ نانا نہیں رہے تو سارے قفل اپنے آپ ہی کھل گئے۔ امی نے خلع کا دعوا دائر کر دیا۔

جاتے وقت وہ بابا کے لیے تلخ یادوں کے علاوہ کچھ اور بھی چھوڑ کر گئیں اور وہ کچھ اور میں تھی۔" جویریہ نے کانپتی آواز میں کہا۔

اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ حذیفہ کو سننے میں دشواری پیش آ رہی تھی مگر اس نے جویریہ کو ٹوکا نہیں، بولنے دیا اور خود خاموشی سے سنتا رہا۔

"نانی اور ماموں وغیرہ کا خیال تھا کہ میرا وجود امی کے آنے والی زندگی میں مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔" جویریہ چٹختے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کیونکہ میں اپنی ماں کی خوشیوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی اس لیے فیصلہ یہ کیا گیا کہ مجھ سے جتنی جلدی جان چھڑالی جائے، اتنا اچھا ہے اور جان چھڑانے کا سب سے بہترین طریقہ یہ تھا کہ جس کا خون ہے اسی کے حوالے کر دیا جائے۔"

بابا نے اس ذمہ داری کو بخوشی قبول کر لیا۔ امی کے برعکس میرا وجود ان کے لیے بے حساب خوشی و انبساط کا باعث تھا۔ انہوں نے میرے لیے وہ سب کچھ کیا جو کوئی ماں اپنے بچے کے لیے کرتی ہے چاہے وہ راتوں کو گود میں اٹھا کر لوری دے کر سلانا ہو یا پھر اپنے ہاتھوں سے نوالہ بنا کر کھانا کھلانا ہو۔ ماسوائے ان چند گھنٹوں کے جب بابا آفس جاتے وقت مجھے پڑوس کی ایک عمر رسیدہ خاتون کے پاس چھوڑ کر جاتے، وہ اپنا سارا وقت میرے ساتھ بتاتے تھے۔

لیکن یہ اولاد بھی کتنی ناشکری ہوتی ہے نا۔" جویریہ نے دکھ کے ساتھ کہا۔ "والدین کے پیار، ان کی قربانیوں کی قدر ہی نہیں کرتی۔ بابا کے اتنے پیار، اتنی توجہ کے باوجود میرے اندر ایک بے چینی رہتی تھی جو مجھے کسی کمی کا احساس دلاتی۔ ایک ایسی تشنگی جسے بابا کی محبتوں کی بوچھاڑ بھی سیراب کرنے میں ناکام ہو گئی۔

سب سے پہلے میں نے اسکول اور محلے کے بچوں سے اس توجہ کو پانے کی کوشش کی۔ میں زبردستی ان کے کھیلوں میں شامل ہوتی تو کبھی بن بلائے ان کے ساتھ جا کر بیٹھتی۔

میری حالت اس بھکاری جیسی تھی جو توجہ حاصل کرنے کے لیے بار بار مخاطب کر کے زچ کر دیتا ہے۔

بچے مجھ سے تنگ پڑنے لگے۔ مجھے آتا دیکھتے تو اٹھ کر بھاگ جاتے یا پھر مل کر میرا مذاق اڑاتے اور میں بے وقوف اپنی ہی تضحیک پر ہنستی رہتی۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہوا کہ سب میرے ساتھ نہیں بلکہ میرے اوپر ہنستے ہیں۔ تب میں نے ان بچوں کے پیچھے پھرنا بند کر دیا۔ ان کے کھیلوں میں شامل ہونے کے لیے منتیں کرنا بھی چھوڑ دیں۔ کچھ عرصہ بعد وہ لوگ بھی مجھے بھول بھال گئے اور میں ہمیشہ سے جیسی اکیلی تھی ویسی اکیلی ہی رہی۔

میں آٹھ یا نو سال کی تھی جب مجھ پر ادراک ہوا کہ جس چیز کی کمی نے مجھے بچپن سے خوار کر رکھا ہے اسے "ماں" کہتے ہیں۔ گلی، محلے اور اسکول کے جتنے بھی بچوں کو میں جانتی تھی سب ہی کے پاس ماں تھی ایک نہیں تھی تو بس میرے ہی پاس نہیں تھی۔

اتنا تو مجھے معلوم تھا کہ میری ماں حیات ہے۔ بابا نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا لیکن یہ بھی کہا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ کیوں نہیں رہ سکتیں؟ اس کی بابا نے کبھی وضاحت نہیں کی تھی اور میرا چھوٹا سا ذہن خود سے اس معمّا کو حل کرنے سے قاصر تھا۔

بابا کی تمام محبتوں کے باوجود میرے اندر ماں سے ملنے، ماں کو دیکھنے کی طلب بڑھتی گئی۔

نو سال کی عمر میں پہلی بار میں نے بابا سے چھپ کر کوئی کام کیا اور وہ تھا ان کی الماری میں پڑی شادی کی برسوں پرانی البم کو نکال کر دیکھنا۔ جس رشتے نے بابا کو درد کے سوا کچھ نہ دیا، اس رشتے کی یادگار کو انہوں نے اب تک سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ اکثر رات کے وقت جب بابا کو لگتا کہ میں سو چکی ہوں تو وہ الماری کا لاک کھول کر اس میں سے البم نکال کر دیکھا کرتے تھے اور اپنے رستے زخموں پر اپنی خاموش محبت کا لیپ لگا کر ان کی تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کرتے۔ امی کے لیے یہ بندھن مجبوری کا تھا مگر بابا نے صدق دل سے اس رشتے کو نبھایا تھا اور رشتہ ختم ہو جانے کے اتنے سال بعد تک امی کی یاد دل میں بسائے اس بندھن کا حق ادا کرتے چلے آ رہے تھے۔

اگلے دو سالوں میں ہم دونوں نے اس البم کو ان گنت بار دیکھا مگر کبھی ایک ساتھ نہیں۔ بابا نے اپنی دانست میں مجھ سے چھپ کر اور میں نے ان سے خفیہ۔ اپنی ماں کی تصویروں کو دیکھ کر میری کیا حالت ہوتی تھی یہ میں بیان نہیں کر سکتی۔

ان کے ہونٹوں کا کٹاؤ، رخساروں کا ابھار، بھوؤں کی کمان سی اٹھان۔ جس جیتی جاگتی ماں کا ایک نقش بھی مجھے یاد نہیں تھا اس کے تصویروں میں ابھرے نقوش پر ہاتھ پھیر پھیر کر میں نے انہیں ازبر کیا۔ بلاشبہ میری ماں ایک خوب صورت عورت تھی اور دلہن کے روپ میں سج کر ان کا حسن دو آتشہ ہو رہا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ دسمبر کی ایک سرد رات تھی جب بابا کو ایک فون کال موصول ہوئی۔ نجانے دوسری طرف سے بابا کو کیا کہا جا رہا تھا۔ میں لحاف میں دبکی ان کی ہوں، ہاں سنتی رہی۔

"کس کا فون تھا بابا؟" تجسس نے مجھے چپ نہیں رہنے دیا۔

"تم جاگ رہی ہو اب تک؟" مجھے جاگتا پا کر وہ چونکے۔

"فون کس کا تھا بابا؟" پتا نہیں کیوں مجھے بے چینی ہو رہی تھی ہمارے گھر فون ویسے ہی کم آتے تھے کجا اتنی رات گئے؟ بابا کچھ دیر خاموش رہے۔

"آپ کی نانی اماں کا انتقال ہو گیا ہے بیٹا۔" آخر کار انہوں نے آہستہ سے بتایا۔

شاید انہیں لگتا تھا کہ نانی کے انتقال کا سن کر مجھے دکھ پہنچے گا مگر مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔

نانی کے حوالے سے بہت دھندلی سی چند یادیں میرے ذہن میں محفوظ تھیں اور ان میں سے کوئی بھی اتنی خوشگوار نہ تھی جو مجھے ان کی موت پر پُرملال کر سکتی۔

بہت پہلے جب میں چھوٹی تھی تب بابا مجھے کبھی کبھار نانی سے ملوانے ان کی حویلی لے جایا کرتے

تھے۔ شاید بابا یہ نہیں چاہتے تھے کہ میں اپنے ننھیال سے انجان رہوں۔ لیکن یہ بابا کی ایک بے کار کوشش تھی کیونکہ ان لوگوں کو ہم سے جان پہچان بڑھانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔

مجھے یاد ہے کہ سردیوں میں نانی صحن میں لکڑی کا تخت بچھوا کر اس پر دھوپ سینکا کرتی تھیں۔ مجھے بھی وہیں صحن کے کونے میں رکھی ایک پیڑھی پر بٹھا لیا جاتا جیسے کسی کام والی ماسی کے اس بچے کو بٹھایا جاتا ہے جسے وہ کسی دن کام پر اپنے ساتھ لے آئی ہو۔

"خبردار' یہاں سے ہلنا مت۔" کا حکم ہمارے جاتے ہی صادر کر دیا جاتا اور ہمارے واپس آنے تک اس میں کسی قسم کی ترمیم کی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔

وہاں میری حیثیت واقعی کسی خدمت گار کی اولاد جیسی ہوتی کیونکہ جتنی دیر ہم وہاں رہتے' ماموں یا گھر کے کسی دوسرے فرد کو بابا کے ذمے لگانے کے لیے کوئی نہ کوئی کام یاد آتا رہتا۔

بابا جس دفتر میں نوکری کر رہے تھے وہاں وہ ایک مناسب عہدے تک پہنچ چکے تھے اور یہ چھوٹے موٹے نوکروں والے کام انہیں بالکل زیبا نہیں دیتے تھے پھر بھی بابا خاموشی سے ہر وہ کام کیے جاتے جن کا انہیں حکم ملتا۔

ننھیال میں گزارے چند گھنٹے میرے لیے عذاب ہوتے۔ وہاں میں اپنے ماموں زادوں کو کھیلتا تو دیکھ سکتی تھی مگر ان کے کھیل میں کبھی شامل نہیں ہو سکتی تھی۔

ننھیال سے یہ زبردستی کا میل ملاپ کم ہوتے ہوتے بالآخر ختم ہی ہو گیا۔ کچھ میرے وہاں نہ جانا چاہنے کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ بابا کی سمجھ میں آگیا کہ وہ سب لوگ مجھے بابا کی بیٹی کے علاوہ اور کسی رشتے سے دیکھنے کو تیار ہی نہیں۔

بابا نے مجھے وہاں لے جانا بند کر دیا۔ خود اگر جاتے تھے تو مجھے خبر نہیں۔

پتا نہیں نانی کے انتقال کی خبر بھی بابا کو کس نے دی تھی۔ ماموں وغیرہ میں سے تو کوئی بابا کو اطلاع دینے کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اگلے ہی پل اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔

بابا نے الماری میں رکھی اپنی ڈائری سے ایک نمبر نکال کر اس پر کال ملائی۔ تھوڑی دیر میں بابا بڑے ماموں سے ان کی ماں کے انتقال پر افسوس کر رہے تھے۔ بات مختصر تھی۔ درمیان میں ایک آدھ بار "مگر" "لیکن" جیسے لفظ بھی آئے۔ پھر فون بند ہو گیا۔

بابا نے ڈائری واپس الماری میں رکھ کر اس کو لاک کیا اور چپ چاپ اپنے بستر میں آکر لیٹ گئے۔

پر میری نیند بالکل اڑ چکی تھی۔ میرا ذہن اس نہج پر سوچ رہا تھا جس پر آج سے پہلے کبھی میرا دھیان نہیں گیا تھا۔

میں لحاف میں سے منہ نکالے بابا کے پلنگ کے پیچھے کھڑی بڑی سی لکڑی کی الماری کو تک رہی تھی جس میں ایک ڈائری رکھی تھی ایسی ڈائری جس پر میرے بڑے ماموں کا پتا درج تھا۔ اس گھر کا پتا جہاں میری نانی رہا کرتی تھیں اور جہاں ان کا انتقال ہوا تھا۔ وہ گھر جہاں یقیناً" اپنی ماں کی میت پر آنسو بہانے اس وقت میری امی بھی آئی ہوں گی۔

صبح جب بابا آفس کے لیے تیار ہو رہے تھے تو میں نے الماری کھول کر ڈائری نکال لی۔ بابا اپنی الماری کی چابی کہاں رکھتے تھے اس بات کا مجھے بہت عرصہ سے پتا تھا۔ (پتا نہ ہوتا تو میں ان سے چھپ کر البم کیسے دیکھ سکتی تھی)

ماموں کا پتا نوٹ کر کے میں حسب معمول تیار ہو گئی۔ بابا آفس کے لیے نکلے اور میں گلی کی دوسری لڑکیوں کی طرح اس وین میں سوار ہو گئی جو ہمیں روزانہ اسکول لے کر جاتی تھی۔

اسکول کے آگے رش ہونے کی وجہ سے وین والا ہمیں گیٹ سے تھوڑا پیچھے ہی اتار دیا کرتا تھا۔ یہ چند قدم کا فاصلہ ہم لڑکیاں پیدل چل کر پار کر لیتی تھیں۔

اس دن میں نے اپنی چال دانستہ آہستہ رکھی اور سب سے پیچھے چلنے لگی۔ کسی نے غور نہیں کیا۔ ویسے بھی میری کسی لڑکی کے ساتھ اتنی دوستی نہیں تھی کہ وہ

میرے ساتھ چلنے یا نہ چلنے پر دھیان دیتی۔

باقی لڑکیاں آپس میں باتیں کرتی ہوئی اسکول کے اندر چلی گئیں اور میں چپکے سے ساتھ والی گلی میں مڑ گئی۔ گلی کے دوسری طرف سے مین روڈ پر نکل کر میں نے ایک رکشے کو ہاتھ دے کر روکا اور اس میں بیٹھ گئی۔

اس چھوٹے سے شہر میں چند ایک ہی قابل دید مقامات تھے اور میرے نانا کی آبائی حویلی بھی ان میں سے ایک تھی۔ رکشے والے کو پتا سمجھنے میں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئی۔ چند ہی منٹوں میں اس نے مجھے ایک بڑے سے گیٹ کے سامنے اتار دیا۔

میرا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسکول کے علاوہ کہیں اکیلی آئی تھی اور وہ بھی بابا کو بغیر بتائے' ان سے بنا اجازت لیے۔ خوف سے میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن اس خوف پر وہ خواہش حاوی تھی جو مجھے یہاں تک کھینچ لائی تھی۔

امی سے ملنے کی خواہش نے کب میرے اندر جڑ پکڑی۔ مجھے معلوم نہیں۔ شاید یہ خواہش ازل سے میرے ساتھ تھی بس مجھے پتا تب چلا جب ان سے ملنے کی موہوم سی امید نظر آئی۔

باہر کی چار دیواری میں لگا بڑا سا آہنی دروازہ ہی نہیں اندر حویلی کے تمام دروازے بھی تعزیت کے لیے آنے جانے والوں کے لیے کھلے ہوئے تھے۔

ہر کمرے' ہر دالان میں کوئی موجود تھا۔

روتے ہوئے' آنسو بہاتے قریبی رشتہ دار' سیپارہ پڑھتے' گٹھلیاں گراتے دور کے قرابت دار اور یہاں وہاں دوڑتے پھرتے سب کی آوازوں پر لپکتے ہوئے حویلی کے ملازم۔

سب مصروف اور میرے لیے سب اجنبی لیکن وہ ایک مانوس چہرہ جسے میں ڈھونڈ رہی تھی' کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

تب ہی مجھے خیال آیا کہ بابا کے ساتھ میں جب کبھی بھی اس حویلی میں آئی تھی امی سے کبھی سامنا نہیں ہوا۔ غالباً" بابا اطلاع دے کر آتے تھے اور امی دانستہ ہمارے سامنے آنے سے گریز کرتی تھیں پر آج تو انہیں میرے آنے کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ پھر آج وہ کہاں تھیں؟

میں ایک کے بعد دوسرے کمرے میں جا کر انہیں تلاش کرتی رہی۔ کسی نے میری طرف دھیان نہ دیا۔ سب اپنے آپ میں مگن تھے۔ آخر میں کمروں سے نکل کر حویلی کے پچھلی طرف اس صحن میں آگئی جہاں نانی بیٹھا کرتی تھیں۔

نانی کا تخت وہیں صحن کے مغربی کونے میں رکھا تھا جہاں سردیوں میں سب سے اچھی دھوپ آتی تھی۔ اس کے اوپر سرخ گلاب کے پھولوں کے ڈیزائن والا صاف ستھرا تخت پوش بچھا تھا اور اس تخت پوش پر جو عورت کروٹ کے بل لیٹی تھی اسے میں ہزاروں کے مجمع میں بھی آسانی سے پہچان سکتی تھی۔

سنا تھا کہ حسن سوگوار ہو تو اور بھی حسین ہو جاتا ہے۔ اس روز دیکھ بھی لیا۔

امی اپنی تصویر سے بھی زیادہ خوب صورت تھیں۔ ان کی آنکھیں متورم اور ناک سرخ ہو رہی تھی جیسے وہ تھوڑی دیر پہلے ہی روئی ہوں۔ اس وقت وہ نڈھال ہو کر تخت پر لیٹی ہوئی تھیں۔ ایک نوکرانی ان کے پیچھے بیٹھی ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔

صحن اس وقت خالی نہیں تھا۔ ٹھنڈ کی وجہ سے کئی لوگ اندر کمروں سے نکل کر باہر دھوپ میں آبیٹھے تھے۔

لیکن پھر نجانے کیسے صحن میں پھیلی دھوپ کی تپش سے خود کو گرماتے ڈھیروں رشتہ دار' ماحول اور حالات سے یکسر بے نیاز و لاپرواہ یہاں سے وہاں دوڑتے کھیلتے ان کے بچے' سب کہیں غائب ہو گئے۔ رہ گئے تو فقط دو افراد۔

میں اور میری امی۔

"امی۔" میں نے ان کے قریب جا کر ان کو پکارا تو انہوں نے اپنی موندی ہوئی آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔

مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر ان کی آنکھوں میں

الجھن عود کر آئی۔ وہ مجھے پہچان نہیں پائی تھیں۔

"امی! میں ہوں جویریہ۔" میں نے اپنے بے قابو ہوتے جذبات پر بمشکل بند باندھتے ہوئے کہا۔ پتا نہیں میں وہاں کھڑی کیسے تھی؟ میرا روم روم مجھے آگے بڑھ کر اس عورت سے لپٹ جانے کو کہہ رہا تھا جو میری ماں تھی' کوئی انجانی قوت مجھے ان کی طرف کھینچ رہی تھی۔

"تم!" ان کی آنکھوں میں حیرت کی جگہ ناگواری اور پھر غصہ نے لے لی "تم یہاں کیسے آگئیں۔ ہم نے ندیم کو منع بھی کیا تھا کہ...... سمجھ گئی وہ تمہیں جان بوجھ کر یہاں لایا ہے تاکہ تماشا کھڑا ہو سکے۔ کم ظرف انسان آخر دکھا دی نہ اپنی اصلیت۔"

امی یک دم بھڑک اٹھیں اور میں بھونچکی رہ گئی۔

بابا کو تو علم بھی نہیں تھا کہ میں یہاں آئی ہوں اور سارا الزام ان کے سر آرہا تھا۔

"اب یہاں کھڑی میرا منہ کیا تک رہی ہو۔ اس سے پہلے کہ کوئی تمہیں دیکھ لے' دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" امی کی زبان نے زہر اگلا۔ یہ وہ الفاظ نہیں تھے نہ ہی یہ وہ ردعمل تھا جو میں نے اپنے اور اپنی ماں کے درمیان ہونے والی پہلی ملاقات کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔

"امی! میں تو......" میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا۔

"یہ لڑکی آپ کو امی کیوں کہہ رہی ہے؟" میری بات ابھی شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسے کاٹ کر یہ چبھتا ہوا سوال پوچھا گیا۔

میں نے اور امی نے چونک کر سوال پوچھنے والے کو دیکھا۔

وہ سات آٹھ سال کا لڑکا تھا جو امی کے پیچھے لیٹا ہوا تھا۔ امی کی طرح اب وہ بھی اٹھ کر بیٹھ چکا تھا اور مجھے متجسس نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"بتائیں نا ماما! یہ لڑکی آپ کو امی کیوں کہہ رہی ہے؟"

"ماما۔" میرا سویا ہوا ذہن ایک جھٹکے سے بیدار ہوا۔

میری امی صرف میری امی نہیں بلکہ اس بچے کی بھی ماں تھیں۔

"وہ اس لیے کیونکہ یہ لڑکی تمہاری امی کی بیٹی ہے' یعنی تمہاری سوتیلی بہن۔"

پوچھے گئے سوال کا جواب دینے والے میرے ماموں کے دو بیٹے تھے جو نجانے کب میرے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

بچپن میں اسی صحن میں پیڑھی پر بیٹھے ہوئے میری ان دونوں کے ہاتھوں اچھی درگت بنا کرتی تھی۔ کبھی گیند کھینچ کر مارتے تو کبھی مٹی کے گولے بنا کر ایسا تاک کر نشانہ لیتے کہ میرے سارے کپڑے داغ دار ہو جاتے۔ یہ بڑے ماموں کے سپوت تھے یا چھوٹے کے یہ مجھے کبھی پتا ہی نہیں چلا تھا۔

"تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ تمہاری اماں کی پہلی شادی ہمارے گھر کے ایک نوکر کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہ اسی کی بیٹی ہے۔" ان میں سے ایک نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔

ان دونوں کے قد بے شک لمبے ہو چکے تھے مگر دوسروں کو اذیت دے کر مزا لینے کی عادت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"اوے یار! اس طرح تو ہمارا اصغر علی ایک نوکرانی کا بھائی ہوا نا۔" ان میں سے ایک نے دوسرے کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے چونکنے کی اداکاری کی۔

"بکواس بند کرو۔" اپنی اور ان کی عمروں کے فرق کا ذرا بھی لحاظ نہ کرتے ہوئے اصغر علی نے انتہائی بدتمیزی کے ساتھ کہا۔

"ہم بکواس نہیں کر رہے۔ یقین نہیں آتا تو اپنی اماں سے پوچھ لو کہ یہ نوکرانی تمہاری کیا لگتی ہے۔" وہ دونوں خود پر ازحد معصومیت طاری کرتے ہوئے بولے۔

اصغر علی نے پلٹ کر امی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

پھر کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔

اس کے بعد اس سوا چار فٹ کے فتنے نے وہ فساد مچایا کہ الاماں۔

اس کو اس بات سے دھچکا نہیں لگا تھا کہ اس کی ایک عدد سوتیلی بہن بھی ہے' جس کے وجود سے وہ اب تک لاعلم تھا بلکہ اس کی شاہانہ طبیعت اس حقیقت کو قبول کرنے سے انکاری تھی کہ اتنی کم حیثیت لڑکی کے ساتھ اس کا اتنا قریبی رشتہ بھی ہو سکتا ہے۔

میرے دونوں ماموں زادوں نے ہمیشہ کی طرح تاک کر نشانہ لگایا تھا' اصغر علی کسی کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ امی اسے چپ کرانے کی کوشش میں ہلکان ہوئے جا رہی تھیں۔ صرف امی ہی نہیں بھانت بھانت کے لوگ اصغر علی کے گرد جمع ہو گئے اور وہ دونوں فساد کی جڑ جنہوں نے یہ ساری آگ بھڑکائی تھی' کب کے منظر سے غائب ہو چکے تھے۔

مجھ میں ذرا بھی عقل ہوتی تو میں بھی وہاں سے رفو چکر ہو جاتی پر مجھ میں عقل ہوتی تو میں وہاں جاتی ہی کیوں۔

معاملے کی سنگینی کا اندازہ مجھے تب ہوا جب میں نے ایک کالی شلوار قمیص میں ملبوس' سر سے پیر تک جاگیر دارانہ کروفر میں لپٹے سانڈ نما آدمی کو تیز قدموں سے صحن پار کر کے اس مجمع کی طرف آتے دیکھا۔ آدھی بھیڑ تو اس آدمی کو آتا دیکھ کر ہی چھٹ گئی جو باقی رہ گئے ان کا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والا حساب ہو گیا اور ان رہ جانے والے باقی لوگوں میں امی بھی شامل تھیں۔

میں سمجھ گئی کہ یہ وہی کوئی ہیں جن کے مجھے دیکھ لینے سے امی ڈر رہی تھیں۔ ساتھ ہی یہ عقدہ بھی مجھ پر وہیں کھڑے کھڑے کھلا کہ امی آج سے پہلے مجھے اور بابا کو نانی کے گھر میں کبھی کیوں نہیں نظر آئیں۔

بابا سے خلع لینے کے ایک سال کے اندر امی کی دوسری شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنے نئے شوہر کی سنگت میں ایک بار پھر دلہن بن کر اس دہلیز کو پار کر گئی تھیں۔

لیکن امی کی پہلی اور دوسری شادی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ سب سے بڑا اور نمایاں فرق تو یہ تھا کہ ان کی دوسری شادی اتنے سال گزر جانے کے باوجود بھی قائم تھی۔

کیسے قائم تھی؟ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا تھا؟

میں حیرت کے عالم میں منہ سے کف اڑاتے' مغلظات بکتے اس مرد کو دیکھ رہی تھی جو میری امی کا دوسرا شوہر تھا۔

میری وہی ماں جس نے اپنی تنک مزاجی سے بابا کو تین سال تگنی کا ناچ نچائے رکھا' اس آدمی کی منتیں کر رہی تھی۔ اس کے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔

یہ تھا امی کی پسند کا معیار؟

یہ تھا وہ آئیڈیل جس کی خاطر امی نے میرے نفیس اور مہذب باپ کو ٹھکرا دیا؟

پر شاید اس میں امی کی پسند کا اتنا عمل دخل نہیں تھا۔ ہمارے معاشرے میں ایک مطلقہ عورت جو ایک بچے کی ماں بھی بن چکی ہو' کی پسند و ناپسند کو آخر اہمیت ہی کتنی دی جاتی ہے؟ انصاف کی نظر سے دیکھا جاتا تو امی کے ساتھ بھی زیادتی ہوئی تھی۔

نادانستگی میں ہی سہی' بابا اور میرے وجود نے ان کے خوابوں کو ناقابل حصول بنا دیا تھا۔

میرے سامنے کھڑا آدمی تہذیب' اخلاق اور شرافت میں بھلے میرے بابا کے پاسنگ نہ ہو مگر ایک چیز میں وہ ان پر ضرور فوقیت رکھتا تھا۔

اور وہ چیز تھی پیسہ۔

بے شمار' بے حساب پیسہ جو اس شخص کی ملکیت تھا۔

ان سب لوگوں کی نظر میں صرف پیسے کی ہی اہمیت تھی۔ اسی پیسے کی وجہ سے میرے بابا جیسے شریف النفس شخص کو پیر کی جوتی کے برابر سمجھا جاتا تھا اور اس شخص کو بدمزاج اور بدزبان ہونے کے باوجود سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔

پر یہ سارا اشتعال' سارا غصہ آخر تھا کس پر؟ مجھے تو ابھی تک یہی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

اس سارے ہنگامے میں وہ سب جیسے مجھے بھول ہی گئے تھے۔ میں ایک طرف کھڑی یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ آخر ایک بچی کا اچانک اپنی ماں سے ملنے آجانا اتنی بڑی بات تو نہیں کہ اس پر اس طرح تماشا

لگایا جائے۔

تب مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ شخص صرف بدزبان اور بدلحاظ ہی نہیں بلکہ شکی اور تنگ نظر بھی ہے۔ حالانکہ امی خود اس کی تیسری بیوی کے عہدے پر فائز ہوئی تھیں پھر بھی اس نے کبھی امی کو ان کی پہلی شادی جیسی سنگین غلطی کو بھولنے نہ دیا۔

پچھلے نو سال میری ماں نے اس آدمی کو یہ یقین دلاتے گزارے تھے کہ ان کا اپنے سابقہ شوہر سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں پر وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا اور آج تو اسے میری شکل میں جیتا جاگتا ثبوت بھی مل گیا تھا۔

"اگر بیٹی اس طرح ملنے آسکتی ہے تو پرانے شوہر سے بھی یقیناً ملاقاتیں ہوتی ہوں گی۔"

وہ بول رہا تھا اور امی اپنی صفائیاں پیش کر رہی تھیں جنہیں وہ سننے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔

جانے کتنی دیر یہ شور شرابا جاری رہا۔ آخر گھر کے چند بزرگ بیچ میں آئے اور اس کو بکتا جھکتا وہاں سے لے کر چلے گئے۔

امی تخت پر سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا کیونکہ میرے سامنے میری ماں میری حماقت کی وجہ سے اپنے شوہر کے ہاتھوں بے عزت ہوئی تھی۔

"امی جی۔" میں نے آگے بڑھ کر انہیں تسلی دینی چاہی۔

میری آواز سن کر وہ یوں اچھلیں جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

"تم ابھی تک یہیں ہو۔" وہ غصے کے مارے کانپنے لگیں۔ "یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔ تمہاری اور تمہارے باپ کی ملی بھگت ہے مجھے سب کے سامنے ذلیل کروانے کی۔ میرا بسا بسایا گھر اجاڑنے کی۔ ابا نے تمہارے باپ کو اوقات سے بڑھ کر نواز دیا تھا پر چھوٹے برتن میں زیادہ ڈال دینے سے برتن بڑا نہیں ہو جاتا، الٹا چھلکنے لگتا ہے۔ تمہارے باپ سے بھی اتنی عزت سنبھالی نہیں گئی۔ ہماری برابری کے خواب دیکھنے لگا۔ لیکن چھوٹے لوگ ہمیشہ چھوٹے ہی رہتے ہیں۔" امی تنفر بھرے لہجے میں جانے کیا کیا بولے جا رہی تھیں۔

"امی! میں تو....." میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہنا چاہا۔

"خاموش۔" ان کا لہراتا ہوا ہاتھ میرے گال پر پڑا اور انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا۔ اس کے بعد کچھ بھی کہنے کی خواہش میرے اندر ہی دم توڑ گئی۔ میں گال پر ہاتھ رکھے پتھرائی آنکھوں سے امی کو دیکھنے لگی۔

میرے تخیل نے مجھے بتایا تھا کہ جب ماں مجھے پہلی بار چھوئے گی تو کائنات کے سارے رنگ میرے اردگرد بکھیر دے گی۔ لیکن اس ایک تھپڑ نے میری خوش فہمی کا شیش محل کرچی کرچی کر ڈالا۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ میرا یہ شیش محل تو بنا ہی برف کا ہوا تھا جس میں کسی کی محبت کی گرماہٹ شامل نہیں تھی۔ ذرا سی نفرتوں کی آنچ کیا لگی، پگھل کر پانی بن گیا۔ اب یہی پانی میری آنکھوں سے بہہ کر میرے چہرے کو بھگو رہا تھا۔

صحن میں اور بھی لوگ موجود تھے لیکن میں اکیلی کھڑی تھی۔ بالکل اس نکیل ڈلے کرتب دکھانے والے جانور کی طرح جس کے گرد تماشائیوں کا مجمع ہوتا ہے مگر وہ خود ان کے بیچ تنہا رہتا ہے۔

ایک بارہ سال کی بچی کا حوصلہ ہی کتنا ہوتا ہے اور جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا، وہ میرے حوصلے کی تاب سے بڑھ کر تھا۔

"جویریہ!" عین ممکن تھا کہ میں سب کے بیچ وہیں چکرا کر گر پڑتی کہ اچانک ایک مانوس آواز نے میرا نام پکارا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو بابا صحن میں داخل ہو رہے تھے۔ میری بے جان ہوتی ٹانگوں میں پھر سے جان آ گئی۔

"بابا" میں دوڑتی ہوئی جا کر ان سے لپٹ گئی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" بابا سخت حیرت زدہ تھے۔

"اب اتنے بھولے مت بنو۔ پہلے خود اسے یہاں

بھیجا جھگڑا ڈلوانے کے لیے اور اب انجان بن رہے ہو۔" یہ امی کی زہر میں ڈوبی آواز تھی۔

اس کے بعد اگلے بیس منٹ میں کیا ہوا، یہ بتانے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ امی اور ان کے گھر والوں نے جی بھر کے بابا کو ذلیل و خوار کیا۔ جس طرح امی کے دوسرے شوہر یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ امی کا بابا سے کوئی رابطہ کوئی تعلق نہیں، اسی طرح وہاں موجود نفوس میں سے کوئی بھی اس بات پر یقین کرنے کو راضی نہ تھا کہ میرے یہاں آنے کے پیچھے بابا کی کوئی سوچی سمجھی اسکیم نہیں ہے۔

سچ ہے کہ بدگمانی لاعلاج ہوتی ہے۔

ان لوگوں نے خاص طور پر فون کر کے بابا کو آفس سے یہاں بلوایا تھا اور یہ سن کر کہ میں یہاں موجود ہوں، وہ بے چارے دوڑے چلے آئے اور اب سب کے بیچ کھڑے ہو کر خود پر لگنے والے الزامات سن رہے تھے۔

مجھے آج تک وہ ذلت بھرے لمحات نہیں بھولتے۔ ایک طرف ان لوگوں کی حقارت بھری نظریں اور زہر میں بجھی زبانیں اور دوسری طرف مجھے اپنے ساتھ مضبوطی سے لپٹائے کھڑے بابا۔

وہاں کھڑے ہوئے میرے دل و دماغ نے اس حقیقت کو بھی قبول کر لیا جو شاید عام حالات میں کبھی نہ کرتا اور وہ حقیقت یہ تھی کہ میں اور بابا کامیابی کی کتنی منزلیں کیوں نہ طے کر لیں۔ ان مغرور لوگوں کی نظر میں کم تر ہی رہیں گے کیونکہ یہ لوگ انسانوں کو کسی اور ہی نظریے سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو سکتی ہے مگر ان لوگوں کے سوچنے کا انداز نہیں بدل سکتا۔

اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے میرے دل کے ٹکڑے ہو گئے کہ ان سطحی لوگوں کی فہرست میں میری ماں، میری اپنی ماں بھی شامل ہے۔ دنیا کی کسی مجبوری نے اس کے پیر نہیں باندھ رکھے تھے۔ وہ اگر ہم سے دور تھیں تو اپنی سوچ اور اپنی تنگ نظری کی بدولت۔ باقی تمام لوگوں کی طرح اپنی سوچ کو بدلنا ان کے بھی بس سے باہر تھا۔

مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ جو سچائی مجھے آدھے پونے گھنٹے میں نظر آگئی، وہ نانا ابا اتنے سالوں میں کیسے نہ واضح ہو سکی تھی۔ کیا وہ اپنے گھر والوں کی ذہنیت اور فطرت سے واقف نہ تھے؟ کیا سوچ کر انہوں نے امی اور بابا کو اس بے جوڑ رشتے میں جوڑا تھا؟

اس دن بڑے لوگوں کی اس بڑی سی حویلی میں جہاں سے سینکڑوں غربا خیرات و زکواۃ سے اپنی جھولیاں بھرے نکلتے تھے ہم دونوں باپ بیٹی نے بھی اپنی بساط سے بڑھ کر ذلت سمیٹی۔

پھر ہم نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا جس سے ہماری اتنی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ بابا نے اپنا ٹرانسفر دوسرے شہر کروا لیا۔ امی سے ملنا تو دور کی بات، ان کو دیکھنے کی بھی اب کوئی خواہش میرے اندر باقی نہیں رہی۔" جویریہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

اسٹیئرنگ پر رکھے حذیفہ کے ہاتھ ساکت تھے۔ گاڑی سے باہر پھیلے اندھیرے کی طرح ساکت جس میں نہ کسی چیز کی آہٹ سنائی دے رہی تھی نہ کوئی حرکت دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے حذیفہ کو لگا جیسے وقت بھی ٹھہر گیا ہو بس گاڑی کے اندر لگی ڈیجیٹل گھڑی کے پل پل بدلتے چمکدار ہندسے وقت کے آگے بڑھنے کی نشاندہی کر رہے تھے۔

آج اماوس کی رات تھی۔ تاریک رات کی سیاہی میں اپنے اجالے سے روشنی کرنے والا چاند آج آسمان کی وسعتوں میں کہیں گم تھا۔ اپنے اپنے مدار میں سورج بن کر جگمگانے والے ان گنت ستارے اس دور افتادہ دنیا میں پھیلی تاریکی کو کم کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر فلک پر شرمندگی سے ٹمٹما رہے تھے۔

"مجھے معلوم ہے کہ میرے رویے سے سب کو بہت مایوسی ہوئی ہے۔ سب مجھ سے ناراض ہیں۔ لیکن میں نے یہ سب جان بوجھ کر نہیں کیا۔ اتنے عرصے کے بعد امی کو اپنے سامنے دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میں اسٹیج پر نہیں بلکہ اس صحن میں قدم رکھنے جا رہی ہوں جہاں بارہ برس کی عمر میں کھڑی ہوئی تھی۔

سب کے بیچ۔ سب کی نفرت بھری نگاہوں کا مرکز بن کر۔"

اندھیرے میں حذیفہ کو اس کے چہرے کے خدوخال نظر نہیں آرہے تھے لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

حذیفہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

"جویریہ! میں مانتا ہوں کہ ماضی میں جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا' وہ ناقابل برداشت تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے ماضی کو اپنے حال پر اثر انداز ہونے کی اجازت دے دو۔ اگر آج تم اسٹیج پر چلی بھی جاتیں تو زیادہ سے زیادہ کیا ہو جاتا۔ ہو سکتا ہے تمہاری ماں اتنے سالوں کے بعد تمہیں پہچانتی ہی نہیں اور اگر پہچان بھی لیتی تو کیا کر لیتی؟ جو ہو گیا۔ سو ہو گیا اسے بدلا نہیں جا سکتا لیکن جو ہو رہا ہے اور جو ہونے والا ہے' اسے بہتر بنانے کی کوشش ضرور کی جا سکتی ہے۔ اپنے ماضی سے ڈرنا چھوڑ کر اپنے حال میں جیو بنا کسی ڈر کے کیونکہ زندگی اتنی ارزاں نہیں کہ اسے ایک خوف کی نذر کر دیا جائے۔"

اتنا تو وہ جانتا تھا کہ دل میں بیٹھا برسوں پرانے خوف کا اثر محض اس کے ایک بار سمجھا دینے سے زائل ہونے والا نہیں۔ اسے ختم کرنے کی کوشش تو جویریہ کو خود ہی کرنا تھا مگر اس وقت اپنے دونوں ہاتھ گود میں رکھے بچوں کی طرح آنسو بہاتی وہ کوئی بھی کوشش کرنے کے قابل نہیں لگ رہی تھی۔

جواب بارہ سال کی دکھ رہی تھی۔ وہ بارہ سال کی عمر میں کیسی لگتی ہو گی۔ حذیفہ نے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔

حذیفہ کے چہرے پر بہت ناقابل فہم سے تاثرات تھے۔ جویریہ اگر دیکھ لیتی تو ضرور حیران ہو جاتی۔

"تمہارا ہاسٹل آگیا ہے۔" حذیفہ نے اپنا چہرہ واپس ونڈ اسکرین کی طرف موڑتے ہوئے نرمی سے کہا۔

جویریہ نے گاڑی کے باہر دیکھا۔ تھوڑی دیر قبل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے والے درخت اب اپنی جگہ پر کھڑے تھے

وہ آہستہ سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

حذیفہ کچھ دیر اندھیرے میں جویریہ کے جاتے قدموں کی چاپ سنتا رہا پھر یہ چاپ بھی اس سناٹے میں گم ہو گئی جو جاڑے کی راتوں کا خاصا ہوتا ہے۔

اس سارے قصے کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔

جویریہ کی معمّا جیسی شخصیت کے کئی گمشدہ سرے حذیفہ کے ہاتھ لگ گئے۔ اس کا بات بات پر گھبرانا' لوگوں سے زیادہ کھلنے ملنے سے گریز کرنا جیسے معمے بھی خود بخود حل ہوتے چلے گئے۔ اس کی شخصیت کا ادھورا پن اور اعتماد کی کمی کے پیچھے اس کی ماں کی بے اعتنائی اور نفرت تھی۔ اپنی ہی سگی ماں کے ہاتھوں دھتکارا جانا اس کی زندگی کا ایک ایسا ناسور تھا جس کی اذیت اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی کم نہ ہوئی تھی۔

"یاد رکھو' ماں صرف ماں کبھی نہیں ہوتی۔ ماں وہ ڈھال ہے جو دنیا کے سرد و گرم سے انسان کو بچاتی ہے۔ یہ وہ رشتہ ہے جو وقت کی کسوٹی پر سب سے کھرا اور مضبوط ثابت ہوتا ہے اور جس شخص کا بدقسمتی سے یہی رشتہ ناپائیدار ہو' اس کی دلی اور ذہنی کیفیت کو تم نہیں سمجھ سکتے۔"

محب نے کافی پھینٹتے ہوئے حذیفہ سے کہا جب حذیفہ نے ساری کہانی اس کے گوش گزار کی۔

محب اور حذیفہ اسکول کے زمانے کے دوست تھے۔ آگے چل کر حذیفہ نے بزنس اسٹڈیز کو اپنایا اور محب نے نفسیات کے شعبے کا انتخاب کیا۔ اسے اس پروفیشن میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر اپنی ذہانت اور قابلیت کی بنا پر وہ ابھی سے ممتاز ماہرین نفسیات میں شمار ہونے لگا تھا۔

"لیکن اپنے والد کے ساتھ اس کے تعلقات بالکل نارمل ہیں ان سے اسے ہمیشہ بھرپور توجہ اور پیار ملا ہے۔" حذیفہ بولا۔

"تب ہی تو وہ آج تک اپنا توازن برقرار رکھنے میں

کامیاب ہے ورنہ زندگی کی دوڑ میں کب کی تیورا کر گر چکی ہوتی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس لڑکی کو یہ خوف بھی ضرور ہو گا کہ یہ ایک واحد رشتہ جس پر وہ ساری زندگی انحصار کرتی آئی ہے اگر اس سے چھن گیا تو کیا ہو گا؟"

"ویسے یہ لڑکی ہے کون جس کی آپ بیتی اتنی دیر سے زیر بحث ہے۔" محب نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے حذیفہ سے پوچھا۔

"بتایا تو تھا۔ دوست ہے میری۔"

"صرف دوست؟"

"ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟" حذیفہ نے پوچھا۔

"اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ میں نے کبھی صرف کسی دوست کے لیے تمہارے چہرے پر تشویش کی اتنی گہری لکیریں نہیں دیکھیں۔"

محب انتہائی زیرک انسان تھا۔ محض ایک سرا پکڑ کر پوری داستان زنبیل میں سے کھینچ کر نکال لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اسی لیے تو اس فیلڈ میں اتنی جلدی اپنا مقام بنا لینے میں کامیاب ہو گیا تھا وہ۔

"نہیں بتانا چاہتے تو کوئی بات نہیں۔" حذیفہ کی خاموشی پر وہ کافی کا خالی مگ سامنے ٹیبل پر رکھتا ہوا بولا۔ "لیکن اس لڑکی کو یہ ضرور بتا دینا کہ وہ بہت خوش قسمت ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ اس کے پاس تمہارے جیسا دوست موجود ہے۔" محب نے مسکرا کر کہا۔

☼ ☼ ☼

جویریہ نے کافی حد تک خود کو یہاں کے ماحول میں ایڈجسٹ کر لیا تھا اور سب بھول بھال کر پڑھائی میں جُت گئی تھی۔

حذیفہ جب لائبریری میں داخل ہوا تب وہ ایک کتاب ہاتھ میں پکڑے دوسری کی تلاش میں ایک شیلف میں ترتیب سے سجی کتابوں پر انگلی پھیر رہی تھی۔

"ہیلو۔" وہ اسے دیکھ کر اس کے قریب آگیا۔

جویریہ کی کتابوں پر پھرتی ہوئی انگلی ایک دم رک گئی۔ لائبریری کے پرسکون اور خاموش ماحول میں جویریہ کے گالوں پر یکدم پھیلنے والی سرخی حذیفہ کو واضح طور پر نظر آئی۔

جویریہ نے اپنا ہاتھ شیلف سے پیچھے کر لیا۔ کتاب ڈھونڈنے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ساری کتابوں پر لکھے نام اور ان کی شناختی علامات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو چکی تھیں۔

اس ایک رات کے گزر جانے کے بعد صبح کے اجالے نے گمشدہ حواسوں کے علاوہ جویریہ کو جو کچھ لوٹایا تھا' اس میں سرفہرست شرمندگی کا وہ احساس تھا جو ماضی کی کتاب ایک ایسے شخص کے سامنے کھول دینے سے پیدا ہوا تھا جسے وہ چند ماہ قبل جانتی تک نہ تھی۔

حذیفہ کا یہ آخری سمسٹر چل رہا تھا اس کی پڑھائی سے منسلک مصروفیات ان دنوں عروج پر تھیں۔ پر اس وقت کتابوں سے بھری لائبریری کے بیچ کھڑے حذیفہ کو اچانک شک سا ہوا کہ ایک ہی یونیورسٹی میں ہوتے ہوئے' ایک ہی راستوں پر آتے جاتے ہوئے بھی جویریہ سے اتنے دنوں آمنا سامنا نہ ہونے کا سبب اس کی خود کی مصروفیات کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

اگر جویریہ کا خیال تھا کہ وہ باقی ماندہ سمسٹر حذیفہ سے کترا کر گزار سکتی ہے تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ کم از کم حذیفہ کا چھپن چھپائی کے اس حماقت انگیز کھیل میں حصہ لینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"کل تمہارے بابا کو Cardiac centre میں دیکھا تھا۔ میں اور میرے ڈیڈ اپنے ایک آفس ورکر کی عیادت کے لیے گئے تھے جو وہاں پر ایڈمٹ ہیں۔ وہیں تمہارے بابا سے بھی ملاقات ہو گئی۔"

حذیفہ نے ایک شیلف کے ساتھ کندھا ٹکتے ہوئے اتنے عام اور نارمل لہجے میں کہا جیسے وہ شام ان کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہ ہو' جیسے معمول کی گفتگو سے ہٹ کر کوئی بات ان کے درمیان کبھی ہوئی ہی نہ ہو۔

جویریہ کو اس کی موجودگی سے نہ سہی پر اس کے

انداز سے ضرور تسلی ہوئی۔

"یہ ہارٹ کا مسئلہ تمہارے بابا کو کب سے ہے؟" حذیفہ نے جویریہ سے پوچھا۔

"دو سال پہلے پتا چلا تھا۔" اس نے بتایا۔

"علاج یہاں لاہور میں کروا رہے ہیں؟"

"نہیں وہیں راہوالی میں ڈاکٹر سے چیک اپ کرواتے ہیں۔ کبھی کبھار کوئی ٹیسٹ وغیرہ کرانے کے لیے لاہور آنا پڑتا ہے۔" جویریہ نے آہستہ سے کہا۔

لائبریری کی چار دیواری میں ہونے والی گفتگو خود بخود سرگوشیوں کی صورت اختیار کر لیا کرتی تھی۔ لیکن جویریہ کی دھیمی آواز کا سبب صرف اس کی لائبریری میں موجودگی نہیں تھی۔

مسئلہ یہ تھا کہ جس طبقے کی حذیفہ نمائندگی کرتا تھا وہاں لڑکے اور لڑکیوں دوستی یا بات چیت کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا مگر جس ماحول کی جویریہ پیداوار تھی وہاں لڑکیوں کو اس قسم کی کسی بھی سچویشن کو بنا گھبرائے ہینڈل کر لینے کے لیے بالکل تیار نہیں کیا جاتا تھا۔

جویریہ کا خیال تھا کہ اتنا عرصہ یہاں گزار لینے کے بعد اس نے صنف مخالف سے گفتگو کے دوران اپنی گھبراہٹ پر قابو پانا سیکھ لیا ہے لیکن اس کا یہ خیال حذیفہ کے سامنے آجانے پر ہمیشہ غلط ثابت ہو جاتا تھا۔

"پلیز..... میری کلاس شروع ہونے والی ہے۔" جویریہ نے ہاتھوں میں پکڑی کتاب کی جلد پر مضبوطی سے انگلیاں گاڑتے ہوئے سامنے کھڑے حذیفہ سے کہا۔

حذیفہ نے ایک نظر اس چھوٹی سی لڑکی پر ڈالی جو اپنی جان ناتواں پر مصائب کے کتنے بوجھ اٹھائے پھر رہی تھی پھر خفیف سے جھٹکے سے اپنے کندھے کو شیلف سے جدا کیا اور اس کا راستہ چھوڑ کر ہٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا آپ نے پھر لندن کا پروگرام بنا لیا؟" اسمارہ نے دانش سے کہا جو اپنا لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھے ہوئے تھے۔

"آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے میں کام سے نہیں بلکہ تفریح کرنے جا رہا ہوں۔" دانش نے اپنی نظریں لیپ ٹاپ کی اسکرین سے ہٹا کر اسمارہ کی طرف دیکھا۔

"مت کیا کیجیے اتنا زیادہ کام۔ انسان کو کچھ وقت اپنے لیے بھی نکالنا چاہیے۔"

"بس ایک بار حذیفہ کے قدم جم جانے دیجیے آپ کی تمام شکایات دور ہو جائیں گی۔ پھر ہمارا بیٹا کام کرے گا اور ہم دونوں میاں بیوی آرام کریں گے بلکہ ایک وقت وہ ہو گا جب آپ تنگ آ کر کہیں گی کہ خدا کے لیے دانش ہر وقت سر پر مت سوار رہا کیجیے۔ جائیے کچھ کام وام کر کے خود کو مصروف رکھیے۔"

"اس بار کتنے دن کا ٹرپ ہے آپ کا۔" اسمارہ نے موضوع کی طرف واپس آتے ہوئے دانش سے پوچھا۔

"ہفتہ دس دن تو لگ ہی جائیں گے۔" دانش نے کہا تو اسمارہ کا چہرہ اتر گیا۔

"اب تو مان جائیے بیگم صاحبہ کہ آپ میرے بغیر اداس ہو جاتی ہیں۔" دانش نے اسمارہ کی شکل دیکھ کر انہیں چھیڑا۔

"جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ بھلا اتنے آرام سے کیوں ماننے لگیں۔

"چلو! پھر یہ تو اچھا ہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہاں پندرہ بیس دن آرام سے گزارے جا سکتے ہیں۔"

"کیا؟" اسمارہ ان کی بات سن کر اچھل پڑیں۔

"ابھی تو آپ نے ہفتہ دس دن کا کہا تھا۔ یہ پھیل کر پندرہ بیس دن کیسے ہو گئے۔"

"میں تو آپ کی خاطر جلدی واپس آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر آپ کو کوئی مسئلہ نہیں تو میں تسلی سے اپنا کام مکمل کر لوں گا۔" وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اطمینان سے بولے تو اسمارہ انہیں گھورنے لگیں۔

"دانش! آپ..... آپ بہت خراب ہیں۔" اسمارہ کو کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو یہی کہہ دیا۔

دانش قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"اسمارہ! آپ مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش ہی کیوں کرتی ہیں جبکہ آپ کو معلوم بھی ہے کہ آپ ہمیشہ پکڑی جاتی ہیں۔" وہ کرسی سے اٹھ کر اسمارہ کے برابر صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔

"آپ میرے ساتھ لندن کیوں نہیں چلتیں؟" انہوں نے صوفے کی پشت پر بازو رکھتے ہوئے کہا۔

"میں وہاں جا کر کیا کروں گی؟" اسمارہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"آپ اکیلی یہاں رہ کر کیا کریں گی؟ حذیفہ بھی دو چار دنوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ نکل جائے گا۔" انہوں نے الٹا اسمارہ سے سوال کیا۔

"مگر ایسے اچانک۔" وہ آدھی قائل ہو گئیں۔

"آپ ارادہ باندھیے۔ باقی سب انتظامات ہو جائیں گے۔" دانش نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"پھر کیا فیصلہ کیا آپ نے؟ کروں عبدالرحمٰن کو فون؟"

دانش نے اپنے ٹریول ایجنٹ کا نام لیا جو ان کے ٹکٹ وغیرہ کا بندوبست کرتا تھا۔ لیکن اسمارہ کا جواب سننے سے قبل ہی وہ ان کے چہرے پر آمادگی کے آثار دیکھ کر فون کی جانب ہاتھ بڑھا چکے تھے۔

☼ ☼ ☼

عرشی نے تنگ آ کر ٹی وی کا ریموٹ پرے پھینکا۔ دیکھنے لائق ایک بھی پروگرام نشر نہیں ہو رہا تھا۔

"جتنے زیادہ چینل اتنے ہی بوگس پروگرام۔" اس نے بھنا کر سوچا۔ صبح سے اسے یوں بھی ہر بات پر غصہ آ رہا تھا۔ (اب دیکھنے والے کا موڈ ہی خراب ہو تو پروگراموں کا کیا قصور)

عرشی اپنے بستر پر اوندھی ہو کر لیٹ گئی۔ وہ سخت بوریت کا شکار تھی۔ عام طور پر اس کے پاس خود کو مصروف رکھنے کے لیے بہت سے بے کار مشاغل ہوتے تھے جیسے فون پر دوستوں سے لمبی لمبی گفتگو کرنا، اونچی آواز میں میوزک سننا وغیرہ پر اس وقت کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا اور یہ سب حذیفہ کی وجہ سے ہوا تھا۔

پچھلے کئی مہینوں سے اس نے اپنے آخری سمسٹر کو ہوّا بنا کر خود کو مصروف رکھا ہوا تھا۔ اگر کچھ وقت پڑھائی سے بچتا تو اس میں وہ دانش کے ساتھ آفس چلا جاتا۔ عرشی بے چاری کے حصے میں کچھ بھی نہیں آتا پھر بھی عرشی نے اپنی طبیعت کے خلاف، بہت صبر سے کام لیا، یہ سوچ کر کہ کبھی نہ کبھی تو حذیفہ کی ان مصروفیات میں کمی واقع ہو ہی جائے گی۔ پر اتنے مہینوں کے صبر کا پھل اسے کیا ملا؟ امتحان ختم ہوتے ہی حذیفہ اپنے دوستوں کے ساتھ شمالی علاقوں کی سیر کو چلا گیا اور عرشی پیچ و تاب کھاتی رہ گئی۔

کوئی اور وقت ہوتا تو عرشی اپنی گاڑی ہی نکال کر گھوم پھر آتی پر اس وقت گاڑی گیراج میں بند تھی اور اسے وہاں بند کرنے والا بھی حذیفہ ہی تھا۔

عرشی کی مت ماری گئی تھی جو وہ ایک دن حذیفہ کو ساتھ بٹھا کر ڈرائیونگ کرنے نکل پڑی۔ سڑک پر عرشی کی ڈرائیونگ کے کرتب دیکھ کر حذیفہ کے چودہ طبق روشن ہو گئے خاص طور پر تب جب سگنل بند ہو جانے کے باوجود اس کے تیزی سے گاڑی نکالنے پر ایک لنگڑا فقیر گاڑی کی زد میں آنے سے بمشکل بچا جو بتی سرخ ہو جانے کے بعد فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پر بھیک مانگنے کے لیے آ رہا تھا۔

ویسے تو اس لنگڑے فقیر کو عرشی کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا کیونکہ عرشی ہی کی بدولت اسے اپنی ناکارہ ٹانگ کا استعمال واپس مل گیا۔ نہ ملا ہوتا تو وہ بھلا کس طرح اپنے دونوں پیروں پر اچھلتا پھلانگتا فٹ پاتھ پر واپس چڑھ کر اپنی جان بچاتا۔

حذیفہ نے جب پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ ہوا میں ہاتھ لہرا لہرا کر "موئی ڈرائیورن" کا بیڑا غرق ہونے کی بددعائیں دے رہا تھا۔

باقی آئندہ شمارے میں

ہنسایا گیا ہے، رُلایا گیا ہے
ہمیں ہر طرح آزمایا گیا ہے

سماعت کیا جا سکا ہے کسی سے
نہ ہم سے غمِ دل سنایا گیا ہے

بھلا اور عزت افزائی ہو گی
بھری انجمن سے اُٹھایا گیا ہے

نئے رِند اسے قابلِ دید سمجھیں
ہمارا جو حُلیہ بنایا گیا ہے

مسرت کا ایک ایک پل زندگی میں
بڑی خوش دلی سے گنوایا گیا ہے

بچاؤ بکھرنے سے یہ آشیانہ
بہت مشکلوں سے بنایا گیا ہے

شعورؔ ایسے تشریف لائے ہیں گویا
انہیں منتوں سے لایا گیا ہے

انور شعورؔ

میں خیال ہوں کسی اور کا، مجھے سوچتا کوئی اور ہے
سرِ آئینہ میرا عکس ہے، پسِ آئینہ کوئی اور ہے

میں کسی کے دستِ طلب میں ہوں تو کسی کے حرفِ دُعا میں ہوں
میں نصیب ہوں کسی اور کا، مجھے مانگتا کوئی اور ہے

عجب اعتبار و بے اعتباری کے درمیاں ہے زندگی
میں قریب ہوں کسی اور کے، مجھے جانتا کوئی اور ہے

میری روشنی تیرے خدوخال سے مختلف تو نہیں مگر
تو قریب آ تجھے دیکھ لوں تو وُہی ہے یا کوئی اور ہے

تجھے دُشمنوں کی خبر نہ تھی، مجھے دوستوں کا پتا نہیں
تیری داستاں کوئی اور تھی، میرا واقعہ کوئی اور ہے

وہی منصفوں کی روایتیں، وہی فیصلوں کی عبارتیں
میرا جرم تو کوئی اور تھا، پر میری سزا کوئی اور ہے

سلیم کوثر

اندیشۂ زوال سے آگے نہیں گیا
دیکھا میں کس کمال سے آگے نہیں گیا

شاید مرا خیال حقیقت شناس تھا
یعنی ترے جمال سے آگے نہیں گیا

اعمال کا حساب وہ لینے کو آئے تھے
لیکن میں قیل و قال سے آگے نہیں گیا

دُنیا بدل گئی مگر آیا نہیں جواب
میں ایسے اک سوال سے آگے نہیں گیا

بس دُور دُور ہی سے بہلتا رہا یہ دل
جانے کس احتمال سے آگے نہیں گیا

شاید وہ آرہے ہوں مجھے ڈھونڈتے ہوئے
میں بس کچھ اس خیال سے آگے نہیں گیا

دکھ سکھ میں کیا وہ ساتھ نبھاتا جو عمر بھر
اپنی ہی دیکھ بھال سے آگے نہیں گیا

عین سلام

میرے پروردگار!
مجھے سخن وری عطا کر
لفظوں کی جادوگری عطا کر
مجھے مہکنے کا ہُنر دے
جو دِلوں پر نقش ہو جائے
میری بات میں ایسا اثر دے
جو مٹا دے تیرہ شبی
ذہن و دل کی
مجھے بس!
اک ایسے حرف کی روشنی دے

شبانہ یوسف

وضاحت ضروری ہے

دینو لوہار نے اپنے نئے شاگرد کو گھوڑے کی نعل بنانا سکھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو کالے یہ لوہا بھٹی میں تپ کر لال ہو چکا ہے۔ اب میں اسے اہرن پر رکھوں گا۔ جب میں سر ہلاؤں تو تم اس پر ہتھوڑا دے مارنا۔"

دینو لوہار نے سر ہلایا۔

اور کالے نے سچ مچ ہتھوڑا دے مارا۔

لوہے پر نہیں دینو لوہار کے سر پر۔

(سونیا ربانی..... قاضیاں محلہ بالا)

نوکری پکی

"میرا خیال ہے کہ باس نے مجھے مستقل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" ایک نئی اسٹینو گرافر نے اپنی سہیلی کو بتایا۔

"کیوں، باس نے کچھ کہا ہے اس بارے میں؟" سہیلی نے پوچھا۔

"نہیں، باس نے آج میرے لیے ڈکشنری منگوائی ہے۔" اسٹینو گرافر نے خوشی خوشی بتایا۔

(یاسمین ظفر..... اقبال ٹاؤن لاہور)

بلاوا

بیوی سے عاجز ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا۔ "بیگم! میں چاہتا ہوں کہ سکون قلب کے لیے کوئی مقدس سفر اختیار کروں۔"

بیوی نے فوراً تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نیک کام میں دیر کیسی، چلیے! میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔" خاوند نے کچھ دیر سوچا، پھر کہنے لگا۔ "نہیں رہنے دو، مجھے لگتا ہے ابھی بلاوا نہیں آیا۔"

ابھی مجھے مزید اپنے گناہوں کی سزا ملنی ہے۔"

(نسرین اختر..... سائٹ ایریا کراچی)

چیدہ چیدہ

☆ پکنک پر جانے والے طلبہ کے لیڈر نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

"تمہاری ٹیکسی میں ہم ساتوں دوست آرام سے بیٹھ سکیں گے یا تم پیدل چلنا پسند کرو گے؟"

☆ ایک سردار جی جو لفن باکس دفتر لے کر جاتے ہیں، اسے کئی بار آتے جاتے کھول کر دیکھتے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ دفتر جا رہے ہیں یا دفتر سے آ رہے ہیں۔

★ "آپ احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہیں۔" ماہر نفسیات نے مریض کو تسلی دی۔ "بلکہ آپ خود کمتر ہیں۔"

☆ وہ کیک پر سالگرہ مبارک لکھنا چاہتا تھا۔ مگر تین گھنٹے کی مشقت کے بعد بھی وہ کیک کو ٹائپ رائٹر پر نہیں چڑھا سکا۔

☆ ایک شخص کا تجربہ ہے کہ مٹھائی پر مکھیاں اور سامان آرائش و زیبائش پر خواتین کی تعداد یکساں ہوتی ہے۔

☆ وہ تین بلاک تک چھڑکاؤ کرنے والی گاڑی کے پیچھے دوڑتا رہا تھا، تاکہ ڈرائیور کو بتا سکے کہ اس کے ٹرک کا نل ٹپک رہا ہے۔

☆ ایک احمق آدمی اپنی بیوی کو گر کی بات بتا رہا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو گرم پانی میں جلنے سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے پانی میں ہاتھ ڈال کر اسے چیک کر لو۔

(ماہم صلاح الدین..... میٹروول کراچی)

اعصابی تکلیف

دو دوست باتیں کر رہے تھے۔ پہلے دوست نے کہا۔

"یار! تمہاری بیگم کی اعصابی تکلیف کا کیا حال ہے؟"

دوسرا دوست۔ "اب تو خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ہے۔"

پہلا دوست۔ "لگتا ہے کوئی اچھا ڈاکٹر مل گیا۔ کیا نسخہ لکھا تھا اس نے؟"

دوسرا دوست۔ "نسخہ تو اس نے کوئی نہیں لکھا۔ بس اتنا کہا کہ اعصابی تکلیف بڑھاپے کی علامت ہوتی ہے۔ یہ سن کر ہی میری بیوی تندرست ہو گئی۔"

(کومل عدنان..... گلستان جوہر)

جانچ پڑتال

حامد نے اپنے پڑوسی سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ "سنا ہے... اکبر خان کے ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئی ہیں، یہ حادثہ کیسے ہوا؟"

"اس نے یہ دیکھنے کے لیے گھوڑے کے منہ میں ہاتھ ڈالا تھا کہ اس کے کتنے دانت ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟" حامد نے پوچھا۔

"گھوڑے نے یہ جاننے کے لیے اچانک منہ بند کر لیا کہ اکبر خان کے ہاتھ میں کتنی انگلیاں ہیں۔" پڑوسی نے جواب دیا۔

(عروسہ شہوار..... کالا گوجراں)

نرالی منطق

ہٹلر کے وزیر اطلاعات ڈاکٹر گوئبلز نے ایک بار ایک بوڑھے یہودی عالم سے کہا۔ "ربی! میں نے سنا ہے کہ تم یہودی لوگ اپنی مذہبی کتاب کی بنیاد پر ایک خاص قسم کی منطق استعمال کرتے ہو، جس سے تم لوگوں کی زیرکی کا اظہار ہوتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے بھی یہ علم سکھاؤ۔"

ربی نے کہا۔ "اچھی بات ہے، میں پہلے تمہارا امتحان لیتا ہوں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ دو آدمی ایک چمنی میں گر پڑتے ہیں، ان میں سے ایک کالک سے سیاہ ہو جاتا ہے، مگر دوسرا بے داغ رہتا ہے۔ یہ بتایئے کہ ان میں سے کون نہائے گا؟"

"جو کالک سے سیاہ ہو گیا ہے۔" گوئبلز نے جواب دیا۔

"غلط۔ جو بے داغ رہا، وہ نہائے گا۔" ربی نے فوراً کہا۔

"وہ کیوں؟" گوئبلز نے تعجب سے پوچھا۔

"اس لیے کہ دونوں آدمی گرتے ہی ایک دوسرے کو دیکھیں گے۔ کالک سے سیاہ ہو جانے والا آدمی بے داغ کو دیکھ کر سوچے گا کہ چمنی میں گرنے کے باوجود وہ بے داغ ہے جبکہ بے داغ آدمی کالک سے سیاہ ہونے والے آدمی کو دیکھ کر یہ خیال کرے گا کہ ہم دونوں کالک سے سیاہ ہو گئے ہیں، چنانچہ وہ پہلی فرصت میں نہانے کی کوشش کرے گا۔"

"جواب نہیں۔" گوئبلز نے تعریفی انداز میں کہا۔ "دوسرا سوال کیا ہے؟"

"دوسرا سوال یہ ہے کہ دو آدمی ایک چمنی میں گر پڑتے ہیں۔ ان میں سے ایک کالک سے سیاہ ہو جاتا ہے، مگر دوسرا بے داغ رہتا ہے، اب یہ بتائیں کہ ان میں سے کون..."

"یہ تو وہی سوال ہے۔" گوئبلز نے ربی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں یہ علیحدہ سوال ہے۔" ربی نے کہا۔

"اچھی بات ہے تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ جواب یہ ہے کہ بے داغ آدمی نہائے گا۔"

"غلط۔" ربی نے فوراً کہا۔

"مگر ابھی تو تم نے کہا تھا۔"

"وہ مسئلہ اور تھا۔ اس بار کالک لگا آدمی نہائے گا، کیونکہ پہلے ہی کی طرح دونوں آدمی ایک دوسرے کو

دیکھیں گے۔ بے داغ آدمی سیاہ ہوجانے والے آدمی کو دیکھ کر سوچے گا کہ وہ گندا ہوگیا ہے مگر جب اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑے گی تو اسے یقین ہوجائے گا کہ وہ گندا نہیں ہوا۔ دوسری طرف کالک سے سیاہ آدمی بے داغ آدمی کو دیکھ کر اس بات پر تعجب کرے گا کہ وہ آدمی چمنی میں گر کر بھی بے داغ کیسے رہا' پھر سوچے گا کہ کیا میں بے داغ ہوں؟ مگر اپنے ہاتھوں کو دیکھ کر وہ سمجھ لے گا کہ وہ اس آدمی کی طرح بے داغ نہیں ہے' لہٰذا فطری طور پر وہ آدمی نہائے گا۔"

"بہت خوب۔ واقعی جواب نہیں تمہاری منطق کا۔ اب تیسرا سوال پوچھو۔"

"تیسرا سوال سب سے مشکل ہے۔ دو آدمی ایک چمنی میں گر پڑتے ہیں' ان میں سے ایک......"

"مگر یہ تو وہی سوال ہے۔" گونبلز نے کہا۔

"نہیں۔ الفاظ ضرور وہی ہیں' لیکن مسئلہ بالکل نیا ہے۔" ربی نے کہا۔

"تو جواب یہ ہے کہ کالک سے سیاہ ہوجانے والا نہائے گا۔" گونبلز نے کہا۔

"غلط۔" ربی نے پھر کہا۔

"بے داغ آدمی نہائے گا۔"

"غلط۔"

"تو پھر صحیح جواب کیا ہے؟"

"صحیح جواب یہ ہے کہ یہ سوال ہی احمقانہ ہے۔" یہودی عالم نے کہا۔ "یہ کیسے ممکن ہے کہ دو آدمی ایک ساتھ ہی چمنی میں گریں اور ان میں سے ایک کالک سے سیاہ ہوجائے' مگر دوسرا بالکل بے داغ رہے؟ جو آدمی یہ چھوٹی سی بات نہیں سمجھ سکتا' وہ ہماری منطق کیا سمجھے گا؟"

(نمرہ رزاق ..... ڈیفنس)

ایمان دار دکان دار

سات مختلف دکانوں پر اپنی گمشدہ کتاب تلاش کرنے کے بعد غائب دماغ پروفیسر آٹھویں دکان سے کتاب حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

"بہت بہت شکریہ۔" انہوں نے دکان دار سے کہا۔ "پورے شہر میں بس ایک تم ہی ایمان دار ہو۔ تمہارے علاوہ میں جس دکان پر بھی گیا' انہوں نے یہی کہا کہ آپ کی کتاب یہاں نہیں ہے۔"

(فائزہ ..... کراچی)

اب فرمایئے....

ایک خاتون نے میڈیکل اسٹور سے کسٹر آئل طلب کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اسے پیتے وقت اس کا ذائقہ محسوس نہ ہو؟"

"آپ اسے ٹیوب کے ذریعے پی سکتی ہیں۔ ویسے ذرا رکیے! میں کوئی اور طریقہ دیکھ کر بتاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ایک موٹی سی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔ خاتون وقت گزاری کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں تو اس نے ایک گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"جب تک آپ لیمن جوس نوش فرمائیں۔"

خاتون نے مسکرا کر دیکھا اور لیمن جوس پینے لگیں۔ دکان دار مطالعے میں مصروف ہوگیا۔ خاتون نے گلاس خالی کرکے میز پر رکھا تو دکان دار نے کتاب بند کرکے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اب فرمایئے! ذائقہ محسوس ہوا؟"

"لیکن مجھے تو کسٹر آئل اپنی والدہ کے لیے چاہیے تھا۔" خاتون نے حیرت سے کہا۔

(رخسار ظفر ..... لاہور)

نشانہ باز

ایک ماہر نشانہ باز کے پاس ایک اخباری نمائندہ انٹرویو کرنے گیا۔ کمرے میں بہت سی آنکھیں بنی ہوئی تھیں اور ہر آنکھ پر صحیح نشانہ لگا تھا۔ اخباری نمائندے نے نشانوں سے متاثر ہوتے ہوئے پوچھا۔

"آخر آپ اتنا اچھا نشانہ کس طرح لگالیتے ہیں؟"

"یہ کون سا مشکل کام ہے' پہلے نشانہ لگاتے ہیں اور پھر اس نشانے پر آنکھ بنالیتے ہیں۔"

(نمرہ سعید ..... اوکاڑہ)

شگفتہ جاہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن بریدہ اپنے والد حضرت بریدہ بن حصیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک نوجوان لڑکی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا۔

"میرے والد نے میرا نکاح اپنے بھتیجے سے کردیا ہے تاکہ میرے ذریعے سے اس کا مقام بلند ہوجائے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکی کو (نکاح فسخ کرنے کا) اختیار دے دیا۔

اس نے کہا۔ "میں اپنے والد کے کیے نکاح کو قبول کرتی ہوں لیکن میں چاہتی ہوں کہ عورتوں کو معلوم ہوجائے کہ ان کے باپوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔"

فوائد و مسائل:۔

1۔ "تاکہ میرے ذریعے سے اس کا مقام بلند ہوجائے۔" اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میرے والد نادار ہیں اور ان کا بھتیجا خوشحال ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس رشتے کی وجہ سے انہیں بھی مالی فوائد حاصل ہوجائیں اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ بھتیجا نادار ہے۔ میرے والد صاحب میرا رشتہ دے کر اس کا مقام بلند کرنا چاہتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھ کر اس کی عزت کریں کہ یہ فلاں صاحب کا داماد ہے۔

2۔ والدین کو بھی لڑکی کی رضامندی کے بغیر بالجبر ایسی جگہ نکاح کردینے کی اجازت نہیں، جو اسے پسند نہ ہو۔

3۔ ایسی صورت میں لڑکی کو نکاح فسخ کرنے کی اجازت ہے۔

(ابن ماجہ)

تقدیر پر اور اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا،

جو اللہ کے فیصلے پر راضی ہوگا تو اللہ نے جو فیصلہ کیا ہے' وہ تو ہوکر رہے گا لیکن اسے (اس پر راضی ہونے کی وجہ سے) اجر ملے گا اور جو اس پر راضی نہ ہوگا تو بھی اللہ کا فیصلہ ہوکر رہے گا لیکن اس کے نیک عمل ضائع ہوجائیں گے۔"

(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

حضرت عثمان بن عفان کا زہد،

حضرت شرجیل بن مسلم رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

"خلیفہ سوئم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہہ لوگوں کو خلافت والا عمدہ کھانا کھلاتے اور خود گھر جاکر سرکہ اور تیل یعنی سادہ کھانا کھاتے۔"

حضرت عمر فاروق نے فرمایا،

- اپنی اولاد کو تیراکی، تیر اندازی اور گھوڑے کی سواری کی تعلیم دو اور انہیں تاکید کرو کہ وہ کسی کی بے آبروئی نہ کریں۔
- اے لوگو! اللہ کا ذکر کیا کرو کہ اس میں شفا ہے اور لوگوں کے عیب بیان نہ کرو' اس میں بیماری ہے۔
- تین چیزیں محبت بڑھانے کا ذریعہ ہیں۔ سلام کرنا، مخاطب کو بہتر انداز سے پکارنا، دوسروں کے لیے مجلس میں جگہ خالی کرنا۔
- اپنے دوست کے حال کو اچھی صورت پر محمول کیا کرو۔ اپنے دشمن سے کنارہ کش رہو، اپنے معاملات میں مشورہ اُن لوگوں سے کرو جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔

حنا سلیم اعوان۔ آخون باندی ہری پور

عدل وانصاف

حضرت علی بن ربیعہ کہتے ہیں۔ حضرت جعدہ بن ہبیرہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں آکر کہا۔

"اے امیر المومنین! آپ کے پاس دو آدمی آئیں گے ان میں سے ایک کو تو اپنی جان سے بھی زیادہ آپ سے محبت ہے یا یوں کہیے اپنے اہل وعیال اور مال ودولت سے بھی زیادہ محبت ہے اور دوسرے کا بس چلے تو آپ کو (خدانخواستہ) ذبح کردے۔ اس لیے آپ دوسرے کے خلاف پہلے کے حق میں فیصلہ کریں۔"

اس پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت جعدہ بن ہبیرہ کے سینے پر مکا مارا اور فرمایا۔

"اگر یہ فیصلے اپنے آپ کو راضی کرنے کے لیے ہوتے تو میں ضرور ایسا کرتا لیکن یہ فیصلے تو اللہ کو راضی کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔" (اس لیے میں تو حق کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ اب وہ فیصلہ جس کے حق میں چاہیے، ہوجائے)

(حیاۃ الصحابہ۔ جلد دوئم)

حضرت علی بن ابی طالب کا زہد

حضرت عبداللہ بن شریک کے دادا بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی بن ابی طالب کے پاس ایک مرتبہ فالودہ لایا گیا اور ان کے سامنے رکھا گیا تو آپ نے فالودے کو مخاطب کرکے فرمایا۔

"اے فالودے! تیری خوشبو بہت اچھی ہے اور رنگ بھی بہت خوبصورت ہے اور ذائقہ بھی بہت عمدہ ہے مگر مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ مجھے جس چیز کی عادت نہیں ہے، میں خود کو اس کا عادی بناؤں۔"

صحابہ کرام کو برا کہنا

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو میرے صحابہؓ کو برا کہے گا، اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہوگی۔"

اچھی بات

ایک گھنے درخت کے نیچے چند لوگ ہمیشہ خاموش رہا کرتے تھے۔ ایک شخص ہر روز وہاں سے گزرتا تھا اور ان کو دیکھتا تھا۔ آخر ایک روز اس شخص نے خاموش بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا۔

"ہر روز میں یہاں سے گزرتا ہوں۔ آپ لوگ ہمیشہ خاموش بیٹھے ہوتے ہیں۔ کیا آپ لوگوں کی آپس میں دشمنی ہے جو ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے؟"

ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

"جب ہمیں اس خاموشی سے اچھی کوئی بات ملے گی، تو ہم ضرور بات کریں گے۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

شکر

نعمت ملنے پر فوراً اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ شکر ادا کرنے سے نعمت اور بڑھتی ہے۔ شکر اور نعمت کا ملنا ایک ہی رسی میں بندھے ہوئے ہیں۔ جب بندہ شکر ادا کرنا چھوڑے گا تب اللہ کی طرف سے نعمت کا بڑھنا بند ہوگا۔"

(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

سوچ کا دروا ہوا ہے

- جب کبھی دل بھر آئے تو رو لو جیسے آسمان پر چھائے ہوئے بادل برستے ہیں کیونکہ اس کا نتیجہ ایک چمکتا اور ابھرتا ہوا سورج ہے۔
- گناہ کرنے کے ساتھ ساتھ خدا کی رحمت کی امید رکھنا بدقسمتی کی علامت ہے۔
- خواہشات تاریک جنگل ہیں جس میں بھٹکتے بھٹکتے عمر بیت جاتی ہے مگر منزل کا راستہ نہیں ملتا۔
- تمناؤں کو دل میں کبھی جگہ مت دو، یہ گہرے زخم ہیں جو ہمیشہ ہرے رہتے ہیں۔
- غلطیاں بے وقوف اور عقل مند دونوں سے ہوتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ایک کو آخر تک احساس نہیں ہوتا اور دوسرے کو فوراً ہوجاتا ہے۔
- عیاری چھوٹے کمبل کی طرح ہے۔ سر چھپاؤ تو پاؤں ننگے ہونے لگتے ہیں۔

- لوگ اونچے پہاڑوں سے نہیں ہمیشہ کنکریوں سے پھسلتے ہیں۔

حرمت رضا اکرم۔ ڈوال

زبان

- عقل مند شخص وہ ہے کہ جو اپنی زبان کو دوسروں کی مذمت سے بچائے۔ (افلاطون)
- جب آدمی بہت زیادہ بولنے لگتا ہے تو سوچ کا آدھا قتل ہوجاتا ہے۔ (خلیل جبران)
- تلخ لہجہ تلوار کا اثر رکھتا ہے (سیکسپئر)
- باتونی لوگوں کی زبان ان کے قابو میں نہیں رہتی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بولتے ہیں۔ (ٹموتھی)
- کوڑے کی مار انسان کے جسم پر پڑتی ہے لیکن زبان کی مار روح کو تڑپا دیتی ہے۔ (سینٹ میتھیو)
- زیادہ باتونی شخص پڑھنے کی طرف کم توجہ دیتا ہے۔ (ارسطو)

عظمیٰ رئیس احمد۔ ٹنڈو آدم

اطاعت

حضرت ابراہیم ابن ادھمؒ فرماتے ہیں میں بکریوں کے ایک چرواہے کے پاس گیا اور کہا۔

"تمہارے پاس کچھ پانی یا دودھ ہے؟"

اس نے کہا۔ "ہاں ہے۔"

میں نے پانی مانگا۔ اسی وقت اس نے اپنی لکڑی نہایت سخت پتھر پر ماری تو اس میں سوراخ ہوگئے۔ اور پانی بہنے لگا۔ میں نے پانی پیا تو برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ میٹھا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ انہوں نے کہا۔

"تعجب نہ کرو۔ جب بندہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو ہر چیز اس کی اطاعت کرتی ہے۔"

مہوش ڈوگر۔ گوجرانوالہ

اقوال مفکرین

- کوئی شخص تم سے اس وقت تک متاثر نہیں ہوسکتا جب تک تمہارے دلی جذبات تمہارے لہجے میں اثر نہ کریں۔ (لارڈ)
- اللہ ہر طائر کو رزق دیتا ہے مگر اس کے گھونسلے میں نہیں ڈالتا۔ (افلاطون)
- علم سے آدمی کی دیوانگی اور وحشت دور ہوتی ہے۔ (بیکن)
- سیدھی اور صاف بات کہنے سے نقصان بہت تھوڑا مگر فائدہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ (لارڈ میکالے)
- جو گناہ کا مرتکب ہوا اسے آدمی سمجھو اور جو گناہ کرکے اترائے اسے شیطان سمجھو۔ (بوعلی سینا)
- آدمی آزاد پیدا ہوا لیکن ہر جگہ زنجیروں میں ہے۔ (روسو)
- انسان آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے درمیان لٹکا ہوا پنڈولم ہے۔ (بائرن)

لاریب عروج عندلیب۔ وہاڑی

محبت اور جنگ

ایک دفعہ ایک سپاہی نے ٹیپو سلطان سے پوچھا۔

"کیا محبت اور جنگ میں سب جائز ہے؟"

ٹیپو سلطان نے کہا۔ "ہرگز نہیں۔ یہ انگریزوں کا قول ہے۔ ہم تو کہتے ہیں محبت اور جنگ میں جو کچھ ہو۔ وہ جائز ہو۔"

حضرت علیؓ کا قول

انسان کبھی دھوکا نہیں دیتے بلکہ انسانوں سے وابستہ توقعات ہمیں دھوکا دیتی ہیں۔

سیدہ نوبا سجاد۔ کہروڑ پکا

شاعری سچ بولتی ہے

حمیرا اشرف

میرا اور شاعری کا تعلق "شعاع" سے چند سال پرانا ہے۔ چونکہ تقریری مقابلوں میں حصہ لیتی تھی اور ہر تقریر کا آغاز شعر سے ہوتا تھا بس تب سے شاعری کو جاننا شروع کر دیا۔ شاعری کی ابتدا رب ذوالجلال کی عظمت بیان کرتے ہوئے ایک شعر سے کرتی ہوں جس میں شاعر ایمان والوں کو کچھ احساس بھی دلا رہے ہیں۔ اگر ہم سمجھ سکیں تو.....

وہ چاہے تو ملا دے آسمانوں سے زمینوں کو
وہ چاہے تو ہواؤں سے لا دو لائیں بحر طوفانوں کو
وہ چاہے تو مٹا ڈالے مکانوں کو مکینوں کو
مگر کچھ بیشتر اس سے جھکا دو تم جبینوں کو

ایک نعت کے کچھ اشعار جو بہت اچھے لگتے ہیں مجھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کرتی ہوں۔

کبھی ان کی خدمت میں جاکے تو دیکھو
در مصطفیٰ کھٹکھٹا کے تو دیکھو
جواب صدا تم کو فوراً" ملے گا
انہیں صدق دل سے بلا کے تو دیکھو
تڑپ کے لپٹ جاؤ قدموں سے ان کے
میرا مشورہ آزما کے تو دیکھو

"شعاع" آنے لگا گھر میں تو شاعری سے دوستی بڑھتی چلی گئی۔ مگر اس سے پہلے اخبار اور اپنے والد کی ڈائری سے کچھ شاعری پڑھی۔ شاعروں پر تعریفی تبصرے تو سب ہی کرتے ہیں۔

سب سے پہلے جو چیز میری سمجھ میں آئی وہ میں نے آٹھویں جماعت میں پڑھی تھی۔ علامہ ذوقی کی ایک نظم آپ بھی پڑھیں۔

جب یادوں کی رت آتی ہے
ارمانوں کو تڑپاتی ہے
نیند کی پریاں اڑ جاتی ہیں
رات کی ناگن لہراتی ہے
آنکھیں پتھر بن جاتی ہیں
روح بدن میں گھبراتی ہے
میں خود سے باتیں کرتا ہوں
جب تنہائی ستاتی ہے
ذہن میں سوچیں چبھتی ہیں تو
حسرت آنسو بن جاتی ہے
درد کی آہٹ دل میں آکر
ہوش اڑا کر لے جاتی ہے
ایک دن تم سے ملیں گے ہم
گردش دوراں سمجھاتی ہے

اس کے بعد اسی جماعت میں ایک دوست کی کاپی پہ بے حد خوب صورت تحریر میں ناصر کاظمی کی ایک نظم پڑھی۔ جو مجھے حد سے زیادہ پسند ہے۔

مجھ کو اور کہیں جانا تھا
بس یونہی رستہ بھول گیا تھا
دیکھ کے تیرے دیس کی رچنا
میں نے سفر موقوف کیا تھا
کیسی اندھیری شام تھی اس دن
بادل بھی گھر کر چھایا تھا
رات کی طوفانی بارش میں
تو مجھ سے ملنے آیا تھا
ماتھے پر بوندوں کے موتی
آنکھوں میں کاجل ہنستا تھا
چاندی کا ایک پھول گلے میں
ہاتھ میں بادل کا ٹکڑا تھا
بھیگے کپڑوں کی لہروں میں
کندن سونا دمک رہا تھا
بارش کی ترچھی گلیوں میں
کوئی چراغ لیے پھرتا تھا
بھیگی بھیگی خاموشی میں ناصر
میں تیرے گھر تک آیا تھا

پھر میری بڑی بہن نے "خوشبو" خریدی۔ پروین شاکر کو پڑھا۔ صنف نازک کے ہر جذبے کو وہ بڑے خوب صورت انداز میں بیان کرنے کا ہنر رکھتی تھیں، جیسے اس نظم میں کہتی ہیں۔

جانے سے پہلے
اس نے میرے آنچل سے ایک

فقرہ باندھ دیا
آئی ول مس یو
پھر سارا سفر
خوشبو میں بسا رہا

ان کی زیادہ تر نظمیں جو مجھے پسند ہیں، وہ وقتاً" فوقتاً" رسالے میں آتی ہی رہتی ہیں مگر ان کے ایک دو شعر زیادہ ہی پسند ہیں، وہ سنیں۔

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی

★ ★ ★

اس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

نویں کلاس میں فیض احمد فیض کی غزل "نہ گنواؤ ناوک نیم کش" پڑھی۔ بہت ٹھہرے سے انداز میں گہری بات کرنا ان کا خاصا ہے ان کی سب غزلوں، نظموں میں میری پسند حاضر خدمت ہے۔

پریم گتھا کا انت نہ کوئی
کتنی بار اسے دہرائیں
پریت کی ریت انوکھی ساجن
کچھ نہ مانگیں سب کچھ پائیں
فیض ان سے کیا بات چھپی ہے
ہم کچھ کہہ کر کیوں پچھتائیں

امجد اسلام امجد اور قتیل شفائی کو بہت دیر میں پڑھا۔ امجد اسلام امجد محبت کے جذبوں کو بڑی گہرائی سے بیان کرتے ہیں۔ میری پسندیدہ غزل جو میں نے تین سال پہلے پڑھی اور بے اختیار امجد صاحب کو داد دینے کو دل چاہا۔

کوئی موسم ہو دل میں ہے تمہاری یاد کا موسم
کہ بدلا ہی نہیں جاناں تمہارے بعد کا موسم
نہیں تو آزما کے دیکھ لو! کیسے بدلتا ہے
تمہارے مسکرانے سے دل ناشاد کا موسم
کہیں سے اس حسین آواز کی خوشبو پکارے گی
تو اس کے ساتھ بدلے گا دل ناشاد کا موسم
نہ کوئی غم خزاں کا ہے نہ خواہش ہے بہاروں کی
ہمارے ساتھ ہے امجد کسی کی یاد کا موسم

اب قتیل شفائی کی ذرا سی دل شکستہ نظم پڑھیے۔

لہو لہو ہے آرزو
کبھی گماں، کبھی یقین
قدم کہیں، نظر کہیں
جب ہوش میں بھی رہیں، بے خودی سی لگتی ہے
یہ زندگی کبھی کبھی اجنبی سی لگتی ہے

محبت ازل سے ادھوری رہتی ہے اس کا مقدر صرف سہانے خواب ہیں جو جاگتی آنکھوں میں بستے ہیں اور رت جگے ہیں۔ فرحت عباس شاہ کی یہ نظم بھی محبت کی اسی محرومی پر ہے۔

محبت کی ادھوری نظم

بے شمار باتوں کی تلخیوں سے بہتر ہے
ایک ہی شکایت ہو

بے شمار راتوں کی بے کلی سے بہتر ہے
ایک ہی اذیت ہو
بے شمار ذلتوں کی کج روی سے بہتر ہے
ایک ہی محبت ہو

میں نے سندھی شاعری بھی پڑھی اور شاعروں کے انداز بیاں کو بے اختیار داد دینے کو جی چاہا۔ سچل سرمست اور شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بہت خوب صورت کافیاں اور غزلیں کہیں۔ ان کی ایک غزل جس کو اردو میں بھی ترجمہ کر کے پیش کیا گیا وہ حاضر ہے۔

جب پیا ملن کو جاؤں
میں برکھا رت بن جاؤں
نینوں سے نیر بہاؤں
جب پیا ملن کو جاؤں
کاٹوں دن رات سفر میں
انجانی پریت ڈگر میں
میں لوٹ کے پھر نہ آؤں
جب پیا ملن کو جاؤں
ہر وقت لطیف ہے کہتا
مجھ کو ہے دھیان اسی کا
میں گیت اسی کے گاؤں
جب پیا ملن کو جاؤں

چاہت میں ایک مقام "فراق" ہوتا ہے۔ اب چاہے وہ عمر بھر کا ہو یا کچھ لمحوں کا۔ مگر دونوں صورتوں میں ہی اس کے لیے سب سے مشکل رات بسر کرنا ہوتی ہے۔ یادوں اور ارمانوں کی چادر اوڑھے رات کی تاریکی اس جدائی کے احساس کو دوچند کر دیتی ہے اور یوں کرب میں ہی رات کٹ جاتی ہے۔ اس غزل میں بھی کسی کے احساس کو زبان میں ڈھالا ہے شاعر نے۔

رات کٹتی رہی چاند جلتا رہا
آتش ہجر میں کوئی جلتا رہا
تنہائی دل کو ڈستی رہی
کوئی بے چین کروٹ بدلتا رہا
آس و امید کی شمع روشن رہی
گھر کی دہلیز کو کوئی تکتا رہا
رات بھر چاندنی گنگناتی رہی
رات بھر کوئی تنہا سسکتا رہا
اشک پلکوں پہ آ کر بکھرتے رہے
نام لب پہ کسی کا لرزتا رہا
آج پھر رات بسر ہو ہی گئی!
آج پھر کوئی خود سے الجھتا رہا

نام ہے میرا حمیرا اشرف۔ انڈر گریجویٹ ہوں۔ شاعری اور رسالے پڑھنے کے علاوہ بولنا اور گنگنانا میرا مشغلہ ہے۔ ہر طرح کی کتابیں پڑھتی ہوں۔ دوستوں سے خط و کتابت 'پڑھنے 'پڑھانے میں دن رات صرف کرتی ہوں۔ زندگی کے بہت سے تجربے بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو یقین ہو گیا کہ شاعری میں بھی لفظ لفظ سچا اور کھرا ہوتا ہے۔ بہت سے رشتوں میں سے "دوستی" کو پسند کرتی ہوں۔ کیونکہ یہ ایک بے غرض اور بے تکلف رشتہ ہے۔

آپ کو میرا انتخاب کیسا لگا؟ ضرور بتایئے گا۔ آپ کے شہر کراچی سے کوسوں میل دور عارف والا شہر میں بیٹھی آپ کی رائے اور اپنے انتخاب کے چھپنے کی منتظر رہوں گی۔

آپ کے اور اپنے شعاع کے نام یہ دعا اور میری طرف سے خدا حافظ۔ اللہ تعالیٰ سب کا حامی و ناظر ہو (آمین)

میرا لفظ لفظ
دعا دعا
میرے آنسوؤں سے دھلا ہوا
تمہیں زندگی کی سحر ملے
تمہیں خوشبوؤں کا سفر ملے
تم پہ درد غم کبھی نہ پڑے
تم پہ خوشیوں کی برسات ہو
اور طویل تیری حیات ہو۔
(آمین)

کھلتا کسی کا کیوں مرے دل کا معاملہ

خالدہ جیلانی

راضیہ شریف ________ آخون بانڈی

ضرورت توڑ دیتی ہے غرور بے نیازی کو
نہ ہوتی کوئی مجبوری تو ہر بندہ خدا ہوتا

شمیم شمشاد احمد ________ شکارپور

اس قدر دنیا کے دکھ اے خوبصورت زندگی
جس طرح تتلی کوئی مکڑی کے جالوں میں رہے

آمنہ اُجالا ________ ڈہرکی

کرم کی بھیک نہ دے اپنا تخت بخت سنبھال
ضرورتوں کا خدا تو فقیر ہم بھی نہیں
ہماری ڈوبتی نبضوں سے زندگی نہ مانگ
سخی تو ہیں مگر اتنے امیر ہم بھی نہیں

حرمت ردا اکرم ________ ڈلوال

میرے کمرے میں پڑے ہیں میری قسمت کے نجوم
ہر طرف بکھرے رسالے اور کتابوں کا ہجوم
اب جگہ کافی نہیں ہے میرے رہنے کے لیے
میں نے کتنا پڑھ لیا ہے کچھ نہ کہنے کے لیے

سحر خان ________ کوئٹہ

دل شکستہ آج رو رہا ہے بہت
ہم نے ہی وقت کو گنوایا ہے بہت
تو بدگمان ہے ہم سے اس کا دکھ نہیں
ہم نے ہی تیری محبت کو آزمایا ہے بہت

نمرہ، اقراء ________ کراچی

نہیں چاہا کسی کو تیرے سوا
تم نے ہم کو بھی پارسا رکھا

صبا سلیم ________ ٹنڈو جان محمد

رکن بے دلوں میں پھینک دیا حادثات نے
آنکھوں میں جن کی نور، نہ باتوں میں تازگی
بول اے میرے دیار کی سوئی ہوئی زمیں
میں جن کو ڈھونڈتا ہوں کہاں ہیں وہ آدمی

عذرا ناصر ________ کراچی

کرو پھر سے کوئی وعدہ کبھی نہ بچھڑنے کا
تمہیں کیا فرق پڑتا ہے بچھڑنے میں مکرنے میں

مسرت الطاف احمد ________ کراچی

ابھی کچھ دیر باقی ہے خزاں کے بیت جانے میں
خوشی کے گیت گانے میں بہاروں کے زمانے میں
سحر کے جگمگانے میں تمہارے لوٹ آنے میں
گلوں کے مسکرانے میں بہاروں کے زمانے میں

زوباریہ خالد ________ لاہور

سُنا تھا دل سمندر سے بھی گہرا ہوتا ہے ناصر
پھر کیوں نہیں سمایا اس میں کوئی اور اس کے سوا

ملیحہ طاہر ________ جھبراں

سوچ میں فاصلے در آئیں تو پھر چاہت بھی
پاس لے آنے میں ہو جاتی ہے ناکام بہت

کنول معشوق ________ کوٹ غلام محمد

جب سے تیرے نام کر دی زندگی اچھی لگی
تیرا غم اچھا لگا تیری خوشی اچھی لگی
تیرا پیکر، تیری خوشبو، تیرا لہجہ، تیری بات
دل کو تیری گفتگو کی سادگی اچھی لگی

مریم سلیم ________ ٹنڈو جان محمد

بے غرض کون دل گنواتا ہے
تیری قیمت ادا ہمیں سے ہوئی
سعئ تجدید دوستی ناصر
آج کیا بارہا ہمیں سے ہوئی

عظمیٰ غلام نبی ________ کراچی

زمین کی پشت تحمل سے دوہری ہو جائے
اگر وہ بوجھ اٹھائے جو ہم اٹھاتے ہیں
ہمیں بجھانے کو اندر کا حبس کافی ہے
ہوا مزاجوں کا احسان کم اٹھاتے ہیں

غزل ثوبان

مسکراہٹ برائے فروخت

فلم "بول" نے بھارت میں بہترین فلم کا ایوارڈ کیا حاصل کیا، فلم کی ہیروئین عمیمہ ملک نے کام حاصل کرنے کے لیے وہاں ڈیرے ہی ڈال لیے۔ عمیمہ کا کہنا ہے کہ وہ بھارت میں ہر طرح کا کام کرنے کو تیار ہیں۔ (بس! کسی طرح کام مل جائے وہاں) حتیٰ کہ عمیمہ وہاں کام حاصل کرنے کے لیے اپنے سے کہیں زیادہ عمر رسیدہ امیتابھ بچن کی ہیروئن بننے کو بھی تیار ہیں۔ (ہاں! اس طرح پبلسٹی جو زیادہ ملے گی ناں)

عمیمہ نے مہیش بھٹ کی فلم میں اداکارہ میرا کی طرح کا بولڈ کردار کرنے پر بھی آمادگی ظاہر کی ہے۔ یہی نہیں، انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر کوریو گرافر سروج خان یا فرح خان ہوں تو وہ آئیٹم نمبر بھی کرلیں گی۔

عمیمہ بھارت میں گزشتہ تین ماہ سے مقیم ہیں۔ وہ وہاں پر فلموں میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ ماڈلنگ کرنے کی بھی خواہش مند ہیں کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح کم وقت میں زیادہ پیسے کمائے جا سکتے ہیں۔ عمیمہ کا کہنا ہے کہ "بعض اوقات تو ماڈلنگ میں صرف ایک لمحے کی مسکراہٹ کا بھاری معاوضہ مل جاتا ہے۔" (بشرطیکہ یہ مسکراہٹ کسی مقبول شخصیت کی ہو۔ عمیمہ! ابھی آپ شہرت اور مقبولیت کے اس مقام تک نہیں پہنچیں جہاں آپ کو معقول معاوضہ دیا جائے۔)

اعتراض

گلوکارہ نغمانہ جعفری خاصے عرصے سے شوبز میں

ہیں، مگر وہ ابھی تک کوئی خاص مقام حاصل نہیں کرپائی ہیں۔ اب اس کی وجہ ان کی فنی مہارت میں کمی ہو یا کچھ اور، وہ اس کا ذمہ دار میڈیا ہی کو ٹھہراتی ہیں۔

جی جناب! نغمانہ جعفری کا کہنا ہے کہ "میڈیا اور کرپشن نے میوزک انڈسٹری کا بیڑہ غرق کردیا ہے۔" (بی بی! کیا آپ کو یقین ہے کہ ہماری میوزک انڈسٹری کا کوئی وجود ہے؟) "میڈیا بے سُرے لوگوں کو پروموٹ کر رہا ہے۔ ان گلوکاروں کے گانے چلائے جاتے ہیں، جنہیں لوگ سننا پسند نہیں کرتے۔" (عاطف، فاخر، شہزاد رائے توجہ دیں بھئی!) نغمانہ کو یہ بھی شکوہ ہے کہ "ہم پانچ لاکھ کی ویڈیو بنائیں، ہمارا گانا نہیں چلے گا لیکن جو گلوکار ایک لاکھ روپے دے دے گا تو اس کا گانا چل جائے گا۔" (تو بھئی! آپ بھی پانچ لاکھ کے بجائے صرف ایک لاکھ ہی خرچ کیا کریں نا۔)

"ایسی شاعری ہو رہی ہے، جس کا کوئی سر پیر نہیں ہے۔" (سر پیر کیا، وہ تو شاعری ہی نہیں ہے جناب!) موسیقی پر تنقید کرتے کرتے نغمانہ نے فلمی ہیروئنوں کو بھی گھسیٹ ڈالا۔ انہوں نے کہا ہے کہ "فلم انڈسٹری میں دو تین ہیروئن ہیں، تین سو سال بعد بھی وہی ہوں گی۔" (تین سو سال... ! آب حیات پی کر آئی ہیں کیا؟)

نغمانہ کو لکس ایوارڈز کے مہمانوں پر بھی اعتراض ہے۔ وہ کہتی ہے کہ "لکس ایوارڈز میں کون لوگ جاتے ہیں، پتا نہیں۔" (ہائے نی سسٹی بے خبری! یہ ایوارڈز ہر چینل پر تو دکھائے جاتے ہیں۔ دیکھ لیا کریں کون کون آیا ہے۔

بی بی! میوزک میں اپنی ناکامی کا ذمہ دار میڈیا کو ٹھہرانے کے بجائے اپنی فنی خامیوں پر نظر رکھتیں تو زیادہ بہتر ہوتا۔ ہمارے گلوکاروں نے پڑوسی ملک میں کامیابی کے جھنڈے اپنی صلاحیتوں کی بنا پر ہی گاڑے ہیں۔ ایک ایسی سرزمین پر جہاں موسیقی، مذہب و ثقافت کی رگوں میں دوڑتی ہو، ایک نمایاں مقام حاصل کرنا فنی صلاحیتوں کے بغیر ممکن ہی کہاں تھا۔)

گالیوں والی خالہ

ٹی وی اور اسٹیج کی معروف اداکارہ سلمیٰ ظفر کے نام سے کون واقف نہیں۔ ایک زمانہ ان کی صلاحیتوں کا معترف ہے۔ تاہم ان کی ایک صلاحیت ایسی بھی ہے کہ جس سے صرف ان کے محلے والے ہی واقف ہیں، سو وہ اپنے محلے میں اپنی اداکاری کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی اسی صلاحیت کی وجہ سے جانی مانی جاتی ہیں۔ سلمیٰ ظفر اپنے محلے میں اپنے نام کے بجائے "گالی والی خالہ" کے نام سے زیادہ معروف ہیں۔ یہ راز اس وقت طشت ازبام ہوا جب وہ نجی پروڈکشن کے تحت بننے والی ایک سیریز میں کام کررہی تھیں۔ ڈرامے کی ریکارڈنگ کے لیے ڈائریکٹر نے سلمیٰ ظفر کو لینے کے لیے وین بھیجی۔ گھر تلاش کرنے کے لیے جب وین ڈرائیور نے لوگوں سے ان کا پتا دریافت کیا تو کوئی بھی انہیں نہ پہچانا۔ تاہم جب ڈرائیور نے ان کا حلیہ بتایا اور اداکاری کا حوالہ دیا تو لوگوں نے کہا "اچھا! آپ گالی والی خالہ کو پوچھ رہے ہیں۔ پہلے بتاتے نا!"

ملکی وقار

ابھرتی ہوئی اداکارہ حیا علی خیر سے اپنی پہلی بھارتی فلم "دل پردیسی ہو گیا" میں کام مکمل کروا کے لوٹ آئی ہیں۔ (کیا پتا، آخری فلم بھی یہی ہو) اس فلم میں ان کے ساتھ معروف اداکارہ ثنا نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ حیا علی، ثنا سے حیرت انگیز طور پر مشابہت رکھتی ہیں۔ کبھی یہ بات حیا کے لیے فخر کا باعث تھی، تاہم اب وہ یہ بات سننا تک نہیں چاہتیں۔ اس کی وجہ ثنا کا وہ رویہ ہے جو انہوں نے بھارت میں قیام کے دوران حیا کے ساتھ روا رکھا ہے۔

بھارت سے واپس آنے کے بعد حیا نے ثنا کے خلاف شکایتوں کا ایک پٹارہ کھول لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ثنا نے بھارت میں ہر جگہ ان کا تعارف "سی کلاس اداکارہ" کہہ کر کروایا۔ یہاں تک کہ ثنا نے حیا کے ساتھ مشترکہ تصویر بنوانے تک سے انکار کردیا۔

یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی ہماری فنکاراؤں نے بھارت جا کر اکثر ملکی وقار کا خیال نہیں رکھا۔ ہماری بیشتر اداکارائیں وہاں جا کر اوٹ پٹانگ حرکتیں کرکے ملک کی عزت تک داؤ پر لگا چکی ہیں۔ غیر ممالک جانے والے فنکاروں کے لیے جب تک کوئی باقاعدہ ضابطۂ اخلاق نہیں بنے گا، یہ لوگ اسی طرح ملک کو بدنام کرتے رہیں گے۔

☼ ☼ ☼

یہ بیان کالمانہ

مشرف نے اسرائیل کے ایک کثیر الاشاعت روزنامہ کو انٹرویو دیتے ہوئے اسرائیل کو تسلیم کرنے کی حمایت کی اور ایران کے ایٹمی پروگرام کو بلاجواز قرار دیا۔ اس طرح انہوں نے پاکستان واپسی اور اقتدار کے حصول کو ممکن بنایا۔ امریکا، یورپ اور عالمی یہودی برادری کو پتا ہے کہ ایران کو اس کے ایٹمی پروگرام سے روکنا ہو یا اسرائیل کو تسلیم کرنا، یہ کارنامے صرف مشرف صاحب ہی انجام دے سکتے ہیں۔

(دریچہ افلاک۔ زمرد نقوی)

جس ایوب خان نے مشرقی پاکستان کو علیحدگی کی راہ پر دھکیلا، ذوالفقار علی بھٹو اس ایوب خان کو کیا کہا کرتے تھے، اگر یاد نہیں آتا تو کسی سے پوچھ کر بتا دیجیے۔

(نقارہ، مشتاق احمد خان)

مظلومیت کی سیاست نے عوام میں رد عمل کی سطحی نفسیات پیدا کی اور اسے پروان چڑھایا۔ (روبرو، شاہنواز فاروقی)

میں سیاست میں نہیں آؤں گا۔ آج کل چوروں، لٹیروں کا زمانہ ہے۔ سیاست میں آ کر خود کو متنازعہ نہیں بنانا چاہتا۔ (سحر ہونے تک۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان)

اس زمین پر روز فرعون اگتے ہیں اور اگلے دن ان کا نام تک باقی نہیں رہتا۔ (زیرو پوائنٹ۔ جاوید چوہدری)

☼

کاشو میر سے کشمیر تک 3000 قبل مسیح

قدیم و جدید مصنفین، محققین اور مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ کشمیر کا موجودہ علاقہ ایک زمانے میں بہت بڑی جھیل تھا جس کا پانی خشک ہونے کے بعد وہاں زندگی نے جنم لیا۔

ماہرین ارضیات کی تازہ ترین تحقیقات نے ان دیومالائی کہانیوں کو ثابت کر دیا ہے کہ وادی کسی قدیم دور میں ایک بہت بڑی جھیل تھی جسے "ستی سر" مقدس عورت کی جھیل یا ہندوؤں کے دیوتا شو کی بیوی ستی کی سرزمین کہا جاتا تھا۔

کشمیر کے جھیل سے وادی بننے کے بارے میں علیحدہ علیحدہ روایتیں مشہور ہیں۔ مسلمانوں کے بقول اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی اور کرۂ ارض کے بادشاہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک بار اپنے تخت پر سوار، لشکر کے ساتھ ہوا کے دوش پر سفر کر رہے تھے کہ ان کی نظر برف سے اٹے ہوئے بلند پہاڑوں میں گھری ایک وسیع و عریض جھیل پر پڑی جس کا منظر دیدنی تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جھیل اور اس کے گرد و نواح کے مناظر سے متاثر ہوئے۔ اپنے علم سے انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جھیل کی تہ میں ایک زرخیز زمین اور شاداب وادی ہے جہاں انواع و اقسام کے بیج بکھرے ہوئے ہیں لہٰذا اگر کسی طرح اس جھیل کا پانی نکال دیا جائے تو زمین پر گویا جنت بن جائے گی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس امر کا تذکرہ اپنی مجلس میں کیا جس میں انسانوں کے علاوہ جن اور دیو بھی شامل تھے۔ انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ جھیل کا پانی پہاڑوں سے نکال کر زمین خشک کی جائے لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ شرط بھی رکھی کہ پانی کی تہہ میں موجود بیج نہ بہنے پائیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ پیش کش بھی کی کہ جو بھی یہ کام کرے گا اس کی ہر تمنا پوری کر دی جائے گی۔

کہتے ہیں کہ کاشو نامی ایک جن بھی اس مجلس میں موجود تھا۔ اس نے حضرت سلیمان سے کہا کہ میں اس کام کے لیے تیار ہوں لیکن میری ایک درخواست ہے کہ میں میر نامی پری سے عشق کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ پانی نکالنے والے کی ہر خواہش پوری کی جائے گی لہٰذا میری خواہش ہے کہ جھیل خالی کرنے کے عوض میر سے میری شادی کر دی جائے۔

حضرت سلیمان نے درخواست قبول فرمائی اور کاشو جن نے بارہ مولا کے قریب ایک جگہ سے پہاڑ کاٹ ڈالا جس سے پانی کی ایک ندی جاری ہو گئی۔ یہی ندی ماضی کا دریائے وستاست اور آج کل دریائے جہلم کہلاتی ہے۔ جھیل چونکہ میلوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس لیے خالی ہونے میں بھی عرصہ لگتا چنانچہ جن صاحب نے سوچا کہ اتنی دیر سو لیا جائے۔ چنانچہ وہ وہیں پہاڑ سے ٹیک لگا کر سو رہا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جھیل خالی ہو چکی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مختلف بیج بھی بہہ کر باہر جا رہے ہیں۔

جن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اسے یاد آگیا کہ حضرت سلیمان نے سختی سے ہدایت فرمائی تھی کہ بیج نہ بہنے پائیں۔ جن ہڑبڑا کر اٹھا اور جلدی جلدی اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے بیج جمع کر کے وادی میں پھینکنے لگا۔ یہ بیج وادی میں ہر جانب گرے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی

کشمیر میں پھولوں اور پھلوں کے بیشتر درخت خودرو ہیں۔

کاشو جن اپنا کارنامہ انجام دے کر خوشی خوشی حضرت سلیمان کی مجلس میں حاضر ہوا۔ حضرت سلیمان کو اپنا قول یاد تھا چنانچہ انہوں نے میر پری کو طلب کر کے کاشو کی اس سے شادی کر دی۔ اس جوڑے کی مناسبت سے اس خطے کا نام ہی کاشو میر پڑ گیا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر بن گیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام 964 قبل مسیح سے 924 قبل مسیح تک پیغمبری اور بادشاہت کے مرتبہ پر فائز رہے۔ اس لحاظ سے جھیل کا کشمیر بننا اسی عہد کی یادگار ہو سکتا ہے۔

لیکن ہندو عقائد اس سے مختلف ہیں۔ راج ترنگنی کا مصنف کالہن لکھتا ہے۔

وادی کشمیر ایک زمانے میں بڑی جھیل تھی جس میں ہندو مذہب کے بنیادی دیوتا شو کی بیوی پاربتی دیوی اپنی خوشنما کشتی میں شمال کی جانب واقع ہرمکھ پہاڑ سے جنوب کی جانب کنسا ناگ جھیل تک سیر کیا کرتی تھی۔ دیوی کی وجہ سے جھیل کو ستی سر یا مقدس عورت کی جھیل کہا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جھیل کے اردگرد آباد لوگوں کو جالود بھاوا کی ناجائز اولاد جل دیو نامی ایک شیطان تنگ کیا کرتا تھا۔ برہما دیوتا کا دیوتا کیشیا ان کی مدد کے لیے آیا لیکن جل دیو نامی شیطان کیشیا کو دھوکا دے کر پانی کے اندر چھپ گیا۔ اس موقع پر شو دیوتا (اور بعض روایات میں وشنو دیوتا) نے مدد کی اور اپنے ترشول کی مدد سے بارہ مولا کے مقام پر پہاڑ کو کاٹ ڈالا۔ جھیل کا پانی اس راستے سے باہر نکلنا شروع ہو گیا لیکن جل دیو نے پاتال (زمین کے اندر) میں پناہ لے لی۔ یہ جگہ موجودہ سری نگر شہر کے قریب بیان کی جاتی ہے۔ جب اسے زمین سے باہر نکالنے کی کوشش ناکام ہو گئیں تو پاربتی دیوی نے ایک پہاڑ اس پر الٹ دیا تاکہ وہ اس کے نیچے دب کر مر جائے۔ اس پہاڑ کو ہری پربت (قدیم دور میں ہرا پربت) کہا جاتا ہے۔ گئے زمانوں سے اس پہاڑ کی ڈھلوان پر پاربتی دیوی کی پوجا کی جاتی ہے۔

جب شیطان کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا تو لوگوں نے جھیل کی جگہ بن جانے والی وادی میں جانا شروع کر دیا۔ ابتدا میں سخت سردی کے باعث لوگ صرف موسم سرما میں ہی اس علاقے میں جایا کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ موسم معتدل ہوتا چلا گیا اور لوگوں نے موسم سرما میں بھی وہاں جانا اور رہنا شروع کر دیا۔ پھر اس وادی میں برادریاں بنیں جو چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تبدیل ہو گئیں اور بالآخر ان حکومتوں کے ادغام سے ایک بڑی بادشاہت نے جنم لیا۔

ہندو دیومالائی کہانیاں ہزاروں سال پرانی ہیں۔ پاربتی دیوی کے جھیل میں سیر کرنے کی کہانی سچ تسلیم کی جائے تو یہ واقعہ کم از کم 8'000 قبل مسیح کا بنتا ہے لیکن ہندو تاریخ میں کشمیر کا پہلا تذکرہ مہابھارت جنگ سے ذرا پہلے کیا گیا ہے لیکن کشمیر کو محض شمالی ہند میں واقع پہاڑوں میں گھری ایک وادی قرار دیا گیا ہے جس کے راستے پر خطر بتائے گئے۔ اس کے بادشاہ کے نام کا ذکر بھی کیا گیا ہے اس کے برعکس کشمیر سے اب تک جو قدیم ترین آثار قدیمہ دریافت ہوئے ہیں وہ 3'000 قبل مسیح تک کے ہیں۔

بعض علمی مشاقوں نے اس کی وجہ تسمیہ یوں بیان کی ہے کہ زبان شاستری میں "کم" پانی کو اور "شمیر" باہر نکالنے کو کہتے ہیں چونکہ ستی سر کا پانی باہر نکالا گیا تھا اس لیے اس کا نام کشمیر قرار پایا جو اب اس نام سے مشہور ہے۔

بہرحال کچھ بھی ہو تمام مورخ اور محقق اس بات میں پر متفق ہیں کہ زمانہ قدیم میں کچھ عرصہ تک یہ خطہ سرزمین، پانی کے نیچے دبا رہا تھا اور کسی طرح بھی کیوں نہ ہو، آبادی قائم کرنے سے پیشتر اس کا پانی نکالا گیا تھا۔

بعض دیگر روایتوں کے مطابق کشمیر نہایت قدیم عہد سے خوف ناک اور ناقابل گزر پہاڑوں سے گھرا ایک ویران اور سنسان جنگل تھا۔ برف سے لدی ہوئی

پہاڑی چوٹیاں اس ملک کو بچانے کے لیے مستحکم مورچے مہیا کرتی تھیں۔ انسان تو در کنار پرندے بھی اس ناقابل عبور فصیل کو دیکھ کر حسرت بھری نگاہوں سے مایوس لوٹ جاتے تھے۔ غیر ممالک کے باشندے اسے ایک برفانی تودہ کے سوا کچھ بھی خیال نہ کرتے تھے۔ آخر کچھ عرصے کے بعد جب برف کی شدت کم ہونے لگی تو گردو نواح سے من چلے بہادر موسم گرما میں ان تمام مشکلات کو حل کر کے اس عروس ملک سے بغل گیر ہونے لگے۔

بھمبر، راجوڑی، کاغان، وغیرہ ممالک کے گڈریے اور چوپان، مال مویشی اور بھیڑ بکری کے ریوڑ لے کر موسم گرما میں یہاں آجاتے اور اس کی سرسبز و شاداب چراگاہوں میں اپنے جانوروں کی چرا کر شروع زمستان میں اپنے اپنے وطن کو لوٹ جاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ تہذیب سے بالکل نا آشنا وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا گزارہ زیادہ تر مال مویشی اور شکار پر تھا۔ پتھر کی کلہاڑیاں اور ہتھیار ان کے جنگلی اسلحہ تھے۔

کشمیریوں کے اجداد کے مذہب کی بابت کچھ زیادہ تفصیلات تواریخ میں موجود نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ موسم گرما گزار کر اپنے علاقوں میں واپس جانے والے افراد میں سے ایک چندرا دیو نام کا شخص بھی موجود تھا جس کے قوائے بدنی، ضعیف، العمری اور پیری کے باعث جواب دے چکے تھے۔ وہ واپس نہ جا سکا اور اپنے لواحقین اور ہمراہیوں کی اجازت سے ضروریات خوردو نوش لے کر ایک غار میں اکیلا جا بیٹھا۔

سردی شروع ہوئی اور برف گرنے لگی تو یہاں عجیب و غریب تلاطم و طوفان مچ گیا۔ ہولناک اور ڈراؤنی اشکال کے انسان تمام ملک میں مور و ملخ کی طرح چھا گئے۔ خلاف عادت اپنی جاگیر میں اس خمیدہ پشت شخنی صورت کے ایک انسان کو پا کر اس کا تمسخر اڑانے لگے۔ اسی دارو گیر اور کھیل کود میں بے چارے کا کام تمام ہو جاتا لیکن اتفاقاً وہ چشمہ نیلا ناگ کے کنارے پہنچ گیا۔

راجہ نیلا ناگ (بعض کے مطابق نیلم ناگ) وہاں اپنا دربار لگائے بیٹھا تھا۔ بڈھے چندرا دیو نے شور و واویلا کیا اور دوڑ کر راجہ کے قدموں میں گر پڑا۔ راجہ کو اس کی حالت پر بے حد ترس آیا اور اس نے ملعونوں کو اسے ایذا پہنچانے سے باز رکھا۔ کتاب نیلامت پوران دے کر اس نے حکم دیا کہ تم لوگ اس کتاب پر ایمان لے آؤ تو یہ بلائیں تم کو ایذا نہ پہنچا سکیں گی۔

جان کے بچاؤ کے لیے اس نے ایسا ہی کیا اور صحیح سالم اپنے غار کو لوٹ آیا۔ دوسرے سال موسم بہار میں جب اس کے لواحقین اور ہم وطن پھر کشمیر آئے تو بڑے میاں کو زندہ سلامت پا کر حیران اور خوش ہوئے۔ چندرا دیو نے اپنی ساری سرگزشت بیان کر کے نیلامت پوران قوم کے سردار دریا دیو کو دی اور راجہ نیلم ناگ کا حکم سنا کر انہیں اس پر ایمان لانے کی ترغیب دی۔ اگرچہ چندرا دیو کے زندہ رہنے ہی نے انہیں تمام باتوں کا یقین دلا دیا تھا مگر پھر بھی بہ لحاظ دور اندیشی و پیش بینی دریا دیو نے اس سال بھی بہ طور آزمائش چند آدمی یہاں چھوڑے اور خود باقیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔ دوسرے سال جب یہ لوگ بھی محفوظ و مامون رہے تو دریا دیو بھی نیلامت پوران پر ایمان لے آیا اور اپنے ہمراہیوں سمیت کشمیر میں سکونت پذیر ہو گیا۔

یہی دریا دیو کشمیر کا پہلا حکمران قرار دیا جاتا ہے۔ اسی نے پہلے پہل آبادی قائم کی۔ اس کے بعد صدیوں اس کا خاندان کشمیر کا حکم رہا حتیٰ کہ طوفان نوح کے نتیجے میں سب کچھ برباد ہو گیا۔ اسی طوفان کے دوران بارہ مولا کے پاس پہاڑ کا ایک ٹکڑا گرا اور پانی کا راستہ مسدود ہو گیا جس سے تمام آبادی غرق ہو گئی اور کشمیر نے تالاب کی صورت اختیار کر لی۔

اکثر رشی اور مہاتما اس کے کناروں پر آ کر عبادت الٰہی میں مصروف رہتے۔ جب ستی دیو مہاراج کا گزر ادھر سے ہوا تو انہوں نے یہ جگہ بے حد پسند آئی چنانچہ

اکثر اس کی سیر و تفریح میں مصروف رہتے جس سے اس تالاب کا نام بھی ستی سر مشہور ہو گیا۔ اس زمانے میں ضرورت وقت نے لوگوں کو کشتیاں بنانا سکھلا دیا چنانچہ ستی سر میں بھی کشتیوں کے ذریعے سیر و تفریح ہونے لگی۔ ان کشتیوں کو باندھنے کے لیے ستی سر کے کناروں پر بڑے بڑے پتھروں میں چھید کیے گئے۔ ہیر پور کے متصل وشنہ یار میں جو ناؤ کا بندھن اب تک فرقہ ہنود کا متبرک مقام خیال کیا جاتا ہے۔

روایت ہے کہ بارہ مولا سے پہاڑ کاٹے جانے کے تین سو سال بعد ستی سر خشک ہوا اور زمین نمودار ہو کر موجودہ کشمیر کی بنیاد پڑی۔

تاریخ کشمیر کے مطابق 1282 قبل مسیح میں خاندان گودھر کے آخری فرمانروا راجہ نراندر (مدت حکومت 2 ہفتے) کے مسند حکومت پر بیٹھنے کے چند روز بعد حضرت سلیمان علیہ السلام وارد کشمیر ہوئے اور ان کا ہوائی تخت کوہ جیت لارک یا شنکر اچارج کی چوٹی پر ٹھہرا۔ یہ کیفیت دیکھ کر عوام و خواص وہاں جمع ہوئے۔ کوئی انہیں دیو تا کہتا، کوئی فرشتہ بتاتا۔ راجہ نراندر بھی حضرت سلیمان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت سلیمان کی شفقت اور قدر افزائی سے سربلند ہو کر راجہ موصوف نے راج پاٹ کو بھی خیرباد کہا اور کشمیر چھوڑ کر حضرت سلیمان کے ہمراہ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔

حضرت سلیمان کی کشمیر آمد سے ایک ہزار برس پہلے 2043 قبل مسیح میں جو سند مت نگر، غرق آب ہو کر تباہ ہو چکا تھا۔ حضرت سلیمان کی عظمت و شان دیکھ کر کشمیر کے باشندوں نے ان کی خدمت میں اس کے انسداد کے لیے درخواست کی۔ جس پر حضرت سلیمان نے اپنے ہمراہیوں کو حکم دیا۔ وہاں کیا دیر تھی۔ حکم پاتے ہی قوم اجنہ نے کھاوہ بار کے پاس دریا گہرا کر کے صاف کر دیا۔ جس سے سوائے اس مقام کے جہاں جھیل وولر لہریں مار رہی ہے تمام علاقہ مراج کی زمین خشک ہو گئی۔ زراعت اور آبادی کا موقع نکل آیا۔

پنڈت رتناگر کا قول ہے کہ راجہ نراندر کی تخت نشینی کے چند روز بعد سندیمان نام کا ایک شخص جو مغربی ممالک کے رکھشوں میں سے تھا، کشمیر پہنچ کر کوہ لارجیت پر مقیم ہوا۔ اس نے لکھا ہے کہ سندیمان کا دیمان (تخت) آسمان پر چلتا تھا۔ تمام جن، دیو، چرند، پرند اس کے مطیع تھے۔ یہ کیفیت حضرت سلیمان علیہ السلام کے حالات سے ملتی ہے۔ سندیمان کا نام بھی آپ (یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام) کے نام سے پوری طرح مشابہت رکھتا ہے۔

کشمیر اور اسرائیلی قبائل

تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے یقیناً" اس امر سے آگاہ ہوں گے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی وفات کے وقت بنی اسرائیل کے جو بارہ قبائل چھوڑ گئے' ان میں سے صرف دو باقی رہ گئے تھے جبکہ دس قبائل تاریخ کی بھول بھلیوں میں کہیں کھو گئے تھے۔ کشمیر کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ دلچسپ اور عجیب و غریب حقیقت سامنے آتی ہے کہ موجودہ کشمیریوں کے اصل آباؤ اجداد تاریخ کی بھول بھلیوں میں کھو جانے والے بنی اسرائیل کے یہی دس قبائل ہیں۔

اور یہ بات محض روایت نہیں بلکہ کشمیر کے علاوہ دیگر علاقوں سے تعلق رکھنے والے اسکالرز نے بھی حقائق و واقعات سے اسے ثابت کیا ہے۔

کشمیر میں بہت سے مقامات کو اسرائیلی ناموں سے پکارا جاتا ہے جیسے ہرنیو' بیت پور' پسگا' پیشبون۔ یہ نام انہی دس کھو جانے والے قبائل کی سرزمین کے مختلف شہروں اور علاقوں کے نام ہیں۔ یہی صورت حال کشمیری مردوں' عورتوں اور دیہات کے ناموں میں بھی نظر آتی ہے۔

کشمیری' یہودیوں کی طرح موسم بہار میں شمسی اور قمری کیلنڈر میں پیدا ہونے والے فرق کو پورا کرنے کے لیے "پسکا" نامی تہوار مناتے ہیں۔ اس موضوع پر اب تک بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں جبکہ کشمیر میں بولی جانے والی زبان ادو (UDU) میں بھی کئی عبرانی الفاظ شامل ہیں۔

مورخین اس امر پر متفق دکھائی دیتے ہیں کہ اس خطے میں آباد لوگوں کی نسبت کشمیریوں کا ماضی زیادہ پر اسرار نظر آتا ہے۔ زیادہ تر کشمیری محققین کا خیال ہے کہ کشمیر کی بیشتر آبادی 722 قبل مسیح میں جلاوطنی کے نتیجے میں کھو جانے والے بنی اسرائیل کے دس قبائل کی اولاد ہیں۔ یہ قبیلے شاہراہ ریشم کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مشرق' ایران اور افغانستان میں داخل ہوئے اور بالآخر کشمیر میں آباد ہو گئے۔

بعض لوگوں کے خیال میں یہ منتقلی 300 سال بعد عمل میں آئی۔ یہ قبائل کشمیر میں اسلام کی آمد تک اپنے مذہبی عقائد پر قائم رہے۔

☼

مضامینِ فرحت

مُصنف: مرزا فرحت اللہ بیگ
تبصرہ: آمنہ زریں

عمدہ ذوق کی پرورش کا ایک فائدہ جو کہ نتائج کے اعتبار سے بے حد اہم ثابت ہوتا ہے وہ یہ کہ لطیف اور رکیک کی تمیز پیدا ہو جاتی ہے اور جو عمدہ کے پروردہ ہوں، رکاکت کی ہم نوائی کبھی نہیں کر سکتے۔

"مضامین فرحت" کا ایک سادہ اور ظاہری مطلب تو یہی ہے کہ یہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین ہیں، لیکن جب آپ ان کو پڑھ چکتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تحریر کی شگفتگی نے جو فرحت و انبساط کی کیفیت پیدا کی ہے.... وہ بھی اسی سے تعلق رکھتی ہے۔

اردو ادب کے مہذب دور سے تعلق رکھنے والے، مرزا فرحت اللہ بیگ کے قلم سے پھوٹنے والے شگوفے بے اختیار ہنسنے پر مجبور تو کرتے ہیں.... مگر یہ مزاح نہ کسی پر پھبتی کسنے کا نام ہے، نہ ہی جگت بازی نہ ہی کسی کی کردار کشی، نہ خوامخواہ کی دل آزاری اور یہی عمدگی ہمیں دراصل ایک ایسے ذہن سے متعارف کرواتی ہے جو علم و فضل کے حصول کے راستے کو خشک طبعی کے بجائے خوش طبعی سے گزارنے پر یقین رکھتا ہے۔

مزاح کی یہی شگفتگی جب قلم کے ذریعے تحریر میں ڈھلتی ہے تو وہ پھر کسی کا شخصی خاکہ ہو جیسا کہ مولوی نذیر احمد، یا دلی کے آخری دور کے یادگار مشاعرے کا خیالی تذکرہ .... یا پھر معاشرتی برائیوں کی طرح جڑ پکڑتی فضول رسموں پر طنز "مردہ بدست زندہ" کے اصلاح احوال کا معاملہ ہو، کم سنی کی شادی یا کسی پنپتے ہوئے مسئلے کی طرف اشارہ، پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر، صاحب مضمون کا قلم نہ صرف تہذیب کا پورا پورا خیال رکھتا ہے بلکہ کہیں بھی دل آزاری کا مرتکب نہیں ہوتا اور ایسا کرنے پر کمال حاصل کرنا قلمی اور تہذیبی اخلاق کا آئینہ دار ہے۔

مولوی نذیر احمد پر لکھے گئے شخصی خاکے نے مرزا صاحب کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ حتیٰ کہ بعض لکھنے والوں نے لکھا کہ مرزا صاحب اس کے علاوہ کچھ نہ بھی لکھتے تو اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہتا۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مولوی نذیر احمد جیسی ہستی کا چلتا پھرتا خاکہ تحریر کی صورت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دینا، آنے والی تمام نسلوں پر ایک احسان کے طور پر یاد رکھے جانے کے لائق ہے۔

شخصی خاکہ لکھتے وقت عموماً خوبیوں یا صرف خامیوں پر توجہ دی جاتی ہے .... لیکن ایک بڑی شخصیت بھی بشری فطرت کے تحت خوبیوں اور خامیوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہے.... اور اس شخصی خاکے کی اصل خوبی یہی ہے کہ یہ مصنوعی یا نقلی نہیں لگتا بلکہ بے ساختگی ہی اس کا اصل حسن ہے۔

لیجیے اب مولوی صاحب کا حلیہ سنیے۔

"رنگ سانولا مگر روکھا، قد خاصا اونچا تھا مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا۔ بھاری بدن کی وجہ سے چونکہ قد ٹھگنا معلوم ہونے لگا تھا اس لیے اس کا تکملہ اونچی ترکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا۔ کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا۔ توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا بے ضرورت ہی نہیں، تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔ گرمیوں میں تہ بند باندھتے تھے، اس کے پلو اڑسنے کی بجائے اِدھر اُدھر ڈال لیتے تھے مگر اٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے۔ اول تو قطب بنے بیٹھے رہتے تھے۔ اگر اٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کرتے تھے کہ فی الحال اٹھنے کو ملتوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ سر بہت بڑا تھا مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے ہاتھوں میں رکھا تھا، جو تھوڑے رہے سہے بال تھے وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دیے جاتے تھے۔

آواز میں گرج تھی مگر لوچ کے ساتھ جب کوئی دور سے سنے تو یہ سمجھے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں۔ لیکن پاس بیٹھنے والا ہنسی کے مارے لوٹ رہا ہو۔ جوش میں آ کر جب آواز بلند کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ترم بج رہا ہے۔ اسی لیے بڑے بڑے جلسوں پر چھا جاتے تھے۔

گو متانت چھو کر نہیں گئی تھی، لیکن جسم کے بوجھ نے رفتار میں خود بخود متانت پیدا کر دی تھی۔

اب رہی لباس کی بحث تو اس کا بھی حال سن لیجیے جنہوں نے اسٹیج پر ان کو شال رومال باندھے کشمیری جبہ یا ایل ایل ڈی کا گون پہنے دیکھا ہے، انہوں نے عالی جناب شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد خاں صاحب ایل ایل ڈی مد ظلہ العالی کو دیکھا ہے، مولوی نذیر احمد صاحب کو نہیں دیکھا۔ ان کے گھر کے اور باہر کے لباس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اگر ان کو روزانہ باہر جانے کا شوق نہ ہوتا تو لباس کی مد ہی ان کے اخراجات کی فہرست سے نکل جاتی۔

مولوی صاحب کو حقہ کا بہت شوق تھا مگر تمباکو ایسا کڑوا پیتے تھے کہ اس کے دھوئیں کی کڑواہٹ بیٹھنے والوں کے حلق میں پھندا ڈال دیتی تھی۔ خیر! جاڑے کا موسم ہے۔ مولوی صاحب بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور پڑھا رہے ہیں۔ سر پر کنٹوپ ہے، مگر بد قیانوسی، کبھی کانوں کو ڈھکے ہوئے اور ڈوریاں نیچے لٹکتی ہوئی، کبھی اس کے دونوں پاکھے اوپر کی طرف سیدھے کھڑے ہو کر لاٹ پادری کی ٹوپی کا نمونہ بن جاتے اور ڈوریاں طرے کا کام دیتیں، جسم پر روئی کی مرزئی، مگر ایسی پرانی کہ اس کی روئی کی گرمی مدت سے مائل بہ سردی ہو چکی ہے اوپر مہندی رنگ کا دھبہ پڑا ہوا، لیجیے دیکھا آپ نے ہمارے مولوی صاحب کو۔ چار بجے، اور مولوی صاحب نے آواز دی۔

"پانی تیار ہے۔"

جواب ملا "جی ہاں!"

مولوی صاحب غسل خانے میں گئے۔ کپڑے بدل (یا یوں کہو کہ جون بدل) باہر نکل آئے اور چلے ٹاؤن ہال کو لیجیے اب یہ ہمارے مولوی صاحب نہیں رہے، آپ کے مولوی صاحب ہو گئے۔

گھر میں اس لباس سے استغناء کے کئی باعث تھے۔ جن میں ایک تو پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے کی مصروفیت، دوسرے یہ کہ وہ بہت کم لوگوں سے مکان پر ملتے تھے، تیسری یہ کہ وہ اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے جس طرح آرام ملتا اسی طرح رہتے۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ گھر میں کوئی عورت نہ تھی جو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی۔

گھر میں تھا کون، ایک مولوی صاحب، دوسرا ایک کانڑا شوبد ہو نفر، ان کا نوکر خدا بخش، وہ بھی ایسا بے پرواہ کہ خدا کی پناہ۔ ظالم نے بہرا بن کر کام سے اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا۔ مولوی صاحب کی آواز جس سے مردے قبر میں چونک پڑیں، اس کو کبھی سنائی نہ دی اور جب تک کسی نے جا کر اس کا شانہ نہ ہلایا اس نے ہمیشہ سنی کو ان سنی کر دیا۔

وہ ہمیشہ بہت سویرے اٹھنے کے عادی تھے۔ گرمیوں میں اٹھتے ہی نہاتے اور ضروریات سے فارغ ہو کر نماز پڑھتے، ان کی صبح کی اور عصر کی نماز کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی۔ باقی کا حال اللہ کو معلوم ہے۔ نہ میں نے دریافت کیا اور نہ مجھ سے کسی نے کہا۔ صبح کی نماز پڑھ

کر کچھ تلاوت کرتے۔ ادھر ذرا دن چڑھا ادھر مولویوں کی جماعت اور خود مولوی صاحب کا ناشتا داخل ہوا۔ اس جماعت میں بخارا' کابل' سرحد وغیرہ کے لوگ تھے۔ محنت ایسی کرتے تھے کہ کوئی دوسرا کرے تو مر جائے لیکن ٹھوٹھ ایسے تھے کہ مولوی صاحب بھی ان سے زچ ہو جاتے تھے۔ خوش مذاقی تو انہیں چھو کر نہیں گزری تھی' خود مذاق کرنا تو کجا' دوسرے کا مذاق بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ متانت اور ادب کا یہ حال تھا کہ آنکھ اٹھا کر مولوی صاحب کو دیکھنا سوءِ ادب سمجھتے تھے۔ اب ان کے وہ عمامے اونچے اونچے' یہ لمبی لمبی داڑھیاں دیکھو اور مولوی صاحب کی حالت کا اندازہ کرو۔ بے چارے ناشتا کرتے جاتے اور اپنا فرض اتارتے جاتے تھے۔ کہا کرتے تھے۔

"ان فتح پوری۔ ملاؤں کو پڑھا کر میرا دل بیٹھ جاتا ہے' کیا کہوں میں' ہوں ہنسوڑا تو ہے مقطع' میرا تیرا میل نہیں کا نقشہ ہے۔ ہزار سمجھاتا ہوں' ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔"

ایک روز مولوی صاحب **معلقات** پڑھا رہے تھے۔ عمرو بن کلثوم کا قصیدہ تھا۔ جب اس شعر پر پہنچے۔

ابا ہند خلد تعجل علینا
وانسظ تا نخبرک الیقینا

تو بہت ہنسے' کتاب رکھ دی اور ہنستے ہنستے لوٹ ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سنبھل کر بولے۔

"میاں بعض شعر قصہ طلب ہوتے ہیں۔ یہ شعر میری زندگی کے قصہ کا آغاز ہے۔ اچھا لو! سناتا ہوں' مگر پہلے تمہید سن لو۔ بھئی! ہم بہت غریب لوگ تھے' نہ کھانے کو روٹی' نہ پہننے کو کپڑا۔ تعلیم کا شوق تھا' اس لیے پھرتا پھراتا پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں آکر ٹھہر گیا۔ یہاں کے مولوی صاحب بڑے عالم تھے۔ ان سے پڑھتا اور توکل پر گزارا کرتا۔ دن رات پڑھنے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ تھوڑے سے دنوں میں کلام مجید پڑھ کر میں نے ادب پڑھنا شروع کیا۔ چار پانچ برس میں معلقات پڑھنے لگا' گو میری عمر بارہ سال تھی' مگر قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے نو دس برس کا معلوم ہوتا تھا۔ پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھبڑی ہاتھ میں لے کر گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا۔ کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دے دی۔ کسی نے قیمہ کی لگدی ہی رکھ دی۔ کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں ہی پر ٹرخایا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق کا گھر تھا۔ ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ ادھر میں نے دروازے میں قدم رکھا' ادھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی' جب تک سیر دو سیر مسالا سے نہ پسوا لیتی' نہ گھر سے نکلنے دیتی' نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پر مارا' بخدا جان سی نکل جاتی۔ میں نے مولوی صاحب سے کئی دفعہ شکایت کی مگر انہوں نے ٹال دیا۔ خبر نہیں مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ مارا دھاڑی روز وہاں جانا پڑتا اور روز ہی مصیبت جھیلنی پڑتی۔ تم سمجھے بھی کہ یہ لڑکی کون تھی؟ میاں یہ لڑکی وہ تھی جو بعد میں ہماری بیگم صاحبہ ہوئیں۔"

پھر انہوں نے اس شعر کا اصل پس منظر تفصیل سے بیان کیا جو بیان میں تو خوب ہے ہی' مگر واقعتاً مولوی صاحب کی زندگی کا سنگ میل بھی.....

فرصت کے اوقات میں پھرتے پھراتے کشمیری دروازے پہنچے تو دینی کالج میں ہجوم نظر آیا۔ قریب جا کر معلوم ہوا کہ مفتی صدر الدین لڑکوں کا امتحان لینے آئے ہیں۔ ہم نے کہا' چلو ہم بھی دیکھیں۔ بھیڑ میں کھڑے امتحان لینے کا سارا مرحلہ شوق سے دیکھتے رہے۔ بھیڑ ہٹانے میں چپراسیوں کے دھکا دینے سے گرے..... اور اسی گرنے پر پرنسپل صاحب دوڑ کر متوجہ ہوئے اور بڑی شفقت سے پوچھا کہ چوٹ تو نہیں آئی۔

باتوں باتوں میں پوچھا میاں صاحبزادے کیا پڑھتے ہو۔

"میں نے کہا" **معلقات**" ان کو بڑا تعجب ہوا۔ بجائے اپنے کام پہ جانے کو' ہاتھ پکڑ کر سیدھا مفتی صاحب کے پاس لے گئے اور کہا کہ یہ لڑکا کہتا ہے' **معلقات** پڑھتا ہوں۔ ذرا پوچھیے تو انہوں نے کتاب ہاتھ میں دی اور کہا "یہاں سے پڑھ!" جس شعر پر انہوں نے انگلی رکھی تھی' وہ یہی شعر تھا۔

"میں نے پڑھا' معنی بیان کیے۔ انہوں نے ترکیب پوچھی' وہ بیان کی۔ میاں وانی! تمہاری طرح شعر نہیں پڑھا اور میاں فرحت! تمہاری طرح ترکیب نہیں کی تھی (یہ اشارہ ہماری کمزوریوں کی طرف تھا۔)

اس کے چند روز بعد مسجد کے مولوی صاحب کو انتظامیہ کی طرف سے خط موصول ہوا جس میں داخلہ کے ساتھ ساتھ وظیفہ ملنے کی نوید بھی تھی۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے۔ دوسرے روز لے جا میرا ہاتھ پرنسپل صاحب کے ہاتھ میں دیا۔ میں عربی کی جماعت میں شریک ہوا۔ ایک تو شوق' دوسرے پڑھانے والے ہوشیار' تیسرے ایک مضمون اور وہ بھی ایسا جس کا مجھے بچپن سے شوق تھا۔ اب جب کبھی یہ شعر پڑھتا ہوں تو پہلا زمانہ یاد آجاتا ہے۔

وانی نے کہا۔ "مولوی آپ کے اختیاری مضمون کیا تھے؟"

مولوی صاحب ہنسے اور کہا۔ "میاں وانی! ہم پڑھتے تھے' آج کل کے طالب علموں کی طرح نہیں تھے۔ ارے بھئی! ایک ہی مضمون کی تکمیل کرنا دشوار ہے۔ آج کل پڑھاتے نہیں' لادتے ہیں' آج پڑھا' کل بھولے' تمہاری تعلیم ایسی دیوار ہے جس میں گارے کا بھی روا ہے' ٹھیکریاں بھی گھسیڑ دی گئی ہیں' مٹی بھی ہے' پتھر بھی ہے' کہیں چونا اور اینٹ بھی ہے' ایک دھکا دیا اور اڑاڑا دھم گری۔ ہم کو اس زمانے میں ایک مضمون پڑھاتے تھے' مگر اس میں کامل کر دیتے تھے۔ پڑھانے والے بھی ایرے غیرے پنج کلیاں نہیں ہوتے تھے۔ اچھا بھئی! آگے چلو۔"

کچھ نئے زمانے کی تعلیم کے حالات سے آگاہی ہے نا آپ کو؟ مولوی صاحب کے ارشاد کی روشنی میں تو ..... دیا ہی گل ہو گیا!

"میں نے کہا "مولوی صاحب اس شعر کے تو معنی رہ ہی گئے۔"

کہنے لگے "اتنا بڑا قصہ سنا دیا۔ اس کے بعد بھی اس شعر کے معنوں کی ضرورت ہے؟ بس اس کے یہی معنی ہیں کہ ایک ملا کا بیٹا ڈاکٹر ڈپٹی شمس العلماء ایل ایل ڈی ہو گیا ساتھ آسانی کے' بیچ اسی دلی کے' بوجہ اس شعر کے۔"

پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم میں سے کسی نے کتاب میں سے ایک شعر پڑھا اور مولوی صاحب نے کتاب الٹ کر میز پر رکھ دی۔ پہلے وانی کی طرف متوجہ ہوئے اور صرف و نحو کے نکات پر بحث شروع ہوئی۔ اس بحث میں مجھے بارہ پتھر باہر سمجھ لیا جاتا تھا۔ کبھی میں نے دخل بھی دیا تو مولوی صاحب نے فرمایا۔

"آپ مہربانی کر کے اس بارے میں اپنے دماغ پر زور ڈالنے کی تکلیف گوارا نہ فرمایئے۔" اس کے بعد معنی بیان کیے' نکات بتائے اور پھر اس مضمون کے اشعار اور مقولوں کا سلسلہ چھڑا۔ اب یہاں میاں وانی خارج از بحث ہو گئے۔ اول تو مجھے ہزاروں شعر یاد تھے' دوسرے خاص طور پر تیار ہو کر جاتا تھا۔ مولوی صاحب اگر ایک شعر پڑھتے تو میں دو پڑھنے کو تیار ہو جاتا۔ غرض جب فریقین اپنا ہندوستانی گولہ بارود ختم کر چکتے تو یورپ اور انگلستان کے شعراء اور فلسفیوں کے مقولوں کا نمبر آتا۔ غرض ایک شعر کی تشریح میں آدھ گھنٹہ گزر جاتا مگر اس کے بعد جو وہ شعر ذہن نشین ہوتا تو اس کا محو ہونا مشکل تھا۔"

کیسے استاد..... کیسے شاگرد..... کچھ کچھ حسرت محسوس ہوتی ہے نا؟

عقیدت اور محبت میں کتنا فرق ہے کہ مولوی صاحب کے حلیے سے لے کر روزمرہ کے معمولات' عادات' تعلیم' تدریس' ادبی کارنامے' علم و فضل میں یکتائی کو مرزا صاحب نے اس محبت سے تحریر میں سمو دیا ہے کہ وہ جیتی جاگتی تصویر بن گئی ہے اور یہی محبت خود بخود قاری کے دل میں بھی گھر کر لیتی ہے۔
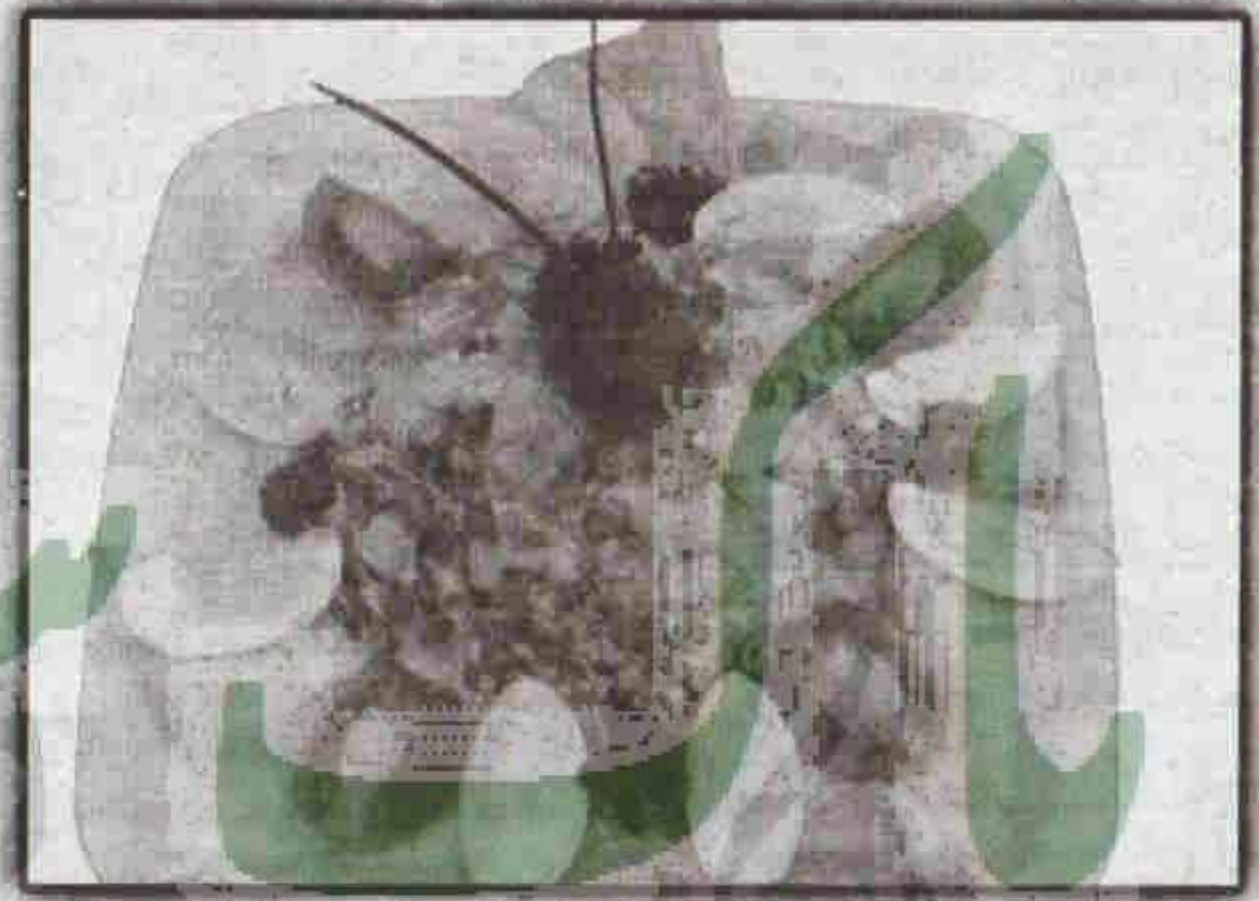
☼

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

قیمہ بھرے پراٹھے

اجزا :

میدہ	1کلو
باریک قیمہ	1کلو
پیاز	1پاؤ
لہسن ادرک پیسٹ	2کھانے کے چمچے
سرخ کٹی مرچ	2کھانے کے چمچے
ثابت دھنیا	1کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

پیاز باریک کاٹ کر تیل میں سرخ کرلیں۔ ثابت دھنیا باریک پیس کر نمک' مرچ اور لہسن ادرک پیسٹ کے ساتھ ڈال کر بھون لیں۔ پھر قیمہ ڈال کر (قیمہ باریک اور چکنائی سے پاک ہو) بھون لیں۔ قیمہ گل جائے تو اتنا بھونیں کہ خشک ہو جائے۔ بھرائی کے لیے قیمہ تیار ہے۔ میدہ چھان کر گوندھ لیں۔ تھوڑا سا نمک بھی شامل کرلیں۔ چھوٹا سا پیڑہ بنا کر چھوٹی سی روٹی بیل کر الگ رکھ دیں۔ اسی طرح ایک اور روٹی بیلیں۔ اس پر تین کھانے کے چمچے قیمہ رکھیں (مقدار گھٹائی یا بڑھائی جاسکتی ہے) اوپر دوسری بیلی ہوئی روٹی رکھ کر کنارے ملا کر دبالیں۔ پھر مطلوبہ سائز تک بیل لیں۔ اور عام پراٹھوں کی طرح تل لیں۔ املی کی چٹنی یا رائتہ کے ساتھ پیش کریں۔

تلی ہوئی ثابت مچھلی

اجزا :

روہو مچھلی	1عدد (ثابت)
ٹماٹر	2عدد
پیاز	1عدد
لہسن	4جوے
ہری مرچ	3عدد
رائی	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
ڈبل روٹی کا چورا	آدھی پیالی
کالی پسی مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ
سرسوں کا تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

مچھلی جس کا وزن تقریباً" آدھا کلو ہو' اچھی طرح صاف کرکے اس پر نمک' پسی کالی مرچ' پسی ہوئی رائی اور ڈبل روٹی کا چورا تھوڑے سے پانی میں مکس کرکے لگائیں اور پندرہ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کرکے آہستگی سے مچھلی ڈال دیں۔ دونوں جانب سے اچھی طرح سنہری ہو جائے تو نکال لیں۔ الگ پتیلی میں دو کھانے کے چمچے تیل گرم کریں۔ لہسن کے جوے پیس کر اور ہری مرچ کتر کر ڈال دیں۔ ہلکا سا چمچہ ہلا کر بھونیں۔ لہسن خوشبو دینے لگے تو مچھلی ڈال کر ہلکی آنچ پر نرم ہونے تک پکائیں۔ بڑی اور کھلی ڈش میں نکال کر دھنیے کے پتوں' گول کٹے ہوئے کھیروں کے ساتھ پیش کریں۔

دہی کا پلاؤ

اجزا :

چاول	1کلو
دہی	1کلو
پیاز	2عدد
ہری مرچ	5عدد
لہسن	ایک پوتھی
ادرک	آدھا انچ کا ٹکڑا
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

سب سے پہلے لہسن اور ادرک باریک پیس لیں اور دہی میں اچھی طرح ملا دیں۔ ساتھ ہی ہری مرچ باریک کاٹ کر تھوڑے سے نمک کے ساتھ اس میں شامل کر دیں۔ اب پتیلی میں تیل گرم کریں اور اس میں پیاز کے کٹے ہوئے لچھے تل لیں۔ جب پیاز بادامی رنگت اختیار کرلے تو اس پیاز اور گھی کو دہی میں ملا کر پھینٹیں یہاں تک کہ پیاز اور دہی یک جان ہو جائیں اور گھی علیحدہ ہو جائے۔ دہی کے اس آمیزے کو پتیلی میں ڈال دیں' ساتھ ہی چاول بھی اس میں شامل کرکے چولہے پر چڑھادیں اور اتنا پانی ڈالیں کہ چاول گل جائیں۔ جب چاولوں کا پانی خشک ہو جائے تو پتیلی توے پر رکھ دیں اور آنچ بالکل ہلکی کر دیں۔ دس منٹ بعد چولہا بند کردیں۔ دہی کا پلاؤ تیار ہے۔

رشین سالاد

اجزا :

مٹر	1کپ
آلو بڑا	1عدد
بند گوبھی	8پتے
انڈے کی زردی	2عدد
لیموں کا رس	1کھانے کا چمچہ
پسی ہوئی رائی	آدھا چائے کا چمچہ
پسی کالی مرچ	1چائے کا چمچہ
چینی	1چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
مکئی کا تیل	آدھا کپ

انڈوں کی زردی میں نمک' پسی کالی مرچ' چینی' لیموں کا رس اور مکئی کا تیل ڈال کر خوب اچھی طرح پھینٹ لیں۔ سبزیاں ابال لیں۔ بند گوبھی کو ابلتے پانی میں ایک یا دو منٹ رکھ کر نکال لیں۔ اور باریک کاٹ لیں آلو کے چوکور چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیں۔ گاجر کے گول قتلے کاٹ لیں۔ ان سب اشیا کو انڈے والے آمیزے میں اچھی طرح مکس کرلیں۔ رشین سالاد تیار ہے۔

موسم سرما اپنے جلو میں بے شمار پھل اور سبزیاں لے کر آتا ہے۔ یہ پھل اور سبزیاں محض اپنے منفرد ذائقوں کے حوالے سے ہی ہمارے لیے یادگار اور اہم نہیں ہیں بلکہ اپنے خواص کے اعتبار سے بھی ہمارے لیے بے حد مفید ہیں۔ سیب، گاجر، کینو، مالٹا اور انگور وغیرہ اس موسم کی خاص سوغاتیں ہیں۔

گاجر

ہمارے ہاں گاجر کا استعمال کئی طرح سے رائج ہے۔ اسے کچا بھی کھایا جاتا ہے اور مختلف طریقوں سے پکا کر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی اس کی سبزی پکائی جاتی ہے تو کبھی گاجر کا حلوہ ہمارے ذائقے کی تسکین کرتا ہے۔ کچھ لوگ گاجر کا رس بھی بہت شوق سے پیتے ہیں۔

گاجر ’’وٹامن اے‘‘ کا قدرتی ذخیرہ ہے۔ ’’وٹامن اے‘‘ آنکھوں، دانتوں اور ہڈیوں کے لیے بے حد فائدہ مند ہے۔ نیز ’’وٹامن اے‘‘ خشک اور بے رونق بالوں کو قدرتی نمی اور چمک بھی عطا کرتا ہے۔ ’’وٹامن اے‘‘ کی کمی سے چہرے پر بلیک یا وائٹ ہیڈز نمودار ہو جاتے ہیں۔

نہانے سے قبل گاجر کے رس کو تھوڑے سے دودھ یا کسی بھی کریم میں ملا کر جلد پر لگائیں۔ تھوڑی دیر مساج کرنے کے بعد دھو لیں۔ جلد نرم و ملائم ہو جائے گی۔

آنکھوں کی سوجن میں گاجر کے رس میں دودھ ملا کر لگانے سے فوری آرام آتا ہے۔

گاجر کا رس تھوڑی دیر بالوں میں لگائیں اور پھر سر دھو لیں۔ یہ عمل بالوں کو نئی زندگی عطا کرتا ہے۔

کینو

کینو ’’وٹامن سی‘‘ کا منبع ہے۔
اور ناخنوں کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔
اگیزیما اور خارش کا بہترین علاج بھی ہے۔ ’’وٹامن سی‘‘ کی کمی سے جلد اور بال خشک اور بے رونق ہو جاتے ہیں۔ نیز چہرے پر بلیک ہیڈز بھی بن جاتے ہیں۔

کینو کی قاش کے دو ٹکڑے کر کے اس کا رس چہرے پر ملیں۔ پندرہ منٹ بعد سادہ پانی سے منہ دھو لیں۔ اس سادہ سے عمل سے چہرہ ایسا نظر آنے لگتا ہے جیسے ابھی ابھی فیشل کرایا ہو۔ اگر آپ کے چہرے پر ایکنی یا دانے ہیں تو کینو کے بیج دھوپ میں خشک کر کے انہیں پیس کر سفوف بنا لیں۔ اس سفوف کو تھوڑے سے پانی میں ملا کر رات سوتے وقت چہرے پر لیپ لیں۔ صبح چہرہ دھو لیں۔ کچھ ہی دنوں میں جلد صاف شفاف ہو جائے گی